دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماهنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
جنوری 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول
JANUARY 2017

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

قرشی
شربت توت سیاہ
گلے کی خراش، درد اور ورم کے لیے موثر
سُر سے سُر مِلا
توت سیاہ صِرف
قرشی کا ہی لا
Qarshi
Sharbat
Toot Sia
Qarshi
Sharbat
Toot Siah
قرشی شربت توت سیاہ کے فوائد:
گلے کی خراش، درد، ورم اور آواز کے بیٹھ جانے میں مفید ہے
گلے کے غدود بڑھ جانے (Tonsillitis) کی شکایت میں مؤثر ہے
سگریٹ نوشی اور خشک چیزوں کے استعمال سے گلے میں ہونے والی خراش کے لیے انتہائی مفید ہے
خناق میں ہونے والے گلے کے ورم میں بھی مفید ہے
لہٰذا خالص اور معیاری توت سے تیار کردہ صرف قرشی کا شربت توت سیاہ ہی استعمال کریں
facebook.com/QarshiPakistan | www.qarshi.com
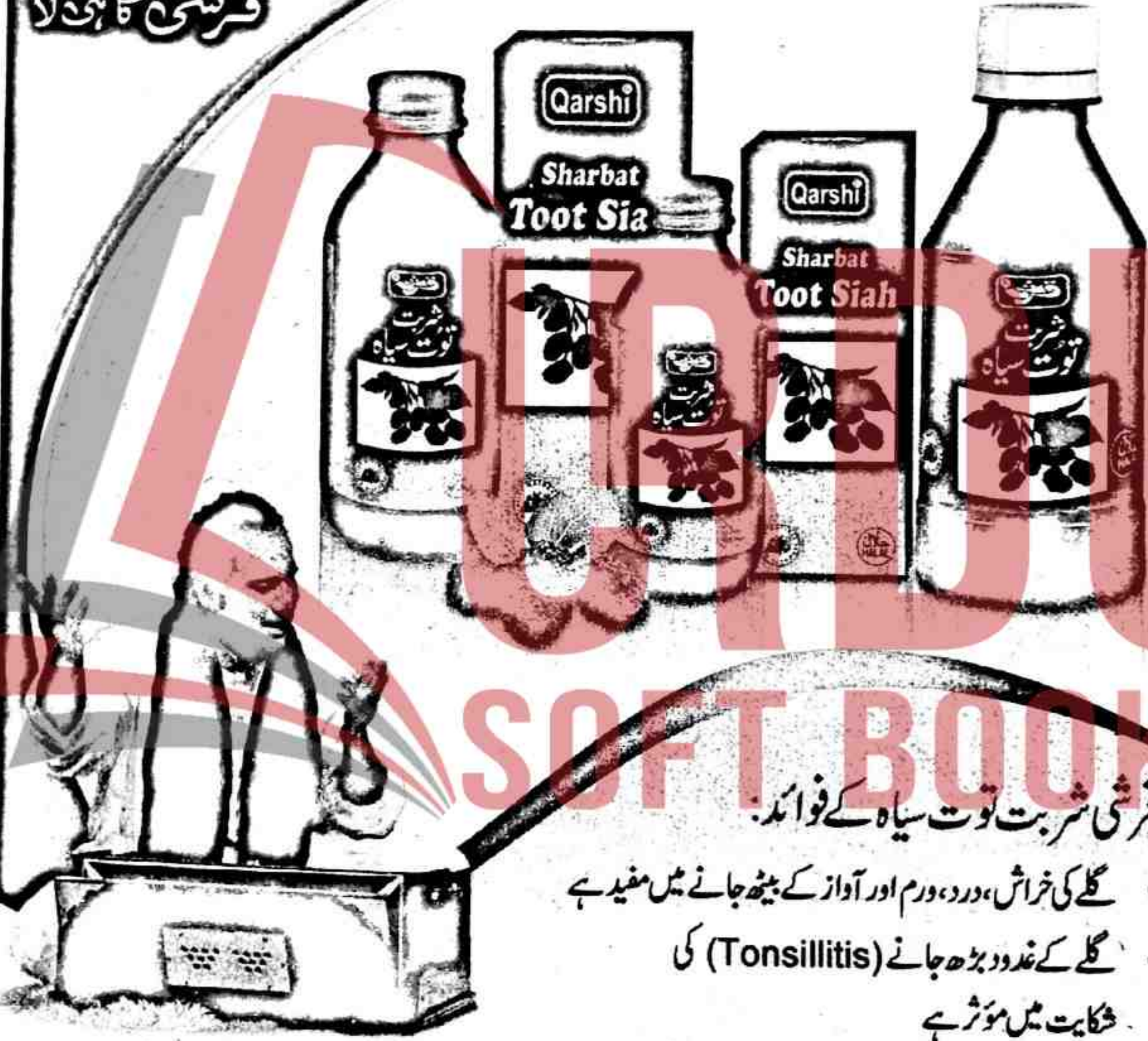
جلد 47 • شمارہ 01 • جنوری 2017 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Season
Pleasure
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

مدیر اعلیٰ — چھینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

2017ء بھی آ گیا۔ نئے سال کے پہلے شمارے کے ساتھ قارئین کو دلی مبارکباد۔ امید کرنی چاہیے کہ نئے سال میں قوم کو حالات میں مجموعی بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نظر آئے گی اور اب بات کھیل کی۔ کھیل کوئی بھی ہو۔ اس میں ایک فریق جیت جاتا ہے۔ دوسرا یا دوسرے ہار جاتے ہیں۔ ویسے تو ہمارے پیارے وطن میں بھی سیاست سیاست کھیلی جا رہی ہے، ہر طرف سے بلند بانگ دعووں اور آتش فشانی بیانات کا شور برپا ہے اور اس کی گونج وسیع و عریض میدانوں سے پارلیمنٹ تک میں سنی جا رہی ہے لیکن ہمیں اس سے فی الحال غرض نہیں کیونکہ ہم عوام ہیں۔ ہمارا طریقۂ استعمال ہمارے رہنما خوب جانتے ہیں۔ وہ وعدے وعید کر کے کسی نہ کسی طرح ہمیں اپنے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کر لیتے ہیں پھر اپنی پوری مدت اقتدار میں ہمیں یکسر بھولے رہتے ہیں۔ بعض اتنے بے نیاز ہوتے ہیں کہ ہمیں استعمال کیے ہوئے ٹشو پیپر جتنی اہمیت بھی نہیں دیتے۔ ان کی دانست میں سیاست لڑانا پیشہ وروں، شرفا (جی ہاں، شرفا) اور مقتدر خاندانوں کا حق ہوتا ہے۔ یہ دل فگار باتیں تو یوں ہی یاد آ گئیں...... بات ہو رہی تھی کھیل کی۔ تو جناب ہماری کرکٹ ٹیم آسٹریلیا میں پہلا ٹیسٹ میچ ہار گئی ہے۔ مبارک ہو کہ اس بار اور مدتوں بعد شاید پہلی بار پوری جان لڑا کر اتنی عزت سے ہارے ہیں کہ روایت کے برعکس شکست خوردہ ٹیم کے اسد شفیق کو مین آف دا میچ کا اعزاز دیا گیا ہے، کرکٹ کے آسٹریلوی ماہرین پاکستانی ٹیم کی کارگزاری اور سخت جانی کے گن گا رہے ہیں۔ اس ہار کو قوم نے بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے کہ کھیل میں جیت کے ساتھ ہار بھی ہوتی ہے۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا کے مصداق ہر پاکستانی کو امید ہے کہ اگلے دو ٹیسٹ میچ کانٹے کے ہوں گے۔ پہلی اننگز میں ناکامی کے بعد ہمارے کھلاڑیوں نے اپنی دوسری اور میچ کی چوتھی اننگز میں جو ریکارڈ ساز اور یادگار کارکردگی دکھائی ہے اس پر انہیں مبارکباد دیتے ہوئے اب چلتے ہیں اپنی محفل میں۔

کھاروٹھٹھہ سے منصور حبیب پلیجو کی شرکت ”سرد ہواؤں میں بیتے لمحوں کی میٹھی کسک جگاتے بے درد دسمبر کا پیارا جاسوسی روایتی جلوؤں کے سنگ بروقت جگمگاتا ہوا ہمارے ہاتھوں میں آن پہنچا۔ سرورق پہ نوخیز دوشیزہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرقاب ڈگمگاتے قدموں والے نوجوان کو تکتے نظر آئی اور اوپر کونے میں ایک ضعیف الاعتقاد بندہ معنی خیز مسکراہٹ سجائے ہوئے سمجھ سے بالاتر رہا البتہ ذاکر انکل نے جھکڑی سجا کر احساسِ مایوسی، خوفِ سزا اور سفاکانہ عیاری کو سرورق میں بہت مہارت سے سمویا۔ دھڑکتے دل سے امید اور چاہ کے سنگ پھولوں کے چمن کی طرف لپکے اور اپنے نشیمن کی تلاش میں سرگرداں کونے کونے کو کھنگالا اور اس بار مستقبل کے مکینوں میں اپنا اندراج دیکھ کے مایوسی کے بادل چھٹ گئے۔ مدیر اعلیٰ پورے جوش خروش اور ولولے سے موذی کو اس کی اوقات میں رہنے کا درس دیتے نظر آئے مگر جناب لاتوں کے بھوت باتوں سے کہاں مانتے ہیں بے شک ہمارے شیر جوان ان کو راہِ راست پر لے آئیں گے۔ شہر قائد سے ساحر بھیا مسندِ صدارت پہ چہکتے نظر آئے۔ رانا بشیر آپ کی شاعرانہ دعا قبول ہو، بابر عباس صاحب کچھ گل حساس ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو تک آ جاتے ہیں اس لیے زبردستی کے رشتے سے بچاہ ضرور کیجیے گا۔ قدرت اللہ صاحب مفت مشورے بانٹتے رہے بس کوئی استفادہ نہ کرے تو اس کا نصیب۔ شعیب الرؤف، بابر عباس کی تعریف میں رطب اللسان لیکن طاہرہ باجی کو چھیڑنے سے باز نہ آئے جبکہ طاہرہ باجی چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے ملول اور افسردہ دکھائی دیں اس لیے حریفوں کو اپنے سابق روایتی انداز میں جواب دینے میں ناکام رہیں۔ سید عبادت کاظمی، شاہد امین، آصف بشیر، تانیہ مہر اور ماہ گل کے تبصرے شائع ہونے پہ ان کو دلی مبارکباد۔ انگارے میں اب وہ پہلے والی چاشنی کچھ کم ہو گئی ہے پھر بھی سسپنس اور ایکشن قائم ہے قسطینا، تاجور کی یادوں تک کو پسِ پردہ کر چکی۔ سجاول کا غیاب اب ہضم نہیں ہو رہا ہے۔ شہزی جی نے کوریلا کو زندہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب میجر کمن کے نگر میں آپ کی معرکہ آرائی کے منتظر ہیں۔ بھٹی صاحب کہانی کو اس نہج پر پہنچا چکے کہ ماضی کی تنقیدیں اب قصۂ پارینہ بن چکیں۔ آتشِ بغاوت میں شاہ جی کا خون صدر حیات کے عبرتناک انجام کا باعث بنا۔

باقی کہانی میں جھول جابجا موجود رہے۔ کرداروں پر گرفت مکمل نہ تھی۔ مرکزی کردار کٹھ پتلی بنے رہے جبکہ معرکہ تو غیر ملکی جہازوں کی غیبی مدد کی وجہ سے سر ہوا البتہ کہانی کا موضوع اور اختتام دلآویز اور خوش آئند رہا۔ دائرہ سادہ تحریر رہی، تنویر کی شرارت کی سزا بہت بھاری رہی، قاری کو تجسس باندھے رکھتا ہے اور اندازے سے منفرد انجام متاثر کرتا ہے مگر یہاں مرحلہ وار سب کچھ سوچ کے موجب ہی ہوا۔ اس بار بھی کبیر عباسی خونی رات میں ان چھوئے حساس موضوع کو اپنے قلم کی نوک تلے زیر تحریر لے آئے۔ معاشرتی برائیوں کو عیاں کرتے دلچسپی کے عنصر کو قائم رکھنے کی خاطر فلمی ایکشن کا تڑکا خوب رہا اور بڑی خوب صورتی سے کہانی کو خاتمہ بالخیر تک پہنچا گئے البتہ کرداروں کی بہتات اور کہانی کی بے جا طوالت نے ذرا سی الجھن میں ضرور مبتلا کیا۔ منظر امام اس بار رنگ نہ جما سکے، کہانی میں تضادات لامحدود، فلمی ملغوبا آمیز موضوع، بہرطور کھینچ کھانچ کے انجام تک پہنچایا۔ مرحوم مختار آزاد کی دہرا جیون بہت زبردست رہی بس پروفیسر سے یہ امید نہ تھی کہ نشانہ بناتے وقت پہلے کمزور فریق کو مار گرائے۔ سلیم انور اس بار جاسوسی کے قارئین کے لیے شاہکار پیش کرنے میں مکمل کامیاب رہے۔ قرض، وہ عورت، اور ہمشکل درمیانی درجے کے خلا کو پُر کرنے میں بہتر رہیں جبکہ سرور اکرام ہلکی پھلکی مزاح سے مزین میرا سایہ پیش کر کے داد سمیٹنے میں فاتح ٹھہرے۔ معاشرتی مسائل پر موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے اسفند یار کی ہمدردی کا صلہ بھی بہترین رہی۔‘‘

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی قابلِ غور باتیں ’’اس سال کا جاسوسی کا آخری شمارہ 3 دسمبر کو مسرور بیس میں ملا اور یہ کراچی میں میرا آخری شمارہ ثابت ہوا کہ میری پوسٹنگ پشاور میں ہوگئی۔ آج کراچی سے یہ آخری تبصرہ لکھ رہا ہوں۔ کراچی میں مجھے بہت محبت ملی۔ خوب صورت مقامات کا یہ شہر جس میں عبداللہ شاہ غازی، سی ویو، ہاکس بے، زیرو پوائنٹ، نیشنل اسٹیڈیم اور کئی خوب صورت مقامات دیکھنے کو ملے۔ کراچی شہر نے یہاں آنے والوں کو ہمیشہ سر چھپانے کے لیے ٹھکانا اور کھانے کو روزی دی مگر اس کی حالتِ زار دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ جابجا گندگی کے ڈھیر، جھگڑے فساد اور لاقانونیت کا راج۔ شاید کہ امیرِ شہر کو اس بات کا ادراک نہیں کہ یہ صرف ایک شہر نہیں بلکہ پاکستان کی شہ رگ ہے۔ میری حکمرانوں سے اپیل ہے کہ اس شہر کو اس کا حق دیا جائے۔ اس سال نے بہت دکھ دیے جہاں ادب کی دنیا کو بہت نقصان پہنچا، نواب انکل، کاشف زبیر، مختار آزاد اور کئی مصنف ہم کو چھوڑ گئے، وہیں محفل کے کئی ساتھیوں نے اجل کے ہاتھوں غم اٹھائے۔ خود میرے سر پر یہ سال غم کے پہاڑ توڑ گیا... ہوائی جہاز کے حادثے نے روح تک کو زخمی کر دیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ آنے والا سال ہر کسی کے لیے خوشیاں لائے، آمین۔ سرورق کو دو صنفِ وجاہت اور ایک صنفِ نازک سے سجایا گیا۔ آپ کے اداریے تک پہنچے، آپ نے بجا فرمایا مودی کے بارے میں لگتا ہے کہ یہ بھارت کو خاک چٹوائے گا۔ دوستوں کی محفل میں سجاد احمد ساحر اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ نظر آئے۔ کرسیِ وزارت پر بشیر احمد ایاز نے اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ قبضہ جمایا ہوا تھا۔ مرحا گل شکریہ آپ کو میری سالگرہ یاد تھی۔ قدرت اللہ نیازی کی بھی خوب عرق ریزی، شعیب الرؤف کی بہترین تبصرہ نگاری، باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ اسرار ساقی بھائی بلیک لسٹ میں نظر آئے۔ ایچ اقبال کی آتشِ بغاوت پڑھی، کاش ہمیں بھی ایسے اچھے حکمران میسر آجائیں۔ مختار آزاد مرحوم کی دہرا جیون بہت اچھی لگی۔ ماریو اور پروفیسر ایک شخصیت کے دو نام۔ اپنی کہانی مکمل کرنے کے لیے پروفیسر کا منصوبہ آخر میں جا کر ناکام ہوا۔ لوئے کے مزے ہو گئے۔ امجد رئیس کی قرض میں ایلون بوائڈ نے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ تنویر ریاض کی وہ عورت دماغ میں کوئی بیٹھی نہیں۔ طاہر جاوید کی انگارے پڑھی۔ اس دفعہ والی قسط بھی بامِ عروج پر رہی۔ شاہ زیب اور قسطینا میں نئے رشتے کی بنیاد پڑ گئی۔ زینب والا معاملہ بھی پُراسرار ہے۔ خزانے کا عفریت سلیم انور کے قلم سے آئی جیک میڈلن کو لالچ نے موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ منظر امام دوسرا چہرہ لے کر آئے۔ جمیلہ اور بجلی بہت عمدہ کمبی نیشن، ایک فلم دیکھ کر جمیلہ نے بجلی بننے کا سین بخوبی نبھایا اور آخر میں وکیل نے اس کو بری بھی کروا لیا۔ سہیل کو اس کی محبت مل گئی۔ جمال دستی کی ہم شکل میں سراغ رساں سینڈی نے کیا خوب نقطہ دیا چور کو پکڑنے کے لیے۔ آوارہ گرد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا قلم بھی زوروں پر ہے۔ شہزی ایک مصیبت سے نکلتا ہے تو آگے دو تین اور منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں لیکن اس دفعہ وہ اپنے ہدف کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ امید ہے وہ اب دوستوں کو بھی چھڑوا لے گا اور لولووش کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کر لے گا۔ سرور اکرام کی میرا سایہ کیا خوب رہی، شگن میاں کی چھان بین، کیا خوب طریقہ ہے معلومات اکٹھی کرنے کا۔ تمکین رضا کی نابلد بھی اچھی رہی۔ اسفند یار کی ہمدردی کا صلہ بھی عمدہ رہی۔ واقعی کبھی کبھی انسان کو اس کی نیکی گلے پڑ جاتی ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی دائرہ محمد فاروق انجم کے قلم سے جس نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ بچوں کی کہانیوں جیسا حال تھا۔ کبیر عباسی کی خونی رات کچھ بہتر تھی۔ ہمارے معاشرے کے کرداروں کو اجاگر کیا گیا کہ کس طرح یہاں وڈیرا سر پرستی میں سارے دھندے چلتے ہیں۔ ان وڈیروں کی وجہ سے غریب کے بچے کو اسکول کا منہ دیکھنا میسر نہیں۔ یہاں میں نے کینٹینوں اور ہوٹلوں پر پاکستان کے مستقبل کو

رُلتے ہوئے دیکھا ہے کہ 10 سال کے بچے کام کررہے ہیں پڑھنے کے بجائے۔ میں نے ایک سے پوچھا، بیٹا تم پڑھتے کیوں نہیں ہو تو جواب آیا کہ ہمارے ہاں گاؤں میں اسکول ہی نہیں۔ والدین بھی بہت بڑے ظالم کا کردار ادا کررہے ہیں بچوں کو تعلیم نہ دے کر۔ میری پاکستان کے تمام والدین سے اپیل ہے کہ خدارا اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے ضرور آراستہ کریں ورنہ کئی نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔ اس دفعہ امید ہے کہ ادارے والوں کی قینچی میرے تبصرے کو کاٹنے سے پرہیز کرے گی۔ بیچ میں کترنوں نے بھی مزہ دیا۔ مجموعی طور پر سال کا آخری شمارہ بیسٹ رہا۔“

رانا بشیر احمد ایاز احسان پور ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ”سال کا آخری شمارہ 6 تاریخ کو لرزتے، ہانپتے کانپتے اور لڑکھڑاتے ہوئے آن وارد ہوا۔ سرورق پر بیٹھی دوشیزہ کا منہ شاید شدید سردی لگنے کی وجہ سے کھلا ہوا تھا۔ بے چاری کے پاس کوئی گرم شال تک نہیں تھی۔ اوپر ایک صاحب ہتھکڑی لیے مونچھوں کو تاؤ دیتے اور نیچے بابر عباس کو دھمکاتے نظر آئے کہ ذرا ہوشیار رہنا بچو۔ ذاکر انکل کو چاہیے تھا کہ بے چاری کو شال تو پہنا دیتے۔ چلو خیر، سب قارئین اور جاسوسی کے تمام اسٹاف کو نیا سال مبارک ہو۔ نئے سال کی مبارک دینا تو اب رسم نبھانا رہ گیا ہے کیونکہ پہلے ہم 2016ء لکھتے تھے اور اب 2017ء لکھیں گے۔ عام آدمی کی زندگی میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ چینی نکتہ چینی میں کراچی سے سجاد احمد ساحر، انیق کی طرح خاص آلتی پالتی مار کر بیٹھے دکھائی دیے۔ مرحا گل کی فنکاریاں اچھی لگیں۔ محمد قدرت اللہ صاحب ویلکم بیک۔ اب امید ہے کہ غیر حاضر نہیں ہوں گے آپ۔ بھائی محمد صفدر معاویہ بہت شکریہ اتنے اچھے انداز میں سراہنے کا۔ آپ کا اپنا تبصرہ لاجواب ہوتا ہے۔ ماہ تاب گل کا تفصیلی تبصرہ گویا موتیوں کو مالا میں سلیقے سے پرو دیا گیا تھا۔ ویری نائس ماہ تاب گل۔ باقی طاہرہ گلزار، تانیہ مہر اور آصف بشیر بھی خوب رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آغاز آتشِ بغاوت سے کیا۔ پرتگال سے شاہ صاحب کی واپسی میں روڑے اٹکائے گئے مگر دوسرے ملک سے طیارہ چارٹر کرکے واپس اپنے ملک میں آئے تو راکٹ مار کر ان کو شہید کر دیا گیا۔ عوام کے ہمدرد کور کمانڈرز بھی اسی پاداش میں شہید کر دیے گئے۔ آخر میں صدر حیات بیگ عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا مگر جنرل چنگیزی کا کچھ پتا نہ چلا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ مغل اعظم صاحب کے دہکتے انگارے اب مشعلوں میں بدل گئے ہیں۔ کبڈی شاہ بھی برونائی آن دھمکا ہے۔ بڑی بیگم نے اپنے گھر کو بچانے کے لیے زینب پر دباؤ ڈال کر اس کو ابراہیم سے دور کر دیا ہے۔ انیق کی پرفارمنس بہت اچھی رہی۔ بھٹی صاحب کا ہیر و کچھ زیادہ ہی آوارہ گرد ہو گیا ہے۔ سوشیلا کو اژدھے سے بچایا تو سے جی کو ہارا پہنچ گیا۔ اس کو ڈاج دے کر شہزی نکلنے میں کامیاب رہا۔ کہانی کے سارے کردار منظرِ عام سے غائب ہیں۔ لگتا ہے ڈاکٹر صاحب نے سب کو لمبی چھٹی پر بھیج دیا ہے۔ آخر میں سونگ کھلا کا رویہ بھی بدل گیا ہے۔ منظر امام کا دوسرا چہرہ کچھ خاص رنگ نہ جما سکا۔ اس دفعہ نفسیاتی بیماری پر قلم کے جوہر دکھانے میں مصروف رہے۔ بس مناسب کہانی تھی۔ اسفندیار کی ہمدردی کا صلہ اچھی کاوش رہی۔ ارشد ایک ہمدرد اور بے لوث انسان ثابت ہوا اور دوسری طرف فرزانہ ایک نمبر کی عیار، مکار اور فریبی نکلی۔ پہلے پہل تو ارشد کو اپنی اداؤں اور حسن سے اپنا اسیرِ زلف بنانا چاہا، اس میں ناکامی کے بعد بیٹے کو اغوا کروا کے دس لاکھ روپے اینٹھ کر چلتی بنی۔ فرزانہ جیسے کرداروں کی وجہ سے اب اصل اور مستحق لوگوں کا حق بھی مارا جا رہا ہے۔ دائرہ میں تنویر علی اپنی شوخیوں اور شرارت کی وجہ سے گرداب میں پھنس گیا۔ جمی نے صرف نئی کار پر لکیر کھینچنے کے جرم میں تنویر کو نہایت سخت سزا دی اور ہر پل خوف و ہراس میں مبتلا رکھا۔ مدد کرنے کا ناٹک رچا کر بے چارے کی خوب دوڑ لگوائی۔ عروسہ بھی ہاتھ سے گئی اور جمی کو مارنے کے بعد تنویر خود بھی جان کی بازی ہار گیا۔ اچھی کہانی رہی۔ دوسرے سرورق رنگ میں کبیر عباسی صاحب کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ ایک ہی رات میں اتنے قتل اور غارت گری۔ مار دھاڑ سے لبریز کہانی میں کوئی جان نہیں تھی۔ نہ کوئی پلاٹ میں دم تھا کہانی کے اور نہ ہی کرداروں میں دم خم۔“

سندیلیانوالی سے وارث علی کی پسندیدگی ”سال کا آخری شمارہ 5 دسمبر کی شام کو ملا جو خلافِ توقع کافی جلدی مل گیا جس پر بے تحاشا خوشی محسوس ہوئی۔ سرورق پر کبیر عباسی کی پُرسوچ عورت اور احسان سحر کی بھاگتی ہوئی پرچھائیں دیکھ کر کچھ سمجھ نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے؟ بہرحال حسینہ ماہ جبینہ بہت خوب صورت تھی۔ کہانیوں کی لسٹ پر سرسری نظر ڈالی اور تبصروں میں جا وارد ہوئے۔ سجاد احمد ساحر صاحب مبارک ہو تبصرہ اچھا تھا۔ دونوں کے تبصرے اعلیٰ پائے کے تھے۔ سید عبادت کاظمی کے دکھ میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں کہ ان کی ہونے والی شریکِ حیات اگلے جہاں کوچ کر گئیں۔ کاظمی بھائی سے صبر کی التجا ہے کیونکہ بے شک ہم سب بھی اللہ کی طرف جانے والے ہیں۔ احسان سحر کا خط پڑھ کر نہ جانے کیوں عجیب سا لگا کہ انہوں نے اتنی بڑی بات بنا سوچے سمجھے کہہ دی کہ جاسوسی پر اتنا بھی برا وقت نہیں آیا کہ ایسی کہانیاں پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ ارے میرے پیارے جادوگر صاحب یہ ہماری سوچ کا فرق ہے ورنہ کہانی تو بہت زبردست تھی۔ بہرحال آپ کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ جاسوسی اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ بنا کچھ سوچے سمجھے کچھ بھی شائع کر دے۔ یقیناً اچھی طرح

سوچ سمجھ کے ہی جاسوسی والوں نے اس کی کہانی لگائی اور اس دفعہ بھی ہمارے شہزادے جی کی تحریر ”خونی رات“ شاملِ اشاعت ہے۔ خیر جو بھی ہے بندہ اپنے الفاظ سوچ سمجھ کر یوز کرے تو عقل والا ہی کہلائے گا۔ خطوط میں آپی طاہرہ گلزار کا خط کافی عرصے بعد بغیر کسے گلے شکوے کے شامل ہوا۔ کہانیوں میں ابتدا انگارے سے ہی کی۔ اس دفعہ بھی پوری قسط شعلوں اور انگاروں میں ہی گھری رہی۔ شکر ہے کہ قسطینا اور شاہ زیب بیگمن والی چھت سے بخیر و عافیت نکل آئے۔ قسط میں سجاول کا نہ آنا دکھی سا کر گیا۔ کم بخت ہے تو ڈکیت لیکن شاہ زیب کے ساتھ کافی احسان کر چکا ہے اور کافی ساتھ بھی اس کا دے چکا ہے اس لیے دعا ہے کہ وہ بھی خیریت سے رہے، انیق کا زینب والے معاملے کو سمجھ داری اور رازداری سے نمٹانا بہت اچھا لگا۔ قسطینا اور شاہ زیب اب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن رہے ہیں۔ جاناں کا نہ آنا اس دفعہ اچھا لگا۔ دوسرے نمبر پر حالات کے مارے شہزی کی آوارہ گردی پڑھی جس کی ابتدا اتنے ہولناک اور خطرناک طریقے سے ہوئی کہ حقیقت کا گمان لگنے لگی تھی۔ شہزی پر کوہارا اور کوریلا کا حملہ، سوشیلا اور شہزی پر اژدھے کا حملہ اور پھر خطرناک کالے بچھوؤں کا شہزی کو ڈنک مارنا حقیقت میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے الفاظ تھے۔ سوشیلا اب پھر منظرِ عام سے ہٹ گئی۔ شہزی بے چارہ باقی ساتھیوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود موت کے منہ میں چلا گیا جہاں سے اسے خطرناک حسینہ سونگ کھلا نے بچایا جو اَب شہزی کے لیے کھلا چیلنج بن گئی ہے کہ کب تک اس سے بچتا ہے۔ سونگ کھلا کی حقیقت بھی شہزی پر کھل گئی اب یقیناً شہزی موقع ملتے ہی ان پر کھل کر برسے گا باقی بعد میں دیکھا جائے گا کہ اس کے ساتھی کہاں سے برآمد ہوتے ہیں۔ جاسوسی کی یہ دونوں کہانیاں تو حقیقت میں ہم سب کی جان ہیں۔ طاہر جاوید مغل اور عبدالرب بھٹی آپ لوگوں کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے اور بے اختیار داد دیتے ہیں ہم سب۔ ہمیں اتنی اچھی کہانیاں دینے پر...... تیسرے نمبر پر جو کہانی پڑھی وہ بھی بلاشبہ دونوں قسط وار کہانیوں سے کم نہ تھی۔ ایچ اقبال کافی عرصے بعد اتنی اچھی کہانی لے کر آئے اور آتے ہی چھا گئے۔ پشمینہ کا اتنے دگرگوں حالات میں مقابلہ کرنا، ماں اور بھابی کو بچانا اور ملک اور عوام کی خاطر خود کو آگ میں جھونکنے سے نہ روکنا بہت پسند آیا۔ قیصر حیات صاحب کو کتے کی موت حاصل ہوئی جو آخر دم تک لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیلنے کا کام کرتا رہا۔ ڈیبرا نے کافی متاثر کیا اور اپنی دوست سے دوستی اور وفاداری کا حق نبھایا۔ اس مطلبی، ہوس پرستی اور لالچی دور میں اتنی اچھی دوست پشمینہ کو نصیب ہوئی۔ بہت تیزی سے حالات و واقعات کو آگے لیتے ہوئے ایچ اقبال نے کافی اچھی تحریر دی۔ کبیر عباسی کی خونی رات بہت حساس موضوع پر لکھی گئی تحریر تھی۔ دو طرح کے سبق حاصل ہو رہے تھے کہ بچوں کی پرورش اس طرح بھی نہ کی جائے کہ ان کا اعتماد ہی جاتا رہے بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ والدین کو چاہیے کہ بچوں کی حالات کے مطابق تربیت کرتے رہیں۔ دوسری یہ بات کہ ماں باپ بولنا پھر ان کو دھوکا دینا خود اولاد کے لیے ہی باعث مصیبت ہوگا جیسا کہ صائم کے ساتھ ہوا۔ مجموعی طور پر اچھی تحریر تھی۔ کبیر بھائی جی بہت بہت مبارک ہو آپ کو کہ آپ کی تیسری کہانی بھی جاسوسی کی زینت بن گئی۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔“

کراچی سے ادریس احمد خان کی محبت نوازی ”جاسوسی ڈائجسٹ گوناگوں دلچسپیاں لیے ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ہمیشہ کی طرح محظوظ ہوئے اور معترف ہیں کہ واقعی جاسوسی جیسا کوئی نہیں۔ سرورق کمالِ فن کا آئینہ دار تھا جس میں ذاکر صاحب کی کاوشوں کا ذکر سرفہرست ہے۔ اداریہ بھی حالات کے عین مطابق تھا۔ موذی کا کام ہی دشمن کو زک پہنچانا ہے جس کا دشمن صرف اور صرف مسلم ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کو خوب اچھی طرح تجربہ ہو گیا ہے۔ انسان کی جبلت ہے کہ اپنی عادت بدل سکتا ہے مگر فطرت نہیں بدل سکتا یہ مقولہ موذی پر سو فیصد اشارہ کرتا ہے۔ سانپ کو جتنا بھی دودھ پلاؤ اس کا کام ہی ڈسنا ہے۔ چیچی نکتہ چینی میں ناموں کی فہرست میں سارے نئے و پرانے دوست نظر آ رہے تھے اور اپنی اپنی آرا کا اظہار کر رہے تھے۔ آگے بڑھ کر لفظوں کے کھلاڑی ایچ اقبال کی خوب صورت تحریر میں محو ہونا پڑا۔ انہوں نے آج کی سیاست کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا۔ واقعی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس کے لیے جذبات کوئی حیثیت نہیں دکھاتے صرف اور صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے، چاہے رقیب اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو اور اولاد اپنے جسم کا حصہ ہوتی ہے اور انسان اپنے جسم کے حصے کو کاٹ کر پھینکنا چاہے تو عجیب ہی کہا جاسکتا ہے اور آنکھ کا اندھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ مختار آزاد کی دہرا جیون ایک اثر پذیر کہانی تھی۔ قرض بھی پسندیدہ کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی وہ عورت نے بھی محظوظ کیا۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے خوب آنچ دے رہی تھی۔ اس کا ثبوت وہ انہماک ہے جو انگارے پڑھتے وقت طاری ہوتا ہے اور تادیر تک قاری اس کے سحر میں رہتا ہے۔ خزانے کا عفریت بھی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھی۔ منظر امام کی دوسرا چہرہ انسانی نفسیات پر لکھی گئی اچھی کہانی تھی جس نے معاشرے کی صحیح عکاسی کی۔ سراغ رساں سینڈی نے بہت ذہانت کا مظاہرہ کیا اور ایڈنا لوگن کے قاتل کو پابندِ سلاسل کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی ہے۔ سرور اکرم کی میرا سایہ بھی اپنا آپ منوا رہی تھی۔ ان کا اندازِ تحریر بھی منظر امام جیسا ہے۔ کہانی میں پیغام بھی چھپا ہوتا ہے۔ نابلد میں انسپکٹر میلوری نے انتہائی مشاقی کا ثبوت دیا۔ پروڈیوسر کے قتل کا سراغ لگا لیا۔ ہمدردی کا صلہ بہت اچھی طرح لوگوں کو ادراک کرایا گیا کہ اس کے باوجود کہ پڑوسی و محلے والوں کے حقوق بہت ہوتے ہیں مگر اجنبی پڑوسی پر بھی اتنی جلدی بھروسا نہیں کرنا چاہیے جب تک خوب اچھی

طرح سے پرکھ نہ لیں، تعلق کو ایک حد میں رکھیں۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں اچھی تھیں۔"

سعودی عرب، جدہ سے پرویز لانگاہ کا تبصرہ "خلافِ معمول اس بار جاسوسی 6 تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق پہ نظر ڈالی، عورت بے چاری، مرد کو مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا دیکھ کر سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کیسے مچھر سے جان چھڑواؤں۔ اداریے میں موذی کے ذکر پہ دل و دماغ کھول گئے اور نام نہاد اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی مجرمانہ خاموشی پہ خون کے گھونٹ پینے کے سوا کچھ نہ کرسکا اور دل اس بات پہ کڑھتا ہے کہ ہمارے یہاں فارن منسٹری اتنی کمزور کیوں ہے؟ محفلِ یاراں میں وکٹری اسٹینڈ پر سجاد احمد ساحر براجمان تھے مبارکاں بھائی تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا۔ آتش بغاوت اور انگارے کے درمیان قرعہ آتشِ بغاوت کے نام نکلا بہت عرصے بعد ایک اچھی کہانی پڑھنے کو ملی جس میں سسپنس بھی تھا۔ تھرل بھی تھا۔ سیاست کو لوگوں نے اتنا گندہ کر دیا ہے کہ اپنی اولاد تک کو قتل کرنے سے بھی نہیں گھبراتے۔ پشمینہ کے بچنے کی امید نہیں تھی مگر آخر میں اس کا بچنا سرپرائزنگ لگا۔ انگارے کی یہ قسط ذرا ٹھنڈی لگی اور زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ میں نے کہا تھا کہ قسطینا شاہ زیب کے چکر میں پڑ جائے گی جو کسی حد تک درست نکلا۔ سجاول تا حال لاپتا ہے۔ سرورق اس بار جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھے۔ فاروق انجم کے دائرہ میں تنویر کو اس کے چھوٹے مذاق کی قیمت جان دے کر چکانی پڑی۔ اس کہانی میں بھی یہی دکھایا گیا کہ پیسے کے پیچھے کیسے خونی رشتے بھی دغا دے جاتے ہیں۔ کبیر عباسی کی خونی رات بھی بہت اچھی تحریر تھی پتا نہیں ہم کب ان چوہدریوں اور وڈیروں کے چنگل سے آزاد ہوں گے جن کے ایک اشارے پہ خاندانوں کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کمال جیسی لعنتیں بھی ہیں تو عاصم جیسے بھولے لڑکے بھی جن کے ایک واقعے سے پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے مگر عاصم خوش نصیب تھا جو بچ گیا۔ والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو ایسی کسی صورت میں بچنے کی تدابیر سکھانی چاہئیں۔ چھوٹی کہانیوں میں خزانے کا عفریت بہترین لگی جیک میڈلین اکیلے ہی خزانے کو ہڑپ کرنے کے چکر میں ٹام کے ہاتھوں مارا گیا۔ نابلد میں الینا اولیور کو اس کے امریکی لب و لہجے اور رائٹنگ نے پکڑوا دیا یہ کہانی بھی ٹھیک تھی۔ میرا سایہ میں شگن بھائی کی جاسوسی اس کو مرواتے مرواتے بچی۔ شگن بھائی جیسے پیدائشی جاسوس ہمارے آس پاس بہت ہیں۔ ابھی باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں پردیس کی نوکری میں اتنا کچھ پڑھنے کو ملتا ہے یہ بھی غنیمت ہے۔"

چنیوٹ سے لیلیٰ کوثر لاشاری کی متاثر پسندی "دسمبر کا جاسوسی ڈائجسٹ پانچ دسمبر کی خنک شام کو ملا۔ حسبِ عادت سرورق کا جائزہ لیا۔ صنفِ کرخت کا سوچتی ہوئی نگاہوں سے حسینہ دلنواز کو دیکھنا اور ہتھکڑی کی موجودی اس بات کا تاثر دیتی تھی کہ سرورق کے رنگ شاہکار ہوں گے۔ اشتہارات کو نظروں میں تولتے چینی نکتہ چینی میں پہنچ گئے، جہاں چینی چینی میں نقطے تھے اور نقطے نقطے میں چینی تھی۔ اداریہ موجودہ حالات کا صحیح عکس پیش کر رہا تھا۔ کرسی صدارت پر براجمان صاحب خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے، باقی تبصرہ نگاروں میں شبراتی تبصرہ نگار کھلکھلاتے نظر آئے تو ثانیہ مہر چہکتی ہوئی نظر آئیں۔ کہانیوں کے مطالعے کا آغاز ابتدائی صفحات کی تحریر آتشِ بغاوت سے کیا کہانی ایک نازک اندام حسینہ کے آہنی ارادوں کا احاطہ کرتی ایک متاثر کن تحریر رہی۔ سطر سطر رنگ بدلتی، لہو رنگ سلسلہ وار کہانی انگارے کی حالیہ قسط کافی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئی تھی، اور کیوں نہ دلچسپ ہو، قلم ہو مغلِ اعظم کا اور صفحات جاسوسی کے، چار چاند لگ گئے۔ اس کے بعد سرورق کے رنگوں میں پہلے دائرہ پڑھی جس میں اس چھوٹی خوشی کا احوال بیان کیا گیا جو زندگی کا وبال بن گئی تھی، دوسرا رنگ، کبیر عباسی کے قلم کا شاخسانہ، خونی رات پل پل رنگ بدلتی زیرِ نقاب چھپے گھناؤنے چہروں کی کج ادائیوں کا احوال بیان کرتی بہترین تحریر تھی، آوارہ گرد بھی سابقہ اقساط کی نسبت ایکشن سے بھرپور رہی، مختصر کہانیوں میں، مختار آزاد صاحب کی دہرا جیون، امجد رئیس کا قرض اور منظر امام کا دوسرا چہرہ رومانوی فضا میں سرمستی اور کیفیت میں ڈوبا دلپذیر فسانہ تھا۔ مجموعی طور پر شمارہ دلچسپ رہا۔"

مانسہرہ سے اے ایچ کاظمی کی شمولیت "یوں تو عرصہ چھ سال سے جاسوسی کا قاری ہوں، لیکن تبصرہ بھیجنے کی ہمت صرف دو بار کی، پہلی بار تو ردی کی نذر ہو گیا، اس بار شاید اس اعزاز سے بچ جائے۔ جاسوسی اس ماہ 8 تاریخ کو ملا، محفلِ یاراں میں داخل ہوئے تو کرسیِ صدارت پہ سجاد احمد ساحر کو فائز پایا، فیصل آباد سے شعیب الرؤف کی مشترکہ عرق ریزی ملاحظہ کی لیکن سمجھ نہیں آیا، کس کے ساتھ مشترکہ تھی، باقی تبصرے بھی بہترین تھے، انگارے میں مغل صاحب کا قلم اپنے جوبن پر ہے، آوارہ گرد بھی اپنی مخصوص تیز رفتاری سے جاری ہے، میرے خیال میں آوارہ گرد کو اب اختتام پذیر ہو جانا چاہیے، سرورق کے رنگ بھی عمدہ تھے، کبیر عباسی برادر کو مبارکباد، وہ بہت ہی کم وقت میں ایک پختہ قلم کار کے طور پر چھا گئے ہیں، باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

راجن پور سے ماہ تاب گل کی پسند "جاسوسی اس مرتبہ بس مل ہی گیا۔ اب یہ مت پوچھئے گا کہ کب، کہاں، کیسے...... لمبی کتھا

ہے۔ خیر سرورق حسینہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر ہتھکڑی اور صنفِ کرخت کے چہرے پر بھی بامعنی مسکراہٹ، خدا خیر کرے۔ کچھ تو گڑبڑ ہے۔ خیر اس بارے میں زیادہ غور و فکر نہیں کیا اور پاکستانیوں کا مخصوص جملہ دہرایا ’سانوں کی‘۔ اپنی محفل میں جا کے سکھ کا سانس لیا ویسے تو دسمبر میں پاکستانی سکھ کا سانس۔ ایسا ممکن نہیں۔ دسمبر ہم پاکستانیوں کو پتا نہیں کیوں راس نہیں۔ ابھی پچھلا گھاؤ تازہ ہوتا ہے کہ ایک نیا زخم۔ اللہ پاک ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھیں، آمین۔ تبصرے اس مرتبہ سارے ہی زبردست رہے بس کچھ پرانے تبصرہ نگار ہیں جن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ انکل جی! کیا خیال ہے ان سب کے بھی وارنٹ گرفتاری جاری نہ کر دیے جائیں؟ تمام بلیک لسٹ گان سے اظہارِ افسوس اور اب بڑھتی ہوں کہانیوں کی طرف۔ ابتدا کی خونی رات سے جو واقعی خونی رات رہی۔ ایکشن اور تھرل سے بھرپور جاسوسی کہانی۔ ویلڈن کبیر۔ انگارے کیا ٹوئسٹ آیا کہانی میں مزہ دے رہی ہے اب۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بھی لاجواب رہی، دیکھیں جی اب شہزی کاکا پر کیا مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔ اللہ خیر کرے۔ ابتدائی صفحات پر آتشِ بغاوت تھی ایچ اقبال صاحب کی۔ پہلا حصہ جتنا متاثر کن تھا دوسرا اتنا خاص نہیں تھا اور شاہ صاحب کا پلین باہر ہی کریش کروا دیا، کیوں؟ خزانے کا عفریت، واقعی زوجۂ فساد۔ دوسرا چہرہ بھی اچھی رہی۔ میرا سایہ بہت مزے کی کہانی تھی جاسوسی دولہا صاحب کی۔ اچھا آئیڈیا ہے ویسے۔ سرورق کا پہلا رنگ دائرہ اچھی تحریر تھی۔ ہمدردی کا صلہ بائے اسفند یار سبق آموز کہانی۔ واقعی لوگ ہمدرد فطرت والوں کا غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پھر انسانیت سے اعتبار ہی اٹھ جائے۔ ہمشکل میں ذہانت سے کیس حل کر دیا۔ دہرا جیون اچھی کہانی تھی ویسے ہم سب ہی دہری زندگی گزار رہے ہیں دیکھا جائے تو۔ قرض بائے امجد رئیس اچھی رہی۔ وہ عورت کچھ خاص نہیں لگی۔ کترنیں بھی ٹھیک رہیں اور اسکیچز بھی۔‘‘

کراچی سے سعدیہ قادری کی امنگ و امید پروری ’’حسبِ معمول وہ ایک عام سی شام تھی جب ہمارے سرتاج جاسوسی ہاتھ میں لئے گھر میں داخل ہوئے، لیکن ہر مرتبہ کی طرح اس بار بھی میں نے شمارہ لے کر دراز میں ڈالنے کے بجائے اسی وقت کھول لیا۔ اس بات پر انہوں نے تھوڑا گھورا لیکن میں نے ان کی نظروں سے انجان بنتے ہوئے فوراً نکتہ چینی کے صفحات کھولے مگر یہ کیا! چشمہ صاف کر کے دوبارہ دیکھا پھر بھی اپنا نام خطوط میں تو کیا بلیک لسٹ تک میں نہ نظر آیا، خیر پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ کے مصداق پھر سے حاضر ہوں۔ سب سے پہلے بات ہو جائے اداریے پر، واقعی ہم تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں بھارتیوں کی ہدایت کے لیے بھی اور ان ہموطنوں کی ہدایت کے لیے بھی جو انڈین نشریات پر پابندی کے باوجود انٹرنیٹ پر ڈرامے اور فلمیں دیکھ رہے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ کے والد کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا، باپ ایک ایسا درخت ہے جس کی چھایا کی اصل قدر اس کے جانے کے بعد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبر عطا فرمائے کہ والدین کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ حسبِ معمول انگارے سے شروعات کی جہاں شاہ زیب اور قسطینا کئی گھنٹوں سے بھوکے پیاسے ٹین کی چھتوں کے درمیان محصور تھے۔ شکر ہے اس فاقہ کشی کی صورتِ حال سے نکلے، خدا کرے جلدی اس خانہ جنگی سے نکل کر واپس پاکستان پہنچیں، پہلوان حشمت کی شاعری بہت یاد آ رہی ہے۔ ویسے ایک بات ہے، کتنے ہی کردار آئے مگر للکار کے ہیرو بھائی کی جگہ کوئی نہ لے سکا۔ انگارے کے بعد آتشِ بغاوت کا رخ کیا جہاں عقلمند عوام طویل جدوجہد کے بعد ظالم حکمران سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوئے۔ آتشِ بغاوت کا شدت سے انتظار تھا، ایک اور یادرہ جانے والی کہانی، پہلا حصہ پڑھ کر لگ رہا تھا کہ شاید ڈیبرا، پشمینہ کو ڈبل کراس کرے گی لیکن خیر گزری اور انجام بالخیر ہوا۔ یہاں تک لکھا تھا کہ طیارہ حادثہ کی خبر سننے کو مل گئی، آہ جنید جمشید اور ان کے ساتھ 47 افراد اپنے لواحقین کو روتا چھوڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام مرحومین کی بخشش و مغفرت فرمائے، آمین۔ اب بات ہو جائے سرورق کے رنگوں کی۔ دائرہ میں بے چارے تنویر کے ساتھ بہت ہی برا ہوا۔ جمی نے کسی نفسیاتی مریض کے مانند کئی گنا بڑا بدلہ لیا۔ تنویر کی پوری زندگی برباد کر دی لیکن اپنی لگائی ہوئی آگ سے خود بھی نہ بچ سکا۔ مجموعی طور پر تحریر اوسط درجے کی رہی۔ اب بات ہو جائے خونی رات کی، جو کچھ زیادہ ہی خونی ہو گئی۔ اگر اس کہانی کو بے داغ منصوبہ کے تناظر میں نہ دیکھا جائے تو یہ ایک نسبتاً نئے مصنف کی بہت اچھی کاوش ہے۔ اتفاقات تھوڑے زیادہ ہو گئے، ذیشان اور وحید کا سامنا پولیس سے کہیں بھی نہیں ہوا۔ ہم تو جس دن کاغذات ساتھ رکھنا بھول جائیں اسی دن چالان ہو جاتا ہے۔ باقی کہانیوں میں مجھے ہمدردی کا صلہ بہت اچھی لگی۔ ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے، اگر ارشد اپنی زوجہ کی بات سن لیتا تو اتنا نقصان نہ ہوتا مگر وہ بھی اسی معاشرے کا فرد تھا جہاں عورت کو ناقص العقل کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ٹھوکر کھا کر ہی عقل آ گئی۔ دہرا جیون پڑھ کر علیم الحق حقی صاحب کی تاش کے پتے یاد آ گئی۔ پروفیسر اپنے دونوں روپ کامیابی سے لے کر چل رہا تھا مگر اس نے اپنے ہاتھوں اپنی موت یعنی لوسی کو اپنے پیچھے لگا لیا، وہ عورت، میں چینی نے روایتی مغربی عورتوں کے برعکس خاصی شوہر پرستی کا ثبوت دیا۔ منظر امام کی دوسرا چہرہ بھی کافی اچھی رہی۔

حد سے زیادہ بندشیں اور حد سے زیادہ آزادی دونوں ہی نقصان دہ ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ پرانی شاہکار تحاریر کو قندِ مکرر کے طور پر شائع کیا جائے تاکہ نئے پڑھنے والے بھی مستفید ہوں۔ آخر میں، میں فیس بک کے آفیشل گروپ کے ممبران خاص طور پر مظہر سلیم ہاشمی صاحب کی شکر گزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھنے کے لائق ہوئی۔ اب اجازت چاہوں گی اس تمنا کے ساتھ کہ نیا سال ہم سب کی زندگی میں خوشیاں لائے اور پاکستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو، آمین۔

ڈی آئی خان سے عبادت کاظمی کا مشورہ ”سرد موسم میں جاسوسی خلاف توقع بہت لیٹ ملا، ٹائٹل زبردست تھا۔ حسینہ اداس اداس سی لگی۔ مونچھوں والے انکل تنولی عرف ٹوٹی سے مشابہ لگے۔ اپنی محفل میں سجاد احمد ساحر نمایاں نظر آئے۔ اچھا تبصرہ کیا۔ رانا بشیر احمد کا تبصرہ مجھے ذاتی طور پسند ہے۔ مرحا گل، بابر عباس سے تنگ نظر آئی۔ سیف الرؤف، طاہرہ گلزار کو ہنساتے نظر آئے۔ طاہرہ گلزار کا حیرت کی بات ہے مختصر تبصرہ تھا۔ (جگہ کی کمی کے پیشِ نظر مختصر کرنا پڑا)۔ شاہد امین کا سچا اور کھرا تبصرہ دل کو لگا۔ تانیہ مہر، ماہ تاب گل رانا، آصف بشیر ساگر اچھے تبصروں کے ساتھ چھائے رہے۔ انگارے اب جلتا انگارا بن گیا ہے۔ تاجور کا ذکر کم ہوتا ہے، زینب پر رحم آتا ہے۔ قسطینا کا کردار انتہائی منفرد ہے۔ سیف کے کردار کو تراشتے ہوئے بھی مغل صاحب کی کردار نگاری عروج پر نظر آرہی ہے۔ آوارہ گرد بور ہوتی جارہی ہے۔ قسط وار کہانی میں صرف اور صرف ایکشن ہو تو کہانی کا مزہ نہیں رہتا۔ کبیر عباسی اس دفعہ انوکھے موضوع کے ساتھ تشریف لائے۔ ہمارے معاشرے میں آج کل یہ سب ہورہا ہے۔ شکاری ہر طرف جال لگائے بیٹھے ہیں جن میں ذیشان، وحید، زرتاج اور صائم جیسے معصوم پھنستے ہیں۔ لیکن جب یہ معصوم لوگ اپنے پر کیے گئے مظالم کا بدلہ لینے کے لیے علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں تو ظالم ان کے آگے ٹک نہیں پاتے۔ ذیشان اور وحید کی ہمت ایسے مظلوموں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اُتنے حساس موضوع کے ساتھ مصنف نے خوب انصاف کیا۔ فاروق انجم کی دائرہ دلچسپ رہی۔ گو کہ اینڈ کا اندازہ تھا مگر اس کے باوجود بوریت نہیں ہوئی۔ ایچ اقبال کی آتشِ بغاوت میں اس قسط میں کافی جھول دیکھنے کو ملے۔ یہ جس طرح کی فرضی اور خیالی سی کہانی تھی اس میں اگر پاکستان کی جگہ کسی فرضی ملک کا ذکر ہوتا تو کہانی بہتر طور پر ہضم ہو جاتی۔ منظر امام کی دوسرا چہرہ ایک دل گداز تحریر رہی، کافی دیر تک اس کے سحر میں کھوئے رہے۔ سرور اکرام کی میرا سایہ میں شگفتہ اندازِ بیان اور دوسرا چہرہ نے اداسی کو دور کر دیا۔ ویسے منظر امام اور سرور اکرام کا اندازِ تحریر بالکل ایک جیسا ہے۔ فیس بک پر اکثر احباب کہتے پائے جاتے ہیں کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ (جی نہیں) باقی مختصر تحریروں میں انگلش تراجم میں کچھ خاص شوق سے نہیں پڑھتا۔ ان کو اگر کم کر کے ماضی کی شاہکار طویل تحریریں قندِ مکرر کے طور پر شائع کی جائیں تو جاسوسی کے معیار کو چار چاند لگ جائیں کیونکہ میں نے کم ہی لوگوں کو مختصر تراجم میں دلچسپی لیتے دیکھا ہے۔ خیر یہ تھا میرا مشورہ، عمل کرنا آپ کی مرضی۔“

بہاولپور سے مومنہ کشف کی معصومیت ”پہلی مرتبہ تبصرہ کر رہی ہوں، امید ہے کہ آپ میرے جیسی معصوم اور شوخ لڑکی کا چھوٹا سا دل نہیں توڑیں گے۔ (جی بالکل نہیں!) ٹائٹل بہت اچھا تھا، پر میں اس سے بہت اچھے ٹائٹل دیکھ چکی ہوں۔ مونچھوں والے انکل تو بڑے خوفناک تھے۔ ماہتاب رانا کا خط بہت اچھا تھا، اپنی باتوں سے لگتا ہی نہیں کہ وہ اتنی بڑی ہیں۔ انگارے میری فیوریٹ کہانی ہے، یہ قسط بھی بہت اچھی لگی۔ تاجور اور جاناں تو مجھے زہر لگتی تھیں، شکر ہے مغل انکل قسطینا کی شکل میں ایک اچھی ہیروئن لے آئے ہیں۔ شاہ زیب کا کندھا اب ٹھیک بھی کر دیں، کب تک بے چارہ ایسے ہی پھرتا رہے گا؟ آوارہ گرد بھی بہت مزیدار کہانی ہے۔ پڑھتے ہوئے کوئی انگلش فلم یاد آجاتی ہے، بھٹی انکل نے ایسے ایسے جنگلات کی سیر کرادی ہے جن کا پہلے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ ہمدردی کا صلہ بہت پسند آئی، دوسری عورت بھی بہت اچھی تھی۔ میرا سایہ مزاحیہ کہانی لگی، لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں، ویسے میری سہیلیاں مجھے بھی بے وقوف کہتی ہیں۔ اب ان کو کون بتائے میں معصوم ہوں بے وقوف نہیں۔ ٹائٹل اسٹوریز میں آج کل نئے نئے نام سامنے آرہے ہیں۔ انکل میں نے اپنے ماموں کے پاس جاسوسی کے پرانے شمارے دیکھے ہیں اور ان میں محمود مودی اور غلام قادر، شگفتہ پروین کی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ سب رائٹرز کیوں نہیں لکھتے اب؟ (بس ان کی مرضی...... ہم تو تھک چکے ہیں کہہ کہہ کے) ایچ اقبال کی کہانی بہت بڑی ہے اور میں پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہوں، جتنی پڑھی ہے وہ بہت اچھی لگی ہے۔ آپ میرا خط چھاپیں گے تو میں اگلی مرتبہ پھر آؤں گی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد اقبال، کراچی۔ میمونہ عزیز، لاہور۔ کاشف رفیق، کوٹری۔ انصار احمد، کراچی۔ وقار الحسن، میرپور خاص، سونیا جنید، حیدر آباد۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ اسرار ساقی، اٹک۔ بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، کھاریاں۔ منصور حبیب بلیجو، کھاروشٹھہ۔ پرویز خٹک، جدہ سعودی عرب۔ نصیر احمد چوہدری، گجرات۔ شفقت محمود، کھیوڑہ۔

برعکس

حسام بٹ

خواہش اور کوشش کسی بھی کامیابی کی جانب بڑھتا ہوا پہلا زینہ ہے۔ شرط لازم ہے کہ ارادے مضبوط ہوں... کیونکہ انسان کو زندگی کی دشوارگزار راہوں پر تلاش و جستجو کا سفر کرنا پڑتا ہے... شوبز کی جگمگاتی دنیا کے ستاروں کے گرد گھومتا ڈرامائی سلسلہ... کرداروں کی ایک ایسی مثلث جو ایک دوسرے سے پیوست تھی... مگر خواہش کے تند و تیز جھکڑ اسے علیحدہ کرنے پر کمربستہ تھے... دشواریاں تھیں... مگر جذبات کا سیلابی ریلا تھا جو ہر رکاوٹ کو رگیدتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا... جرم... محبت... اور ناز و ادا کی شدتوں کے سنگ راہ میں آنے والے یقینی رشتوں اور تعلق کی توڑ پھوڑ کا پرتجسس و سنسنی خیز احوال...

سراب اور حقیقت کے فریب میں آنے والے خوابوں کی برعکس تعبیر کا فسانۂ آزار......

پہلے فائر کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا......

سلمٰی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ فائر اور کانچ کے کرچی کرچی ہونے کی مخصوص آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔ یہ اس کے قیام گاہ کے ایک بیرونی کمرے کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز تھی لہٰذا اس کا تشویش میں مبتلا ہونا فطری امر تھا۔

سلمٰی نے بے ساختہ نگاہ اٹھا کر دیوارگیر کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک گیارہ بج کر گیارہ منٹ کا وقت بتا رہا تھا۔ وہ موسم سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار رات تھی۔ گولی چلنے اور کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی مخصوص آواز کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ خنک رات میں یہ خاموشی سناٹے کا منظر پیش کرتی تھی۔ سلمٰی بڑی سرعت کے ساتھ بیڈروم سے نکلی اور "متاثرہ" کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ابھی وہ متعلقہ کمرے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی کہ سامنے سے شریف چاچا آتا دکھائی دیا۔ شریف چاچا اس بنگلے کا چوکیدار تھا جو کل وقتی چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کا گھر شہر سے باہر ایک کچی آبادی میں تھا۔ وہ ہفتہ وار چھٹی پر ایک دن کے لیے اپنے گھر جایا کرتا تھا۔ یہ

ایک دن اس کی فیملی کے لیے عید سے کم حیثیت کا حامل نہیں تھا۔

شریف چاچا کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھ کر سلمیٰ نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے بھی گولی چلنے کی آواز سنی ہے؟“

”جی بیگم صاحبہ! فائر کی وجہ سے ہماری ایک کھڑکی کا شیشہ بھی چکنا چور ہو گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ......!“ سلمیٰ نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”ہماری کھڑکی پر کس نے گولی چلائی ہے؟“

”کچھ معلوم نہیں بیگم صاحبہ!“ اس نے جواب دیا۔ ”شہر کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ اب تو کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے......!“

”ہوں......“ سلمیٰ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

”بیگم صاحبہ!“ شریف چاچا گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ اندر اپنے کمرے میں جائیں۔ میں باہر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔ ویسے......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”صاحب جی تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں، وہ ٹھیک ہیں۔“ سلمیٰ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے میں نے انہیں دوا کھلا دی تھی۔ اس وقت وہ گہری نیند میں ہیں۔“

”ٹھیک ہے جی۔ میں ابھی واپس آ کر آپ کو باہر کی رپورٹ دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے چوکیدار مڑا اور بیرونی گیٹ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

سلمیٰ متفکر ذہن کے ساتھ بیڈ روم کی طرف چل پڑی۔ ان لمحات میں اس کی سوچ میں خاصی الجھن پائی جاتی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کافی پریشان تھی۔ آج کل وہ جن حالات سے گزر رہی تھی، وہ خاصے غیر اطمینان بخش تھے۔ اس فائر اور اس کے نتیجے میں ٹوٹنے والے کھڑکی کے شیشے نے اس کی پریشانی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

شریف چاچا نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ شہر کے حالات کچھ اسی نوعیت کے تھے۔ کسی وقت کوئی بھی بڑے سے بڑا واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔ اغوا، ڈکیتی، چوری، بھتا خوری اور ٹارگٹ کلنگ ایسے جرائم اپنے عروج پر تھے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی جرائم کی اس شرح پر صاحبِ اقتدار اور صاحبِ اختیار افراد نے کمالِ بے حسی کی چپ سادھ رکھی تھی۔ گویا ”اندھیر نگری اور چوپٹ راج“ کی سی کیفیت تھی جس میں ”متاثرین“ کی شنوائی یا دادرسی کی کوئی امید کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز نے سلمیٰ کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے بیڈ روم کے دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ باہر قدموں کی آواز ابھری پھر چند لمحوں کے بعد دروازے پر شریف چاچا کی صورت دکھائی دی۔

گھریلو ملازم کی شکل دیکھ کر سلمیٰ کی تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ شریف کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ سلمیٰ نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

”کیا ہوا......تم اتنے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟“

”بیگم صاحبہ! باہر پولیس آئی ہے۔“ شریف نے بتایا۔

”پولیس......“ سلمیٰ چونکتا نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب...... جی پولیس آئی ہے۔“ شریف وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ دو باوردی افراد ہیں۔ ہمارے بنگلے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“

سلمیٰ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ آج کل شہر میں بڑی عجیب و غریب وارداتیں ہو رہی تھیں۔ بعض ایسے واقعات بھی سننے میں آئے تھے جب خطرناک مجرموں نے پولیس والوں کا بھیس بدل کر کسی بھی جگہ رسائی حاصل کی اور پھر اپنا ”کام“ نمٹانے کے بعد چلتے بنے۔

”آپ کیا سوچ رہی ہیں بیگم صاحبہ؟“ شریف چاچا نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اصلی پولیس والے ہی ہیں؟“

شریف کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔

”جی بیگم صاحبہ......!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان کی وردیوں اور بیج وغیرہ سے تو یہی لگ رہا ہے۔ باقی اللہ جانے......“

اسی لمحے ایک بار پھر اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ سلمیٰ نے خود کو سنبھالتے ہوئے شریف سے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آتی ہوں۔“

”جی بیگم صاحبہ!“ یہ کہتے ہوئے شریف باہر کی جانب بڑھ گیا۔

سلمیٰ بیڈ روم میں آئی۔ اس کا شوہر فیروز نظامی گہری

نیند کے مزے لے رہا تھا۔ فیروز نظامی کی طبیعت کافی عرصے سے خراب چلی آرہی تھی اور وہ مکمل بیڈ ریسٹ پر تھا۔ سلمیٰ رات دس بجے اسے دوا کھلا کر سلا دیا کرتی تھی۔ پھر اس کی آنکھ اگلی صبح ہی کھلا کرتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

وہاں دو پولیس اہلکار موجود تھے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر اور دوسرا کانسٹیبل دکھائی دیتا تھا۔ سلمیٰ کے دل نے گواہی دی کہ وہ اصلی پولیس والے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ دونوں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ قبل اس کے کہ سلمیٰ کچھ بول پاتی، انسپکٹر رینک کے پولیس آفیسر نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

''میڈم! ہم آپ کے بنگلے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

''تلاشی......'' سلمیٰ نے بھویں سکیڑ کر استفسار کیا۔ ''کس قسم کی تلاشی۔ ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کیا کہ پولیس ہمارے دروازے پر آئے اور...... گھر کی تلاشی لے......؟''

''آپ نے کچھ نہیں کیا لیکن یہ تلاشی کسی اور سلسلے میں ہے۔'' انسپکٹر نے سلمیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور آپ سے درخواست ہے کہ وقت ضائع نہ کریں ورنہ وہ شیطان ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''پتا نہیں، آپ کس قسم کی الجھی ہوئی باتیں کررہے ہیں۔'' سلمیٰ کے لہجے میں ایک خاص نوعیت کی پریشانی جھلکتی تھی۔ ''یہ شیطان کون ہے جس کی تلاش میں آپ یہاں آئے ہیں؟''

''وہ ایک خطرناک مجرم اور پیشہ ور قاتل ہے۔'' انسپکٹر نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''کچھ عرصہ پہلے جیل سے فرار ہوا ہے۔ اس نے آج شام اپنے کسی دشمن کو قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا ہے۔ ہمیں مقتول کی لاش مل گئی ہے۔ اب ہم قاتل کے تعاقب میں ہیں۔'' لمحے بھر کے لیے وہ سانس لینے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تھوڑی دیر پہلے وہ آپ کے بنگلے کی چھت پر دکھائی دیا تھا۔ میں نے اس پر گولی بھی چلائی تھی لیکن تاریکی کے باعث میرا نشانہ ٹھکانے پر نہیں لگا...... اور وہ بچ گیا۔''

''اوہ......!'' سلمیٰ کے سینے سے ایک بوجھل سانس خارج ہوئی۔ ''میرے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ آپ کے فائر سے چکنا چور ہوا ہے۔''

''مجرم پر گولی چلانا میری مجبوری تھی۔'' انسپکٹر نے اضطراری انداز میں کہا پھر بولا۔ ''باقی باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں پہلے......''

انسپکٹر کی ادھوری بات کو سمجھنا سلمیٰ کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''جی...... ضرور...... آپ آئیں میرے ساتھ۔''

سلمیٰ کی انسپکٹر سے جو بھی مختصر سی بات چیت ہوئی تھی اس کے نتیجے میں وہ اچھی طرح یہ جان گئی تھی کہ وہ پولیس والے کوئی ڈھونگی یا فراڈ نہیں تھے لہٰذا وہ خانہ تلاش کے سلسلے میں ان کی طرف سے قطعی مطمئن ہوگئی تاہم اس نے اپنے گھریلو ملازم شریف چاچا کو بھی ان کے ہمراہ کردیا۔

پہلے انہوں نے بنگلے کے بیرونی حصوں میں جھانکا پھر چھت کا رخ کیا۔ بنگلے کے زیریں حصے میں تو وہ بھی ان کے ساتھ رہی تاہم اس نے چھت کا رخ کرنے کی کوشش نہیں کی اور یہ معاملہ شریف چاچا پر چھوڑ دیا۔

سلمیٰ اور فیروز نظامی جس بنگلے میں رہائش پذیر تھے، وہ ساحل سمندر کے بہت نزدیک واقع تھا۔ یہ ''سی ویو'' کا وہ فیز تھا جو ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ ڈیفنس سوسائٹی کا علاقہ طول و عرض میں روز بروز پھیلتا چلا جارہا ہے۔ اس کے وہ فیز ز جو ''سی ویو'' کی پٹی کو ٹچ کرتے ہیں، وہ مکمل طور پر آباد نہیں ہوئے تھے۔ یہ بنگلا بھی ڈیفنس کے ایک ایسے ہی فیز کا حصہ تھا۔

سلمیٰ اور فیروز نظامی کی شادی کو لگ بھگ پانچ سال ہوگئے تھے لیکن ابھی تک وہ دو سے تین نہیں ہوئے تھے۔ ان دونوں کا تعلق شوبزنس کی دنیا سے تھا۔ سلمیٰ کچھ عرصہ پہلے تک ٹی وی کی ایک نامور آرٹسٹ رہی تھی تاہم نظامی سے شادی کے بعد اس نے اداکاری کو خیرباد کہہ دیا تھا اور صرف اور صرف نظامی کی ہوکر رہ گئی تھی۔

نظامی کے پاس دہرا پیشہ تھا۔ بنیادی طور پر ڈانس ڈائریکٹر تھا اور پاکستان کے مانے ہوئے ڈانس ڈائریکٹرز میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ وہ لولی وڈ کی کئی فلموں میں بھی ڈانسرز کو رپہرسلز کراچکا تھا اور پاکستان سے انڈیا اور امریکا سمیت دنیا کے کئی ملکوں میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرچکا تھا اور تو اور بولی وڈ کی سپر اسٹار مادھوری ڈکشٹ بھی اس کے فن کی معترف تھی۔

فیروز نظامی کو ایک اور شعبے میں بھی مہارت حاصل تھی۔ وہ سریلی اور رسیلی آواز کا مالک تھا اور اس نے پلے بیک گانے بھی گائے تھے تاہم ان دنوں وہ وہیل چیئر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا علاج باقاعدگی سے جاری تھا۔ سلمیٰ اس کا

حتی الامکان خیال رکھے ہوئے تھی۔

پانچ چھ منٹ کے بعد سلمٰی ایک مرتبہ پھر پولیس والوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔ پولیس والوں نے جس مقصد کی غرض سے اس کے بنگلے کی تلاشی لی تھی، وہ پورا نہیں ہوسکا تھا۔ وہ شیطان عادی مجرم انہیں کہیں نہیں ملا تھا۔

”میں سمجھتا ہوں، وہ آپ کے بنگلے کی چھت پر سے ہوتے ہوئے آگے کہیں نکل گیا ہے۔“ انسپکٹر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن وہ کتنا بھی ہوشیار کیوں نہ ہو، ہمارے ہاتھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ پولیس کے نصف درجن جوان اس علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔“

”میری دعا ہے کہ آپ کو اس نیک مقصد میں جلد از جلد کامیابی حاصل ہو۔“ سلمٰی نے خلوصِ دل سے کہا۔ ”میں اس سلسلے میں آپ کی جو بھی مدد کرسکتی ہوں، آپ بتائیں......!“

”ہمیں صرف آپ کے تعاون کی ضرورت ہے میڈم!“ انسپکٹر نے سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کی زیادہ امید تو نہیں کہ وہ دوبارہ اِدھر کا رخ کرے لیکن...... وہ ایسا کر بھی سکتا ہے۔ آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”ہم تو ویسے بھی بہت محتاط رہتے ہیں۔“ سلمٰی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آج کل ہمارے شہر کے جو حالات ہیں ان میں نہ تو کوئی گھر میں محفوظ ہے اور نہ ہی گھر سے باہر...... آپ فکر نہ کریں۔ میں کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کرلوں گی۔“

”اور اگر کوئی غیر معمولی بات محسوس کریں تو فوراً مجھے فون کردیں۔“ انسپکٹر نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اس پر میرے گھر کا نمبر بھی درج ہے اور سیل فون کا نمبر بھی......“

”انسپکٹر فیصل رانا......“ سلمٰی نے زیرِ لب دہرایا پھر تشکرانہ لہجے میں بولی۔ ”بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب۔“

”آپ مجھے اپنے گھر کا فون نمبر بھی دے دیں۔“ انسپکٹر بڑی رسان سے بولا۔ ”تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں آپ سے رابطہ کیا جاسکے۔“

سلمٰی نے اپنے گھر کا نمبر نوٹ کرانے کے بعد کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

انسپکٹر فیصل نے اثبات میں گردن ہلانے کے بعد اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔ ”آپ کے علاوہ اس بنگلے میں اور کون کون رہتا ہے؟“

”میں، میرے شوہر اور ہمارا ملازم شریف چاچا۔“ سلمٰی نے جواب دیا۔ پھر قریب کھڑے گھریلو ملازم کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

”مجھے آپ کے شوہر کہیں دکھائی نہیں دیے۔“ انسپکٹر نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”کیا وہ اس وقت بنگلے پر موجود نہیں ہیں؟“

”وہ اس وقت گہری نیند میں ہیں انسپکٹر صاحب۔“ سلمٰی نے بتایا۔

”اوہ......“ انسپکٹر نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسی بھی کیا نیند کہ گھر میں اچھی خاصی افراتفری پھیلی ہوئی ہے اور وہ مزے سے سو رہے ہیں جبکہ تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک گولی بھی فائر ہوچکی ہے جس کے نتیجے میں آپ کی ایک کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہوگیا تھا۔“

”میرے شوہر فیروز نظامی مزے سے نہیں بلکہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہے ہیں۔“ سلمٰی نے نپے تلے الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ پچھلے کچھ عرصے سے مکمل بیڈ ریسٹ پر ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق، رات دس بجے تک انہیں لازمی سو جانا ہے۔ اسی لیے میں روزانہ ساڑھے نو بجے انہیں دوا کھلا دیتی ہوں اور آدھے گھنٹے کے اندر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے ہیں۔“

”آپ کے شوہر کی بیماری کا سن کر مجھے دلی افسوس ہوا۔“ انسپکٹر نے گہری ہمدردی سے کہا۔ ”میں آپ کو اس خطرناک مجرم کا حلیہ تفصیلاً بتا دیتا ہوں تاکہ کسی ہنگامی صورت میں آپ کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہو......“

پھر وہ سلمٰی کو اس عادی مجرم کی وضع قطع اور پہناوے کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگا۔ ”نام مراد علی، عمر لگ بھگ چالیس سال، قد آور، چوڑی ٹھوڑی، آنکھوں میں شیطانی چمک اور چہرے پر سفاکی۔ اس نے بھوری پتلون اور آف وہائٹ شرٹ پہن رکھی ہے اور شرٹ کی آستینیں اڑسی ہوئی ہیں۔ گریبان کھلا ہوا۔ چند روز پہلے وہ جیل سے فرار ہوا تھا۔ آج اپنے کسی دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سمندر میں پھینک آیا ہے۔ مقتول کو خنجر کی مدد سے قتل کیا گیا ہے۔ پولیس نے مقتول کی لاش دریافت کرلی ہے۔ اس خطرناک قاتل کی گاڑی سمندر کے کنارے کھڑی مل گئی ہے جسے پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ......“

اس کے بعد انسپکٹر فیصل رانا اپنے ساتھی کانسٹیبل کے

ہمراہ سلمٰی کے بنگلے سے رخصت ہوگیا۔
سلمٰی نے شریف چاچا سے کہا۔ ''تم بیرونی گیٹ کو اچھی طرح لاک کردو اور ذرا چوکنا رہنا۔ میں اندر تمہارے صاحب جی کے پاس جارہی ہوں۔''
''جی بیگم صاحبہ!'' شریف نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور بڑی فرماں برداری سے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔
سلمٰی بیڈروم میں چلی آئی۔
سلمٰی کا شوہر اس وقت گہری نیند میں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے میں جو واقعات پیش آئے تھے، ان سے فیروز نظامی مطلق بے خبر تھا۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے بستر کا ہوکر رہ گیا تھا اور سلمٰی نے اس کی تیمارداری میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی تھی۔ وہ اس کے کھانے، ادویات اور آرام کا مکمل خیال رکھے ہوئے تھی۔
سلمٰی بیڈ پر نیم دراز ہوکر خیالوں میں گم ہوگئی۔

☆☆☆

وہ ماہ دسمبر کی ایک ٹھنڈی ٹھار رات تھی اور اس سرد موسم میں سلمٰی اپنے ماضی کے واقعات پر گری ہوئی حالات کی برف کو دھیرے دھیرے ہٹا رہی تھی۔ فیروز نظامی سے اس کی شادی کم و بیش پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ ان دنوں سلمٰی ٹی وی ڈراموں میں کام کررہی تھی۔ وہ ایک اچھی ڈراما آرٹسٹ تھی تاہم ایک واقعے نے اسے اداکاری سے منہ موڑنے پر مجبور کردیا۔
فیروز نظامی ایک معروف ڈانس ڈائریکٹر اور پلے بیک سنگر تھا۔ وہ بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا کہ کب ان میں محبت کے پودے نے جڑ پکڑی اور کب وہ پروان چڑھ کر تناور درخت بن گیا۔ اس سرعت سے سفر کرتی ہوئی قربت نے انہیں ایک ایسے مقام تک پہنچا دیا جس سے اگلی منزل صرف اور صرف ملاپ تھا۔
جب شادی کے موضوع پر ان کے درمیان سنجیدہ گفتگو ہوئی تو نظامی نے ایک عجیب سی شرط عائد کردی۔ وہ اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔
''سلمٰی! شادی کے بندھن میں بندھنے سے پہلے تمہیں میری ایک بات ماننا ہوگی۔'' نظامی نے سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''میں تو تمہاری ہر بات مانتی ہوں۔'' سلمٰی نے سرسری انداز میں کہا۔
''ہر بات کی نہیں، میں ایک خاص بات کی جانب اشارہ کررہا ہوں۔'' نظامی کی سنجیدگی میں اضافہ ہوگیا۔
''ٹھیک ہے۔'' سلمٰی نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''بتاؤ، وہ خاص بات کون سی ہے؟''
''تم اداکاری چھوڑ دو......'' نظامی سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔
''کیا مطلب؟'' وہ حیرت بھری نظر سے نظامی کو تکنے لگی۔
''میں نے کوئی مشکل بات نہیں کی۔'' نظامی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اتنا کما لیتا ہوں کہ تمہیں ایکسٹرا محنت کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میری انکم میں ہم ٹھاٹ سے زندگی گزار سکتے ہیں۔''
''نظامی! میں اداکاری دولت کمانے کے لیے نہیں کرتی ہوں۔'' سلمٰی نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔ ''یہ میرا شوق ہے۔''
''تمہارا یہ شوق کسی اور طرح بھی تو پورا ہوسکتا ہے۔'' نظامی نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔
''میں سمجھی نہیں۔'' سلمٰی کی الجھن سوا ہوگئی۔ ''تم مجھے اداکاری چھوڑنے کو کہہ رہے ہو۔ جب میں اپنا یہ پروفیشن ترک کروں گی تو پھر میرا شوق کیسے پورا ہوگا؟''
''مستقبل میں میرا ارادہ ایک پروڈکشن ہاؤس بنانے کا ہے۔'' نظامی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''تم اپنا اداکاری کا شوق میرے ڈراموں میں کام کرکے پورا کرتی رہنا۔''
''تو گویا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری بیوی بننے کے بعد دوسروں کے ڈراموں میں کام نہ کروں......؟'' سلمٰی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''بالکل...... میں یہی چاہتا ہوں۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''تم اسے میری محبت سمجھ لو، دیوانگی کہہ لو یا......''
''حسد!'' سلمٰی اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''یہ تمہاری جیلسی بھی تو ہوسکتی ہے......''
''تم کچھ بھی سمجھ لو۔'' وہ سلمٰی کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں اسے اپنی محبت ہی کہوں گا۔''
نظامی کے دوٹوک انداز میں بڑی طاقت تھی۔ وہ اس وقت جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے وہاں کا خواب ناک ماحول اپنی مثال آپ تھا پھر اس پر مستزاد یہ کہ ان کے بیچ

خاصی رومینٹک گفتگو ہورہی تھی۔ سلمٰی شوبز کی دنیا سے وابستہ تھی۔ دن رات رومانس کی چکا چوند سے واسطہ رہتا تھا لیکن وہ اس دنیا کے کھوکھلے، مصنوعی پن سے اچھی طرح واقف تھی مگر نظامی کی باتوں میں جو سنجیدگی اور خلوص رچا بسا تھا، اس نے سلمٰی کے پورے وجود میں ایک عجیب سی لذت آمیز سنسنی دوڑا دی تھی۔ وہ اپنے احساسات کو نظر انداز نہیں کرسکتی تھی۔

''ایک بات بتاؤ نظامی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

نظامی سوالیہ انداز میں اسے تکنے لگا۔

''تمہیں میری کس چیز نے محبت کرنے پر مجبور کیا ہے؟'' سلمٰی نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''بس میں اتنا جانتا ہوں کہ تم بہت خوب صورت ہو......!''

اس حقیقت سے سلمٰی بھی آگاہ تھی۔ صبح وشام تعریفی، توصیفی اور ستائشی کلمات اس کی سماعت سے ٹکراتے رہتے تھے تاہم حسن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر کسی کی زبان سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔

''اوہ......!'' سلمٰی ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''تو تمہیں میری خوب صورتی نے متاثر کیا ہے۔''

''دیکھو سلمٰی! میں ایک سیدھا سادہ انسان ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے گھما پھرا کر بات کرنا نہیں آتا۔ جو میرے دل میں تھا، وہ میں نے کہہ دیا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تم سے شدید محبت ہے۔ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور نہیں کرسکتا اسی لیے میں نے تمہیں اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

سلمٰی، نظامی کی باتوں کی سچائی اور جذبے کی تازگی کو اچھی طرح سمجھ اور محسوس کررہی تھی۔ تاہم اس نے شرارت کے انداز میں کہا۔ ''نظامی! تمہیں مجھ سے افلاطونی محبت ہو گئی ہے۔ اس صورتِ حالات میں، شادی کے سلسلے میں شرائط تو مجھے عائد کرنا چاہیے نا...... الٹا تم مجھ سے میرا پروفیشن چھڑانے کی بات کررہے ہو۔''

سلمٰی کو اپنے دل کا حال بہ خوبی معلوم تھا۔ یہ آتش یک طرفہ نہیں تھی۔ وہ بھی نظامی کی محبت میں پاتا سر ڈوب چکی تھی اور اس کی ہر شرط ماننے کو بھی تیار تھی۔ وہ اپنے پروفیشن کی قربانی دینے کے لیے راضی ہوچکی تھی۔

''میں تمہیں ایکٹنگ کا پروفیشن چھوڑنے کو تو نہیں کہہ رہا۔'' نظامی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بتایا ہے نا، مستقبل میں میرا پروڈکشن ہاؤس بنانے کا پروگرام ہے۔ جب کام گھر کا ہوگا تو پھر تم جی بھر کر اپنا شوق پورا کرتی رہنا۔''

کچھ دیر تک ان کے بیچ اسی نوعیت کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ شادی کے فائنل فیصلے پر پہنچنے کے بعد ریسٹورنٹ سے اٹھ گئے۔ اس ریسٹورنٹی ملاقات کے ایک ماہ بعد سلمٰی، نظامی کی بیوی بن کر اس کے گھر آگئی۔

شوبز کی دنیا سے وابستہ افراد نے سلمٰی اور نظامی کی شادی پر بہت زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ان کا میل ملاپ سب کی نظروں میں تھا اور چند لوگ ان کے بیچ پروان چڑھنے والے محبت کے سلسلے سے بھی واقف تھے اور توقع کررہے تھے کہ اس معاملے کا اونٹ شادی کی کروٹ ہی بیٹھے گا لیکن یہ خبر کسی کو ہضم نہیں ہوئی تھی کہ سلمٰی نے رنگ و روشنی کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے......

کسی کو یقین آئے یا نہ آئے مگر سلمٰی نے جو کہا تھا وہ کر بھی دکھایا تھا۔ یہ بات اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی کہ بعدازاں وہ نظامی کے پروڈکشن ہاؤس کے بینر تلے اداکاری کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

شادی کے موقع تک وہ جن ڈراموں میں کاسٹ تھی انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانا اس کی اخلاقی ذمے داری تھی تاہم اس نے کوئی نیا کنٹریکٹ سائن نہیں کیا۔ اگرچہ اس کے پاس آفرز کی کوئی کمی نہیں تھی۔

☆☆☆

قدموں کی چاپ نے سلمٰی کو ماضی کے دریچوں سے کھینچ کر حال کے تپتے صحرا میں پہنچا دیا۔ قدموں کی آواز بیڈ روم کے بیرونی حصے میں سنائی دی تھی۔ سخت سرد موسم کی وجہ سے ائرکنڈیشنر کی ان دنوں چھٹی تھی۔ اگر اس وقت اے سی چل رہا ہوتا تو پھر یہ مخصوص چاپ بیڈ روم کے اندر رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔

''کون ہوسکتا ہے......؟'' یہ سوچ کر وہ بیڈ روم کے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

دروازے تک پہنچنے سے پہلے اس کے ذہن نے جواب دے دیا۔ ''شریف چاچا ہی ہوگا۔''

سلمٰی کے ذہن نے بالکل درست اندازہ قائم کیا تھا۔ جب وہ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچی تو سامنے اس کا کل وقتی ملازم کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ سلمٰی شریف سے کوئی سوال کرتی، اس نے پوچھ لیا۔

''بیگم صاحبہ! آپ سوئی نہیں؟''
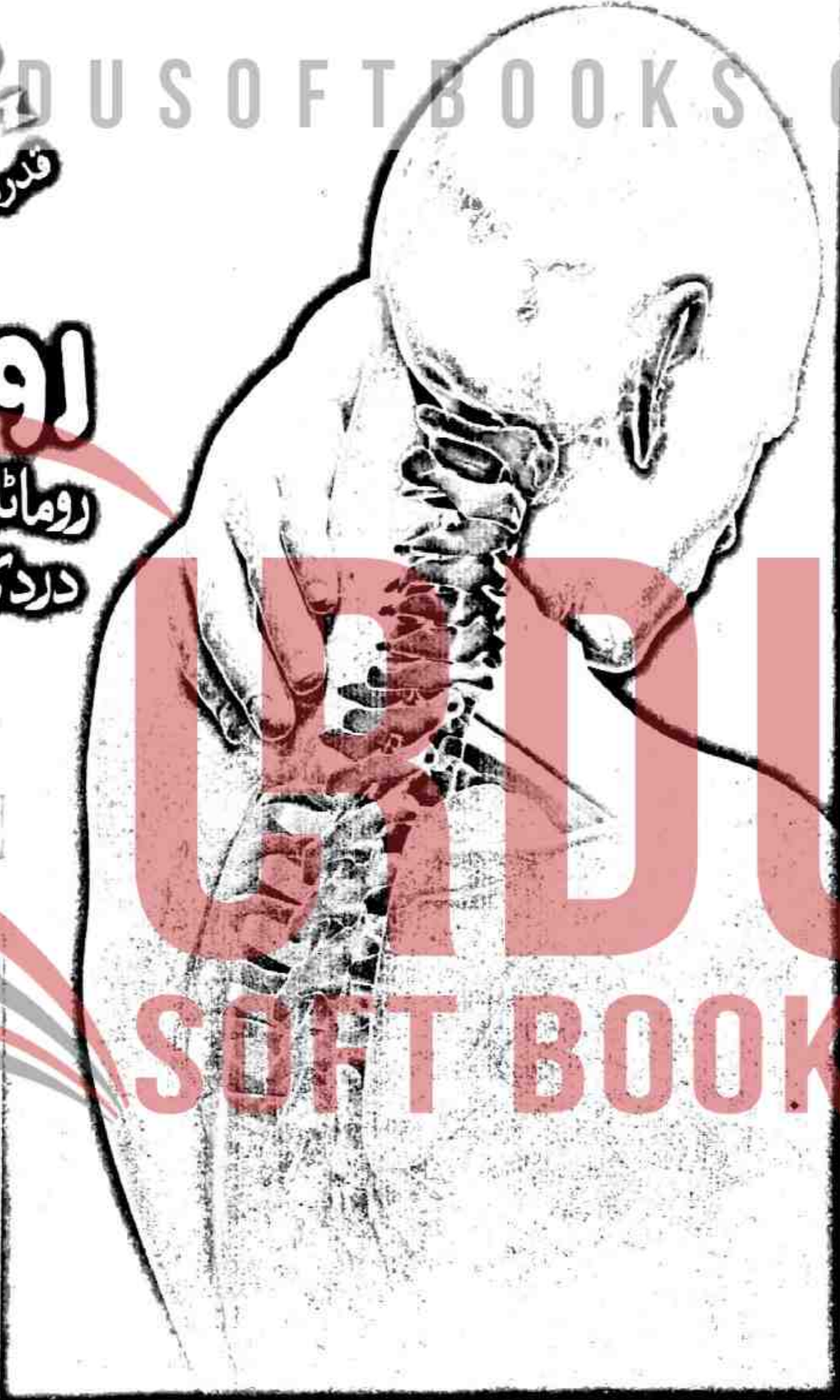
"بس، میں سونے ہی جا رہی تھی۔" سلمیٰ نے سپاٹ آواز میں کہا پھر اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں...... کوئی خاص بات؟"

"خاص بات تو کوئی نہیں جی......" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "بس جی، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے...... ایسا لگتا ہے کہ......"

"کیسا لگتا ہے؟" سلمیٰ بیڈروم سے باہر کوریڈور میں نکل آئی۔ "مجھے کھل کر بتاؤ، تم کیا محسوس کر رہے ہو؟"

کوریڈور میں بید کی دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بات ختم کرتے ہی سلمیٰ ان کرسیوں کی سمت بڑھ گئی تھی۔

"میں ٹھیک ٹھیک اندازہ تو نہیں لگا سکتا بیگم صاحبہ!" شریف، سلمیٰ کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ "مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہو...... میں اپنے محسوسات کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ بس دل میں اطمینان نہیں ہے......"

سلمیٰ نے بید کی ایک کرسی سنبھال لی پھر دوسری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شریف سے کہا۔ "تم بھی بیٹھ جاؤ چاچا۔"

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد شریف کرسی پر ٹک گیا۔ سلمیٰ نے کہا۔ "مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔ دل میں ایک عجیب سی بے چینی ہے۔ شاید یہ حالات کا اثر ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ!" شریف تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "شہر میں ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ انسان، انسان کا دشمن بن گیا ہے۔ پتا نہیں ہم کس طرف جا رہے ہیں......!"

"شہر میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ نیا نہیں ہے۔ یہ سلسلہ کافی عرصے سے چل رہا ہے۔" سلمیٰ نے کہا۔ "میں آج والے واقعے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہوں۔"

"آپ اس خطرناک قاتل کی بات کر رہی ہیں جس کی تلاش میں آدھا گھنٹا پہلے پولیس والے یہاں آئے تھے۔" شریف نے سوالیہ نظر سے اپنی مالکن کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" سلمیٰ نے اثبات میں گردن ہلا دی اور کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ اس خطرناک شخص نے یہاں کوئی واردات نہیں کی۔"

"لیکن اس بدبخت کے یہاں ہونے سے ہمارے بنگلے کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔" شریف نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

"کھڑکی کا شیشہ کوئی ایسی قیمتی شے نہیں جس کے لیے آدھی رات کو بیٹھ کر کفِ افسوس ملے جائیں۔" سلمیٰ نے کسی فلسفی کے انداز میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہماری جان بچ گئی۔ انسپکٹر بتا رہا تھا کہ وہ خطرناک قاتل اب تک درجنوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ حال ہی میں وہ جیل سے فرار ہوا ہے اور آج ہی اس نے اپنے کسی دشمن کو قتل کر کے اس کی لاش سمندر میں پھینک دی تھی۔ پولیس نے مقتول کی لاش دریافت کر لی ہے۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ایک جھرجھری لیتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

"اگر وہ ہم میں سے بھی کسی کی زندگی کا چراغ گل کر دیتا تو ہم بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے......"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" شریف نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی......"

"کون سی بات شریف چاچا؟" سلمیٰ نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"پولیس والوں کے مطابق، جب انہوں نے اس خطرناک مجرم پر گولی چلائی تو وہ اس وقت ہمارے بنگلے کی چھت پر موجود تھا۔" شریف نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس وقت بنگلے کے گیٹ پر تھا اور وہاں سے چھت کا منظر بہت واضح نظر آتا ہے۔ اگر وہاں کوئی ہوتا یا کسی کا ہیولا بھی نظر آتا تو مجھے ضرور خبر ہو جاتی۔"

"ہاں، انسپکٹر نے مجھے بھی یہی بتایا تھا کہ انہوں نے ہمارے بنگلے کی چھت پر اس مجرم کو دیکھ کر فائر کیا تھا۔" سلمیٰ نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں بنگلے کے اندر تھی۔ مجھے بھی چھت پر کسی کے چلنے یا دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی نہیں دی۔"

"آپ کو کچھ سنائی نہیں دیا اور مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔" شریف نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ پولیس والوں کو دھوکا ہوا ہو۔ وہ خطرناک مجرم ہمارے بنگلے کے قریب بھی نہ پھٹکا ہو۔"

شریف کی تعلیم بس واجبی سی تھی تاہم وہ باتیں بڑی دانش بھری اور منطقی کیا کرتا تھا۔ سلمیٰ اس کی باتوں کو اہمیت دیا کرتی تھی تاہم اس وقت وہ جس نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھی اس کے زیرِ اثر اس نے بیزاری سے کہہ دیا۔

"وہ منحوس شخص ہماری چھت پر تھا یا نہیں۔ پولیس

والوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی یا ان کا اندازہ درست ہے...... ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ خطرناک شخص یہاں سے دفع ہو چکا ہے۔''

''جی واقعی، یہ کافی اطمینان کی بات ہے۔'' شریف نے سنجیدگی سے کہا۔''پولیس والوں نے ہمارے بنگلے کی اچھی طرح تلاشی لی ہے۔ اگر وہ بدذات یہاں کہیں چھپا ہوتا تو بچ نہیں سکتا تھا۔ ویسے......''

شریف جملہ ادھورا چھوڑ کر سلمٰی کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے اضطراری لہجے میں پوچھ لیا۔ ''ویسے کیا شریف چاچا؟''

''آج کل شہر کی جو صورتِ حال ہے اس میں شہری تو غیر محفوظ ہیں ہی۔ اس کے ساتھ ہی قانون کے محافظوں کو بھی اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔'' شریف وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جرائم پیشہ افراد چن چن کر پولیس والوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ کئی پولیس چوکیوں پر بھی کریکر پھینکے گئے ہیں۔''

''پولیس والوں کے علاوہ دہشت گردوں کا دوسرا اہم نشانہ صحافی حضرات ہیں۔'' سلمٰی نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جرائم پیشہ افراد اپنے خلاف کسی نوعیت کی قانونی کارروائی کے حق میں نہیں ہیں اور نہ ہی وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بارے میں اخبارات اور مختلف ٹی وی چینلز پر سچ بیان کیا جائے۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے حکمراں اس طرف سے خاصے بے فکرے نظر آتے ہیں۔'' شریف برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''آئے دن بم دھماکے اور خودکش حملے ہو رہے ہیں۔''

''چھوڑو چاچا! ہمیں کیا لینا۔'' سلمٰی بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''یہ بتاؤ، تمہاری بیٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''شریف سنی ان سنی کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''یہ تو کوئی اُن سے جا کر پوچھے جہاں بم پھٹتا ہے، جو لوگ دہشت گردی کی واردات سے متاثر ہوتے ہیں جن کے گھروں میں صفِ ماتم بچھتی ہے......'' پھر سلمٰی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کر دی۔ ''بیگم صاحبہ! آپ بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں...... ہمارا دہشت گردوں سے کیا واسطہ......!''

ان لمحات میں شریف چاچا خاصا جذباتی ہو رہا تھا لہٰذا سلمٰی نے اسے اس موضوع پر زیادہ چھیڑنا مناسب نہ جانا۔

ایک عام محبِ وطن پاکستانی کی طرح شریف کا دل بھی ملک کی موجودہ صورتِ حال پر کڑھتا تھا لیکن وہ بھی کروڑوں پاکستانیوں کی طرح بے بس اور مجبور تھا، ان بگڑے اور مزید بگڑتے ہوئے حالات کو سدھارنے کا اختیار اس کے پاس نہیں تھا چنانچہ وہ اپنا خون جلاتا رہتا یا پھر کبھی کبھی کھری کھری سی باتیں کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتا تھا۔

شریف کو عمیق سوچ میں ڈوبے دیکھ کر سلمٰی نے اپنا سوال دہرایا۔ ''چاچا! فرزانہ کا کیا حال ہے؟''

فرزانہ شریف چاچا کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ بھی بڑھاپے کی اولاد......فرزانہ کی عمر اس وقت لگ بھگ گیارہ سال تھی اور شریف ساٹھ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''فرزانہ کا علاج آخری مراحل میں ہے لیکن بدپرہیزی کی وجہ سے کبھی اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ آج صبح جب میں گھر سے نکلا تو اسے تیز بخار تھا۔ آنے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا مگر یہاں آنا بھی ضروری تھا۔''

شریف کی رہائش شہر سے باہر کچی آبادی میں تھی جہاں وہ اپنی بیوی زلیخا اور لاڈلی بیٹی فرزانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ شریف کے ہفتے میں چھ دن تو سلمٰی کے بنگلے پر ہی گزرتے تھے۔ ہفتے کی شام کو وہ اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اتوار کا دن اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ گزارنے کے بعد پیر کی صبح وہ واپس سلمٰی کے بنگلے پر آ جاتا تھا اور آج پیر کا دن ہی تھا۔ فرزانہ کو کچھ عرصہ پہلے ٹی بی تشخیص ہوئی تھی۔ اس کے علاج کا سارا خرچہ سلمٰی ہی نے اٹھایا تھا۔

''اپنی بیٹی کو سمجھاؤ کہ علاج کی آخری منزل پر... بداحتیاطی ساری محنت پر پانی پھیر دے گی۔'' سلمٰی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر دوا لینے میں کوئی کوتاہی ہو گئی تو مرض بگڑ جائے گا پھر سنبھالنا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

''جی ہم اسے بہت سمجھاتے ہیں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''پھر بھی کبھی کوئی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی ہے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ فرزانہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گی۔'' سلمٰی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انفیکشن کا زور ٹوٹے گا تو اسے بھوک لگنے لگے گی۔ جب وہ خوب ڈٹ کر کھائے گی تو پھر اس کی جان بھی بنے گی۔''

''بھوک تو اسے اب لگ رہی ہے جی۔'' شریف نے کہا۔ ''بس، کھانے پینے کی بداحتیاطی ہی سے گڑبڑ ہو جاتی ہے۔''

"اگر تم صبح ہی مجھے بتا دیتے کہ فرزانہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو میں تمہیں ایک دن کی چھٹی اور دے دیتی۔" سلمٰی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ۔" وہ سادگی سے بولا۔ "اچھا ہی ہوا جو میں آج بنگلے پر موجود ہوں۔ اب دیکھیں نا...... اس وقت جو صورت حال ہے، اس میں اگر آپ اکیلی ہوتیں تو آپ کی پریشانی کئی گنا بڑھ جاتی۔"

"ہاں، یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سلمٰی نے تشکرانہ نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "خیر صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" شریف نے پرامید لہجے میں کہا۔

"ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔" سلمٰی نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی بیگم صاحبہ!" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں پہلے بنگلے کے گردونواح پر ایک نگاہ ڈالوں گا پھر اپنے کمرے میں جاؤں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" یہ کہتے ہوئے سلمٰی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی تقلید میں شریف بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر دونوں اپنی اپنی راہ پر چل پڑے۔ بیڈروم کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے سلمٰی سوچ رہی تھی۔

بعض مرض ایسے ہوتے ہیں جن کا غربت کے ساتھ چولی دامن کا ناتا ہے۔ ٹی بی (تپ دق) کا تعلق بھی انہی امراض سے ہے۔ کبھی کسی صاحب ثروت شخص کو ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ اِکا دُکا کوئی کیس نظر آئے تو اسے شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اٹھانوے فیصد اس مرض کا شکار وہ افراد ہوتے ہیں جن کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا یا پھر وہ ناقص اور غیر معیاری خوراک استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کی اچھی خاصی آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے پھر فضائی آلودگی اور کثیف ماحول نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ فضا کہیں بھی ہو اس میں بے شمار بیماریوں کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور وہ انسانوں پر حملہ آور بھی ہوتے رہتے ہیں جو انسان اندر سے کمزور ہوتے ہیں یعنی جن کے جسم میں بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت کم ہوتی ہے، وہ کسی نہ کسی وبا کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

ٹی بی کا ایک بڑا سبب دماغی تناؤ بھی ہے۔ اگر کوئی انسان کسی ایسی سچویشن میں مسلسل پھنسا رہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا ہو تو بے بسی کی انتہا اسے ایک ایسے اندرونی روگ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ خون تھوکنے پر مجبور ہو جاتا ہے...... جو کہ ٹی بی کی سب سے خطرناک علامت ہے۔

☆☆☆

سلمٰی نے اپنے بیڈ پر جانے سے پہلے ایک نظر اپنے شوہر فیروز نظامی پر ڈالی۔ وہ اپنے بستر پر بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ سلمٰی رات کو جلدی اسے دوا کی آخری خوراک کھلا دیا کرتی تھی جس کے فوراً بعد وہ نیند کی وادی کی سیر پر روانہ ہوتا تھا۔ دونوں کے بیڈروم الگ الگ مگر ایک دوسرے سے ملحقہ تھے۔ سلمٰی اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے نظامی پر نگاہ ڈال سکتی تھی۔ دونوں بیڈ رومز کا درمیانی دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ ایک سال پہلے پیش آنے والے خوفناک حادثے نے نظامی کو معذوری کی زندگی دے کر اسے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا تھا۔ اس حادثے کے نتیجے میں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دی گئی تھیں۔ اس اپاہجی اور محتاجی کی زندگی میں اس کی طبیعت روز بروز بگڑتی جارہی تھی اور پھر کچھ عرصہ پہلے ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل بیڈ ریسٹ کی تاکید کر دی۔

صورتِ حالات ایسی تھی کہ نیند سلمٰی کی آنکھوں سے کوسوں دور کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ کوئی بزدل عورت نہیں تھی۔ ہر نوعیت کے حالات سے نمٹنے کا حوصلہ تھا اس میں لیکن انسانی فطرت کے مطابق، وہ اپنے ماحول اور گردوپیش کے حالات کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتی تھی لہٰذا اس کا ذہن ایک حد تک دباؤ کا شکار تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اپنے ماضی کو کھنگالنے لگی۔

شادی کے بعد سلمٰی کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ شادی کے موقع پر اس کی عمر پچیس اور نظامی کی پینتالیس سال تھی۔ وہ ٹی وی ڈراموں میں "اِن" تھی تو آئے دن شوٹنگ کا سلسلہ چلتا رہتا تھا مگر اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی پر ایک جمود سا طاری ہو گیا ہو۔ ایسی بات نہیں کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی۔ اصل میں، روٹین کی تبدیلی نے زندگی کی رفتار کو خاصی حد تک کم کر دیا تھا۔ اس کی مصروفیت اب آرام میں بدل گئی تھی۔

ایک ماہ کے بعد اس نے نظامی سے کہا۔ "نظامی! میں

کافی بوریت محسوس کرنے لگی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ رہا ہو۔‘‘

’’مگر مجھے تو اس کے برعکس محسوس ہو رہا ہے۔‘‘ نظامی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

سلمٰی نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ’’مطلب......؟‘‘

’’مطلب یہ کہ مجھے تو اپنی زندگی صحیح معنوں میں اب ہی بامقصد نظر آ رہی ہے۔‘‘ نظامی نے جواب دیا۔ ’’تمہیں پا کر لگتا ہے، میں مکمل ہو گیا ہوں۔‘‘

’’ہاں، یہ تو ہے۔‘‘ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ’’میں بھی تمہارے ہی انداز میں سوچتی ہوں مگر بوریت سے میری مراد کچھ اور تھی۔‘‘

’’میں تمہاری مراد کو سمجھ سکتا ہوں۔‘‘ نظامی بڑی رسان سے بولا۔ ’’تمہارا اصل مسئلہ مصروفیت ہے۔ تم نے شادی سے پہلے شوبز کی دنیا میں جتنی بزی لائف گزاری ہے وہ عادت اس ٹھہری ہوئی زندگی میں تنگ کر رہی ہے۔ ہے نا یہی بات؟‘‘

’’بالکل، میرا مسئلہ اسی نوعیت کا ہے۔‘‘ سلمٰی تائیدی انداز میں بولی۔ ’’اور اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہیے ورنہ میں کہیں نفسیاتی مریض نہ بن جاؤں......!‘‘

’’ایسا کچھ نہیں ہوگا۔‘‘ نظامی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ’’میں اس مسئلے کو بہت جلد حل کر دوں گا۔‘‘

’’مطلب پروڈکشن ہاؤس......!‘‘ سلمٰی نے سوالیہ نظر سے اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ ’’وہ جو شادی سے پہلے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا؟‘‘

’’وہ وعدہ اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔‘‘ نظامی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’مگر فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔‘‘

’’اگر فوری طور پر پروڈکشن ہاؤس کا قیام ممکن نہیں تو پھر تمہارے ذہن میں کیا ہے؟‘‘ سلمٰی پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

’’ابھی کچھ فائنل نہیں ہو سکا۔‘‘ وہ بدستور پُرسوچ انداز میں بولا۔ ’’میں اس حوالے سے مسلسل سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’پروڈکشن ہاؤس کے قیام میں کیا رکاوٹ حائل ہے؟‘‘ سلمٰی نے پوچھا۔ ’’فنانس......‘‘

’’ہاں، ایک رکاوٹ یہ بھی ہے۔‘‘ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ’’اس کے علاوہ چند ٹیکنیکل وجوہات بھی ہیں......‘‘

لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’دراصل، میں یہ کام ایک اصول کے تحت شروع کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اظہر جعفری کی بات نے بہت متاثر کیا ہے۔‘‘

’’اوہ...... جعفری صاحب......‘‘ سلمٰی نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ’’ان کی کون سی بات نے تمہیں متاثر کیا ہے؟‘‘

اظہر جعفری شوبز کی دنیا کا ایک بڑا نام تھا۔ جعفری صاحب ایک سکہ بند پروڈیوسر تھے۔ ان کی پروڈیوس کی ہوئی سیریلز نے نام، مقام اور پیسا...... سب کچھ کمایا تھا۔ انہوں نے سرکاری ٹی وی چینل سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا پھر جب پرائیویٹ چینلز کی بھرمار ہوئی اور تقریباً ہر چینل نے اپنا انٹرٹینمنٹ کا شعبہ قائم کیا تو جعفری صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا مگر جعفری صاحب نے بہت سلیکٹڈ کام کیا اور جو بھی کیا اپنی مرضی سے، اپنے اصولوں کی بنیاد پر کام کیا۔ اپنے کام میں مہارت رکھنے کے علاوہ وہ اپنی ذات اور کردار میں بھی یکتا ہیں۔ رنگ و نور اور حسن و شباب کی دنیا میں رہنے کے باوجود وہ بہت سادہ اور صاف زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے منفرد کام اور بے داغ کردار کے بل بوتے پر عزت اور پیسا کمایا ہے اور مسلسل کما رہے ہیں۔ نظامی کی جعفری صاحب سے دوستی تھی۔

’’پچھلے دنوں جعفری صاحب کی ایک سرمایہ کار شخص سے مقامی ہوٹل میں ملاقات ہوئی۔‘‘ نظامی، سلمٰی کے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’وہ مال دار شخص امریکا سے آیا تھا اور جعفری صاحب کے ساتھ جوائنٹ وینچر کرنا چاہتا تھا۔‘‘

’’مطلب یہ کہ پیسا اُس شخص کا اور پروڈکشن جعفری صاحب کی!‘‘ سلمٰی، نظامی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

’’تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔‘‘ نظامی ’’ہاں‘‘ میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’اور وہ تمام تر پروڈکشن امریکا میں کرنا چاہتا تھا جس مقصد کے لیے وہ جعفری صاحب کو اپنے ساتھ امریکا لے جاتا۔ وہاں امریکا میں اس کا اپنا سیٹ اَپ ہے۔‘‘

’’پھر جعفری صاحب نے کیا جواب دیا؟‘‘ سلمٰی نے پوچھا۔

’’ان کا جواب ہی تو فقید المثال ہے۔‘‘ نظامی زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’جس نے مجھے کافی متاثر کیا۔‘‘

سلمٰی گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میں بھی تو سنوں......؟“

”ضرور!“ نظامی بتانے لگا۔ ”جعفری صاحب نے اس شخص کی اس عظیم الشان پیشکش کو بہ یک جنبش زبان ٹھکرا دیا۔“

”مطلب......؟“ سلمٰی حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

”جعفری صاحب نے اس شخص سے کہا کہ ”پارٹنرشپ بزنس“ صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس دو میں سے کوئی ایک چیز نہیں ہوتی یا کسی ایک چیز میں کمی یا ناپختگی ہوتی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ سلمٰی الجھن زدہ نظر سے اسے تکنے لگی۔ ”جعفری صاحب نے کن دو چیزوں کا ذکر کیا تھا؟“

”نمبر ایک فنانس، مطلب......انویسٹ منٹ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”نمبر دو اسکل، مطلب پیشہ ورانہ مہارت۔“

”اوہ......“ سلمٰی ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔ ”واقعی فنانس اور اسکل ہی کسی بھی بزنس میں کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں۔“

”جعفری صاحب نے اس سرمایہ کار سے کہا کہ نہ تو ان کے پاس فنانس کی قلت ہے جو وہ کسی انویسٹر کے پیسے سے پروڈکشن کریں اور نہ ہی وہ پیشہ ورانہ غربت کا شکار ہیں جو انہیں کسی کی ٹیکنیکل سپورٹ کی ضرورت ہو۔“ نظامی نے بتایا۔ ”پھر وہ کیوں کسی کے ساتھ جوائنٹ وینچر کر کے منافع میں سے آدھا حصہ اسے دیں۔“

”پھر اس بندے نے کیا ردِعمل ظاہر کیا؟“ سلمٰی نے دلچسپی بھرے انداز میں پوچھا۔

”وہ ہکا بکا رہ گیا اور بے یقینی سے جعفری صاحب کو دیکھتے ہوئے بولا...... جناب! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ یہاں پاکستان میں تو درجنوں پروڈیوسرز میرے ساتھ جوائنٹ وینچر کرنے کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے جا رہے ہیں اور آپ نے مجھے ٹکا سا جواب دے دیا ہے...... جعفری صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ بھائی! میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا۔ آپ کسی کے ساتھ بھی جوائنٹ وینچر کر سکتے ہیں۔ میں کم کروں یا زیادہ کروں، جب بھی کروں گا صد فیصد اپنا ہی کام کروں گا۔“

”اوہ، اب سمجھی!“ سلمٰی معنی خیز انداز میں اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جعفری صاحب کی اسی ادا نے تمہیں متاثر کیا ہے اور تم بھی خالصتاً ذاتی فنانس ہی سے پروڈکشن ہاؤس کی بنیاد رکھنا چاہتے ہو...... ہیں نا؟“

”بالکل یہی بات ہے۔“ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”جب کوئی اس بزنس میں پیسا لگاتا ہے تو پھر پروڈکشن کے ہر شعبے میں ٹانگ بھی اڑانے لگتا ہے حتیٰ کہ اس کی خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی منظورِ نظر فیمیل آرٹسٹس کو کاسٹ کیا جائے اور مجھے اس نوعیت کی نان پروفیشنل مداخلت سے سخت چڑ بلکہ نفرت ہے۔“

”میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتی ہوں نظامی۔“ سلمٰی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، اس وقت تمہارے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ انڈی پینڈنٹ پروڈکشن ہاؤس قائم کر سکو اور تم کسی فنانسر کی مدد بھی نہیں لینا چاہتے مگر میں تو تمہارے لیے غیر نہیں ہوں نا......!“

”کیا مطلب؟“ نظامی نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا۔

”مطلب یہ کہ......“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اب ہم ایک ہیں۔ ہماری ہر چیز سانجھی ہے۔ ہم غم خوشی، فائدہ نقصان کے ساتھی ہیں۔ میرے پاس اتنی رقم ہے کہ تم بہ آسانی ایک پروڈکشن ہاؤس کی بنیاد رکھ سکتے ہو اور......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر بڑے پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ”میرا خیال ہے، تمہیں اس پیشکش پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

نظامی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ ستائشی نظر سے اپنی حسین و جمیل اور ایثار پیشہ بیوی کو دیکھنے لگا۔ اس وارفتگی میں محبوبیت کا ہر رنگ شامل تھا، دلبری کا ہر ڈھنگ شامل تھا۔

آئندہ دو ماہ کے اندر پروڈکشن ہاؤس قائم ہو گیا۔

☆☆☆

دھماک کی آواز نے سلمٰی کو چونکا دیا۔

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کے بیڈ کے نزدیک ہی کوئی بم پھٹا ہو۔ وہ کوئی گہری نیند نہیں سو رہی تھی۔ بس آنکھیں بند کیے اپنے بیڈ پر لیٹی ماضی کے دھندلکوں میں جھانک رہی تھی۔

اس نے چاروں جانب نگاہ گھما کر اپنے بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ ہر شے اپنی جگہ پر صحیح اور سلامت نظر آ رہی تھی۔ گویا، دھماکا اس کی خواب گاہ میں نہیں بلکہ اس کے بنگلے کے

باہر، شہر کے کسی حصے میں ہوا تھا تاہم اس بلاسٹ کی دھمک اور آواز ایسی تھی کہ اسے یوں لگا، اس سے چند قدم کی دوری پر ہوا ہو۔

اپنے بیڈ روم کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے درمیانی دروازے سے نظامی کے بیڈ روم میں جھانکا۔ نظامی کی نیند میں تعطل پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ مخصوص دوا کے زیرِ اثر بے خبری کی گہری نیند سو رہا تھا۔

سلمٰی کی نگاہ وال کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ کلاک رات ایک بج کر دس منٹ کا وقت بتا رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھی اور اپنے کمرے سے نکل کر شریف چاچا کی جانب بڑھ گئی تاکہ اس دلدوز دھماکے کے بارے میں کچھ جان سکے۔

اسی لمحے اسے بنگلے کا مین گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی پھر اس نے گیٹ کے قریب ہی شریف چاچا کو دیکھ لیا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ سلمٰی کو یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہ ہوا کہ وہ باہر کی صورتِ حال جاننے جا رہا ہے۔ سلمٰی گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

پانچ منٹ سے بھی کم مدت میں شریف کی جھلک دکھائی دی۔ جب وہ گیٹ بند کر کے مڑا تو اس نے سلمٰی کو دیکھ لیا۔ پہلے شریف کی اس پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔

''بیگم صاحبہ! آپ جاگ گئیں؟'' وہ سلمٰی کی جانب بڑھتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولا۔

''چاچا! یہ دھماکا کہاں ہوا ہے؟'' وہ اس کے سوال کے جواب میں مستفسر ہوئی۔ ''اسی کی خوفناک آواز نے مجھے بیڈ روم سے باہر نکلنے پر مجبور کیا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے، کوئی بم پھٹا ہے۔'' شریف قیاس آرائی کے انداز میں بولا۔ ''لیکن ہمارے علاقے سے کہیں دور۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا، ہمارے بنگلے کے باہر ہی دھماکا ہوا ہے۔''

''میرے احساسات بھی تم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''خیر...... اب تو یہ روز کا معمول ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں کو عادی ہو جانا چاہیے۔''

شریف نے سلمٰی کے تبصرے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''بیگم صاحبہ! آپ اندر جائیں۔ موسم خاصا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اس شدید موسم میں آپ کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔'' شریف کا مشورہ خاصا معقول اور حسبِ حال تھا۔

سلمٰی خود بھی فضا میں رچی بسی خنکی کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ وہ یہ کہتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب مڑی۔

''چاچا! تم بھی جا کر اپنے کوارٹر میں آرام کرو۔''

''جی بیگم صاحبہ۔'' اسے اپنے عقب میں شریف کی آواز سنائی دی۔ پھر اس آواز میں ایک اور آواز بھی شامل ہو گئی۔

یہ کسی گاڑی کے انجن کی مخصوص آواز تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے مذکورہ گاڑی کے بنگلے کے باہر رکنے کی آواز بھی سماعت کر لی۔ وہ پلٹی اور شریف کی جانب دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

''اب یہ کون آ گیا......؟''

''میں دیکھتا ہوں جی۔'' شریف نے اضطراری انداز میں کہا اور بیرونی گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔

اس دوران میں وہ گاڑی رک چکی تھی پھر اس کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی مخصوص صدائیں فضا میں گونجیں۔ اس کے بعد انسانی قدموں کی چاپ ابھری۔ شریف چاچا نے گیٹ کے اندر بنی ہوئی ننھی سی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکا پھر اطلاع دینے والے انداز میں سلمٰی کو بتایا۔

''بیگم صاحبہ! انسپکٹر صاحب آئے ہیں۔''

''اوہ......'' سلمٰی کے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ ''انہیں اندر لے آؤ چاچا۔''

انسپکٹر اس مرتبہ اکیلا ہی بنگلے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ آنے والے کانسٹیبلز بنگلے سے باہر ہی رک گئے تھے۔ سلمٰی کو اس وقت بنگلے کے بیرونی حصے میں موجود پا کر انسپکٹر نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

''خیریت...... آپ ابھی تک سوئی نہیں؟''

''بس سونے ہی جا رہی تھی کہ دھماکے کی زوردار آواز نے بیڈ روم سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔'' اس نے بتایا پھر پوچھا۔ ''کیا کہیں کوئی بم پھٹا ہے؟''

''جی ہاں...... بم بلاسٹ ہوا ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

سلمٰی نے پوچھا۔ ''کہاں...... مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا کہ ہمارے بنگلے کے سامنے ہی دھماکا ہوا ہے۔''

''دھماکا کورنگی کے علاقے میں ہوا ہے۔'' انسپکٹر فیصل رانا نے بتایا۔ ''بلاسٹ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ تقریباً پورے شہر ہی میں اس کی آواز سنی گئی ہے۔ کہیں کم اور کہیں

زیادہ۔ آپ چونکہ سمندر کے کنارے پر رہتی ہیں اس لیے آپ کو زیادہ شدت محسوس ہوئی۔"

"کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا......؟" سلمٰی نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔

"ابھی حتمی طور پر نہیں بتا سکتا۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے بھی ابھی چند منٹ پہلے اس بلاسٹ کی اطلاع ملی ہے۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر سلمٰی کے چہرے کا بغور جائزہ لینے کے بعد مستفسر ہوا۔

"آپ کے بنگلے میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"جی...... اللہ کا شکر ہے۔" سلمٰی نے کہا۔ "مگر آپ اس طرح کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

پھر سلمٰی کو احساس ہوا کہ اسے یوں کھڑے کھڑے بات نہیں کرنا چاہیے بلکہ انسپکٹر کو اندر ڈرائنگ روم میں بٹھانا چاہیے۔ یہ تو بد اخلاقی ہے۔

سلمٰی کی درخواست نما پیشکش پر انسپکٹر ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا پھر وہ سلمٰی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "دراصل، میں تھوڑی دیر پہلے آپ کو رِنگ کر رہا تھا لیکن آپ کا فون مسلسل انگیج مل رہا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد بھی جب آپ کا نمبر نہیں لگ سکا تو مجھے آپ کی طرف سے تشویش محسوس ہوئی اور میں آپ کی خیریت دریافت کرنے خود آپ کے پاس آگیا۔"

"اچھا، یہ بات ہے۔" سلمٰی نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔ "وہ اصل میں، رات کو سونے سے پہلے میں دانستہ فون کا ریسیور ہٹا کر ایک طرف رکھ دیتی ہوں تاکہ فون کی گھنٹی سے نظامی کے آرام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ ویسے یہ ایک احتیاطی تدبیر ہے ورنہ آپ دیکھ لیں کہ نظامی دوا کے زیرِ اثر گہری نیند سوتا ہے کہ بم دھماکے کی اس لرزہ خیز آواز نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔"

"احتیاط بہرحال افسوس سے بہتر ہے۔" انسپکٹر کھوجنے والی نظر سے سلمٰی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ جو بھی کرتی ہیں، اپنے شوہر کے آرام و سکون کی خاطر کرتی ہیں۔ آپ کا یہ عمل قابلِ تعریف ہے۔"

"آئی ایم سوری انسپکٹر صاحب۔" سلمٰی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "آپ کو فون کے سلسلے میں کافی کوفت اٹھانا پڑی۔ میں نے آپ کو لینڈ لائن کا نمبر دیا اور پھر فون کا ریسیور بھی ہٹا دیا لیکن یقین جانیں، اس میں میری بدنیتی کا دخل نہیں ہے۔"

"آپ بھی کمال کر رہی ہیں۔" وہ بدستور سلمٰی کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے بولا۔ "اس میں 'سوری' والی کوئی بات نہیں۔"

"اب میں ریسیور کو کریڈل کر دیتی ہوں۔ انشاء اللہ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی لیکن......" وہ ایسے رکی جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔

انسپکٹر سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن آپ مجھے کیوں فون کر رہے تھے۔ خیریت تو ہے نا؟'

"جی، سب خیریت ہے۔" انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایک معاملے میں میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ بس اسی سلسلے میں تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔"

"کون سا معاملہ؟" سلمٰی کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ "کیسا سلسلہ......؟"

"آپ کا چہرہ مجھے جانا پہچانا اور دیکھا بھالا محسوس ہو رہا تھا۔" اس نے بتایا۔ "لیکن یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ آپ کو کب اور کہاں پر دیکھا ہے۔"

"ٹی وی کی اسکرین پر دیکھا ہوگا۔" سلمٰی نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کسی ڈرامے میں اداکاری کرتے ہوئے۔"

"یس!" وہ اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "بالکل آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، دراصل میں ٹی وی پر زیادہ تر خبریں ہی دیکھتا ہوں۔ ڈرامے دیکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ البتہ میری وائف کو دیسی بدیسی تمام ڈراموں کا بہت شوق ہے۔ اگر میں بھی ریگولر ٹی وی ڈرامے دیکھنے کا عادی ہوتا تو پھر مجھے آپ کو دیکھتے ہی سب کچھ یاد آجاتا۔"

"کوئی بات نہیں، کبھی کبھار فرصت نکال کر ڈراما بھی دیکھ لیا کریں۔" سلمٰی نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ اتنی بھی بری چیز نہیں ہے۔"

"نہیں...... میں ٹی وی ڈرامے کو تو برا نہیں کہہ رہا۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اپنی عدم فرصتی کا رونا رو رہا ہوں۔"

"ویسے آپ کی آمد نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔" سلمٰی ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ اور پھر جب آپ نے سنسنی خیز انداز میں میری خیریت دریافت کرتے ہوئے بتایا کہ آپ کافی دیر سے مجھے فون کر رہے تھے اور میرا نمبر نہ ملنے پر آپ یہاں آئے ہیں تو میری تشویش ایک خوف میں بدل گئی تھی...... میں واقعی ڈر گئی تھی۔"

"اوہ......" انسپکٹر نے معتدل انداز میں کہا۔ "چلیں، صورت حالات واضح ہونے کے بعد تو آپ کا خوف زائل ہو گیا ہوگا...... ہیں نا؟" آخری جملہ انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ادا کیا تھا۔

"جی بالکل......" وہ جلدی سے بولی پھر پوچھا۔ "اس خونی کا کچھ پتا چلا جس کے تعاقب نے آپ کو میرے بنگلے تک پہنچا دیا تھا؟"

"ابھی تک پولیس اس کی گردن ناپنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔" انسپکٹر فیصل رانا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "لیکن وہ زیادہ دیر تک خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ بہت جلد میں اسے اپنی گرفت میں لے لوں گا۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس پورے علاقے میں اپنے مستعد بندوں کا جال پھیلا دیا ہے۔"

"انسپکٹر صاحب! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ منحوس آپ کے بیان کردہ علاقے سے نکل گیا ہو...... میرا مطلب ہے، وہ بڑی ہوشیاری سے شہر کے کسی دوسرے حصے میں منتقل ہو چکا ہو......"

"دیکھیں میڈم!" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن اپنی کارکردگی پر پورا بھروسا ہے اور یقین ہے کہ وہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ جلد یا بدیر، وہ میرے قبضے میں ہوگا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" سلمٰی نے تہ دل سے کہا۔ "وہ اس علاقے میں ہے کہ اس علاقے سے باہر شہر کے کسی بھی حصے میں ہے، میری دعا ہے کہ وہ جلد از جلد قانون کی گرفت میں آجائے۔ مراد جیسے ناسور اس معاشرے کے لیے بہت خطرناک ہیں۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے میڈم!" انسپکٹر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ آپ بھی آرام کریں۔"

"تھینک یو انسپکٹر صاحب۔" سلمٰی بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "آپ کے تعاون اور خیر خواہی کے لیے میں دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں۔"

"یہ تو میرا فرض ہے۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ کی جگہ اگر کوئی اور شہری بھی اس سچویشن میں ہوتا تو میں اس کے لیے بھی یہی سب کچھ کرتا۔ آپ کے لیے میں نے کچھ اسپیشل نہیں کیا ہے۔"

"پھر بھی......" وہ بڑے رسان سے بولی۔ "ہمارے معاشرے میں پولیس والوں کے لیے جس نوعیت کے خیالات پائے جاتے ہیں، آپ کا رویہ اس سے قطعی مختلف ہے۔"

"دیکھیں ہر رویہ کسی رویے کا عکس ہی ہوتا ہے جیسے ہر عمل کا ردعمل بھی ہوتا ہے۔" انسپکٹر نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "عوام کے ذہن میں پولیس ڈپارٹمنٹ کا جو امیج بن گیا ہے اس میں آپ سراسر پولیس کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔"

"کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں۔" سلمٰی نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس گورکھ دھندے میں پولیس، عوام اور ان دونوں کے مسائل بھی شامل ہیں۔" انسپکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ دیانت داری سے پولیس والوں کے مسائل کا جائزہ لیں اور انہیں میسر سہولیات اور مراعات کا بین الاقوامی پولیس والوں سے موازنہ کریں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ جس ڈپارٹمنٹ کے لیے ہم اپنے ذہن میں ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی بلند توقعات رکھتے ہیں، ان کی اپنی سیفٹی اور سیکیورٹی کے لیے کون سے اقدام کیے جاتے ہیں؟ ان کے بیوی بچوں کے مستقبل کے لیے کیا مثبت پالیسیاں بنائی جاتی ہیں؟ ایک بات ذہن نشین کرلیں کہ میں......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں یہاں ایک عام پولیس والے کی بات کر رہا ہوں۔ کیونکہ عوام کا واسطہ تو انہی بے چارے کانسٹیبلز ہی سے پڑتا ہے۔ ہاں، البتہ پولیس کے اعلٰی افسران کا معیارِ زندگی کافی حد تک تسلی بخش ہے۔"

"میں آپ کی بات اور ایک عام پولیس والے کے مسائل کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں انسپکٹر صاحب۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "مگر یہ خراب کارکردگی کے لیے کوئی جسٹی فکیشن تو نہیں ہے۔ انہیں کوئی گن پوائنٹ پر تو پولیس ڈپارٹمنٹ میں بھرتی ہونے پر مجبور نہیں کرتا۔"

"میں جسٹی فائی نہیں کر رہا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "بلکہ ان کی زندگی کو بہتر دیکھنے کا خواہاں ہوں۔ اگر ایک عام پولیس والے کی تنخواہ اتنی ہو کہ وہ اس میں اپنے بیوی بچوں کو باعزت معیاری زندگی دے سکے تو مجھے یقین ہے، اس کی کارکردگی میں مثبت اور نمایاں فرق دیکھنے کو ملے گا۔"

"یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "چاند رات میں، کسی شاپنگ سینٹر کے دروازے پر کھڑا پولیس والا، لوگوں کو لاکھوں کی خریداری کر کے گھر جاتے ہوئے دیکھ کر یہ ضرور سوچ رہا ہوتا ہے کہ کاش، وہ بھی بھی اپنی فیملی کے لیے اس درجے کی شاپنگ کر سکے۔"

"ایک فنکار ہونے کے ناتے آپ ایک حساس دل کی مالک ہیں۔" انسپکٹر نے توصیفی نظر سے سلمیٰ کی جانب دیکھا۔ "اینی ہاؤ...... مجھے امید ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"انشاءاللہ!" سلمیٰ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

انسپکٹر نے رخصت ہونے سے پہلے پوچھ لیا۔ "میرا وزیٹنگ کارڈ آپ نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے نا؟"

"جی بالکل، وہ میرے پاس محفوظ ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"جب بھی میری ضرورت محسوس ہو، آپ پہلی فرصت میں مجھے کال کر سکتی ہیں۔" اس نے پُرخلوص انداز میں کہا۔

"جی شیور......!"

پھر انسپکٹر الوداعی کلمات ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

جب پروڈکشن ہاؤس قائم ہو گیا تو ظاہر ہے، پروڈکشن بھی شروع ہو گئی۔ سلمیٰ کافی عرصے سے اداکاری کے شعبے میں جوہر دکھا رہی تھی اور اس نے کئی کامیاب سیریلز دیے تھے۔ وہ اپنے کردار میں اس قدر ڈوب جاتی تھی کہ اسے اپنے گرد و پیش کی مطلق خبر نہیں رہتی تھی۔ کئی ڈائریکٹرز کا خیال تھا کہ سلمیٰ کے اندر ایک ڈائریکٹر چھپا ہوا ہے۔ اسے ڈراما ڈائریکٹ کرنے کی آفرز بھی ہوتی رہی تھیں لیکن اس نے کبھی ان آفرز کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ اپنے شعبے ہی میں رہ کر بہتر سے بہتر پرفارم کرنے کے لیے کوشاں رہتی تھی لیکن اب صورتِ حال خاصی مختلف تھی۔ ذاتی پروڈکشن ہاؤس کی وجہ سے وہ اداکاری کے علاوہ دیگر شعبہ جات میں بھی طبع آزمائی کر سکتی تھی۔ ذاتی کام کا سب سے بڑا فائدہ بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی من مانی کر سکتا ہے۔

"ایس این پروڈکشنز"، سلمیٰ اور فیروز نظامی کی مشترکہ کاوشوں کا ادارہ تھا۔ "ایس این" میں "ایس" سلمیٰ کے لیے اور "این" نظامی کے لیے تھا۔ دونوں شوبز کی دنیا میں، اپنے اپنے شعبے میں خاص مقام رکھتے تھے لہٰذا کام کے آغاز میں "ایس این" پروڈکشنز کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور پروڈکشن کا آغاز ہو گیا۔

سلمیٰ فی میل آرٹسٹ تھی اور سیریلز میں عموماً لیڈنگ رول کیا کرتی تھی۔ کاسٹ میں شامل اس کے نام کے سبب سیریل مہورت کے وقت ہی سیل ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا نام اور کام سیریل کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ تاہم یہ ممکن نہیں تھا کہ نظامی اپنے ہر سیریل میں سلمیٰ ہی کو کاسٹ کرے۔ ورائٹی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وہ دیگر فی میل اور میل آرٹسٹس سے بھی کام لے رہا تھا جنھیں وہ بہ وقتِ ضرورت ارینج کر لیا کرتا تھا البتہ اس نے ٹیکنیکل اسٹاف اور ڈائریکٹر کو اپنے پروڈکشن ہاؤس میں مستقل بنیادوں پر اپائنٹ کر لیا تھا۔ اس پروڈکشن ہاؤس میں پروڈکشن، ایڈیٹنگ، پوسٹ پروڈکشن الغرض تمام شعبوں کا کام ہوتا تھا۔

فیروز نظامی نے نور پاشا نامی ایک ماہر اور ہنرمند ڈراما ڈائریکٹر کو اپنے پروڈکشن ہاؤس میں فل ٹائم کام کے لیے رکھ لیا تھا۔ نور پاشا شوبز کی دنیا میں "پاشا صاحب" کے نام سے مشہور تھا۔ نور کا کام کے حوالے سے ایک مقام تھا۔ جب "ایس این" نے ایک دو کامیاب سیریلز مارکیٹ میں دیے تو نظامی نے سلمیٰ کو نور کے ساتھ نتھی کر دیا تاکہ وہ ڈائریکشن کا اسرار و رموز بھی سیکھ سکے۔ نور بھی سلمیٰ کی خفیہ صلاحیتوں کا معترف تھا۔ اس نے سلمیٰ کے اندر چھپا ہوا ٹیلنٹ دیکھ لیا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ سلمیٰ کچھ ہی عرصے کے بعد انڈی پینڈنٹ ڈائریکشن کرنے لگے گی۔

شوبز کی دنیا اپنی نوعیت کی ایک عجیب و امیر دنیا ہے۔ یہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ زیادہ تر ان ڈور ریکارڈنگ (شوٹنگ) رات ہی میں ہوتی ہے اور رات گئے تک جاری رہتی ہے اور عموماً پیک اَپ کرتے ہوئے صبح بھی ہو جاتی ہے۔ آرٹسٹ میل ہو یا فی میل، اسے ڈائریکٹر کی ہدایت پر لازمی عمل کرنا ہوتا ہے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر تو گویا ڈائریکٹر کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ سلمیٰ نور سے سیکھ رہی تھی۔ گویا اسے اسسٹ کر رہی تھی لہٰذا ریکارڈنگ پر وہ ایک ساتھ ہی دکھائی دیتے تھے۔

نور پاشا کی عمر چالیس کے قریب تھی اور وہ غیر شادی شدہ تھا۔ شوبز کی دنیا میں غیر شادی شدہ ہونا ایک پلس پوائنٹ سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پاشا کافی ہینڈسم اور اسمارٹ بھی تھا لہٰذا کئی پری وشوں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی

ناسور
ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی
طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس
لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔
سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا
اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرپیکار
رہنے میں بیتنے لگا۔
ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی
بہت جلد
ماہنامہ
سرگزشت
کے صفحات پر
ملاحظہ کریں

تھیں جن میں ڈراما آرٹسٹس بھی شامل تھیں۔ پاشا خاصا سنجیدہ شخص تھا چنانچہ کسی کو زیادہ فری ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک تو ڈائریکٹر کا اپنا رعب داب اور احترام ہوتا ہے۔ اس پر وہ غصہ ور بھی مشہور تھا لیکن جب سلمیٰ ہمہ وقت اس کے نزدیک نظر آنے لگی تو پروڈکشن ہاؤس کے اندر اور باہر شوبز کے حلقوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''خرم! تمہیں کیا لگتا ہے۔'' روبی نے اپنے ساتھی اداکار کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''سلمیٰ اور پاشا میں کیا چل رہا ہے؟''

روبی اور خرم ڈراما آرٹسٹ تھے۔ خرم نے جواب دیا۔ ''کیا چل رہا ہے، مطلب...... تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

''سوال پر سوال نہیں کرتے خرم!'' وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔ ''جو میں نے پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔''

''بھئی مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔ تم ہی بتاؤ۔'' خرم سادگی سے بولا۔

روبی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں اس لیے کچھ نظر نہیں آرہا کہ تم اندھے ہو ورنہ فیلڈ میں تو بہت سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔''

''واقعی میں اندھا ہوں اسی لیے تمہارے ساتھ بیٹھ کر اپنا وقت برباد کر رہا ہوں۔'' خرم نے تپانے والے انداز میں کہا۔ ''بائی دا وے...... ان میں سے ایک آدھ سرگوشی میرے کان میں بھی کر دو جو اس وقت مارکیٹ میں گردش کر رہی ہیں۔''

''تم اتنے معصوم اور بھولے بھی نہیں ہو خرم......!''

روبی نے ایک مرتبہ پھر اسے آنکھیں دکھائیں۔

''اگر اتنا نہیں تو پھر کتنا معصوم اور بھولا ہوں میں؟'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔

''خرم...... میں بے حد سنجیدہ ہوں اور تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے۔'' روبی ٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہاری قسم! میں مذاق نہیں کر رہا۔'' وہ بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں واقعی نہیں سمجھ سکا کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے......!''

''سلمیٰ اور پاشا میں کوئی سیریس چکر چل رہا ہے۔'' روبی نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ ''دونوں کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزر رہا ہے۔''

''وقت ایک ساتھ گزرنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے روبی!'' خرم نے منطقی انداز میں کہا۔ ''ایک تو دونوں کا تعلق ایک ہی فیلڈ سے ہے، دوسرے سلمیٰ، پاشا صاحب سے ڈائریکشن بھی سیکھ رہی ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس کے علاوہ بھی اگر کچھ ہے تو بتاؤ......؟''

''اگر انسان خود ہی کوئی بات سمجھنا نہ چاہے تو کوئی ہزار کوشش کر کے بھی اسے نہیں سمجھا سکتا۔'' وہ مایوسی سے سر کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''خرم! تمہارا بھی ایسا ہی حال ہے۔''

''تم میری نیت پر شک کر رہی ہو۔'' خرم نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''حالانکہ میں نے تم سے کسی قسم کی کوئی غلط بیانی نہیں کی۔''

''پاشا صاحب کئی مقامات پر سلمیٰ کی تعریف کرتے سنے گئے ہیں۔'' روبی اپنی ہی دُھن میں بولتی چلی گئی۔ ''اور یہ تعریف کوئی فنکارانہ انداز کی نہیں بلکہ ذاتی پسندیدانہ انداز کی تھی۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ پاشا صاحب ایک خاص زاویے سے سلمیٰ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' خرم، روبی کے آخری جملے کی تہ میں اترتے ہوئے بولا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ سلمیٰ، نظامی صاحب کی بیوی ہے۔ ان کی شادی کو لگ بھگ دو سال ہو گئے ہیں۔''

''تم تو ایسے بتا رہے ہو جیسے یہ کوئی سربستہ راز ہو۔'' روبی منہ بگاڑ کر بولی۔ ''سلمیٰ اور نظامی کے رشتے سے تو شوبز کا ہر شخص واقف ہے۔''

''اس کے باوجود بھی تم ان کے بیچ کسی خفیہ پلاننگ کی بات کر رہی ہو۔'' خرم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میری معلومات کے مطابق، سلمیٰ اور نظامی میں کسی قسم کا کوئی کلیش نہیں ہے۔ ان کے ازدواجی رشتے کی دیوار میں ایسی کوئی دراڑ نہیں جہاں انور پاشا کے لیے گنجائش نکل سکتی ہو۔''

''خرم! دراصل تم ہر معاملے میں مثبت انداز میں سوچنے کے عادی ہو اس لیے تمہیں کہیں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔'' روبی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے، میرے بارے میں تمہاری رائے درست ہو لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ منفی انداز میں سوچنے سے بہتر ہے، انسان مثبت انداز میں سوچے۔'' خرم نے کہا۔ ''باقی جہاں تک چیزوں کے خراب یا صحیح نظر آنے کی بات ہے تو میں اس سلسلے میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔''

''میں نے تم سے درخواست نہیں کی کہ تم مجھ سے اتفاق کرو۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے ایک حقیقت بیان کی ہے۔ یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں

ہے۔"

"روبی! ایک بات پوچھوں……؟"

"ہاں پوچھو۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"پوری دیانت داری سے جواب دوگی نا؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"بابا…… جو پوچھنا ہے، پوچھو…… یہ امانت، دیانت، شرافت اور صداقت کے چکر کو چھوڑو۔" روبی نے بدستور بیزاری سے کہا۔ "مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ تم جو بھی پوچھوگے، میں اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گی۔"

"یہ…… جو کچھ تم…… سلمٰی اور پاشا کے بارے میں بتا رہی ہو……" خرم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارے مجروح احساسات کی کارفرمائی تو نہیں ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ الجھن زدہ نظر سے خرم کو تکنے لگی۔ "میرے کون سے مجروح احساسات؟"

"یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ تم بھی پاشا میں انٹرسٹڈ رہی ہو بلکہ…… اب تک انٹرسٹڈ ہو۔" خرم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن پاشا نے تمہاری دلچسپی کو کبھی سنجیدہ نہیں لیا اور اب…… جبکہ پاشا، سلمٰی کے زیادہ قریب نظر آرہا ہے تو……"

"تو وہاٹ……" وہ خرم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ کیا میں کوئی گری پڑی لڑکی ہوں۔"

"تم میری بات کو غلط رنگ میں لے رہی ہو، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں انسانی نفسیات کی بات کررہا تھا۔ اس قسم کی سچویشن میں جیلسی تو فیل ہوتی ہے نا……"

"وہ جیلس ہوتی ہے میری جوتی۔" وہ برہمی سے بولی۔ "سلمٰی اور پاشا کے بیچ جو کچھ بھی چل رہا ہے، مجھے اس کی ذرہ برابر پروا نہیں ہے۔ وہ اگر شادی کا اعلان بھی کردیں تو میری بلا سے۔"

"خیر، وہ شادی کا اعلان بھلا کیسے کرسکتے ہیں۔" خرم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سلمٰی شادی شدہ ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ بڑی خوش گوار اور مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ میرا خیال ہے، وہ اس نوعیت کی حماقت کبھی نہیں کرے گی۔"

"اگر سلمٰی کو یہ حماقت کرنا بھی ہوگی تو وہ تم سے مشورہ لینے نہیں آئے گی۔" روبی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کیونکہ اس نوعیت کے فیصلوں کے لیے کسی ماہر نفسیات سے کنسلٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"ماہر نفسیات……!" خرم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں…… یہ الفاظ میں نے تمہارے لیے ادا کیے ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولی۔ "تھوڑی دیر پہلے تم میری نفسیات کا تجزیہ نہیں پیش کررہے تھے……!"

"اوہ……!" خرم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر فیصل رانا کے جانے کے بعد سلمٰی ایک مرتبہ پھر اپنے بیڈروم میں آگئی۔ بیڈ پر دراز ہونے سے قبل اس نے نظامی والے بیڈروم میں جھانک کر دیکھا۔ نظامی گہری نیند میں تھا۔ اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ سارے گدھے گھوڑے بیچ کر سکون کی نیند سو رہا ہے۔

سلمٰی عموماً رات میں نائٹ بلب جلا کر سویا کرتی تھی لیکن آج کی رات اتنی ہنگامی خیز تھی کہ وہ ابھی تک اپنے بیڈروم کو روشن رکھے ہوئے تھی۔ البتہ، نظامی والے بیڈروم میں نائٹ بلب روشن تھا۔

جب سلمٰی اپنے بستر پر دراز ہوئی تو رات کے ایک بج کر پچیس منٹ ہورہے تھے۔ اس نے ایک طویل جماہی لی۔ یہ جماہی نیند کی علامت نہیں تھی بلکہ اس رات میں پیش آنے والے پے در پے ہنگامہ خیز واقعات نے اس کے اعصاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ خود کو بہت مضمحل اور نڈھال محسوس کررہی تھی۔ انسپکٹر کی اس بات نے لمحاتی طور پر اسے بور کردیا تھا کہ وہ ٹی وی ڈرامے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ یہ احساس محض سلمٰی ہی کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ کوئی فنکار چاہے زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو، جب اسے یہ پتا چلے کہ سامنے والا اس کے فن سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تو اسے ایک دھچکا ضرور لگتا ہے، سلمٰی بھی ایک لمحے کے لیے اسی کیفیت سے دوچار ہوئی تھی۔

تاہم اس نے انسپکٹر کے تبصرے کا زیادہ اثر نہیں لیا تھا اور پلک جھپکتے میں خود کو نارمل کرلیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انسپکٹر نے معذرت خواہانہ انداز میں اس کی وضاحت بھی کردی تھی۔

فون کی گھنٹی نے سلمٰی کو چونکا دیا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید انسپکٹر نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا ہو۔ ذہن کے ایک حصے میں یہ خدشہ بھی کلبلایا کہ کوئی نئی مصیبت نازل نہ ہوگئی ہو۔ دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے ہی اس نے ریسیور اٹھالیا پھر دھیمی آواز

میں، ماؤتھ پیس میں کہا۔
''ہیلو......!''
دوسری جانب انسپکٹر فیصل رانا نہیں بلکہ کوئی اجنبی مردانہ آواز تھی۔ ''ہیلو، آپ سلمٰی بات کررہی ہیں؟''
''جی، میں سلمٰی ہی ہوں۔'' سلمٰی نے جواب دیا۔
''آپ کون؟''
دوسری طرف بولنے والے نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور کہا۔ ''لیں، بات کریں۔''
سلمٰی کے لینڈ لائن فون پر ''سی ایل آئی'' کی سہولت موجود تھی لیکن اس نے ڈائل پر نگاہ ڈالے بغیر ہی فون اٹینڈ کرلیا تھا۔ اب جو اس نے دیکھا تو پتا چلا، وہ انسپکٹر کا نہیں، کسی اور کا نمبر تھا۔ اگلے ہی لمحے ائرپیس میں ایک گھبرائی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔
''بی بی جی...... میں زلیخا بول رہی ہوں۔''
''کون زلیخا؟'' بے ساختہ سلمٰی کے منہ سے نکلا۔
''شریف کی بیوی زلیخا جی......'' اس نے بتایا۔ ''میرا شوہر شریف آپ کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔''
''ہاں، ہاں بولو......'' سلمٰی نے جلدی سے کہا۔ ''سب خیریت تو ہے نا۔ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''
''خیریت نہیں ہے جی۔'' زلیخا نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''آپ شریف سے میری بات کرادیں۔''
''بات کراتی ہوں۔'' سلمٰی نے پُرخلوص انداز میں کہا۔ ''مگر کچھ بتاؤ تو سہی، آخر ہوا کیا ہے؟''
''فرزانہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے......'' زلیخا نے رُندھی ہوئی آواز میں بتایا۔
''اچھا ٹھیک ہے، تم ہولڈ کرو۔ میں شریف کو بلاتی ہوں۔''
''شکریہ بی بی جی۔'' زلیخا نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔
سلمٰی بیڈروم سے نکل کر شریف چاچا کے کمرے کی جانب بڑھ گئی جو مین گیٹ کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔ شریف نامی وہ ساٹھ سالہ شخص سلمٰی کا کل وقتی ملازم تھا اور ہفتے کے چھ دن اسی کے بنگلے پر گزارتا تھا۔ اتوار کا دن وہ اپنی فیملی کے ساتھ بتانے کے بعد پیر کی صبح دوبارہ ڈیوٹی پر آجاتا تھا اور آج بھی پیر کا دن تھا اور اصولی طور پر نصف شب کے بعد منگل کا دن لگ چکا تھا۔
فرزانہ، شریف اور زلیخا کی بڑھاپے کی اکلوتی اولاد تھی۔ تمام والدین یقیناً اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں لیکن اکلوتی اولاد کی صورت میں والدین کی محبت کا زاویہ ہر حد سے بڑھ جاتا ہے۔
فرزانہ کو ٹی بی ایسا موذی مرض لاحق تھا جو مسلسل علاج کے نتیجے میں اب کافی حد تک قابو میں تھا۔ شریف چاچا نے سلمٰی کو بتایا تھا کہ آج صبح جب وہ اپنے گھر سے نکلا تو فرزانہ کو تیز بخار تھا اور اب، ایمرجنسی میں شریف چاچا کی بیوی کا فون آگیا تھا۔ بے ساختہ سلمٰی کے منہ سے نکلا۔ ''اللہ خیر کرے......!''
آئندہ پانچ منٹ میں شریف چاچا نے اپنی بیوی سے فون پر بات کرلی تھی اور اب سلمٰی سے محوِ کلام تھا۔
''میری بیوی نے بتایا ہے کہ تیز بخار کی وجہ سے فرزانہ بے ہوش ہوگئی ہے۔'' شریف نے بتایا۔
''تم ابھی گھر جاؤ اور فرزانہ کو فوری طور پر کسی اسپتال لے جاؤ۔'' سلمٰی نے کہا۔ ''اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔''
''اور آپ یہاں اکیلی رہیں گی۔'' شریف نے سوالیہ نظر سے اپنی مالکن کی طرف دیکھا۔
خیر ہے، تم میری فکر نہ کرو۔ اس وقت فرزانہ کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔'' سلمٰی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ہفتے میں ایک دن ویسے بھی تمہاری موجودگی کے بغیر گزارتی ہوں۔''
''مگر آج کی رات تو......!''
''کوئی حجت نہیں۔'' شریف نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو سلمٰی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بنگلے کے باہر سے اس وقت کچھ نہیں ملے گا۔ میں گاڑی نکال رہی ہوں۔ مارکیٹ کے قریب جو اسپتال ہے، وہاں سے ٹیکسی مل جائے گی۔''
''اور صاحب جی کا کیا ہوگا؟'' شریف کا اشارہ فیروز نظامی کی جانب تھا۔
''اللہ خیر کرے گا۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔
اگلے پندرہ بیس منٹ میں سلمٰی، شریف چاچا کو ایک ٹیکسی میں بٹھانے کے بعد واپس اپنے گھر آچکی تھی۔ یہ درست ہے کہ یہ رات سلمٰی کے لیے بڑی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور ثابت ہورہی تھی لیکن فرزانہ کی خرابیٔ صحت والا معاملہ اس نوعیت کا تھا کہ وہ اسے بنگلے پر روک نہیں سکتی تھی۔ سلمٰی نے بوقتِ رخصت شریف کو ایک اچھی خاصی رقم بھی دے دی تھی۔
''پیسوں کی فکر نہیں کرنا چاچا۔'' سلمٰی نے کہا۔ ''میں تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گی۔ جب فرزانہ کو ہوش

آجائے تو مجھے اطلاع ضرور دینا۔"

سلمٰی کے اس حسنِ اخلاق پر شریف کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

"بیگم صاحبہ! آپ انسان کی شکل میں فرشتہ ہیں......!"

"مجھے گناہ گار نہ کرو چاچا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں نے جو کچھ کیا ہے، یہ میرا فرض تھا اور اس میں ایسا کچھ بھی خاص نہیں ہے کہ میرا شمار فرشتوں میں ہونے لگے۔"

شریف کے چہرے پر تشکر کے رنگ جھلملانے لگے تھے۔ ان لمحات میں اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"آج کی رات شاید سونے کے لیے نہیں ہے۔" وہ بستر پر لیٹتے ہوئے خودکلامی کے انداز میں بولی۔ "اور اب تو واقعی نیند بھی اُڑ چکی ہے۔"

وہ خود کو پیش آمدہ حالات پر غور کرنے لگی۔ آج رات گیارہ بجے کے بعد سے اب تک پے در پے کچھ اس نوعیت کے سنسنی خیز واقعات پیش آئے تھے کہ اس کا ذہن بری طرح منتشر ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک ایسا جرائم پیشہ شخص جس کا دور دور تک ان میاں بیوی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا، اس کی آمد اور جاوید نے سلمٰی کی زندگی میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ڈراما آرٹسٹ تھی اور اس نے مختلف ڈراموں میں تقریباً ہر نوعیت کے کردار ادا کیے تھے لیکن اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ کسی سنسنی خیز ہارر ڈرامے، میں بھی کام کرے۔ عملی طور پر ڈرامے کی دنیا میں تو اسے اپنی یہ خواہش پوری کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا تاہم آج کی رات سلمٰی کی اس خواہش سے ضرور لگا کھاتی تھی۔ یہ ایک ایسی "شوٹنگ" تھی جس کے کردار بغیر لائٹس اور کیمرے کے پرفارم کر رہے تھے۔ کسی خاص کوسٹیوم یا میک اپ کی بھی ضرورت نہیں تھی اور سب سے حیران کن اور مزے کی بات یہ کہ کسی بھی کردار کو اس کی لائنز پتا نہیں تھیں، اور نہ ہی انہیں بتائی گئی تھیں۔ اس ڈرامے کا اسکرپٹ کسی نادیدہ طاقت کے ہاتھ میں تھا جو اپنی انگلیوں کے اشاروں پر ان تمام کردار کو نچا رہی تھی۔

سلمٰی کے دل میں آئی کہ ٹی وی کو میوٹ موڈ پر آن کر لے تاکہ شہر کے تازہ ترین حالات سے کچھ آگاہی ہو سکے۔ اس نے بستر چھوڑ دیا اور ٹی وی کی جانب بڑھ گئی لیکن قبل اس کے کہ وہ ٹی وی کو آن کرتی، ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے اپنا رخ تبدیل کیا اور ٹی وی سے ٹیلی فون کی جانب بڑھ گئی۔ ریسیور کو اٹھانے سے پہلے اس نے "سی ایل آئی" ڈائل پر نگاہ ڈالی۔ وہاں ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا۔

اس سے پہلے بھی شریف چاچا کی بیوی زلیخا نے ایک اجنبی نمبر سے کال کی تھی مگر یہ نمبر اس سے مختلف تھا۔

"ہیلو......" سلمٰی نے ریسیور اٹھانے کے بعد دھیمے لہجے میں کہا۔

دوسری جانب خاموشی رہی۔ سلمٰی نے ایک لمحہ اس طرف موجود کسی شخص کے بولنے کا انتظار کیا اور ایک مرتبہ پھر پکارا۔

"ہیلو، کون......؟"

دوسری جانب ریسیور کریڈل کر دیا گیا۔ لائن کٹ گئی۔

سلمٰی کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ سی ایل آئی ڈائل پر ایک مرتبہ پھر وہی نمبر ابھرا جس نے چند سیکنڈ پہلے پُراسرار خاموش کال کی تھی۔

اب کی بار سلمٰی نے کال ریسیو کرنے کے بعد خاموشی اختیار کیے رکھی اور دوسری جانب موجود ذی روح کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

چند سیکنڈ کے بعد ایک ایسی آواز سلمٰی کی سماعت سے ٹکرائی جیسے کسی نے گہری سانس لی ہو تاہم وہ یہ اندازہ قائم نہ کر سکی کہ وہ سانس نسوانی تھی یا مردانہ......!

انتظار کے یہ لمحات اس کے اعصاب پر گراں گزرنے لگے تو وہ بولے بنا نہ رہ سکی۔ اس نے قدرے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں پوچھا۔

"کون ہے...... ہیلو...... آپ بول کیوں نہیں رہے......؟"

دوسری سمت بدستور سکوت طاری رہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جو کوئی بھی تھا۔ اس نے چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ تاہم اسی خاموشی کے بیچ اس نے ایک دفعہ پھر گہری طویل سانس لی تھی۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو سلمٰی نے ریسیور کریڈل کر دیا اور ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگی۔

اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا وہ گونگا یا گونگی دوبارہ کال کرے گا/گی لیکن جب ایسا کچھ نہیں ہوا تو وہ پاؤں پٹخ کر ٹی وی کی طرف بڑھ گئی۔ تاہم ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آج وہ ٹی وی آن نہیں کر پائے گی۔

اس مرتبہ فون کی گھنٹی تو نہیں بجی پھر اس کے ذہن نے فیصلہ کن انداز میں کہا، مجھے اس پُراسرار فون کال کے بارے میں انسپکٹر کو مطلع کرنا چاہیے۔

اس نے انسپکٹر فیصل رانا کے نمبرز ڈائل کرنے سے پہلے ایک کاغذ پر وہ نمبر لکھ لیا جس سے دو مرتبہ اسے خاموش

کال کی گئی تھی۔ دوسری ہی گھنٹی پر انسپکٹر نے کال پک کر لی اور شائستہ لہجے میں بولا۔

”ہیلو میڈم! کیسی ہیں آپ؟“

”جی، میں ٹھیک ہوں۔“ سلمیٰ نے جواب دیا۔

”سب خیریت تو ہے نا......؟“ انسپکٹر کے لہجے سے کھوج کی بو آ رہی تھی۔

سلمیٰ نے کہا۔ ”جی، خیریت تو ہے مگر......!“

”مگر کیا؟“ سلمیٰ کے ادھورے جملے کے جواب میں انسپکٹر نے استفسار کیا۔

وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ”ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے۔“

”کون سی بات میڈم؟“ انسپکٹر کے لہجے میں ہمدردی اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ”پلیز...... آپ مجھے تفصیل سے بتائیں، آخر معاملہ کیا ہے؟“

سلمیٰ نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے پُراسرار کال کے بارے میں بتا دیا۔

”او کے!“ انسپکٹر نے تحمل سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔ ”کیا آپ مجھے وہ نمبر دے سکتی ہیں جس سے آپ کو دوبارہ فون کیا گیا۔“

”جی...... شیور۔“ وہ جلدی سے بولی۔

اگلے ہی لمحے اس نے مذکورہ نمبر انسپکٹر کو نوٹ کروایا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں ابھی اس فون نمبر کو چیک کروا لیتا ہوں۔“

”تھینک یو انسپکٹر صاحب۔“ وہ ایک پُرسکون سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات اگرچہ معمولی سی ہے۔ رانگ نمبرز کی کالز ہر گھر میں آتی ہیں لیکن آج کے حالات کی روشنی میں، میں اسے اہمیت دینے پر مجبور ہوں۔“

”آپ اپنی جگہ بالکل درست سوچ رہی ہیں۔“ اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”کوئی بھی چیز یا کوئی بھی معاملہ چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ وقت اور حالات اسے معمولی اور غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ آج کی رات غیر معمولی رات ہے، آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی لہٰذا ہم کسی غیر معمولی چیز یا غیر معمولی واقعے کے ساتھ ساتھ معمولی چیز اور معمولی واقعے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔“

”ٹیک کیئر...... میں تھوڑی دیر میں آپ کو کال کرتا ہوں۔“

”او کے......!“ سلمیٰ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی ٹیلی فونک رابطہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆

سلمیٰ جتنی تیز رفتاری کے ساتھ ڈائریکشن کے اسرار و رموز سیکھ رہی تھی، وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں تھی جس کے نتیجے میں وہ نور پاشا کے بہت نزدیک ہو گئی تھی اور یہ ”نزدیکی“ ہر جگہ نہ سہی مگر بعض خاص جگہوں پر ڈسکس ضرور ہو رہی تھی۔ شوبز کی دنیا کے بھی اپنے ہی نرالے ڈھنگ اور دستور ہیں۔ یہاں رائی کا پہاڑ بنتے ہوئے ایک لمحہ نہیں لگتا۔ معمولی سے معمولی خبر بھی جنگل کی آگ کی طرح پل بھر میں چہار سو پھیل جاتی ہے۔ سلمیٰ کو پاشا کے ساتھ اٹیچ ہوئے سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ سلمیٰ نے ایک دو سیریلز انڈی پینڈنٹ بھی کیے تھے تاہم اس دوران میں اس کا پاشا کے ساتھ میل ملاپ حسبِ معمول جاری رہا تھا۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ شوبز کی دنیا میں کئی مقامات پر سلمیٰ اور پاشا کو مشکوک انداز میں ڈسکس کیا جا رہا ہو اور فیروز نظامی اس ایشو سے باخبر نہ ہو۔ یہ ”معاملہ“ اُڑتے اُڑتے اس تک بھی پہنچ چکا تھا تاہم اس نے جذباتی انداز میں فوری طور پر کسی شدید ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس پروڈکشن ہاؤس کے قیام میں سلمیٰ کا بھی پیسا لگا ہوا تھا لیکن نظامی اس پروڈکشن ہاؤس کا مالک اور سلمیٰ کا شوہر تھا۔ وہ اس ہاٹ ایشو پر سلمیٰ سے سوال کر سکتا تھا۔

فیروز نظامی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو کھانا ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھانے کے عادی ہوتے ہیں، مطلب، کسی بھی معاملے میں جذباتیت اور جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ جب تک کسی معاملے کی تہ تک نہ پہنچ جائیں، کوئی حتمی قدم نہیں اٹھاتے۔ نظامی نے کچھ عرصہ اپنی تحقیق اور تفتیش کے گھوڑے دوڑائے اور پھر ایک دن اس نے ایک خاصا اہم اور بُردبارانہ فیصلہ کر ڈالا۔ اس نے نور پاشا کی چھٹی کر دی۔

”یہ آپ نے کیا کیا ہے نظامی صاحب؟“

یہ سوال کئی ایک افراد نے اس سے پوچھا تھا مگر اس نے بڑی خوب صورتی سے انہیں ٹال دیا تھا۔ یہ ٹال مٹول سلمیٰ کے معاملے میں نہ چل سکی۔ جب یہی سوال سلمیٰ نے بھی اس سے کیا تو وہ مدلل جواب کے لیے ذہنی طور پر تیار بیٹھا تھا۔

”نظامی! تمہارا یہ فیصلہ میری سمجھ میں نہیں آیا......!“

''کون سا فیصلہ سلمیٰ؟'' اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''تم نے پاشا صاحب کو پروڈکشن ہاؤس سے الگ کیوں کر دیا؟'' سلمیٰ نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

''بھئی! وہ ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا ملازم تھا۔'' نظامی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے جب تک اس کی ضرورت تھی، میں اس کی خدمات سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ جب اس کی ضرورت نہیں رہی تو میں نے اسے فارغ کر دیا اللہ اللہ خیر سلا......''

''ضرورت نہیں رہی...... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سلمیٰ نے ہونٹ بھینچ کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

''میرا وہی مطلب ہے جو میں نے کہا ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ پاشا ایک اچھا ڈراما ڈائریکٹر ہے لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ اس کے بغیر ہمارا پروڈکشن ہاؤس نہ چل سکتا ہو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں پاشا کے ساتھ لگانے کا میرا واحد مقصد یہی تھا کہ تم جلد از جلد اس کام میں مہارت حاصل کر لو اور ماشاء اللہ تم نے واقعی میرا دل خوش کر دیا ہے۔''

نظامی نہایت ہی سمجھ داری کے ساتھ اس سچویشن کو ٹیکل کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اپنی بیوی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ پاشا کے حوالے سے اس کے کردار پر کسی قسم کا شک کر رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ پانی ہمیشہ نشیب میں بھرتا ہے۔ سلمیٰ کو بخوبی اندازہ تھا کہ پاشا کی برطرفی کا محرک کیا ہو سکتا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ڈائریکشن کا کام سیکھ لیا ہے اور میرے ڈائریکٹ کیے ہوئے ایک دو سیریلز ہٹ بھی ہوئے ہیں لیکن یہ شعبہ کسی گہرے سمندر کے مانند ہے جہاں انسان ہر روز کچھ نہ کچھ نیا سیکھتا ہے۔'' سلمیٰ بھی سنبھل سنبھل کر گہری سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔ ''اور پاشا صاحب تو ہمارے پروڈکشن ہاؤس کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی جسم کو ریڑھ کی ہڈی کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔''

''میں نے جو مناسب سمجھا وہی فیصلہ کیا ہے۔'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''ہمارا پروڈکشن ہاؤس پاشا کی خدمات کے بغیر بخوبی چل سکتا ہے۔ میری نظر میں کسی ملازم کی بہ نسبت مالک خود اپنے ادارے کے لیے زیادہ مضبوط ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو سکتا ہے۔ آج کے بعد تم اس پروڈکشن ہاؤس کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کردار کرو گی۔''

''تم نے اگر حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''میرا پوائنٹ یہی ہے کہ ہمارے پروڈکشن ہاؤس کو پاشا صاحب کی ضرورت ہے۔''

وہ اپنی خوبرو بیوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''ہمارے پروڈکشن ہاؤس کو یا......؟''

یہ سوال اتنا سننا تا ہوا تھا کہ سلمیٰ کا اندرون ہل کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے نظامی نے اس کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا ہو تاہم وہ بھی بلا کی اداکار تھی۔ لمحے بھر میں اس نے سچویشن کو سنبھال لیا اور مضبوط لہجے میں بولی۔

''ظاہر ہے، ہم نے پاشا صاحب کو، اگر ڈراما ڈائریکٹ کرنے کے لیے رکھا تھا تو وہ ہمارے پروڈکشن ہاؤس ہی کی ضرورت تھے اور...... یہی میرے کہنے کا مطلب بھی تھا۔''

''میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا سلمیٰ۔'' نظامی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ کسی بھی ٹرین کو چلانے کے لیے ایک مضبوط اور طاقتور انجن کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے بروقت اور بحفاظت اس کی منزل تک پہنچا سکے۔ جب ایسا ہو جاتا ہے تو ڈرائیور کے فرائض کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔''

نظامی متوقف ہو کر سلمیٰ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ان لمحات میں کیا سوچ رہی ہے لیکن نظامی کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ سلمیٰ نے کوئی سوال کیا اور نہ ہی کسی خاص تاثر کا اظہار کیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم یک ٹک اس کے چہرے کو تکتی چلی گئی۔

''جب ٹرین اپنی منزل پر پہنچ جائے تو انجن کو دیگر بوگیوں سے الگ کر دیا جاتا ہے۔'' نظامی اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ منزل پر پہنچ جانے کے بعد اس بات کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ڈرائیور کی نگاہ چوک گئی یا اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے بھی انجن پر سے ہٹ گئی تو وہ طاقتور انجن اس ٹرین کو کسی اور جانب اپنی من پسند منزل کی سمت بھی لے جا سکتا ہے۔''

’’میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا فلسفہ بول رہے ہو۔‘‘ سلمٰی نے کوفت بھرے لہجے میں کہا۔

’’میں جو کہنا چاہ رہا ہوں، وہ تم اچھی طرح سمجھ چکی ہو سلمٰی!‘‘ نظامی کا لہجہ سنجیدگی کی معراج کو چھونے لگا۔ ’’میں نے پاشا کو اپنے پروڈکشن ہاؤس کی ٹرین میں ایک تجربہ کار انجن کی حیثیت سے منسلک کیا تھا۔ اس انجن نے میری توقع کے مطابق کام کیا ہے۔ اب اگر وہ مزید ایک لمحہ بھی اس ٹرین کے ساتھ جڑا رہتا تو مجھے یقین ہے، وہ اس ٹرین کو کسی اور نامعلوم سمت میں لے جاتا اور میں......‘‘ اس مرحلے پر وہ قدرے جذباتی ہوگیا۔ ایک گہری سانس لینے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کردی۔

’’......اور میں اس انجن کے ہاتھوں اپنا معمولی سا نقصان بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں اپنی ٹرین کا ایک چھوٹا سا پرزہ کھونے کا بھی تصور نہیں کرسکتا کجا یہ کہ...... کجا یہ کہ...... وہ ڈرائیور کو بھی لے اُڑے۔‘‘

سلمٰی حیرت سے منہ کھول کر اپنے شوہر کا منہ دیکھنے لگی۔

☆☆☆

دیوار گیر کلاک نے رات کے دو بج کر دس منٹ کا وقت ظاہر کیا تو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سلمٰی نے دوسری گھنٹی پر کال ریسیو کرلی۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے وہ جان چکی تھی کہ فون انسپکٹر فیصل رانا کے سیل فون سے کیا گیا تھا۔

’’ہیلو انسپکٹر صاحب!‘‘ وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

’’آپ ٹھیک ہیں نا؟‘‘ انسپکٹر نے پوچھا۔

’’جی، میں ٹھیک ہوں۔‘‘ اس نے سرسری انداز میں بتایا پھر استفسار کیا۔ ’’اس نمبر کا کچھ پتا چلا؟‘‘

’’جی، میں نے پتا چلا لیا ہے۔‘‘

’’کون...... کون ہے وہ؟‘‘ سلمٰی کے انداز سے بے چینی عیاں تھی۔

’’میں آپ کو اس شخص کے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔‘‘ انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔‘‘

’’جی...... پوچھیں۔‘‘ سلمٰی کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔

’’آپ نے مجھے جو نمبر دیا تھا۔‘‘ انسپکٹر نے پوچھا۔ ’’اسے نوٹ کرنے میں آپ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟‘‘

’’جی نہیں، میں نے اچھی طرح دیکھ کر سی ایل آئی سے وہ نمبر نوٹ کیا تھا۔ مطلب یہ کہ...... اس سلسلے میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔‘‘ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

’’آپ کو یاد ہے، میں نے آپ کو اس خطرناک مجرم کا حلیہ کیا بتایا تھا؟‘‘

’’جی یاد ہے۔‘‘ وہ بے ساختہ بولی۔ ’’آپ نے اس سفاک مجرم کا نام مراد علی بتایا تھا۔ وہ ایک مفرور قیدی ہے۔ اس نے کئی قتل کر رکھے ہیں۔ آج بھی اس نے اپنے کسی دشمن کو قتل کرکے اس کی لاش سمندر میں پھینک دی تھی......‘‘

سلمٰی سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو رکی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔

’’وہ ایک غصہ ور قد آور شخص ہے۔ اس کی ٹھوڑی چوڑی ہے، آنکھوں میں شیطانی چمک ہے اور چہرے سے درندگی جھلکتی ہے۔ اس نے براؤن پینٹ پر آف وہائٹ شرٹ پہن رکھی ہے۔ آستینیں اُڑسی ہوئی اور گریبان کھلا ہوا......‘‘

’’بس ٹھیک ہے۔‘‘ انسپکٹر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ’’آپ کی یادداشت تو کمال کی ہے۔‘‘

’’یادداشت کمال کی ہے یا جمال کی، گولی ماریں انسپکٹر صاحب۔‘‘ وہ پریشانی کے عالم میں بولی۔ ’’یہ بتائیں، اس پُرسرار خاموش فون کال کا اس نامراد قاتل سے کیا تعلق ہے؟‘‘

’’بہت گہرا تعلق ہے میڈم......!‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ سلمٰی کی تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

’’پولیس کے ریکارڈ کے مطابق، آج کچھ دیر کے لیے یہ نمبر مراد علی کے استعمال میں رہا ہے۔‘‘ انسپکٹر نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ’’پھر اس نے فون آف کردیا اور اس وقت بھی یہ نمبر آف آرہا ہے۔‘‘

’’اوہ مائی گاڈ......!‘‘ سلمٰی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ’’لیکن میرا اس مجرم سے کیا واسطہ...... اس نے مجھے دو مرتبہ فون کیوں کیا اور...... اگر فون کیا تو خاموش کیوں رہا......؟‘‘

’’فوری طور پر تو میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔‘‘ انسپکٹر نے بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’سب سے پہلے یہ پتا چلنا چاہیے کہ آپ کے بنگلے کا فون نمبر اس کے پاس کیسے چلا گیا؟‘‘

’’میں کیا بتا سکتی ہوں۔‘‘ وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔ ’’میرا تو دماغ کام نہیں کررہا۔‘‘

"اپنے حواس کو قابو میں رکھیں میڈم۔" انسپکٹر نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "آپ ایک بہادر اور سمجھ دار خاتون ہیں اور...... اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آپ کی یادداشت بہت طاقتور ہے۔ اپنے ذہن پر زور دیں اور اچھی طرح سوچ کر بتائیں کہ اس قد کاٹھ اور حلیے کا کوئی شخص آپ کے حلقے میں شامل رہا ہے...... کوئی دوست...... یا کوئی دشمن......؟"

"جی نہیں، میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتی۔" وہ پُروثوق انداز میں بولی۔

"پھر...... آپ کا نمبر اس کے پاس کیسے پہنچ گیا۔" انسپکٹر کی الجھن بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ......"

انسپکٹر کے ادھورے جملے نے سلمٰی کو بے قرار کر دیا، وہ بے ساختہ بولی۔ "کیسا...... انسپکٹر صاحب؟"

"جب آپ نے مجھے اپنے بنگلے کا فون نمبر نوٹ کرایا تھا تو اس وقت مراد نے بھی وہ نمبر نوٹ کر لیا ہو......" انسپکٹر نے اپنی دانست میں وضاحت کرنا چاہی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔" سلمٰی قدرے خفگی سے بولی۔ "وہ کیسے میرے بنگلے کا فون نمبر نوٹ کر سکتا ہے...... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت وہ شیطان بھی میرے گھر میں موجود تھا؟"

"یہ ناممکن تو نہیں ہے۔" انسپکٹر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"مگر آپ نے تو اپنے سپاہیوں کے ساتھ بنگلے کا چپا چپا دیکھ ڈالا تھا اور کونا کونا چھان لیا تھا۔" سلمٰی کی پریشانی ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ "بلکہ اس تلاش میں میرے گھریلو ملازم نے بھی آپ کا ساتھ دیا تھا۔"

"جی مجھے یاد ہے مگر غلطی کا امکان تو بہرحال موجود رہتا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ اپنے ملازم سے ایک مرتبہ پھر بنگلے کو چیک کرائیں۔ میں آ رہا ہوں۔"

"شریف چاچا تو بنگلے پر موجود نہیں ہے۔" سلمٰی نے بتایا۔

"کیا مطلب ہے، آپ کا......" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ نے تو بتایا تھا، وہ آپ کا کل وقتی ملازم ہے اور بنگلے پر ہی رہتا ہے پھر رات کے اس پہر وہ کہاں چلا گیا......؟"

"میں نے آپ کو کچھ بھی غلط نہیں بتایا تھا انسپکٹر صاحب۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ "اسے ایک ایمرجنسی میں اپنے گھر جانا پڑا ہے۔ اس کی بیٹی کی حالت خراب ہو گئی تھی۔"

"اوہ...... آپ فکر نہ کریں۔" انسپکٹر نے تشفی بھرے انداز میں کہا۔ "میں فوراً آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔"

"تھینک یو انسپکٹر صاحب۔" وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔

"آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا......"

"ہاں...... میں خوف محسوس کر رہی ہوں۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "آپ پلیز جلدی آ جائیں۔"

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں پہنچ رہا ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "آپ کے شوہر تو ٹھیک ہیں نا......؟"

"جی...... وہ بالکل ٹھیک ہیں اور نارمل انداز میں سو رہے ہیں۔"

"اوکے...... ٹیک کیئر۔" انسپکٹر نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ان کے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔

سلمٰی نے ریسیور کریڈل کیا اور ٹی وی کو میوٹ موڈ پر آن کر لیا۔ پھر جلدی سے چینلز بدلتے ہوئے وہ ایک نیوز چینل پر ٹھہر گئی اور تازہ ترین ملکی خصوصاً کراچی شہر کے حالات سے باخبر ہونے لگی۔

اس کی نگاہ ٹی وی اسکرین پر جمی تھی لیکن سماعت بنگلے کے اندرونی حصے کا وزٹ کرنے میں مصروف تھی۔ وہ کوئی بزدل قسم کی عورت نہیں تھی لیکن موجودہ صورتِ حال کی سنگینی نے اسے اچھا خاصا ہراساں کر دیا تھا۔ جب سے اسے یہ پتا چلا تھا کہ وہ خطرناک مجرم رات کے نصف حصے میں، اس کے بنگلے میں، اس کے بہت قریب موجود تھا، اس کی تشویش میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس بات کا کسی کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا کہ مراد نامی وہ نامراد مجرم اس وقت اس کے انتہائی قریب موجود تھا جب وہ انسپکٹر کو اپنے بنگلے کا فون نمبر نوٹ کرا رہی تھی اور...... یہ کہ دو مرتبہ خاموش کال بھی اسی نے کی تھی لیکن حالات و واقعات کی روشنی میں یہ بعید از قیاس بھی نہیں تھا......!

انسپکٹر کے کہنے پر اور ازاں بعد بھی اس نے اپنی یادداشت کے ذخیرے کو سوچوں کے گھوڑے پر سوار کر کے یہ جاننے کی بہت کوشش کی تھی کہ مراد علی کے حلیے اور جثے کا کوئی شخص اس نے کب اور کہاں دیکھا تھا مگر اس کے حافظے

نے اس سلسلے میں اس کا مطلق ساتھ نہ دیا اور یہی بات سمجھ میں آئی کہ مراد علی کا ان لوگوں سے دور و نزدیک کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔

وہ مختلف نیوز چینلز پر اس سفاک قاتل کے حوالے سے کوئی اپ ڈیٹ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس سلسلے میں وہ خاطر خواہ معلومات حاصل نہ کر سکی۔ نیوز چینلز کے نکرز سے اس منحوس کے بارے میں جو بھی پتا چل رہا تھا اس سے زیادہ انسپکٹر فیصل رانا اسے بتا چکا تھا۔

وہ خوف و دہشت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ انسپکٹر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک عجیب سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ آواز اس کے بہت قریب سنائی دی تھی......!

☆☆☆

سلمٰی کی شادی اپنے چوتھے سال کے اختتام پر تھی مگر ابھی تک ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لاولدی میں ان کی کوئی احتیاط یا کوتاہی شامل نہیں تھی۔ ابتدائی دو سالوں میں، اولاد کے حصول کے سلسلے میں ماہر ڈاکٹروں سے علاج معالجے کا معاملہ بھی چلتا رہا تھا لیکن مختلف گائنا کالوجسٹس کے تجربات کوئی رنگ نہ لا سکے تھے چنانچہ نظامی نے یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کا ماننا یہ تھا کہ اگر قدرت کو منظور ہوگا کہ وہ صاحب اولاد ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی نسل کو چلنے سے نہیں روک سکتی۔

ان چار سالوں میں سلمٰی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے بھی گزری تھی۔ وہ ایک کہنہ مشق اور ہر دلعزیز اداکارہ تھی۔ اس کے کریڈٹ پر کامیاب سیریلز کی ایک طویل لسٹ موجود تھی۔ شادی کے وقت نظامی نے اس کی اداکاری پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس ہی رک جائے گی۔ اداکاری کے بغیر وہ جی نہ سکے گی لیکن جب نظامی نے اسے بتایا کہ وہ سلمٰی کی اداکاری کے خلاف نہیں بلکہ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ سلمٰی سیلف پروڈکشن کے ڈراموں میں کام کرے تو یہ سن کر وہ جیسے جی اٹھی تھی۔ شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد نظامی اور سلمٰی کی ذاتی کوششوں سے ان کا پروڈکشن ہاؤس قائم ہو گیا تھا جو تا حال دائم تھا۔

''ایس این'' پروڈکشن ہاؤس میں ڈراموں کی ابتدا سلمٰی ہی کے ایک سیریل سے ہوئی تھی۔ اس سیریل میں وہ مرکزی کردار کر رہی تھی۔ مذکورہ سیریل سپر ہٹ رہا تھا۔ اب اداکاری کے ساتھ وہ ڈائریکشن پر بھی توجہ دے رہی تھی۔ نور پاشا اس کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ اس ''راہ نمائی'' میں وہ اس قدر ڈوب گئی کہ اداکاری سے اس کا دھیان ہٹ گیا۔ پھر ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ وہ محض ڈائریکشن ہی کی ہو کر رہ گئی۔ یہ وہی وقت تھا جب شوبز کے مختلف حلقوں میں سلمٰی اور پاشا کے سنجیدہ تعلقات پر چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ یہی چہ میگوئیاں اور ان کے مابعد اثرات جب ایک طوفان کی صورت نظامی تک پہنچے تو وہ کسی اقدام پر مجبور ہو گیا۔

نظامی نے پہلی فرصت میں ''نور پاشا'' کو ''ایس این'' پروڈکشن ہاؤس کی ملازمت سے فارغ کر دیا اور سلمٰی سے بھی ایک سنجیدہ اور معنی خیز گفتگو کر ڈالی تھی۔ اس نے سلمٰی کے جذبات کو ڈائریکٹ ہٹ نہیں کیا تھا تاہم اس کا انداز ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' والا تھا اور سلمٰی نے ''کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے'' کو بھی بہت گہرائی تک سمجھ لیا تھا۔

کاش! وہ واقعی سمجھ گئی ہوتی اور یہ معاملہ یہیں تھم جاتا مگر انسانی زندگی کا سفر بہت عجیب ہے۔ یہ ''کاش'' کی زبان نہیں سمجھتا۔ ''اگر، مگر، چونکہ، چنانچہ'' بھی اس سفر کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ یہ اپنی ہی دھن میں جاری و ساری رہتا ہے۔ سلمٰی اور نظامی کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ ایک رات وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سلمٰی نے مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور نظامی کی آنکھوں سے خفگی آمیز ناراضی ٹپک رہی تھی۔

''سلمٰی!'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ ''تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ''میں نے کب تم سے شکوہ کیا ہے؟''

''پھر یہ سب کیا ہے؟'' نظامی نے مجروح لہجے میں کہا۔

وہ عجیب سے انداز میں بولی۔ ''کیا ہے......؟''

سلمٰی کے انداز نے نظامی کو سلگا دیا۔ چند لمحات تک وہ دانتوں پر دانت جما کر اپنے غصے کو پینے کی کوشش کرتا رہا پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔

''سلمٰی! میں نے تم سے محبت کی ہے...... سچی محبت...... اور کوشش کی ہے کہ تمہاری زندگی میں اور کوئی کمی نہ آنے دوں مگر تم نے میرے جذبات کی قدر نہیں کی......''

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' سلمٰی نے بیزاری سے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ تم ایک اچھی اداکارہ ہو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن اس وقت تم کیمرے کے سامنے نہیں ہو اور نہ ہی تمہیں کوئی اسکرپٹ پڑھنے کو دیا گیا ہے۔''

''میں اداکاری نہیں کر رہی نظامی۔'' وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولی۔ ''بتاؤ، تمہیں مجھ سے کیا پریشانی ہے؟''

''پریشانی!'' نظامی نے زہرخند انداز میں دہرایا۔ ''تم کوئی نرسری کی بچی نہیں ہو جو میں تمہیں ''اے، با، کا......'' سبق پڑھاؤں۔ تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میرا دکھ کیا ہے مگر افسوس کہ...... تم میرے دکھ کو محسوس نہیں کر رہی ہو۔''

سلمیٰ نے ایک جماہی لینے کے بعد سر کو جھٹکا پھر کسلمندی سے بولی۔ ''مجھے نیند آرہی ہے۔''

''قدرت بھی سمجھ میں نہ آنے والے عجیب و غریب اور اذیت ناک اسکرپٹ لکھتی ہے۔'' نظامی نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''دوسروں کی نیند اڑانے والوں کو نیند آنے لگتی ہے۔''

''نظامی! میں مانتی ہوں، تم بہت اچھے ڈانس ڈائریکٹر ہو۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''بلے بیک سنگنگ میں تمہارا کوئی ثانی نہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم اچھے فلسفی یا تجربہ کار ماہر نفسیات بھی ہو۔ پلیز...... اپنی باتوں سے مجھے بور نہ کرو۔ خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' نظامی اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''جب تم کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو تو میں اپنے الفاظ کیوں ضائع کروں۔ میں نے پاشا کو پروڈکشن ہاؤس سے فارغ کیا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں یہی تھا کہ تم شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے جذبات کو لگام دے لو گی اور خود کو سنبھال لو گی مگر میرے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ تم نے پاشا کے ساتھ میل جول جاری رکھا ہوا ہے اور تم دونوں کے تعلقات میں کوئی کمی نہیں آئی۔''

اپنے دل کا غبار دھوتے ہوئے نظامی دروازے کی جانب بڑھا تو سلمیٰ نے پوچھا۔ ''نظامی! کہاں جارہے ہو؟''

''جہنم میں......!'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''شاید تم میرے منہ سے یہ الفاظ سننا چاہتی ہو لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا کیونکہ مجھے جہنم میں جانے کی ضرورت نہیں...... جہنم تو اس وقت میرے ذہن میں دہکا ہوا ہے۔''

''پھر بھی...... کچھ تو بتاؤ......'' سلمیٰ نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

''میں لانگ ڈرائیو پر جارہا ہوں۔'' وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ ''اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرنے تاکہ...... میں کچھ سوچ سکوں...... اپنی اور تمہاری زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرسکوں...... کوئی حتمی فیصلہ۔''

''اتنی رات کو لانگ ڈرائیو پر جانا ٹھیک نہیں......'' وہ عام سے لہجے میں اتنا ہی بولی تھی کہ......

''کیوں؟'' وہ سلمیٰ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی تیکھے انداز میں بولا۔ ''کیا رات میں ایسے کاموں کی ممانعت ہے۔ کیا اس وقت سڑک زمین سے اڑن چھو ہو جائے گی؟''

''ٹھہرو...... میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' سلمیٰ نے گہری سنجیدگی سے کہا اور اٹھ گئی۔

''سلمیٰ! پلیز......'' وہ آہنی لہجے میں بولا۔ ''مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

نظامی کا استدلال مبنی برحقیقت تھا کہ رات کے وقت لانگ ڈرائیو کی ممانعت تھی اور نہ ہی اندھیرا ہوتے ہی سڑک کہیں غائب ہو جاتی تھی مگر سلمیٰ کے روکنے کے پیچھے ایسا کوئی فلسفہ نہیں تھا۔ اس نے محض نظامی کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر یہ بات کہی تھی لیکن وہ نہیں رکا تھا۔ وہ کسی ایسے طبیب کا نسخہ کیسے استعمال کرسکتا تھا جو اس کی بیماری کا اصل سبب تھا۔

نظامی جس ذہنی حالت کے ساتھ گھر سے نکلا تھا، اسے تسلی بخش نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ایسی ذہنی کیفیت کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلاتی ہے جو زندگی کی راہ میں کانٹے بچھا دیا کرتی ہے۔ نظامی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ دو گھنٹے بعد سلمیٰ کے پاس یہ افسوسناک اطلاع پہنچی کہ ہائی وے پر نظامی کی گاڑی کو ایک خطرناک حادثہ پیش آگیا ہے۔

نظامی شدید ترین ذہنی دباؤ کے تحت ڈرائیو کر رہا تھا کہ سامنے سے آنے والی ایک مسافر کوچ سے اس کی گاڑی ٹکرا گئی تھی۔ یہ سانحہ اتنی سرعت سے پیش آیا تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہ سوچ سکا تھا۔ اس کے اعصاب خطا ہوئے اور ذہن نے معذوری ظاہر کردی۔ نتیجے کے طور پر وہ خوفناک حادثہ پیش آگیا۔

اس ایکسیڈنٹ میں نظامی کی جان تو بچ گئی تھی تاہم وہ زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ تباہ شدہ گاڑی میں وہ اس بری طرح سے پھنس گیا تھا کہ گاڑی کی باڈی کے ایک بڑے حصے کو کاٹ کر اسے باہر نکالا گیا تھا۔ دیگر چھوٹی موٹی چوٹوں کے علاوہ اس کی دونوں ٹانگیں بری طرح متاثر ہوئی تھیں۔ مجبوراً ایک طویل آپریشن کے بعد اس کی ٹانگوں کو گھٹنوں پر سے کاٹنا پڑا تھا۔ وہ اپنے گھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل بجھ گیا اور لبوں پر خاموشی نے ڈیرا جما لیا۔

سلمٰی اس کی منکوحہ شریکِ حیات تھی اور یہ اپاہجی حادثی طور پر اس کی زندگی کی ساتھی بن گئی تھی۔

☆☆☆

سلمٰی نے میکانکی انداز میں گردن گھما کر اس سمت دیکھا جہاں وہ عجیب سی آواز ابھری تھی۔ جلد ہی اس آواز کا سبب اس کی نگاہ میں آگیا۔ وہ بے دھیانی میں ٹیلی فون سیٹ کو اس کے اسٹینڈ پر ٹھیک سے نہیں رکھ پائی تھی جو نیچے گر گیا تھا۔ اسٹینڈ کے قریب ہی ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ ٹیلی فون سیٹ نے اس میز سے ٹکرانے کے بعد وہ آواز پیدا کی تھی جو رات کے سناٹے میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی تھی۔

اس رات پے در پے کچھ ایسے سنسنی خیز واقعات پیش آرہے تھے کہ ہر معمولی چیز بھی غیر معمولی لگنے لگی تھی جبھی اس ٹکراؤ کی آواز نے بھی سلمٰی کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ اس نے فون کو اسٹینڈ پر رکھا اور دوبارہ ٹی وی اسکرین پر نگاہ جما دی۔

سلمٰی کوئی روایتی قسم کی چھوئی موئی یا کمزور عورت نہیں تھی۔ وہ اس رات کو بھی مردانہ وار جھیل رہی تھی لیکن جب سے یہ خطرناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ سفاک قاتل ان لمحات میں اس کے بنگلے میں موجود تھا جب وہ انسپکٹر فیصل رانا کو اپنا لینڈ لائن نمبر نوٹ کرا رہی تھی تو اس احساس نے اسے کافی خوف زدہ کر دیا تھا۔ اگر کسی عام اجنبی شخص کی بھی گھر میں موجودگی کا پتا چلتا تو یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔ کجا یہ کہ وہ بندہ جیل سے بھاگا ہوا ایک مفرور قیدی اور خطرناک قاتل بھی تھا۔

سلمٰی نے خود کو تسلی دی کہ مراد علی اس کے بنگلے میں کبھی نہیں رکا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسپکٹر اس مجرم کا تعاقب کرتے ہوئے ان کے علاقے میں آیا تھا اور اس نے مراد کو ان کے بنگلے کی چھت پر دیکھ کر گولی بھی چلائی تھی لیکن وہ قاتل ان کے بنگلے سے کہیں اور فرار ہوگیا تھا۔ اگر وہ بنگلے کے اندر موجود ہوتا تو پولیس والوں کی نظر سے بچ نہیں سکتا تھا۔

اس کے ذہن کے ایک گوشے سے سوال ابھرا۔

”پھر اس کے بنگلے کا فون نمبر اس مجرم کے پاس کیسے پہنچ گیا......؟“

سلمٰی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا وہ یہ سوچنے پر مجبور تھی۔ ”انسپکٹر کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ جس نمبر سے دو مرتبہ میرے فون پر کال آئی وہ مراد علی کا نمبر نہیں ہوگا......!“

اس نے وقتی طور پر خود کو تسلی تو دے لی تھی مگر ایک سوال ابھی تک جواب طلب تھا اور وہ یہ کہ...... وہ پراسرار خاموش کالز کس نے کی تھیں اور کیوں......؟

وہ انہی سوال و جواب میں غلطاں تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سلمٰی نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ انسپکٹر کا فون ہوگا۔ دس منٹ پہلے اس کی انسپکٹر سے بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں بنگلے پر پہنچ رہا ہے۔

جب سلمٰی فون کے پاس پہنچی تو گھنٹی دوسری بار بجی اور سی ایل آئی ڈائل پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ یہ انسپکٹر کا سیل نمبر نہیں تھا بلکہ فون کسی لینڈ لائن نمبر سے کیا گیا تھا۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے ریسیور اٹھا لیا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔

”ہیلو کون......؟“

اگلے ہی لمحے ایک مانوس آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”بیگم صاحبہ! آپ ٹھیک ہیں؟“

دوسری جانب اس کا گھریلو ملازم شریف چاچا تھا۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے شریف کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”تم سناؤ، فرزانہ کا کیا حال ہے؟“

”جی، فرزانہ کو میں نے اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر اسے اسپتال پہنچانے میں دیر ہو جاتی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“ اس کے بعد شریف چاچا نے سلمٰی کو بتایا کہ اس نے اپنی بستی والوں کی مدد سے کس طرح فرزانہ کو اسپتال پہنچایا تھا۔

”اوہ...... اللہ کا شکر ہے۔“ سلمٰی نے اطمینان بخش سانس خارج کی۔

شریف نے مزید بتایا۔ ”تیز بخار فرزانہ کے سر کو چڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تھوڑی دیر میں اسے ہوش آجائے گا۔“

”بہت اچھی بات ہے، اللہ تمہاری بیٹی کو زندگی دے۔“ سلمٰی نے کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ کے بروقت تعاون کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔“ اس نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ”ورنہ......“

رُندھی ہوئی آواز کے ساتھ شریف چاچا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو سلمٰی نے کہا۔ ”میرے احسان کے لیے اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں چاچا۔ میں نے وہی کیا جو میرا

فرض تھا۔ تمہیں اپنے محلے والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنہوں نے فرزانہ کو فی الفور اسپتال پہنچانے کے لیے تمہاری مدد کی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ۔" وہ اثباتی لہجے میں بولا۔ "میں جیسے ہی گھر پہنچا، یہ لوگ فرزانہ کو لیے تیار بیٹھے تھے جس ٹیکسی میں آپ نے مجھے سوار کرایا تھا، ہم فرزانہ کو اسی ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال پہنچے ہیں میری بستی والے بہت ہی پرخلوص اور انسان دوست ہیں۔"

"مصیبت کے وقت ہی انسان کی پہچان ہوتی ہے۔" سلمٰی نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ اچھے وقتوں میں ساتھ دینے والے سچے دوست بھی ہوں۔ اصل خیرخواہ کا اسی وقت پتا چلتا ہے جب آپ مشکل حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔"

"بیگم صاحبہ...... میں......" شریف نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

"ہاں، بولو تم چپ کیوں ہو گئے؟" سلمٰی نے فوراً پوچھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں بیگم صاحبہ۔"

"ارے...... کیا ہوا؟" سلمٰی نے کہا۔ "چاچا! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہیں کس بات کی شرمندگی ہے؟"

"میں کوئی اچھا انسان نہیں ہوں۔" وہ بوجھل لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب چاچا؟" سلمٰی کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"اس وقت آپ مصیبت میں تھیں۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "اور میں آپ کو چھوڑ کر چلا آیا۔"

"اوہ......" سلمٰی نے ایک طویل سانس خارج کی اور کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں چاچا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کی رات میرے لیے بہت بھاری ہے لیکن تمہارا فرزانہ کے پاس جانا ضروری تھا۔ تمہاری مصیبت مجھ سے زیادہ بڑی تھی اور......" اس نے لمحاتی توقف کیا پھر بات پوری کرتے ہوئے بولی۔

"......اور تم اپنی مرضی سے نہیں گئے تھے۔ میں نے زبردستی تمہیں بھیجا تھا کیونکہ فرزانہ کو تمہاری زیادہ ضرورت تھی۔"

"اب وہ ضرورت پوری ہو چکی ہے۔" شریف نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "فرزانہ خطرے سے باہر ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے پاس آجاتا ہوں......"

ایک لمحے کے لیے سلمٰی کے جی میں آئی کہ وہ شریف کو بنگلے پر بلالے لیکن پھر اس کے اندر ایک عجیب سی توانائی بھر گئی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند لپکا اگلے ہی لمحے اس نے چٹانی لہجے میں کہا۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی بیٹی پر توجہ دو۔ یہاں کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! میں کل دن میں آجاؤں گا۔" شریف نے فرمانبرداری سے کہا۔

سلمٰی نے "اوکے" کہہ کر ریسیور کریڈل کر دیا۔

☆☆☆

اس انکشاف نے انسپکٹر فیصل رانا کو الجھا کر رکھ دیا تھا کہ خطرناک مفرور قاتل نے آج رات ایک بج کر پچاس منٹ پر دو مرتبہ اپنے سیل فون سے سلمٰی کے گھر کے نمبر پر خاموش کال کی تھی۔ اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ نمبر مراد علی ہی کے پاس تھا۔ اس نے اس نمبر سے کال کرنے کے بعد فون آف کر دیا تھا اور پھر سلمٰی کی زبانی پتا چلا تھا کہ دو مرتبہ اسی نمبر سے اس کے گھر کے نمبر پر کال کی گئی تھی۔ یہ نمبر مراد کے پاس کہاں سے آیا؟ جیل سے فرار ہونے کے بعد اس کے کسی خیرخواہ نے اسے دیا تھا یا اس نے اپنے زورِ بازو پر کسی راہ گیر سے چھینا تھا۔ تاہم پولیس کی ریسرچ کے مطابق، یہ نمبر کہیں باقاعدہ رجسٹرڈ نہیں تھا۔ پولیس کا محکمہ اس تھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔ کہ یہ سم کب اور کس کے نام و آئی ڈی کارڈ پر ایکٹی ویٹ کرائی گئی تھی۔ موجودہ صورتِ حال یہ تھی کہ مذکورہ نمبر آف آ رہا تھا۔ انسپکٹر نے وقفے وقفے سے اس نمبر پر رِنگ کر کے دیکھا تھا اور اس کی یہ کوشش جاری تھی مگر اسے اپنے مقصد میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ وہ نمبر مسلسل آف مل رہا تھا۔

اس وقت رات کے دو بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ سلمٰی سے اس کی آخری بات دو بج کر دس منٹ پر ہوئی تھی جب اس نے سلمٰی کو بتایا تھا کہ اسے دو مرتبہ خاموش کال کرنے والا وہ پُراسرار شخص کوئی اور نہیں بلکہ وہی سفاک قاتل تھا جس کے تعاقب میں وہ سلمٰی کے بنگلے تک پہنچا۔ اس اطلاع کے بعد سلمٰی کا خوف زدہ ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ اس نے سلمٰی کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کے پاس آ رہا ہے اور اس وقت وہ اس کے بنگلے کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

اس سفر کے دوران میں وہ مسلسل سلمٰی ہی کے بارے

ہیں سوچ رہا تھا۔ اس کا اصل ٹارگٹ تو مراد علی کو تلاش کرنا تھا اور وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے اسی مشن میں مصروف تھا لیکن سلمٰی کے کردار نے اس مہم میں خاصی پیچ دار سنسنی بھر دی تھی۔

انسپکٹر کا ذہن اس وقت مختلف الانوع خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور ہر خیال کے اختتام پر ایک منہ چڑاتا ہوا سوالیہ نشان بھی دکھائی دیتا تھا۔

وہ خطرناک مجرم قانون سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اس فرار کے دوران میں اس نے سلمٰی کے بنگلے کو کیوں چنا کیا؟ وہ اسے مذکورہ بنگلے کی چھت پر کیوں دکھائی دیا تھا؟ اس قاتل کے پاس سلمٰی کے بنگلے کا ٹیلی فون نمبر کیسے پہنچا؟ سلمٰی تو اس کو جاننے سے انکاری تھی۔ ان لوگوں کے دوستوں اور دشمنوں میں اس جسامت اور وضع قطع کا کوئی شخص شامل نہیں تھا۔ اگر چند لمحات کے لیے یہ فرض کرلیا جاتا کہ جس وقت سلمٰی انسپکٹر کو اپنے گھر کا فون نمبر نوٹ کرا رہی تھی، ان لمحات میں وہ عیار مجرم اسی بنگلے کے کسی کونے کھدرے میں، بہت قریب ہی کہیں چھپا ہوا تھا اور اس نے وہ نمبر ذہن نشین کرلیا تھا یا اپنے سیل فون میں محفوظ کرلیا تھا۔ اس تھیوری کے نتائج میں یہ سوال بنتا تھا کہ اس نے کس مقصد کی خاطر سلمٰی کا فون نمبر محفوظ کیا ہوگا؟ اس نے انسپکٹر کے جانے کے بعد دو مرتبہ سلمٰی کے بنگلے کے نمبر پر فون کیا مگر ایک لفظ منہ سے نہیں پھوٹا۔ اگر اس کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد تھا تو پھر وہ بولا کیوں نہیں؟

یہ سب سوالات تو اپنی جگہ اہمیت کے حامل تھے ہی مگر انسپکٹر کی تشویش کا مرکز ایک نقطہ تھا...... ایک خطرناک نقطہ...... کہ کیا وہ خونی اس وقت بھی سلمٰی کے بنگلے ہی میں کہیں چھپا بیٹھا ہے؟

اس سوچ کے ساتھ ہی انسپکٹر فیصل رانا کے اعصاب تن گئے۔ اسے اپنے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑتا محسوس ہوا۔ اگلے ہی لمحے اس کا سیل فون کسی کال کی اطلاع فراہم کرنے لگا۔

اس نے سیل کے ڈسپلے پر نظر ڈالی تو وہاں سلمٰی کے بنگلے کا نمبر ظاہر ہو رہا تھا۔

''اللہ خیر کرے۔'' اس نے ان الفاظ کے ساتھ کال پک کرلی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہیلو!''

دوسری جانب سلمٰی ہی تھی مگر حد سے زیادہ حواس باختہ، اس کی دہشت زدہ آواز انسپکٹر کی سماعت سے ٹکرائی۔

''انسپکٹر صاحب...... غضب ہو گیا...... آپ کہاں ہیں......؟''

انسپکٹر کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کیا ہو گیا میڈم...... آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''میں تو خیریت سے ہوں مگر......'' اس کی آواز حلق میں گویا اٹک سی گئی۔

''مگر کیا......؟'' بے ساختہ انسپکٹر کے منہ سے نکلا۔

''اس موذی نے نظامی کو قتل کردیا ہے۔'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ فوراً یہاں آجائیں۔''

''اوہ......'' انسپکٹر کی بوجھل سانس خارج ہوئی۔

''آپ اسی سفاک قاتل کی بات کر رہی ہیں نا؟''

''جی ہاں...... اس نے میرے شوہر نظامی کی جان لے لی ہے۔'' سلمٰی کی آواز سے گہرے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں آپ کے بنگلے کے نزدیک پہنچ گیا ہوں۔'' انسپکٹر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ گیٹ کھول دیں۔ بس مجھے آپ تک پہنچنے میں ایک آدھ منٹ ہی لگے گا۔''

سلمٰی نے فون بند کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ انسپکٹر سے بات مکمل کرنے کے بعد اس نے بنگلے کا گیٹ کھولا تھا پھر ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔ ٹھیک دو منٹ بعد انسپکٹر فیصل رانا ایک کانسٹیبل کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔

''آپ آئیں میرے ساتھ۔'' انسپکٹر کو دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ ''نظامی کی لاش اس کے بیڈ روم میں پڑی ہے۔''

انسپکٹر، سلمٰی کی معیت میں آناً فاناً اس بیڈ روم تک پہنچا جو نظامی کے لیے مخصوص تھا۔ پہلے جب انسپکٹر اس بنگلے پر سفاک قاتل کو تلاش کرنے آیا تھا تو نظامی کے بیڈ روم میں نائٹ بلب روشن تھا لیکن اب سلمٰی نے تمام لائٹس آن کردی تھیں۔

انسپکٹر نے نہایت ہی مہارت اور سرعت کے ساتھ جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ نظامی کی نبض کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کی سانسوں اور دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کی کوشش لیکن یہ سعی لاحاصل ثابت ہوئی۔ فیروز نظامی...... وہ شخص اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ انسپکٹر کو اس کی موت کا یقین ہو گیا تو وہ دیگر معاملات پر دھیان دینے لگا۔

نظامی کی لاش افراتفری کا منظر پیش کر رہی تھی۔ لاش کی حالت سے بخوبی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ نظامی کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بیڈ شیٹ کی کیفیت سے پتا

چلتا تھا کہ نظامی نے موت کے منہ میں جانے سے پہلے تھوڑی بہت مزاحمت بھی کی تھی لیکن سفاک قاتل کے سامنے اس کی پیش نہیں چل سکی تھی اور اسے موت کو گلے لگانا پڑا تھا۔

جائے وقوعہ کی ضروری ابتدائی کارروائی مکمل کرنے کے بعد انسپکٹر سلمٰی کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہ اس سے پہلے دو مرتبہ اس بنگلے پر آیا تھا۔ پہلی بار مراد علی کا تعاقب کرتے ہوئے اور دوسری دفعہ اس وقت جب وہ سلمٰی کا فون نہ ملنے سے تشویش میں مبتلا ہوا تھا۔ سلمٰی کا بنگلا ڈیفنس سوسائٹی کے آخری حصے میں سمندر سے بہت قریب تھا لہٰذا اس کی آمدورفت کا علاقہ مکینوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ ویسے بھی شہر کے اس پوش علاقے میں کوئی کسی پر خاص نگاہ رکھتا ہے... اور نہ ہی کسی کے گھر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے کوئی دلچسپی رکھتا ہے، چاہے وہ اس کا پڑوسی ہی کیوں نہ ہو!

''میں نے اپنے تھانے میں اس واردات کی اطلاع دے دی ہے۔'' انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''تھوڑی دیر میں ہمارا ٹیکنیکل اسٹاف بھی یہاں پہنچ جائے گا جو فنگر پرنٹس اور دیگر اہم معاملات کو ڈیل کرے گا۔''

''آپ کو جو بھی کارروائی کرنا ہے وہ کریں۔ مجھے ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میرا جتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔''

''میڈم! میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔'' انسپکٹر نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ کارروائی بھی ضروری ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی ہمت کریں تو میں آپ سے چند اہم سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''جی......'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''پوچھیں......اب ہمت تو کرنا ہی پڑے گی۔''

''یہ واقعہ کیسے پیش آ گیا۔'' انسپکٹر نے سوال کیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ سے میری بات ہوئی تھی۔ جب تو سب ٹھیک تھا۔''

''جی جب سب خیریت تھی۔ بس اچانک ہی سب کچھ ہو گیا۔''

''اچانک سب کچھ ہو گیا...... کیا مطلب میڈم!'' انسپکٹر کی آواز میں گہری تشویش تھی۔ ''آپ کا بیڈروم نظامی کے بیڈروم کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ آپ اپنے بیڈروم میں رہتے ہوئے، اپنے سوئے ہوئے شوہر پر بخوبی نگاہ رکھ سکتی ہیں اور آپ یقیناً جاگ بھی رہی تھیں پھر سب کچھ اچانک......'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے مراد علی کو نظامی کے بیڈروم میں داخل ہوتے دیکھا ہوگا، پھر نظامی کی موت کا منظر بھی آپ کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہا ہوگا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ نظامی کا قاتل وہی شخص ہے جس کی تلاش میں پولیس پورے علاقے میں سرگرداں ہے؟''

''جی، آپ نے مجھے مراد علی کا حلیہ خاصی وضاحت کے ساتھ بتایا تھا اور آپ یہ بات بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ میری یادداشت بہت مضبوط ہے۔'' وہ نمناک آواز میں بولی۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مراد علی ہی تھا۔''

''اوہ!'' انسپکٹر متاسفانہ انداز میں سلمٰی کو تکتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اسے نظامی کے بیڈروم میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟''

''جی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اسے نظامی کے بیڈروم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکی تھی مگر وہ گولی کی رفتار سے دیوار پھلانگ کر بنگلے سے فرار ہو گیا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں میڈم۔'' انسپکٹر نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے اسے نظامی کے بیڈروم میں داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ وہ پہلے سے مقتول کے بیڈروم میں چھپا ہوا تھا؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' وہ دزدیدہ انداز میں انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہو سکتا ہے، وہ نظامی کے بیڈروم میں موجود ہو یا یہ بھی ممکن ہے، وہ باہر سے اندر آیا ہو اور آن واحد میں اس نے نظامی کا کام تمام کر دیا ہو۔ میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔''

''کیا مطلب میڈم؟'' انسپکٹر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ''آپ نے کیوں کچھ بھی نہیں دیکھا؟''

''میں آپ کو بتاتی ہوں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

انسپکٹر جلدی سے اس کے لیے فریج سے پانی نکال لایا پھر پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں میڈم، اگر آپ نے حواس چھوڑ دیے تو یہ معاملہ اور الجھ جائے گا۔''

''میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولی پھر ٹھہر ٹھہر کر پانی کے گھونٹ حلق سے نیچے

اتارنے لگی۔

چند لمحات کے بعد اس کی حالت قدرے سنبھلی تو انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

''آپ مجھے کچھ بتانے جا رہی تھیں؟''

''جی ہاں وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں آپ کو یہ بتا رہی تھی کہ جس وقت اس ذلیل انسان نے میرے شوہر کی جان لی، میں واش روم میں تھی۔ میں نے اچانک نظامی کے چیخنے کی آواز سنی، پھر کچھ اٹھا پٹخ کی آوازیں ابھریں اس کے ساتھ ہی نظامی کی گھٹی گھٹی آواز مجھ تک پہنچی۔ میرے لیے یہ حیرت اور تشویش کی بات تھی کیونکہ جب میں واش روم میں گئی تو سب کچھ ٹھیک تھا، نظامی بھی مزے سے سو رہا تھا......'' بیان کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کی آواز بھرا گئی۔

''اور جب آپ واش روم سے باہر نکلیں تو مراد علی آپ کے شوہر کو قتل کرنے کے بعد واپس جا رہا تھا۔'' انسپکٹر نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے کہا۔ ''مطلب یہ کہ......وہ فرار ہو رہا تھا؟''

''جی......یہی حقیقت ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''ان حالات و واقعات سے تو یہی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ مراد علی اسی بنگلے کے کسی حصے میں چھپا بیٹھا تھا۔'' انسپکٹر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ اس وقت نظامی کے بیڈ روم میں گھسا جب آپ واش روم گئی تھیں یا اس سے پہلے کسی وقت وہ موقع پا کر نظامی کے بیڈ روم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا تاہم اس بات سے یقیناً بہت فرق پڑتا ہے کہ......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس نے آپ کے شوہر کو کیوں قتل کیا۔ نظامی سے اس کی ایسی کون سی دشمنی تھی کہ جیل سے فرار ہوتے ہی اس نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا......؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں انسپکٹر صاحب۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جو حقیقت ہے وہ میں نے بیان کر دی ہے۔''

''ایک حقیقت اس سے پہلے بھی آپ نے بیان کی تھی۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے سلمٰی کو دیکھنے لگا۔

''جی کون سی حقیقت؟'' سلمٰی نے کہا۔

''یہ حقیقت کہ آپ مراد علی کو بالکل نہیں جانتی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ آپ لوگوں کے دوستوں میں شمار ہوتا ہے اور نہ دشمنوں میں۔ آپ نے زندگی میں آج پہلی بار اسے دیکھا تھا......؟''

''جی، میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ مراد نے خوامخواہ ہی نظامی کی جان لے لی ہے۔'' انسپکٹر صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ ایک سفاک قاتل ہے۔ جب پولیس اس کے تعاقب میں تھی تو اس نے فرار ہوتے ہوئے آپ کے بنگلے کا رخ کیا۔ قبل اس کے وہ اپنے ایک دشمن کو قتل کر کے اس کی لاش کو سمندر بُرد کر چکا تھا۔ اگر میں آپ کی بات کا یقین کر لوں تو پھر آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ آپ کا شوہر مراد علی کو اچھی طرح جانتا تھا اور ان دونوں کے بیچ کوئی پرانی دشمنی تھی جبھی اس نے جیل سے فرار ہونے کے بعد آپ کے شوہر کو ٹھکانے لگا دیا۔''

''میں کچھ نہیں جانتی انسپکٹر صاحب۔'' وہ فیصل رانا کی بات مکمل ہونے کے بعد جلدی سے بولی۔ ''مجھے جو کچھ پتا تھا وہ آپ کو بتا چکی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ نظامی اس سفاک قاتل کو جانتا ہو لیکن اس نے کبھی مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔''

''آپ فیروز کو کب سے جانتی ہیں؟'' انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہماری شادی کو لگ بھگ پانچ سال ہو گئے ہیں۔'' وہ آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے بولی۔ ''اس سے پہلے میں نظامی کے بارے میں صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ ایک اچھا ڈانس ڈائریکٹر ہے اور موسیقی سے بھی اسے خاصا لگاؤ ہے۔''

''یہ تو پیشہ ورانہ معلومات ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''میں مقتول کی ذاتیات کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ خاص طور پر شادی کے بعد تو وہ آپ کے بہت قریب آ گیا تھا۔ میاں بیوی کا رشتہ ایک ایسا بندھن ہے کہ ایک دوسرے کی پرائیویسی، پرائیویسی نہیں رہتی۔ کیا ان پانچ سالوں میں نظامی نے کبھی......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک طویل سانس لی پھر سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ سے اپنے کسی دشمن کا ذکر کیا۔ کسی ایسے شخص کا ذکر جس سے وہ یا وہ اس سے شدید نفرت کرتا ہو؟''

''جی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے کے شریکِ حیات تھے لیکن نظامی بہت ہی گہرا انسان تھا، بحر الکاہل سے بھی زیادہ گہرا، خاموش اور پُرسکون...... میں دعویٰ نہیں کرسکتی کہ میں اسے مکمل طور پر جانتی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے......" انسپکٹر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم نظامی کی کسی خطرناک دشمن کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جس کا نتیجہ آج دیکھنے کو ملا ہے؟"

"جی ایسا ہوسکتا ہے۔" سلمٰی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی......"

اس دوران میں دو مزید پولیس والے بھی بنگلے پر پہنچ گئے۔

"ٹھیک ہے، آپ آرام کریں۔" انسپکٹر...... کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں ٹیکنیکل افراد کے ساتھ جائے وقوعہ کی طرف جارہا ہوں۔"

سلمٰی نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

ٹھیک چار بجے صبح انسپکٹر فیصل رانا ایک مرتبہ پھر سلمٰی کے رُوبرو بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس کی تفتیش کے دوران میں وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی آنسو بہاتی رہی تھی۔

"ہم نے ابتدائی تفتیش کے تقاضے پورے کرلیے ہیں میڈم!" انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "لیکن ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے۔"

"کون سی بات؟" سلمٰی نے سر اٹھا کر عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"لاش کے کسی بھی حصے پر مراد علی کے فنگر پرنٹس نہیں ملے۔" انسپکٹر گمبھیر انداز میں بتانے لگا۔ "نہ مقتول کی گردن پر اور نہ جسم کے کسی اور حصے پر حتیٰ کہ بیڈروم کے کسی حصے میں بھی اس کے فنگر پرنٹس نہیں ملے۔"

"تو...... تو پھر......!" سلمٰی نے آنکھیں پھاڑ کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

"ایسا لگتا ہے، وہ یہاں آیا ہی نہ ہو......"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے انسپکٹر صاحب۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" وہ اضطراری لہجے میں قدرے جوش سے بولی۔ "مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوسکتا۔ وہ وہی مراد علی تھا جس کا ڈیل ڈول اور حلیہ آپ نے مجھے بتایا تھا۔ جب میں واش روم سے باہر نکلی تو وہ کم بخت نظامی کے بیڈروم سے نکل کر فرار ہورہا تھا۔"

"میں آپ کے بیان پر کسی قسم کا شک نہیں کررہا ہوں میڈم!" انسپکٹر نے بڑے رسان کے ساتھ کہا۔ "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔"

سلمٰی نے استفسار کیا۔ "کون سی صورت انسپکٹر صاحب؟"

"کہ اس واردات کے دوران میں مراد علی نے دستانے پہن رکھے ہوں۔" انسپکٹر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "آپ نے اسے فرار ہوتے دیکھا ہے۔ کیا آپ کی نظر اس کے ہاتھوں پر بھی پڑی تھی؟"

"جی نہیں...... مم...... میرا مطلب ہے کہ میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ویسے آج کل موسم سرما عروج پر ہے۔ دسمبر کی اس ٹھنڈی ٹھار رات میں اگر اس نے دستانے پہن رکھے تھے تو کچھ عجیب یا ناممکن تو نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "جو بھی ہوگا، جلد ہی سامنے آجائے گا۔ میں آپ کے شوہر کی لاش کو اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔"

"وہ...... وہ کس لیے؟" بے ساختہ سلمٰی کے منہ سے نکلا۔

"میڈیکل ٹیسٹ کے لیے۔" انسپکٹر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "آپ کے شوہر کی موت طبعی انداز میں واقع نہیں ہوئی۔ انہیں قتل کیا گیا ہے لہٰذا ان کی لاش کا میڈیکل ٹیسٹ بہت ضروری ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا......!"

"جج جی......" سلمٰی نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "نظامی کی لاش کب تک مجھے واپس مل جائے گی؟"

"آج شام تک یا کل دن میں کسی وقت......"

"ٹھیک ہے۔" وہ ہونٹ بھینچ کر اپنے دکھ کو برداشت کرتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کو قانونی کارروائی سے تو نہیں روک سکتی۔"

صبح کے پانچ بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے جب پولیس والے فیروز نظامی کی لاش کو لے کر سلمٰی کے بنگلے سے روانہ ہوگئے۔ انسپکٹر فیصل رانا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس رات کے اختتام پر اسے کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ایک خطرناک قاتل کے تعاقب میں اس بنگلے تک پہنچا تھا۔ وہ اس قاتل کی گرد کو بھی نہیں پاسکا تھا تاہم وہ قاتل اسے ایک تحفہ دے گیا تھا...... ایک لاش کا

تحفہ!

☆☆☆

نظامی اور سلمیٰ کا تعلق جس دنیا سے تھا جب اس دنیا سے منسلک افراد کو اس سانحے کی اطلاع ملی تو سلمیٰ کے بنگلے کے باہر گاڑیوں کی قطار لگ گئی۔ شوبز سے وابستہ ہر چھوٹا بڑا آدمی اسے پُرسہ دینے بنگلے تک چلا آیا تھا۔ نظامی ایک نہایت ہی سنجیدہ اور بُردبار شخص تھا۔ اس کا حلقہ احباب [illegible] زیادہ وسیع نہیں تھا اور جہاں تک دشمنی کی بات تو ہر شخص اس حوالے سے حیران ضرور تھا کہ نظامی کا ایسا کون دشمن ہوسکتا ہے جو اس کی جان لے لے تاہم اس وقت شہر کے جو حالات تھے ان میں اکثر لوگوں کا دھیان اس طرف بھی جا رہا تھا کہ کسی وقت، کہیں، کچھ بھی ہوسکتا ہے!

شوبز سے تعلق رکھنے والے افراد بڑے باخبر ہوتے ہیں۔ یہ بات سامنے آچکی تھی کہ نظامی کو اسی مفرور قیدی نے موت کے گھاٹ اتارا ہے جس کے فرار کی خبریں کل تمام چینلز سے دی گئی تھیں لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس خطرناک قاتل کی بھلا نظامی سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟

نظامی کے بنگلے پر صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ تعزیت کے لیے آنے والا ہر شخص اپنی اپنی سمجھ اور سوچ کے مطابق اظہار رائے کر رہا تھا۔ چند لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ ڈکیتی کی کوئی واردات بھی ہوسکتی ہے۔ نظامی کے اچانک بیدار ہو جانے پر وہ شخص بوکھلا گیا ہوگا پھر نظامی کی مزاحمت پر اس نے نظامی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

''نہیں......'' ایک شخص نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر یہ ڈکیتی کی واردات ہوتی تو قاتل نظامی کے بیڈروم میں نہیں بلکہ سلمیٰ کے بیڈروم کو کھنگالنے کی کوشش کرتا لیکن اس نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ میں نے کل مراد علی نامی اس سفاک قاتل کے ٹکرز چلتے دیکھے ہیں۔ نظامی کے بنگلے کا رخ کرنے سے پہلے وہ اپنے کسی دشمن کو قتل کر کے اس کی لاش سمندر میں پھینک آیا تھا......''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فیروز نظامی بھی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔'' ایک دوسرے شخص نے پہلے کی بات مکمل ہونے سے پیشتر سوال کر دیا۔ ''اس خطرناک مجرم کی نظامی سے کوئی دشمنی تھی؟''

''ایسا ہونا ناممکن تو نہیں ہے۔'' پہلا شخص عام سے لہجے میں بولا۔ ''جہاں انسان کے دس دوست ہوتے ہیں وہیں ایک آدھ دشمن بھی انہی کے بیچ چھپا ہوتا ہے۔''

''ہاں بھائی، آپ کے فلسفے سے تو انکار ممکن نہیں لیکن جہاں تک میں نظامی کو جانتا تھا، اس کا ایسا کوئی دشمن نہیں ہونا چاہیے۔'' ایک شخص نے اپنی رائے دی۔ ''اور وہ بھی ایک ایسا دشمن جو جیل سے فرار ہوتے ہی اپنے دشمنوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دے اور پھر غائب بھی ہو جائے۔ پولیس ٹامک ٹوئیاں ہی مارتی رہ جائے۔''

''پولیس کی کیا بات کرتے ہو بھائی، اس کا حال سب کو معلوم ہے۔'' ایک شخص نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''شہر کے ہر چوراہے پر کوئی نہ کوئی پولیس کی موبائل کھڑی ہوتی ہے اس کے باوجود بھی دن دہاڑے وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ لگتا ہے، جرائم پیشہ افراد نے باقاعدہ ''لائسنس ٹوکل'' لے رکھا ہے!''

''واقعی شہر کے حالات بہت ہی تشویشناک ہیں اور یہ تشویش ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔'' ایک شخص نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''عام لوگوں کے علاوہ پولیس والوں کو بھی چن چن کر ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ بعض تھانوں کے باہر تو باقاعدہ خندقیں کھودنے کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ تاکہ دہشت گرد بارود سے بھری ہوئی کوئی گاڑی تھانے سے ٹکرا کر ان کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دیں۔ کئی ایک تھانوں کے سامنے مورچے تو پہلے ہی موجود ہیں۔''

''کتنی مضحکہ خیز بات ہے نا......'' ایک آرٹسٹ نے بددلی سے کہا۔ ''یہ پولیس والے شہریوں کی کیا حفاظت کریں گے۔ انہیں تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔''

''ارے یار...... پاشا کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔'' ایک شخص نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا پاشا کو اس سانحے کی اطلاع نہیں دی گئی؟''

ایک طرف سے معنی خیز انداز میں خیال آرائی کی گئی۔ ''پاشا صاحب نے ایک طویل عرصے تک نظامی صاحب کے ساتھ کام کیا ہے اور ان لوگوں کے شوبز سے ہٹ کر فیملی ٹرمز بھی تھے۔ پاشا صاحب کو اگر نظامی صاحب کی موت کی خبر نہیں دی گئی تو یہ میرے لیے حیرت کی بات ہے......!''

اس شخص نے ''فیملی ٹرمز'' کے الفاظ اس انداز میں ادا کیے تھے کہ اکثر افراد کے چہروں پر معنی خیزی نمایاں ہو گئی۔ سب بخوبی سمجھ رہے تھے کہ مذکورہ شخص کا اشارہ سلمیٰ اور پاشا کے بیچ پائے جانے والے ایک خاص تعلق کی جانب تھا۔

''پاشا صاحب کو اگر اطلاع دی بھی گئی ہوگی تو ان کا یہاں حاضر ہونا ممکن نہیں۔'' ایک نوجوان آرٹسٹ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ آج کل ایک سیریل کے شوٹ پر آسٹریلیا گئے ہوئے ہیں۔''

''فیملی ٹرمز'' کی بات کرنے والے بندے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اگر پاشا صاحب اس وقت پاکستان میں ہوتے تو بھی میرے خیال میں وہ یہاں دکھائی نہ دیتے۔ نظامی صاحب کی معذوری پاشا صاحب ہی کا دیا ہوا تحفہ ہے۔''

''یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔'' ایک بزرگ آرٹسٹ نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ ہوا، وہ ماضی کا ایک باب ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اس واقعے کے بعد سلمٰی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اس نے پوری توجہ اپنے معذور شوہر کی تیمارداری اور دیکھ بھال پر مرکوز کر دی تھی۔''

کہا جاتا ہے، جتنے منہ اتنی باتیں اور جتنے ذہن، اتنی سوچیں۔ اس وقت سلمٰی کے بنگلے پر ایک درجن سے زیادہ افراد موجود تھے اور تعزیت کے لیے آنے والے شوبز کے لوگوں کی آمد و جامد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کس کے ذہن میں کیا تھا، یہ اپنی جگہ درست مگر سلمٰی کے ساتھ سب ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ اسے حوصلہ دے رہے تھے تاکہ وہ اپنے غم کو کم کر سکے البتہ، مختلف ٹولیوں کی صورت میں لوگ اپنی اپنی سوچ اور نفسیات کے مطابق، اظہارِ خیال بھی کر رہے تھے۔

رسم دنیا ہے کہ مرنے والے کے ساتھ کوئی مرتا نہیں اور سوگواران کا دکھ بھی کوئی بانٹ نہیں سکتا۔ سب تسلی دلاسا دے کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ سلمٰی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ شام ڈھلنے تک اس کا بنگلا تعزیت کے لیے آنے والوں سے خالی ہو چکا تھا۔

شریف آج دوپہر میں واپس آ گیا تھا۔ اس کی بیٹی کی طبیعت سنبھل چکی تھی اور وہ فرزانہ کو گھر پہنچانے کے بعد ہی یہاں آیا تھا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بار بار نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے خود کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ جب بنگلا لوگوں کی بھیڑ سے آزاد ہو گیا تو وہ سلمٰی کے سامنے بیٹھ کر نہایت ہی شرمندگی کے عالم میں بولا۔

''بیگم صاحبہ! آپ تو مجھے معاف کر دیں گی لیکن ہو سکتا ہے، میں ساری زندگی خود کو معاف نہ کر پاؤں۔''

''چاچا...... ایسی باتیں نہ کرو۔'' سلمٰی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔''

''کاش! میں نے آپ کی بات نہ مانی ہوتی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں رات ہی میں واپس آ گیا ہوتا تو صاحب جی کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ آپ نے مجھے کیوں روک دیا تھا؟''

''مجھے کیا پتا تھا کہ مجھ پر یہ قیامت ٹوٹ پڑے گی۔'' وہ بوجھل لہجے میں بولی۔ ''جب تم سے فون پر میری بات ہوئی اس سے دس منٹ پہلے انسپکٹر صاحب نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میرے پاس آ رہے ہیں، میں مطمئن ہو گئی تھی اس لیے میں نے تمہیں یہاں آنے کے لیے منع کر دیا تھا لیکن انسپکٹر کے آنے سے پہلے ہی......''

''حوصلہ کریں بیگم صاحبہ!'' شریف چاچا نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''آپ بہت بہادر خاتون ہیں۔''

''حوصلہ ہی تو کیا ہوا ہے۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ورنہ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ان حالات میں وہ بات کرنے کے قابل بھی نہ رہتا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر نفرت آمیز انداز میں بولی۔ ''خدا اس شیطان کو غارت کرے جس نے نظامی کی جان لے لی......!''

''آمین......!'' بے ساختہ شریف کی زبان سے نکلا۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سلمٰی نے دوسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ دوسری جانب انسپکٹر فیصل رانا تھا۔ سلمٰی کی آواز سنتے ہی انسپکٹر نے کہا۔

''میڈم! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان حالات میں میری طبیعت کیسی ہوگی۔'' سلمٰی نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ ''مگر آپ فکر نہ کریں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں اپنے شوہر کی لاش وصول کر سکوں...... آپ کب آ رہے ہیں؟''

''میں آدھے گھنٹے میں آپ کے بنگلے پر ہوں گا۔'' انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''اوکے...... میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''تھینک یو۔'' انسپکٹر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

رات کے نو بجے تھے۔ سلمٰی اور انسپکٹر فیصل رانا رُوبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر کے ساتھ آنے والے دو پولیس اہلکار باہر پولیس کی گاڑی ہی میں رک گئے تھے۔ سلمٰی نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ تو نظامی کی لاش میرے حوالے کرنے والے تھے پھر خالی ہاتھ کیوں آ گئے؟''

''آپ کے شوہر کی لاش کل کسی وقت بنگلے پر پہنچا دی جائے گی۔'' انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کل......'' سلمٰی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''آج کیوں نہیں؟''

''بعض اہم وجوہات کی بنا پر آج یہ کام ممکن نہیں ہے۔''

''مطلب...... میں سمجھی نہیں انسپکٹر صاحب!'' سلمٰی کی حیرت میں الجھن کا تناسب بڑھ گیا۔ ''ایسی کون سی اہم وجوہات ہیں۔ کیا لاش کے حوالے سے آپ کے میڈیکل کے ''معاملات'' ابھی مکمل نہیں ہوئے؟''

''آپ جن میڈیکل معاملات کی جانب اشارہ کر رہی ہیں وہ ایک دم مکمل ہو چکے ہیں۔'' انسپکٹر کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

''پھر......؟'' سلمٰی کے چہرے پر تشویش نے ڈیرا جمالیا۔ ''پھر تاخیر کیوں؟''

''تاخیر کا سبب بھی یہی معاملات ہیں۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میڈیکل رپورٹ کی روشنی میں، جب تک میں آپ سے چند اہم سوالات کے جواب نہ لے لوں، نظامی کی لاش آپ کے سپرد نہیں کی جا سکتی۔''

''آپ صاف صاف بتائیں، کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' وہ ناگواری سے بولی۔

''بتائیں گی تو آپ......'' انسپکٹر کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''میں تو صرف سوال کروں گا۔''

سلمٰی پریشانی کے عالم میں انسپکٹر کا منہ تکنے لگی۔

''کیا یہ درست ہے کہ کسی نور پاشا نامی ڈراما ڈائریکٹر کے ساتھ آپ کے سنجیدہ تعلقات رہے ہیں؟'' انسپکٹر نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، یہ درست ہے۔'' سلمٰی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''پاشا صاحب ایک عظیم ڈائریکٹر ہیں۔ وہ ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں کافی عرصہ کام کر چکے ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ میرے استاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''یہ تو پیشہ ورانہ تعلقات ہوئے۔'' انسپکٹر نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''میرا اشارہ خاص نوعیت کے تعلقات کی جانب تھا۔ ایسے تعلقات جو آپ کے شوہر کی نگاہ میں کھٹکتے تھے۔''

''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں انسپکٹر صاحب......!'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔

''سوری میڈم! اگر میری باتیں آپ کو تکلیف پہنچا رہی ہیں تو میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر نے سادگی سے کہا۔ ''مگر میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔ میں دن ہی میں آپ کے پاس آ جاتا لیکن شوبز کے لوگوں سے میل ملاقات میں مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ آپ کے شوہر کی لاش کی میڈیکل رپورٹ کا تقاضا نبھانا ضروری تھا۔ اگر میں آپ کے ماضی کو نہ کھنگالتا تو اس وقت آپ سے بات کرتے ہوئے مشکل پیش آ سکتی تھی......'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سلمٰی کی آنکھوں میں جھانکا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ شدید ذہنی دباؤ کے سبب ایک سال پہلے آپ کے شوہر کی گاڑی کو ایک خوفناک حادثہ پیش آ گیا تھا؟''

''جی، یہ بالکل درست ہے۔'' سلمٰی نے اثبات میں جواب دیا۔

انسپکٹر نے سوال کیا۔ ''اس رات آپ دونوں کے بیچ جھگڑا ہوا تھا۔ نظامی کے ذہنی تناؤ کا سبب بھی یہی جھگڑا تھا۔ وہ لانگ ڈرائیو پر نکل گیا تھا پھر اس کی گاڑی ایک تیز رفتار مسافر کوچ سے ٹکرا گئی۔''

''جی...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' سلمٰی نے دھیرے سے کہا۔

''اس رات آپ دونوں میں ہونے والے جھگڑے کی وجہ پاشا نامی وہی ڈائریکٹر تھا۔'' انسپکٹر نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا شوہر آپ کے اور پاشا کے درمیان پکنے والی کھچڑی کی خوشبو سونگھ چکا تھا اور وہ آپ کو اس خطرناک کھیل سے باز رکھنا چاہتا تھا اور......''

''خدا کے لیے بس کر دیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے احتجاجی لہجے میں بولی۔ ''یہ سب ماضی کا قصہ ہے۔ نظامی کو پیش آنے والے حادثے کے بعد سب ٹھیک ہو گیا تھا اور میں نے اپنی غلطی کا احساس کر کے پاشا کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیا تھا اور...... پچھلے ایک سال سے میں دل و جان سے نظامی ہی کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ اب وہی میری زندگی کا مرکز و محور تھا۔ آپ کو میری بات کا یقین کرنا چاہیے۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں انسپکٹر صاحب!''

''ٹھیک ہے، میں نے آپ کی بات کا یقین کر لیا

میڈم!'' انسپکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی آپ نظامی کی جانب لوٹ آئی تھیں۔ اب یہ سب ماضی کا تلخ قصہ ہے جسے چھیڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''جی..... میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''لیکن میڈم.....'' انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ماضی کی داستان کو تو فراموش کرسکتا ہوں مگر حال میں پیش آنے والے عبرت ناک واقعے سے نگاہ نہیں چرا سکتا۔''

''آپ کس واقعے کا ذکر کررہے ہیں؟'' سلمیٰ نے پوچھا۔

''گزشتہ رات آپ کے شوہر فیروز نظامی کو پیش آنے والا واقعہ جب مراد علی نامی ایک سفاک قاتل نے کم و بیش دو بج کر پینتیس منٹ پر گلا گھونٹ کر نظامی کو موت کی نیند سلا دیا۔'' انسپکٹر نے کہا پھر پوچھا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''جی نہیں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کے فوراً بعد میں نے آپ کو فون کیا تھا۔''

''اور میں بھی فی الفور آپ کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔'' انسپکٹر نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''پھر آپ نے مجھے بتایا کہ مراد علی نے آپ کے شوہر کو قتل کردیا ہے۔ اور دیوار پھلانگ کر بنگلے سے فرار ہوگیا ہے؟''

''جی، جی..... جو حقیقت تھی، میں نے وہی بیان کی ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''اور آپ کو یقین ہے کہ اس سے پہلے آپ نے مراد علی کو کہیں نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔'' انسپکٹر سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اور.....'' اس نے ڈرامائی انداز میں لمحاتی توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جس وقت مراد علی، نظامی کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار رہا تھا، اس وقت آپ واش روم میں تھیں۔''

''جی..... جی ہاں.....'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''پہلے آپ نے نظامی کے چیخنے کی آواز سنی پھر نظامی کے بیڈ روم میں ہونے والی اٹھا پٹخ کی آوازیں آپ کی سماعت تک پہنچیں اور پھر نظامی کی گھٹی گھٹی آواز.....'' انسپکٹر نے پوچھا۔ ''آپ نے یہی بتایا تھا نا؟''

''جی بالکل۔ ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں فوراً واش روم سے باہر نکل آئی تھی۔ اسی وقت..... اسی وقت میں نے مراد علی کو نظامی والے بیڈ روم سے نکل کر فرار ہوتے دیکھا تھا۔''

انسپکٹر، سلمیٰ کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''رات کے دو بج کر پینتیس منٹ پر اگر آپ نے اپنے شوہر کی چیخ سنی اور اس کی گھٹی گھٹی آواز بھی آپ کی سماعت تک پہنچی۔ ازاں بعد آپ نے نظامی کے بیڈ روم میں، اس کے بیڈ پر قاتل کے خلاف اس کی مزاحمت کے آثار بھی دیکھے، تو اس کا مطلب ہے کہ ان لمحات میں نظامی زندہ تھا؟''

''جی.....!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''لیکن جب تک میں واش روم سے نکل کر نظامی کے بیڈ روم تک پہنچی، وہ شیطان نظامی کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔''

''آئی ایم رئیلی ویری سوری میڈم۔'' انسپکٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کی بات پر یقین نہیں کرسکتا۔ آپ کے مقابلے میں لاش کی میڈیکل رپورٹ میرے لیے زیادہ قابلِ اعتبار اور مستند ہے۔''

''کیا مطلب..... آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں.....؟'' سلمیٰ نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

''میں کچھ نہیں کہنا چاہ رہا۔ میڈیکل رپورٹ کو آپ تک پہنچا رہا ہوں۔'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور اس رپورٹ کے مطابق، نظامی کی موت گزشتہ رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوچکی تھی اور اس کی موت کا سبب حرکت قلب کا بند ہوجانا ہے یعنی..... جب میں پچھلی رات پہلی بار آپ کے بنگلے پر آیا تو اس وقت آپ کا شوہر زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا تھا.....''

''پ..... پتا نہیں..... آپ کس قسم کی..... باتیں کررہے ہیں.....!'' وہ دہشت زدہ نظر سے انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟''

انسپکٹر اپنی ہی دھن میں بولتا چلا تھا۔ ''اگر کسی شخص کی موت رات گیارہ بجے سے پہلے واقع ہوچکی ہو تو وہ اسی رات کے دو بج کر پینتیس منٹ پر نہ تو چیخ چلا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے گلا دبانے پر اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں برآمد ہوسکتی ہیں، قاتل کے خلاف مزاحمت کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میڈم.....''

''میرا سر چکرا رہا ہے.....'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔

''سر چکرانے کے بعد یقیناً آپ کو بے ہوش ہونے کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔'' انسپکٹر نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا بے ہوشی سے قبل یہ بھی سن لیں کہ میڈیکل

رپورٹ کے مطابق، نظامی کی موت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی ہے اور اس کا سبب وہ سلو پائزن ہے جو گزشتہ چھ سے آٹھ ماہ سے اس کے جسم میں اتارا جا رہا تھا۔ میڈیکل رپورٹ میں اس امر کی واضح طور پر نشاندہی کی گئی ہے کہ پارے کی ایک قلیل مقدار نہایت ہی خفیہ انداز میں اپنا کام مکمل کر کے ایک روز اس کے دل کی حرکت کو بند کر دیتی اور وہ موت کی نیند سو جاتا...... اور پچھلی رات ایسا ہی ہوا۔ آپ ایک سال سے اپنے شوہر کی تیمارداری کر رہی تھیں لہٰذا اس کے اندر پہنچنے والا پارا بھی آپ ہی کے ہاتھوں کی کرشمہ کاری ہے۔ آپ نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ نظامی کو موت کے منہ میں دھکیل کر اپنی خواہش کی تکمیل کرنا چاہتی تھیں...... پاشا کو پانے کی خواہش کی تکمیل۔''

سلمٰی نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکنے لگی۔ یہ اس کی شکست کا اعتراف تھا...... اقبالِ جرم تھا!

''تو گزشتہ رات نظامی دس اور گیارہ کے درمیان واقعی موت کے منہ میں چلا گیا تھا لیکن یہ بات آپ کو معلوم نہیں تھی۔'' انسپکٹر نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ نے سفاک قاتل کے واقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور نظامی کے بیڈ پر افراتفری مچا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مراد علی نے اسے قتل کر دیا ہے اور...... اس سے پہلے یقیناً آپ نے نظامی کا گلا دبانے کی کوشش بھی کی ہوگی تاکہ نظامی کی موت میں ڈرامائی رنگ بھرے جا سکیں لیکن...... آپ کے فنگر پرنٹس کہیں نہیں ملے۔ کیا آپ نے دستانے پہن کر......''

''میں نے تکیے کو نظامی کی ناک پر رکھ کر پوری قوت سے دبا دیا تھا۔'' انسپکٹر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ ''کاش مجھے پتا ہوتا کہ وہ پہلے ہی مر چکا ہے......!''

''میڈم! یہ ''کاش'' انسان کو بری طرح مروا دیتا ہے۔'' انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے منصوبے میں پوری طرح کامیاب ہو چکی تھیں۔ اگر آپ سفاک قاتل کے ہاتھوں نظامی کی موت والا سین اپنے اسکرپٹ میں شامل نہ کرتیں تو آج صبح آپ اپنے منصوبے کے مطابق بیوہ ہو چکی ہوتیں۔ پھر آپ کو پاشا کی زندگی میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا...... کوئی نہیں!''

''میری جلد بازی نے مجھے مار ڈالا۔'' وہ کفِ افسوس ملتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔ ''اگر اس منحوس مراد نے مجھے دو مرتبہ خاموش فون نہ کیا ہوتا تو میرا اس کی طرف دھیان نہ جاتا...... میں نے خوامخواہ اسکرپٹ میں اس کم بخت کردار کو شامل کیا...... آہ میری قسمت!''

''قسمت کو دوش نہ دیں میڈم!'' انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔''

''پتا نہیں، اس شیطان نے مجھے کیوں دو مرتبہ فون کیا۔ میرا نمبر اس کے پاس کیسے آیا......!''

''اس افسوس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب وہ پولیس کے ہتھے چڑھے گا تو یہ تمام سوالات اس سے پوچھ لیے جائیں گے۔'' انسپکٹر نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے، وہ بھی آپ کا کوئی فین ہو...... فینز تو اپنے آئیڈیل کا نمبر کہیں سے بھی حاصل کر لیتے ہیں۔''

''یا اللہ...... میں کیا کروں......'' وہ مریل سی آواز میں بولی۔

''آپ نے بہت کچھ کر لیا میڈم!'' انسپکٹر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''زندگی اور موت کے ڈرامے میں آپ کا کردار ختم ہو چکا۔ اب جو بھی کرنا ہے، پولیس کرے گی۔''

سلمٰی نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''انسپکٹر صاحب! کچھ ہو نہیں سکتا......؟''

''بہت کچھ ہوسکتا ہے۔'' انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''اور اس بہت کچھ کا آغاز آپ کی گرفتاری سے ہو رہا ہے...... میں ابھی اور اسی وقت آپ کو اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ امید ہے، اس سلسلے میں آپ مجھ سے تعاون کریں گی۔''

سلمٰی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ اداکاری نہیں تھی بلکہ تقدیر کے سامنے اس کی تدبیر کی شکست کا اعتراف تھا۔ اس نے متعدد ڈراموں میں ٹریجڈی سین کیے تھے اور اپنی پرفارمنس سے کردار میں حقیقت کا رنگ بھر کر ناظرین کو آبدیدہ کر دیا تھا۔ ان لمحات میں اداکاری کرتے ہوئے اس کے دل کی کیفیت نارمل رہا کرتی تھی، سارا کھیل دماغ کا ہوا کرتا تھا۔ آج وہ اوریجنل پرفارمنس دے رہی تھی مگر اس کے آنسوؤں کا انسپکٹر پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جب وقت انسان کے ہاتھ سے نکل جائے تو پھر ہر داد فریاد اور آہ و بکا بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

قدرت کے اصولوں کے برعکس چلنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے......!

منصوبہ ساز ذہن کو پڑھنا مشکل ہی نہیں کبھی کبھی ناممکن بھی ہو جاتا ہے... مختلف جہتوں میں بکھرے ذہن کی باریکیاں ایسے الجھاوے اور اصل ہدف سے بھٹکانے کے لیے وہ رکاوٹیں اور لاحاصل باتوں کا جال پھیلاتی ہیں کہ قانون کے رکھوالے ان پیچیدگیوں اور بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں... قتل کی واردات کی پُرفریب تحقیقات... قاتل سامنے تھا مگر ہنوز نظروں سے اوجھل تھا... کیس لمحہ بہ لمحہ حل ہونے کے بجائے مستقل پیچیدگیوں کی جانب گامزن تھا...

بیچ سمندر سے کنارے آلگنے والی بے پتوار کشتی کی کٹھنائیاں......

بعید از قیاس

تنویر ریاض

میں نے ویب کیمرے کے ذریعے اطلاعی گھنٹی بجانے والے شخص کو دیکھا اور جولیس کو بتایا کہ اس کے دروازے پر دستک دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ تھامس ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور شخص صبح ساڑھے نو بجے اطلاع دیے بغیر جولیس کے ٹاؤن ہاؤس پر آتا تو وہ کبھی اسے اپنے معمولات یعنی اخبار بینی اور کافی میں مداخلت کی اجازت نہ دیتا بلکہ مجھے اطلاعی گھنٹی بند کرنے کے لیے کہہ دیتا تاکہ وہ سکون سے اخبار پڑھ سکے لیکن تھامس کا معاملہ بالکل مختلف

تھا۔ چار روز قبل اس کا کاروباری شریک اینڈریو کونز ایک اپارٹمنٹ میں مردہ پایا گیا اور اس کے فوراً بعد تھامس بھی غائب ہو گیا۔ ایک جانب پولیس اس کروڑ پتی شخص کو سرگرمی سے تلاش کر رہی تھی تو دوسری طرف دونوں کاروباری شریکوں کے بارے میں مخالفت کی افواہ بھی گشت کر رہی تھی کیونکہ کونز گزشتہ تین ماہ سے تھامس کو اس کمپنی سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے بنائی تھی۔

جولیس نے اخبار نظروں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''آرچی، اگر یہ کسی قسم کی چالبازی ہے......''

''نہیں، مجھے ایسا نہیں لگتا اور اگر تم حیران ہو رہے ہو کہ کیمبرج کا سب سے زیادہ مطلب پرست شخص تمہارے دروازے پر کیا لینے آیا ہے تو میں پولیس کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ اسے گرفتار کر لیں گے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اس کی گرفتاری پر کوئی انعام رکھا ہو اور وہ تمہیں مل جائے۔''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

جیسا کہ میں نے کہا۔ تھامس کا معاملہ مختلف تھا۔ یہاں تک کہ جولیس بھی اپنا اصول توڑنے پر تیار ہو گیا جو اس نے ممکنہ گاہکوں کے بغیر اطلاع آنے پر بنا رکھا تھا۔ جولیس نے دروازہ کھولا تو میں نے پہلی بات جو نوٹ کی وہ یہ کہ تھامس نے بہت ہی گندا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر ستاون سال تھی اور میں نے اس کی جو آن لائن تصویریں دیکھی تھیں۔ ان کے مطابق وہ ایک خوش شکل شخص تھا۔ سرخ و سفید رنگت، مضبوط جبڑے، چوڑے کندھے اور سلیقے سے سنورے ہوئے بال جو کہیں کہیں سے سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس وقت جولیس کے سامنے کھڑا ہوا شخص وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور بال بے ترتیب تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی طوفان سے گزر کر آیا ہے۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کا تصویروں سے موازنہ کیا اور پہچان لیا کہ یہی تھامس ہے۔ مجھے اس کے کوٹ کی جیب سے کوئی بھاری چیز ابھری ہوئی نظر آئی۔ جولیس نے بھی اس کا نوٹس لیا اور کہا کہ کیا وہ اس گن کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔

تھامس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کچھ مضطرب نظر آ رہا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کسی وقت بھی کوئی پولیس والا آ کر اسے گرفتار کر سکتا ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم اندر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

جولیس نے ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا پھر بیرونی دروازہ بند کر کے وہ اس مفرور کروڑ پتی کو اپنے دفتر میں لے آیا اور اسے اپنی میز کے سامنے چمڑے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کرسی میں دھنس گیا تاہم اس کے چوڑے کندھے اب بھی نمایاں تھے۔

جولیس نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر تم اینڈریو کونز کے قتل کا اعتراف کرنا چاہتے ہو تو تمہیں پولیس کے پاس جانا چاہیے اور اگر تم میری خدمات اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے کسی ایسے گواہ کا بندوبست کروں جو جائے وقوعہ سے تمہاری غیر موجودگی ثابت کر سکے تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہ ہو گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور کسی وکیل سے رابطہ کرو۔''

تھامس کے جبڑے بھنچ گئے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے یہاں آنے کی یہ وجہ نہیں ہے۔'' پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ سر پر پھیرا اور بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ میں نے اینڈریو کو قتل کیا ہے یا نہیں۔''

''یہ انتہائی احمقانہ بات ہے۔'' جولیس نے بے اختیار کہا۔

''نہیں، یہ سچ ہے۔'' اس کے جبڑے مضبوطی سے بھنچ گئے۔ ''اسی لیے یہاں آیا ہوں اور یہ جاننے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی میں نے اسے قتل کیا ہے۔''

میں جولیس کو بتا سکتا تھا کہ تھامس نے جو کچھ کہا، وہ غیر معتبر ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا لیکن جولیس کا رویہ بالکل واضح تھا۔ وہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا لیکن اس نے تھامس کو کافی بھی پیش نہیں کی جس کی اسے ضرورت تھی کیونکہ وہ قاتلوں کو کھلانے پلانے کا قائل نہیں تھا۔ وہ جن نظروں سے تھامس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔

''اگر تم مجھ پر یہ واضح کرنا چاہتے ہو کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ تم جو گن لے کر یہاں آئے ہو۔ اس سے تم نے کونز کو قتل کیا یا نہیں تو ٹھیک ہے۔ میں سننے کے لیے تیار ہوں لیکن میں تمہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا اپنی ذمے داری پر کرو گے۔''

تھامس نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''اس رات میں گھر پر تھا اور میں نے معمول سے کچھ زیادہ ہی اسکاچ پی

لی۔ نصف شب کے قریب میں بالکل مدہوش ہوگیا اور جب میری آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک گلی میں پڑا ہوا پایا اور یہ ریوالور میری جیب میں تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے اوور کوٹ کی جیب سے اعشاریہ بتیس کا ریوالور نکال کر جولیس کی میز پر رکھ دیا۔ گو کہ پولیس نے ابھی تک یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ کونز کو کس سائز کے پستول سے نشانہ بنایا گیا تھا لیکن جب یہ خبر منظرِ عام پر آئی تو میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے متجسس ہوگیا اور میں نے کیمبرج پولیس کے کمپیوٹر سسٹم میں گھس کر پتا لگا لیا کہ اس واردات میں اعشاریہ بتیس کا ریوالور ہی استعمال ہوا تھا۔ یہ بات میں نے جولیس کو بھی بتادی تھی۔

''یہ کس وقت کی بات ہے؟'' جولیس نے پوچھا۔

''صبح ساڑھے چھ بجے۔ وہ گلی ان مین اسکوائر میں واقع ٹریمونٹ اسٹریٹ سے متصل ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہاں کس طرح پہنچا یا یہ گن میری جیب میں کیسے آئی۔ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جب میں نے ٹیکسی منگوانے کے لیے اپنا سیل فون نکالا تو اس پر میری بیوی کی طرف سے پیغامات دیکھے اور اسی سے اینڈریو کے قتل کے بارے میں معلوم ہوا۔ نیز یہ کہ میں پولیس کو پوچھ گچھ کے لیے مطلوب ہوں۔''

''لہٰذا تم فرار ہوگئے۔''

تھامس کا چہرہ مرجھا گیا جیسے اس نے جولیس کے تبصرے کو حقیقت کے بجائے ایک الزام سمجھا ہو۔ ''میں گھبرا گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی جو یقیناً شرمندگی کی علامت تھی۔ ''مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں رہا یا میں نے کیا کیا اور جب مجھے معلوم ہوا کہ اینڈریو کا قتل ہوگیا ہے اور آلۂ قتل میرے کوٹ کی جیب میں ہے تو میں کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں مجھے تنہائی میسر ہو اور میں یہ یاد کرنے کی کوشش کروں کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ یقیناً میں فوری طور پر پولیس کے سوالوں کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ مجھے خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس طرح کے حالات میں یہی محسوس کرتا۔ ہاں، میں فرار ہوگیا۔ میں نے مین، جانے کے لیے کمپنی کی ایک کار استعمال کی جہاں ایک کیبن میں چار دن گزارے اور اپنے دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں نے کیا کیا ہے۔''

''یہ بھی مکمل طور پر بعید از قیاس ہے۔''

تھامس نے جولیس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور بولا۔ ''جو کچھ ہوا۔ وہ میں نے بتا دیا۔ اب میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔ اگر میں قتل کر کے فرار ہوتا تو اس گن کو مین کے قریب کسی جنگل میں پھینک دیتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔ اگر میں نے اینڈریو کو قتل کیا ہے تو نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ واقعی میں نے یہ قتل کیا ہے گو کہ میں اس سے نفرت کرتا تھا لیکن کسی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ چاہے وہ اینڈریو ہی کیوں نہ ہو۔''

''اگر تم نے اسے قتل نہیں کیا تو تمہارے پاس یہ گن کیوں ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے کسی ایسے شخص کو فون کیا ہو جو اینڈریو سے مجھ جیسی نفرت کرتا ہو۔ اس نے اینڈریو کو قتل کرنے کے بعد گن میری جیب میں ڈال دی ہو اور مجھے گلی میں پھینک کر فرار ہوگیا ہو۔''

دس سیکنڈ تک جولیس بے حس و حرکت بیٹھا تھامس کو دیکھتا رہا پھر اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے میز پر طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ٹاؤن ہاؤس پر بم حملے کے بعد اس نے اس کی تعمیرِ نو کر لی تھی۔ دوستوں، پرانے گاہکوں اور نمایاں شخصیات نے اسے اپنا نیا بار بنانے کے لیے بہترین قسم کی شراب بھیجی تھی لیکن وہ اب بھی اپنی پسندیدہ شراب کی کمی محسوس کر رہا تھا اور اس کے لیے اسے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی جو تھامس سے ملنے والی فیس کی صورت میں پوری ہوسکتی تھی۔ اچانک ہی اس نے طبلہ بجانا بند کر دیا اور کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد بولا۔

''مسٹر تھامس! جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ یہ کیس میرے لیے بدترین دردِ سر ثابت ہوگا۔ میں چند شرائط پر یہ کیس لینے کے لیے تیار ہوں۔ پہلی یہ کہ میرا معاوضہ ایک لاکھ ڈالرز ہوگا۔ چاہے میری تحقیقات ایک منٹ میں مکمل ہو جائے یا ایک سال تک چلتی رہے۔''

تھامس سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''منظور۔''

''میرا کام صرف یہ دریافت کرنے تک محدود ہوگا کہ کیا تم نے اینڈریو کو قتل کیا ہے یا نہیں اور میں اپنی رپورٹ تمہیں اور پولیس دونوں کو دوں گا۔ اگر تم نے کونز کو قتل نہیں کیا اور میں اپنی تحقیقات کے نتیجے میں اصل قاتل کو شناخت کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی رپورٹ بھی دوں گا لیکن اس قتل کا معما حل کرنے کا ذمے دار نہیں ہوں۔''

تھامس کچھ نہیں بولا لیکن سر ہلا کر اپنی رضامندی

ظاہر کردی۔

''یہ پستول ضائع نہیں کیا جائے گا اور اگر پہلے نہیں تو کم از کم اس وقت تک جب میں اپنی تحقیقات مکمل کرلوں۔ اسے پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔''

''منظور ہے۔''

''میں براہِ راست تمہارے لیے کام نہیں کروں گا بلکہ میرا رابطہ اس وکیل سے ہوگا جو تمہاری نمائندگی کرے گا۔''

اس نے آخری شرط بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے ابھی تک کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کی ہیں تو میں ہنری زیک کا نام تجویز کروں گا۔ ماضی میں بھی اس سے کئی مرتبہ کام لے چکا ہوں اور وہ پہلے سے فرض کیے ہوئے بے گناہوں کو جیل سے باہر رکھنے میں ماہر ہے۔''

''میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ میرے وکیل کا بندوبست کرو۔'' تھامس ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے ہے۔'' جولیس نے کہا۔ ''میں کسی وکیل کی طرح اپنے کلائنٹ کی رازداری کا تحفظ نہیں کرسکتا اور نہ ہی مجھے اس کی پروا ہوگی۔ میں جو کچھ بھی دریافت کروں گا وہ پولیس کو معلوم ہوجائے گا لیکن وکیل کے بیچ میں آجانے سے رازداری قائم رہے گی۔ اگر تم براہِ راست میری خدمات حاصل کروگے تو میں مجبور ہوں گا کہ پولیس کو اس گن کے بارے میں بتا دوں جس سے اس معاملے کی تحقیقات کرنے کے لیے میری صلاحیت کو نقصان پہنچے گا۔ اس کے علاوہ پولیس مجھے ہراساں کرسکتی ہے اس لیے اس آخری شرط پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔''

تھامس کے جبڑے مزید آدھا انچ پھیل گئے لیکن اس نے جولیس کی شرائط پر رضامندی ظاہر کردی۔ اس کے بعد جولیس کے دل میں تھامس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگیا کیونکہ جب وہ ہنری زیک کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جولیس اسے دفتر میں اکیلا چھوڑ کر اس کے لیے کافی اور پیسٹری وغیرہ کا انتظام کرنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا کہ تھامس نے جو کہانی بیان کی ہے اس میں کتنا سچ ہے۔ مجھے اس میں کئی جھول نظر آئے۔ مثلاً یہ کہ وہ نشے میں مدہوش تھا اور اس نے کسی کو فون کیا کہ وہ اسے گھر لے جائے اور اسے اس بارے میں کچھ یاد نہیں یا بعد میں اس نے جو کچھ کیا، یہ سب باتیں میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھیں۔ میں نے اس کے گھر کا فون چیک کیا تو جس رات کونز کا قتل ہوا۔ وہاں سے تین فون کالز ہوئی تھیں۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ یہ ٹیلی فون اس نے کیے یا اس کی بیوی نے۔

جب میں نے جولیس کو ان تین لوگوں کے نام بتائے جنہیں یہ ٹیلی فون کیے گئے تھے تو اس نے جواب دینے کے بجائے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ایک بار پھر اپنی بات دہرائی کہ یہ سب کچھ بعید از قیاس ہے گو کہ اب اس میں پہلے جیسا یقین نہیں تھا۔

''یہ کافی نہیں ہے آرچی۔'' اس طرح کے کیسز میں لوگ مدہوش ہونے کا دعویٰ کرتے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں کچھ یاد نہیں رہا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔''

اس سے پہلے کہ میں مزید بحث کرتا اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے ویب کام پر چیک کیا۔ دروازے پر ہنری زیک کھڑا ہوا تھا۔ میں نے جولیس کو اس کی آمد کی اطلاع دی تو وہ خود اسے لینے چلا گیا۔ جب وہ اس کے ساتھ کچن میں واپس آیا تو ناشتے کی تیاری کے دوران اس نے ہنری کو تھامس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جو دعویٰ کر رہا تھا کہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک گلی میں پایا اور امکانی آلۂ قتل اس کے کوٹ کی جیب میں تھا۔ اس دوران ہنری پوری ایک پیسٹری اپنے حلق میں اتار چکا تھا جو اس نے چکھنے کے بہانے اٹھائی تھی۔

''میں جانتا ہوں۔'' جولیس نے ہنری کو پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ مکمل طور پر بعید از قیاس ہے۔''

ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً تم قانونی معاملات میرے حوالے کرکے زندگی کو دلچسپ بنا دیتے ہو۔''

جولیس نے ایک ٹرے میں کافی اور پیسٹریاں رکھیں اور ہنری کو لے کر اپنے دفتر میں چلا گیا۔ تھامس بدستور کرسی میں دھنسا ہوا بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جب جولیس نے اسے کافی اور پیسٹری پیش کی تو اس نے بمشکل اپنا سر اٹھایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کافی کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ رسمی تعارف کے بعد ہنری نے تھامس سے سرگوشیوں میں باتیں کرنا شروع کردیں اور جولیس نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس طرح آنکھیں بند کرلیں جیسے سو رہا ہو لیکن وہ ان کی ساری باتیں سن رہا تھا۔ پہلے تو ہنری نے تھامس کو باز رکھنے کی کوشش کی کہ وہ جولیس کی خدمات حاصل نہ کرے۔ کیونکہ کوئی ہوشیار وکیل اس کا یہ مطالبہ نہیں مان سکتا کہ وہ اپنی تحقیقات کے نتیجے سے پولیس

کو ضرور مطلع کرے گا چاہے وہ کچھ بھی ہو۔ جب وہ اس میں ناکام ہو گیا تو اس نے اپنی فیس کا سوال اٹھا دیا۔ تھوڑی سی بحث کے بعد وہ ایک معاہدے پر متفق ہو گئے اور ہنری نے جولیس کو بتا دیا کہ وہ تھامس کے لیے کام شروع کرنے پر تیار ہے۔ تبھی جولیس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''میرے قانونی مشورے کے باوجود مسٹر تھامس کا اصرار ہے کہ میں اس تحقیقات کے لیے تمہاری خدمات حاصل کروں جس کے بارے میں تم دونوں پہلے ہی گفتگو کر چکے ہو۔'' ہنری نے رسماً کہا۔

''اور یہ ان شرائط کے تحت ہو گی جو میں بتا چکا ہوں۔''

''ہاں۔''

تھامس نے اپنی جیب سے چیک بک نکالی اور وہ چیک لکھنے ہی والا تھا کہ جولیس نے اسے روک دیا اور کہا کہ اس کے بجائے وہ معاوضے کی رقم براہ راست اس کے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دے۔ تھامس نے ٹیلی فون کے ذریعے ہدایات دیں اور دس منٹ بعد میں نے جولیس کو بتا دیا کہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ ڈالر منتقل ہو چکے ہیں۔

''تو پھر ٹھیک ہے'' جولیس نے ہنری سے کہا۔ ''یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کہ مسٹر تھامس نے سامنے آنے میں اتنی دیر لگائی۔ اگر انہیں کوئی نشہ آور شے دی گئی تھی تو ان کے معدے میں اس کے اثرات موجود ہوں گے۔ تمہیں ان کی بچی ہوئی اسکاچ کے ٹیسٹ کا بندوبست کرنا ہو گا۔''

گویا ایک طرح سے جولیس نے میری بات مان لی تھی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کے خیال میں تھامس جھوٹ بول رہا تھا بلکہ اسے شک تھا کہ اس کی شراب میں منشیات ملا دی گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ ہنری کوئی جواب دیتا۔ تھامس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کسی چیز کا ٹیسٹ کروانے کی ضرورت نہیں، مجھے کوئی نشہ آور دوا نہیں دی گئی تھی۔''

''تم یقین سے کہہ سکتے ہو۔'' جولیس نے کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس کی بات سے قائل نہیں ہوا۔

''ہاں، یہ پہلی بار نہیں ہوا کہ میں مدہوش ہو گیا ہوں۔'' تھامس نے کہا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے اس نے کوئی کڑوی چیز چکھ لی ہو پھر وہ نیچی آواز میں بولا۔ ''اس سے پہلے بھی دو مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ پہلی بار اس وقت جب میں کالج میں تھا اور دوسری مرتبہ جب میں اپنی دوسری بیوی سے شادی کرنے والا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تینوں مرتبہ الکحل کے ساتھ ساتھ ذہنی دباؤ بھی اس کا اہم عنصر تھا۔''

''کیا چار دن پہلے تمہیں کسی ایسے ذہنی دباؤ سے واسطہ پڑا جو کونر کی ان کوششوں کے علاوہ ہو جو وہ تمہیں کمپنی سے ہٹانے کے لیے کر رہا تھا؟''

تھامس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''وقتی طور پر میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ تمہاری شراب میں ملاوٹ کی گئی تھی۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری بیوی کے علاوہ باہر کے کسی فرد کی بھی ان بوتلوں تک رسائی ہے؟''

''میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔''

ہنری جانتا تھا کہ جولیس پوری بات سمجھ چکا ہے۔ جس انداز سے اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کرسی کے ہتھے پر طبلہ بجانا شروع کیا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ اس کیس اور تھامس کے بارے میں سب کچھ جان چکا ہے۔

''مسٹر، جولیس کے سوال کا جواب دو۔'' ہنری کاٹ کھانے کے انداز میں بولا۔ وہ تریسٹھ سال کی عمر میں بھی مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ چھ انچ اور وزن ایک سو چالیس پونڈ تھا۔ اگر وہ تھامس کو ایک ہاتھ مار دیتا تو اسے زمین سے اٹھنے میں کم از کم پانچ منٹ لگ جاتے۔ اسی لیے اس نے ہنری کی بات ماننے میں عافیت جانی اور اعتراف کیا کہ جس رات کونر کا قتل ہوا، تین افراد اس کے مکان پر آئے تھے اور ان میں سے کوئی ایک اس کی اسکاچ میں منشیات ملا سکتا ہے۔ جب اس نے ان تین آدمیوں کے نام بتائے تو میں چونک پڑا۔ یہ وہی تینوں افراد تھے جن سے تھامس نے نصف شب کے بعد ٹیلی فون پر بات کی تھی جس رات کونر کا قتل ہوا تھا۔

جینی مارٹن، اس کی کمپنی میں وائس پریذیڈنٹ سیلز ہے۔'' میں نے جولیس کو بتایا۔ دوسرا نام سالومن نامنگرین کا تھا جو وائس پریذیڈنٹ مارکیٹنگ تھا اور حالیہ کاروباری مضامین سے اندازہ ہوتا تھا کہ کونر ان دونوں کو بھی کمپنی سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ البتہ میں ڈینیئل سلیٹری کے بارے میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

''اس ملاقات کا مقصد کیا تھا؟'' جولیس نے پوچھا۔

''اینڈریو، جینی اور سالومن کو بھی ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔'' تھامس نے کہا۔ ''ڈینیئل نے چند روز قبل مجھ سے رابطہ کر کے مدد کی پیشکش کی تھی حالانکہ کئی برس پہلے اس کے اینڈریو سے اچھے تعلقات تھے۔ ہم نے یہ ملاقات اسی لیے کی تھی تاکہ اینڈریو کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے

کوئی حکمتِ عملی تیار کر سکیں۔‘‘ اس نے ایک کمزور سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔ ’’ہم نے ایک آپشن کے طور پر اینڈریو کو قتل کرنے کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ اگر تم ایسا سوچ رہے ہو تو یہ غلط ہے۔‘‘

’’تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟‘‘ جولیس نے پوچھا۔

’’تمہیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔‘‘ تھامس نے ناگواری سے کہا۔

’’میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔ ایک شخص تمہاری کمپنی پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ تم میں سے ایک کو بہت بڑا مالی نقصان پہنچا چکا تھا اور باقی لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسا کہ تم نے پہلے کہا کہ اس سے نفرت کرتے تھے اور مجھے یقین ہے کہ بقیہ تینوں بھی اسے پسند نہیں کرتے ہوں گے پھر اس کے قتل کے بارے میں گفتگو کیوں نہیں ہوئی؟‘‘

تھامس چند سیکنڈ تک منہ کھولے جولیس کو دیکھتا رہا پھر منہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔‘‘

جولیس نے اچانک ہی سوالوں کا رخ تبدیل کر کے اس کی موجودہ بیوی کی طرف کر دیا۔ اس وقت تک میں ایلس تھامس کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس سال تھی اور وہ تھامس کی دوسری بیوی سے سات سال چھوٹی اور کہیں زیادہ پُرکشش تھی۔ اس عورت سے شادی کرنے کی خاطر تھامس نے تین سال قبل دوسری بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ تھامس نے اعتراف کیا کہ ایلس کے پاس کونر کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ان دونوں کے درمیان بہت اچھے تعلقات تھے اور یہ کہ جولیس اس کی بیوی کو اس معاملے میں ملوث کر کے اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔‘‘

’’اس رات تمہاری بیوی کہاں تھی؟‘‘

تھامس نے ایک بار پھر بُرا سا منہ بنایا جیسے اس نے کوئی کڑوا گھونٹ لے لیا ہو اور بولا۔ ’’وہ گھر پر ہی ہو گی، میں نہیں جانتا۔ اس رات میں سیدھا بار میں چلا گیا تھا اور چالیس سال پرانی شراب سے شغل کرنے لگا جس کی سیل میں نے ایک رات قبل ہی کھولی تھی۔‘‘

جولیس نے مزید سوالات کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ کر سکا۔ بالآخر وہ اور ہنری اسے دفتر میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تا کہ آئندہ اقدامات کی منصوبہ بندی کر سکیں۔

ہنری اور تھامس کے جانے کے بعد جولیس نے مجھ سے کہا کہ فون کر کے ٹام ڈرکن کی دستیابی کے بارے میں معلوم کروں۔ وہ اس وقت مارکیٹ میں بہترین پرائیویٹ سراغ رساں تھا۔ جب میرا رابطہ ہوا تو اس نے ایک منٹ سوچنے کے بعد اپنی دستیابی ظاہر کر دی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فی الوقت کسی کام میں مصروف ہے اور اندازہ لگا رہا ہو گا کہ وہ کس طرح جولیس کے لیے وقت نکال سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ اس پوزیشن میں تھا کہ جولیس کے لیے کام کر سکے۔ میں نے جولیس سے اس کا رابطہ کروا دیا اور اس نے ٹام کو اس کے کام کے بارے میں تفصیل بتا دی پھر جولیس کے کہنے پر میں نے اس کی ایک اور پرائیویٹ سراغ رساں سام پینزر سے بات کروائی جو کم و بیش ٹام جیسا ہی ہوشیار اور معروف تھا۔ اس نے بھی اپنی معروفیت کے باوجود جولیس کے لیے کام کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

جولیس نے ان دونوں کو نا کام بتائے، انہیں سننے کے بعد میں سمجھ گیا کہ وہ کس نظریے کے تحت کام کر رہا ہے اور اس کی معقول وجہ موجود تھی۔ اگر واقعی اس رات تھامس کو نشہ آور دوا دی گئی تھی۔ اس مفروضے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے نقلی ماڈل بنانا شروع کر دیے گو کہ میرے پاس محدود اعداد و شمار تھے لیکن ان کا تجزیہ کر کے میں اس قابل ہو گیا کہ کچھ نتائج اخذ کر سکوں۔ ابھی میں اس پر کام کر ہی رہا تھا کہ سترہ منٹ بعد ہنری کا فون آیا۔

’’میں نے وہ گن بحفاظت اپنی سیف میں رکھ دی ہے۔‘‘ اس نے جولیس سے کہا۔ ’’اور اپنے موکل کی مدد سے میں ان لوگوں سے تمہاری ملاقات کا بندوبست کرنے کے قابل ہو گیا ہوں جن کے لیے تم نے کہا تھا۔‘‘ ہنری نے جولیس کو بتایا کہ وہ چاروں مشتبہ افراد کن اوقات میں باری باری جولیس سے ملنے اس کے دفتر آئیں گے۔‘‘

اس فون کال کے اکیس منٹ بعد ٹام نے فون کر کے بتایا کہ اسکاچ کی وہ بوتل غائب ہے جس میں منشیات کی ملاوٹ کا امکان ہو سکتا تھا۔ ’’وہ بوتل گھر میں ہے اور نہ ہی کوڑے دان میں۔ جبکہ اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ اسے اس بوتل کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔‘‘

’’مجھے ان دونوں باتوں کی توقع تھی۔‘‘ جولیس نے کہا۔

’’ہاں، بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا۔ اب میں تمہاری ہدایت کے مطابق دوسرا قدم اٹھانے والا ہوں، امید ہے کہ

اس بار قسمت ساتھ دے گی۔“

”تمہارا وقت ضائع نہیں ہوا تام۔ ہمارے لیے یہ جاننا بھی اہم ہے کہ وہ بوتل نہیں مل رہی۔“

مجھے اس بارے میں جولیس سے اتفاق کرنا پڑا۔ یہ امکان موجود تھا کہ تھامس زیادہ پینے کی وجہ سے مدہوش ہو گیا ہو جیسا کہ اس کا خیال تھا اور گھر سے نکلتے وقت بوتل بھی ساتھ لے گیا ہو۔ یہ اشارے بڑے واضح تھے کہ جس کسی نے بھی اس رات تھامس کو اٹھایا ہو، وہ بوتل بھی ساتھ لے گیا ہو لیکن میں نے جولیس کو یہ بات نہیں بتائی۔

ایک گھنٹا اور چودہ منٹ بعد ہنری نے دوبارہ فون کر کے جولیس کو بتایا کہ جس آتش بازی کی وہ توقع کر رہا تھا، وہ اس سے بھی زیادہ دھماکا خیز ثابت ہوئی جس کا جولیس نے تصور کیا تھا۔ اس نے بتایا۔ ”منصوبے کے مطابق میں نے اپنے مؤکل کو کیمبرج پولیس کے حوالے کر دیا اور سراغ رساں کریمر کو مطلع کیا کہ تم اینڈریو کونر کے قتل کی تحقیقات کر رہے ہو اور اس کا جو بھی نتیجہ سامنے آیا، اس کی رپورٹ پولیس کو بھی دو گے۔ لیکن اس وقت تک میرا مؤکل پولیس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔ یہ سنتے ہی سراغ رساں کریمر کا چہرہ سیکنڈوں میں سرخ سے سفید اور پھر نارنجی ہو گیا۔ اس نے بلند آواز میں دھمکیاں بھی دیں لیکن بالآخر میرے مؤکل کو رہا کر دیا۔ اب تمہیں آنے والے واقعات کے لیے خود کو تیار کر لینا چاہیے۔“

جولیس نے اس انتباہ کے لیے ہنری کا شکریہ ادا کیا اور اپنے لیے کافی تیار کرنے کی غرض سے کچن کی جانب چل دیا۔ کیمبرج پولیس اسٹیشن سے جولیس کے ٹاؤن ہاؤس کا فاصلہ صرف ڈھائی میل تھا اور ٹریفک کی وجہ سے کریمر کو یہاں پہنچنے میں کم از کم دس منٹ ضرور لگتے لیکن شاید وہ تمام سگنل توڑتا ہوا آیا تھا۔ ابھی کافی تیار ہونے سے پہلے وہ جولیس کے دروازے پر موجود تھا۔ میں نے ویب کیم کو دیکھ کر جولیس کو بتایا۔ ”وہ کافی غصے میں نظر آ رہا ہے۔“

جولیس نے حلق سے ہلکی سی غراہٹ نکالی اور دروازہ کھولنے چلا گیا۔ باہر کریمر کھڑا زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ پہلے تو یوں لگا جیسے وہ بہت ناراض ہے۔ اس نے کوئی بات کرنے کے بجائے اپنی انگلی اٹھائی جیسے وہ اسے جولیس کے سینے میں گھونپ دے گا اور یہ اس کی غلطی ہو گی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کی انگلی کئی جگہ سے ٹوٹ جاتی کیونکہ جولیس نے کنگ فو میں بلیک بیلٹ جیتی ہوئی تھی۔ میں اسے کئی مرتبہ ایکشن میں دیکھ چکا تھا اور اس کی مہارت سے واقف تھا۔

تاہم کریمر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”میں دیکھ لوں گا۔ اس تازہ ترین حرکت کے بعد تم اپنے لائسنس سے محروم ہو جاؤ گے۔“

”یہ بے معنی بات ہے۔“ جولیس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم پسند کرو تو ہم دونوں یہاں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دھمکیاں دیتے رہیں گے۔ تم میرا لائسنس منسوخ کرنے کی دھمکی دو گے تو میں بھی تم پر ہراساں کرنے کا الزام لگا دوں گا لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اس کے بجائے اگر تم مہذب انداز میں گفتگو کرنا چاہو تو مجھے خوشی ہو گی کہ تمہیں اپنے ساتھ کافی میں شریک کروں۔“

کریمر شش و پنج میں پڑ گیا۔ جس انداز سے وہ جوش دکھا رہا تھا، اس میں وہ جولیس سے یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی کافی پر لعنت بھیجتا ہے لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ جولیس دروازہ بند کر دے اور اس کے پاس اندر آنے کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہ رہے۔ وہ دل پر جبر کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ جیسا تم کہو۔“

جولیس اسے اپنے کچن میں لے آیا۔ وہ اس کے لیے کافی نکال رہا تھا لیکن کریمر سے صبر نہ ہو سکا اور وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم پوچھ گچھ کے لیے تھامس کو تلاش کر رہے تھے۔ جب وہ تمہارے دروازے پر آیا تو یہ تمہارا فرض تھا کہ پولیس کو اس کی اطلاع دیتے۔“

جولیس نے اسے کافی پکڑاتے ہوئے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ مسٹر تھامس نے اپنے وکیل کے بجائے مجھ سے رابطہ کیا تھا؟“

”اگر ایسا ہے تب بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہنری تمہارا آدمی ہے۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہنری زیک دوسرے مؤکلوں کے لیے بھی کام کرتا ہے لیکن اگر مسٹر تھامس نے پہلے مجھ سے رابطہ کر لیا جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو، تب بھی یہ میری قانونی ذمے داری نہیں تھی کہ تم سے رابطہ کروں اور جیسا کہ تم جانتے ہو جب سے اس کے وکیل نے میری خدمات حاصل کی ہیں تو مجھ پر بھی لازم ہو گیا ہے کہ اپنے مؤکل کی رازداری کا تحفظ کروں۔“

اس وقت کریمر کا چہرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ غصے سے اپنے ناخن چباتے ہوئے بولا۔ ”اس نے تمہیں بتایا ہو گا کہ کس طرح کونر کو قتل کیا اور اب تم اسے اس الزام سے بچانے کا راستہ تلاش کر رہے ہو؟“

”میں ایسا کیوں کروں گا؟“
”ظاہر ہے کہ پیسوں کے لیے تاکہ تمہاری شہرت میں اضافہ ہو اور تمہارا نام اخبارات کی شہ سرخیوں میں آئے کیونکہ کئی مہینوں سے تم نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔“
”بالکل فضول بات ہے جبکہ مجھے یقین ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اس وقت تم غصے میں ہو اور تمہیں ڈر ہے کہ تھامس ..... نے مجھے وہ معلومات فراہم کر دی ہیں جو تمہارے پاس نہیں ہیں لیکن میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس مجھ سے زیادہ معلومات ہیں جس میں فارنسک رپورٹ اور گواہوں کے بیانات بھی شامل ہیں۔ میں یہ بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کسی قاتل کو سزا سے بچانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اسی لیے میں نے اصرار کیا تھا کہ تحقیقات کا جو بھی نتیجہ آئے گا، اس سے تھامس کے علاوہ پولیس کو بھی آگاہ کروں گا خواہ وہ مجرم ہو یا بے گناہ۔“
کریمر نے مشتبہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کوئی بھی وکیل ایسی شرط قبول نہیں کر سکتا۔“
جولیس نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے وہ معاہدہ نکالا جو اس نے ہنری سے کیا تھا اور اسے کریمر کو پکڑا دیا۔
”کیا یہ کسی قسم کا کوئی مذاق ہے؟“ کریمر نے کہا۔ اس کی آواز میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔
”نہیں، یہ حقیقت ہے۔ تم خود دیکھ سکتے ہو۔“
”تم یہ نہیں بتا سکتے کہ تھامس نے آج تم سے کیا کہا تھا؟“
”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“
جولیس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پوری امید ہے کہ پہلے سے موجود ڈھیر سارے ثبوتوں کی بنیاد پر تم کونر کے قاتل کو پکڑ لو گے۔ اس سے پہلے کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ جیسا کہ تم نے معاہدے میں دیکھا ہوگا کہ اس کے باوجود مجھے معاوضے کی ادائیگی ہو چکی ہے۔“
کریمر کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ البتہ اس کے غصے میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اس کا بہت کم امکان ہے۔ جب تک یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ اس نے تمہیں کیا بتایا ہے۔“
”اگر ہم دونوں صرف ان معلومات پر انحصار کریں جو تھامس نے مجھے دی ہیں تو یہ کیس کبھی حل نہیں ہوگا۔“
”اس کے جانے کے بعد میں نے جولیس سے کہا۔
”اگر تم کریمر کو اسکاچ کی گم شدہ بوتل اور تھامس کی جیب میں ڈالے گئے آلۂ قتل کے بارے میں بتا دیتے تو تمہیں کوئی نقصان نہ ہوتا۔“
”میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ پولیس کے پاس تمام فارنسک ثبوت موجود ہیں جن سے قاتل کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ ان کے پاس اتنے لوگ ہیں جو شہادتیں اکٹھی کر سکیں اور ان کی رسائی قریب میں لگے ہوئے ویڈیو کیمروں تک بھی ہے جنہوں نے قاتل کی تصویر محفوظ کر لی ہوگی۔ مجھے تو یہ بھی شبہ ہے کہ کہیں تھامس پہلے پولیس کے پاس نہ چلا گیا ہو اور اسے بھی وہی کہانی سنائی ہو جو اس نے میرے سامنے بیان کی تھی لہٰذا میرے نہ بتانے سے انہیں کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ اس نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔“
جولیس شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر تھامس نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں تو پولیس کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جولیس کو کچھ معلومات درکار تھیں۔ مثلاً جو گن استعمال کی گئی اس کا سائز کیا تھا۔ جس اپارٹمنٹ میں قتل ہوا اس کا پتا۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی باتیں جن تک میری رسائی نہیں ہو سکی اور اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ ابھی تک پولیس نے فارنسک ڈیٹا اور گواہوں کے بیانات کو اپنے کمپیوٹر سسٹم میں نہیں ڈالا تھا۔ شاید اسی لیے جولیس نے دن میں کئی مرتبہ بعید از قیاس کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید بحث کرتا۔ دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی بجی اور میں نے کیمرے کی آنکھ سے دیکھ کر جولیس کو ڈینیل سلیٹری کے آنے کی اطلاع دی۔ ”وہ سترہ منٹ پہلے آگیا ہے۔ کیا میں اسے انتظار کرنے کے لیے کہوں؟“
جولیس نے برا سا منہ بنایا۔ ایک ایسے شخص سے جس پر قتل کا شبہ ہو، مقررہ وقت سے پہلے ملنا، منہ کا مزہ خراب کرنے کے مترادف تھا لیکن اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”نہیں آرچی، اس کی ضرورت نہیں۔“
ڈینیل کی عمر انچاس برس تھی اور اس کا قد جولیس سے تین انچ کم تھا۔ اس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ”جب تھامس نے تم سے ملنے کے لیے کہا تو میں اس سے کہنے والا تھا کہ جہنم میں جاؤ لیکن اس کے بجائے میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تاکہ یہی بات تمہارے منہ پر کہہ سکوں۔“
جولیس ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ”اس کے لیے تمہیں کافی زحمت اٹھانا پڑی۔ تم یہی بات فون پر بھی کہہ سکتے تھے۔“
ڈینیل کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میرا

خیال تھا کہ وہ الٹے قدموں واپس چلا جائے گا اور جولیس بھی شاید ایسا ہی کرے لیکن میرے دس تک گنتی گننے کے بعد بھی وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جولیس نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ”کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گے کہ کونز سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“

”میں بے وقوف نہیں ہوں۔“ ڈینیئل نے کہا۔ ”تھامس نے تمہاری خدمات اس لیے حاصل کی ہیں کہ کونز کے قتل کا الزام اپنے بجائے کسی اور پر ڈال دے اور تم نے مجھے یہاں اس لیے بلایا ہے کہ میں وہ رسی تمہیں دے دوں جس سے تم مجھے اپنے طور پر پھانسی دے سکو۔“

میرا خیال تھا جولیس کہے گا کہ اس کے باوجود تم ابھی تک میرے دروازے پر کھڑے ہوئے ہو لیکن اس کے بجائے اس نے کہا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ میری خدمات حقائق معلوم کرنے کے لیے حاصل کی گئی ہوں۔“

”میں نہیں مانتا۔“

”اگر تمہاری بات مان لی جائے تو بظاہر تم پر ہی شک کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے نفرت کرتے تھے۔“

ڈینیئل برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے یہ بات کبھی نہیں چھپائی۔ اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اس کے بعد میرے پاس اس سے نفرت کرنے کا جواز تھا۔ جب تھامس نے مجھ سے مشورہ مانگا کہ کس طرح کونز کو قابو کیا جائے تو میں نے کہا کہ اس کے دل میں کوئی نکیلی چیز گھونپ دو اور میں بخوشی اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے بڑی مسرت ہوئی جب میں نے سنا کہ ایک گولی نے اپنا کام دکھا دیا۔“

جولیس نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ”تھامس...... نے قتل والی رات تمہیں کس سلسلے میں فون کیا تھا؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ وہ نشے میں بے معنی گفتگو کر رہا تھا۔ اگر مزید جاننا چاہتے ہو تو اسی سے پوچھ لو، کیا ہماری گفتگو ختم ہو گئی؟“

جولیس نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر تمہارے پاس ایسا کوئی گواہ موجود ہے جو جائے وقوعہ سے تمہاری غیر موجودگی ثابت کر سکے تو تم نے ابھی تک اس کا ذکر نہیں کیا۔ تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ جس رات کونز کا قتل ہوا تم 432 ایلم اسٹریٹ نہیں گئے تھے۔“

میں یہ سن کر چونک گیا کہ جولیس نے اس اپارٹمنٹ کا مختلف پتا کیوں بتایا جہاں کونز کا قتل ہوا تھا۔ میں نے ڈینیئل کا ردعمل دیکھا۔ وہ تقریباً جولیس کی تصحیح کرنے ہی والا تھا کہ آخری لمحے پر اس نے اپنے آپ کو روک لیا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو جو وہ پہلے ہی کر چکا تھا جب اس کا زرد چہرہ دودھ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ جولیس نے کہا تو ڈینیئل بناوٹی انداز میں مسکرایا لیکن اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چل دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”یہ جانتا ہے کہ کونز کو کہاں قتل کیا گیا اور تمہیں صحیح پتا بتانے ہی والا تھا اور تمہیں اس پر بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ پولیس نے ابھی تک اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ وہ کتنی آسانی سے اپنے آپ کو فریب دینے میں کامیاب ہو گیا۔“ جولیس بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”یہ شخص بے وقوف ہے۔“

میں نے جولیس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگلے ملاقاتی کو دو بجے آنا تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنے طور پر ڈینیئل اور آلۂ قتل کے درمیان تعلق معلوم کرنے کی کوشش کروں لیکن جینی مارٹن کے آنے تک میں اس بارے میں کچھ نہ جان سکا۔ وہ وقت پر آگئی تھی اور مجھے اس کے چہرے پر کوئی بناوٹی مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ اس نے اس طرح بلائے جانے پر کوئی خفگی ظاہر نہیں کی اور شور شرابہ کیے بغیر جولین کے دفتر میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کی عمر چھتیس سال، قد پانچ فٹ پانچ انچ اور وزن ایک سو پندرہ پاؤنڈ تھا۔ وہ کسی اداکارہ کی طرح پرکشش نظر آرہی تھی اور مجھے اس میں ہالی وڈ اداکارہ گائنتھ پالٹرو کی مشابہت نظر آئی۔ جولیس نے اس کے ساتھ نسبتاً نرم رویہ اختیار کیا اور اسے کافی کی پیشکش کی لیکن اس نے انکار کر دیا جو میرے خیال میں ایک غلطی تھی۔ کافی پینے سے اس کے اعصاب کو سکون مل سکتا تھا کیونکہ وہ گھبراہٹ کے عالم میں ہاتھوں کی انگلیوں کو کھینچ رہی تھی۔

جولیس اپنی کرسی پر بیٹھا خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جب اس نے دوبارہ اپنی انگلیوں کو کھینچا تو وہ بولا۔ ”مس مارٹن، میں ضرورت سے زیادہ تمہارا وقت نہیں لوں گا۔ اس لیے براہِ راست سوال کر رہا ہوں کہ کیا تم نے اینڈریو کونز کو قتل کیا ہے؟“

اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”نہیں۔“

”کیا تھامس نے اسے قتل کیا؟“

”میں...... میں نہیں جانتی۔“

”اس نے تمہیں اس رات فون کیا تھا؟“

جینی نے الجھے ہوئے انداز میں جولیس کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"پلیز مس مارٹن۔ جو کچھ ٹیلی فون ریکارڈ سے ثابت ہو چکا ہے اس سے انکار کر کے میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اس ریکارڈ کے مطابق تھامس کے گھر سے تمہیں چار منٹ اور اڑتیس سیکنڈ دورانیہ کی کال کی گئی تھی۔"

ایک لمحے کے لیے وہ خوف زدہ نظر آئی پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ "اس کی بیوی نے فون کیا تھا۔"

"کس سلسلے میں؟"

"وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ کیا میں اس شام تھامس سے ملی تھی۔"

صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن جولیس نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اس سے ملی تھیں؟" اس نے نفی میں سر ہلایا تو جولیس نے پوچھا۔

"تم اینڈریو کونر کو کتنے عرصے سے جانتی ہو؟"

ایک بار پھر اس نے جواب دینے میں تامل کیا پھر بولی۔ "تقریباً تین سال سے جب تھامس اسے چیف فنانشل آفیسر اور پارٹنر کے طور پر کمپنی میں لایا۔"

مجھے شبہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کے چہرے کی گھبراہٹ نے اس بیان کو ناقابلِ اعتبار بنا دیا تھا اور جب جولیس نے اس سے پوچھا کہ کیا کونر سے اس کا معاشقہ چل رہا تھا تو یہ گھبراہٹ مزید نمایاں ہو گئی اور اس نے اس سوال کا جواب بھی نفی میں دیا۔ اس نے کونر کے اپارٹمنٹ کے بارے میں بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جولیس اس سے مزید آدھ گھنٹے تک مختلف سوالات پوچھتا رہا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے تو معاملے کو مزید الجھا دیا۔ پہلے میں ڈینیئل پر بہت زیادہ شبہ کر رہا تھا لیکن اب مجھے اتنا زیادہ یقین نہیں ہے تاوقتیکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کام ان دونوں نے مل کر کیا ہے۔ بظاہر وہ جھوٹ بول رہی تھی کہ اس کا کونر سے بھی معاشقہ نہیں رہا اور وہ اس کے اپارٹمنٹ کے بارے میں بھی جانتی ہے۔ اب تم دونوں میں سے کس پر شبہ کرو گے؟"

"صبر سے کام لو آرچی۔ ابھی ہمیں کم از کم دو آدمیوں سے مزید بات کرنا ہے۔"

ایلس تھامس کو تین بجے کا وقت دیا گیا تھا جب پندرہ منٹ اوپر ہو گئے تو جولیس نے اسے فون کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا اور کہا۔ "تمہیں آنے میں دیر ہو گئی ہے۔"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جولیس سے نہیں ملوں گی۔" اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کوئی مناسب رویہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میں مسٹر جولیس سے تمہاری بات کرا دوں تو کیا تم چند سوالات کے جواب دینا چاہو گی؟"

وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ "اگر تم نے ایسا کیا تو میں فون بند کر دوں گی۔"

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے شوہر پر قتل کا الزام لگ سکتا ہے۔ کیا تم اس کی مدد کرنا نہیں چاہتیں؟"

"میرے پاس تمہارے باس کو بتانے کے لیے ایسا کچھ نہیں جس سے تھامس کی مدد ہو سکے۔"

جولیس شروع سے ہی ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور ایلس سے کہا۔ "یہ سچ نہیں ہے۔ تم اسے کم از کم یہ تو بتا سکتی ہو کہ وہ بوتل کہاں ہے جس میں چالیس سال پرانی اسکاچ تھی۔"

"میں پہلے ہی دوسرے سراغ رساں کو اس بارے میں بتا چکی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ بوتل کہاں ہے۔"

جولیس نے کاغذ پر دوسرا سوال لکھا۔ "تم نے جینی مارٹن سے کیا کہا تھا؟"

"کیا؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔

"تم نے قتل والی رات اس سے فون پر کیا کہا تھا؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے فون بند کر دیا۔ میں نے جولیس سے پوچھا کہ کیا اس کے شوہر کو فون کروں؟" وہ اسے یہاں آنے پر مجبور کر سکتا ہے یا ٹیکسی بلاؤں۔ کیوں نا ہم ایلس سے ملنے چلے جائیں۔"

جولیس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ وہ میرے لیے دروازہ کھولے گی اور اگر تھامس نے اسے مجھ سے ملنے پر آمادہ کر لیا تب بھی میں اس موڈ میں نہیں ہوں کہ اس سے کچھ اگلوا سکوں۔"

ایلس کے فون نے جولیس کو آزردہ کر دیا اور وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ دس منٹ بعد ہنری کا فون آ گیا اور اس نے کہا۔ "معاف کرنا مجھے کچھ دیر ہو گئی لیکن آخر کار مجھے تھامس کی شادی سے پہلے کے معاہدے کا پتا چل گیا۔ اس کے مطابق وفات کی صورت میں بیوی کو تھوڑی بہت رقم مل جائے گی لیکن اگر وہ طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اسے کچھ نہیں

ملے گا۔ لیکن اس میں ایک دلچسپ شق موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر میرے مؤکل پر کوئی سنگین جرم ثابت ہو جائے تو یہ معاہدہ کالعدم ہو جائے گا اور طلاق کی صورت میں بیوی لاکھوں کی مالک بن جائے گی۔"

"یہ واقعی دلچسپ شرط ہے۔" جولیس نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اس پر غور کرنا چاہیے۔"

ہنری کے فون نے وہ بدمزگی دور کردی جو ایلس سے بات کر کے ہوئی تھی۔ جولیس نے میز پر سے وائن اسپکٹیٹرز کا تازہ شمارہ اٹھایا ارو اس کی ورق گردانی کرنے لگا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس کال کے بعد میں بھی ایلس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی سام کا فون آ گیا۔ وہ جولیس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

"کیا کوئی گواہ مل گیا؟" میں نے پوچھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہی میں اسے تھامس کی بیوی اور دیگر تین مشتبہ افراد کی تصویریں ای میل کر چکا تھا۔ اس نے قدرے توقف کیا تو میں نے اس کی جولیس سے بات کروادی اور اس نے جو کچھ بتایا۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق تھا کہ چاروں مشتبہ افراد میں سے کسے اپارٹمنٹ کی عمارت میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ "اوپر کی منزل پر رہنے والے ایک پڑوسی نے اسے کئی بار عقبی راستے سے عمارت میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اسے آخری بار کونر کے قتل سے تین روز پہلے دیکھا گیا۔ اگر تم کہو تو میں اس شخص کی تلاش جاری رکھوں جس نے اسے قتل والی رات دیکھا تھا۔"

"بہت اچھے سام لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آئندہ چند گھنٹوں میں ضرورت ہوئی تو کیا تم دستیاب ہو سکو گے؟"

"یقیناً، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

سام کے بات ختم کرنے سے پہلے میں مزید ایسے ثبوت تلاش کر چکا تھا جو ایلس اور کونر کے تعلق کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ میں نے ان کی تفصیل جولیس کو بتاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کریڈٹ کارڈ بل سے معلوم ہوا ہے کہ ڈھائی ماہ قبل اس نے اپنی گاڑی ایک ایسے گیرج میں کھڑی کرنا شروع کی جو کونر کے خفیہ اپارٹمنٹ سے تین بلاک کے فاصلے پر ہے۔ ایسے بلوں کی تعداد چوبیس ہے اور ہر بار اس کی گاڑی شام میں پارک کی گئی جس کا اوسطاً وقت دو گھنٹے اور چودہ منٹ ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے شوہر سے کوئی کلاس اٹینڈ کرنے کا بہانہ بنایا ہوگا یا پھر وہ اس وقت کونر سے ملنے جاتی تھی جب اس کا شوہر مصروف ہوتا ہوگا۔ میں نے ان دنوں کا فون کالز کا ریکارڈ بھی حاصل کر لیا جو غالباً اس نے کونر کے وائرلیس فون پر کیے ہوں گے۔

مجھے اس عورت کی منافقت اور سرد مہری پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ کونر سے اس لیے عشق لڑا رہی تھی تا کہ اس کے شوہر پر قتل کا الزام آ جائے۔" "لیکن ہم کیسے ثابت کریں گے کہ اسی نے یہ قتل کیا ہے؟"

جولیس مضحکہ خیز انداز میں بولا۔ "جب تک کہ میرے اندازے غلط ثابت نہ ہو جائیں۔ ٹام آج کسی وقت مجھے فون کرے گا۔ اس کے بعد ہی میں قاتل کو بے نقاب کر سکوں گا۔"

میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ میں جانتا تھا کہ ٹام کس سلسلے میں کام کر رہا ہے اور اس میں اسے کافی وقت

لگ جائے گا لیکن تین منٹ بعد ہی ٹام کا فون آ گیا کہ اسے وہ آدمی مل گیا ہے جسے وہ تلاش کر رہا تھا۔ ”اس شخص کا نام چارلی ہک ہے۔“ ٹام نے کہا۔ پس منظر میں موسیقی اور لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ”اور وہ کوئی چالاک شخص معلوم ہوتا ہے اور اس وقت بار میں بیٹھا ہوا ہے لیکن میری نظریں اس پر ہیں۔ جیسا کہ تم نے مشورہ دیا تھا۔ میں نے اس پر یہی ظاہر کیا کہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جو ریڈ ہائپ نول گولیاں بیچتا ہو پھر اس نے مجھ سے رابطہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے اسے وہ چار تصویریں دکھائیں جو آرچی نے بھیجی تھیں۔ ان میں سے اس نے ایلس کو پہچان لیا اور کہا کہ جس وقت اس کے ہاتھ منشیات فروخت کی تو اس نے سیاہ چشمہ اور سرخ وگ لگائی ہوئی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔ ”کیا میں اس کا بیان لے لوں اور پیسے دے کر فارغ کر دوں۔“

”ٹام، میرا خیال ہے کہ یہ بہتر رہے گا، اگر تم اسے یہاں لے آؤ۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس کے لیے تیار ہو جائے گا۔ کم از کم رضا کارانہ طور پر تو نہیں۔ اس کے لیے مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔“

”میرا نہیں خیال کہ یہ ضروری ہے۔ اس سے کہہ دو کہ اگر پیسے چاہئیں تو اسے یہاں آنا ہوگا۔ اور اگر وہ نہیں آتا تو جو کچھ تم نے بتایا ہے، میں اسے نظر انداز کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے جولیس، میں تمہیں بعد میں فون کرتا ہوں۔“

ٹام کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اسے اپنی کامیابی کا زیادہ یقین نہیں ہے لیکن پچاس سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ فون کیا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”ہم بیس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔“ اس نے مختصر بات کرتے ہوئے کہا۔ شاید وہ ہک کو اتنی مہلت دینا نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا ذہن تبدیل کر سکے۔

”آدھ گھنٹے بعد تمہاری وائس پریذیڈنٹ مارکیٹنگ سالومن نائیگرین سے ملاقات ہے۔“ میں نے جولیس کو یاد دلایا۔

”آرچی، پلیز اسے فون کر کے یہ ملاقات منسوخ کر دو۔“

”اگر تم چاہتے ہو تو میں اسے منع کر دیتا ہوں لیکن ایلس تھامس کے ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کا وزن ایک سو پانچ پاؤنڈ ہے جبکہ اس کے شوہر کا وزن ایک سو نوّے ہے۔ اس عورت کو اپنے شوہر کا بے ہوش جسم کار تک لے جانے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت ہوئی ہوگی تاکہ وہ اسے گلی میں پھینک آئے اور وہ ان تینوں میں سے کسی ایک کو بلا سکتی تھی اور اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک اس سازش میں شریک تھا۔“

”تمہارا نکتہ قابلِ غور ہے لیکن ضروری ہوا تو میں سالومن سے بعد میں بات کر لوں گا۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ کن خطوط پر کام کر رہا ہے۔ اس کی خدمات صرف یہ ثابت کرنے کے لیے حاصل کی گئی تھیں کہ اس کے مؤکل نے کونز کا قتل کیا ہے یا نہیں۔ اس کا یہ کام نہیں تھا کہ وہ ایلس کے ساتھیوں کو بے نقاب کرے۔ جہاں تک جولیس کا تعلق تھا تو چارلی ہک سے ملنے کے بعد اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔

چارلی ہک بالکل ویسا ہی نظر آیا جیسا ٹام نے بتایا تھا۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، سیاہ چمکیلے بال اور گول چہرہ۔ وہ آٹھ مرتبہ بوسٹن میں گرفتار ہو چکا تھا اور یہ سب نقب زنی یا چوری شدہ اشیا فروخت کرنے کی وارداتیں تھیں لیکن اس پر منشیات فروشی کا کوئی الزام نہیں تھا۔ جولیس نے اس سے بیان پر دستخط لیے اور پانچ سو ڈالر اس کے حوالے کر دیے۔ جب وہ اپنی جیب میں ڈالر رکھ کر کرسی سے اٹھنے لگا تو جولیس نے بتایا کہ اسے ایک گھنٹا یا کچھ زیادہ وہاں رکنا ہوگا۔

”دفتر میں نہیں۔“ جولیس نے کہا۔ ”مسٹر ڈرکن تمہیں ایک دوسرے کمرے میں لے جائیں گے اور تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔“

ہک نے جولیس کو اس طرح دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں وہ سب بتا دیا جو جاننا چاہتے تھے۔“

”ایک طرح سے تمہاری بات صحیح ہے۔“ جولیس نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا پھر اس نے وہ کاغذ ہوا میں لہرایا جس پر ہک نے دستخط کیے تھے۔ ”شاید تمہیں اس کا احساس نہ ہو لیکن اس بیان نے تمہیں ایک عمودی چٹان کی چوٹی پر کھڑا کر دیا ہے اور اگر تم نے میری بات نہ مانی تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے۔“

”مثلاً؟“

”اس بیان کی روشنی میں تمہیں کم از کم بیس سال کی سزا ہو سکتی ہے۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو۔“

”نہیں، اگر تمہارے اندر ذرا سی بھی عقل ہے تو تمہیں میری بات سمجھ لینی چاہیے۔“

ہک کچھ دیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی اور وہ مزید کوئی بحث کیے بغیر ٹام کے ساتھ دفتر سے باہر چلا گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جولیس نے اسے بیس سال سزا کی دھمکی کیوں دی تھی۔ ہک پر ماضی میں ایسا کوئی الزام نہیں لگا تھا۔ اور ایلس کو چار گولیاں بیچنے کے الزام میں اسے زیادہ سے زیادہ تین ماہ کی سزا ہو سکتی تھی۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ جولیس نے مداخلت کی اور مجھے ہدایات دینا شروع کر دیں اور کہا۔ ”جب تم سراغ رساں کریمر کو فون کرو تو کہہ دینا کہ میں صرف اپنے مؤکل سے کیا ہوا وعدہ ہی پورا نہیں کر رہا بلکہ قاتل بھی اس کے حوالے کر رہا ہوں۔“

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ قاتل کا نام اسی وقت جان گیا تھا جب سام نے اسے فون کیا اور اب ہک نے ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا۔ اس کے دفتر میں لوگوں کو جمع کرنا مجھے غیر ضروری لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس مقصد کے لیے کریمر کو ہک کا بیان ہی فیکس کر سکتا تھا لیکن میں نے اس کے کہنے پر لوگوں کو فون کرنا شروع کر دیے۔

جولیس کے دفتر میں چھ افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے لیکن اس شام وہاں گیارہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ پانچ افراد کو کرسیوں کے پیچھے کھڑا ہونا پڑا۔ تھامس کو جولیس کی میز کے سامنے ایک بڑی چمڑے کی نشست والی کرسی پر بٹھایا گیا۔ برابر میں اس کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ جو کچھ پیش آنے والا ہے، وہ اس کے بارے میں جانتی ہے۔ اس کے برابر میں جولیس نے سالومن کو بٹھایا تھا اور میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کیا جولیس کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ اس کا شریک تھا جبکہ اس نے اب تک سالومن سے پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ نائیگرین گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن جینی مارٹن اور ڈینیئل سے زیادہ نہیں جو برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کمرے میں صرف ایک شخص چارلی ہک ہی ایلس سے زیادہ مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اردگرد صوفوں پر کریمر، ہنری زیک اور بیاسی سالہ میری پکرلنگ بیٹھی ہوئی تھی جبکہ کرسیوں کے پیچھے ٹام ڈرکن، سام پینزر اور تین پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ جولیس نے سب سے پہلے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اتنے مختصر نوٹس پر وہاں آ گئے پھر اس نے ہنری سے کہا کہ وہ جو چیز لے کر آیا ہے، اسے کریمر کے حوالے کر دے۔ ہنری نے بریف کیس کھول کر وہ گن نکالی جو تھامس لے کر آیا تھا۔ اس نے اسے ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

اس گن کو دیکھنے کے بعد کریمر کا ردِعمل فطری تھا لیکن جولیس فوراً ہی بول پڑا۔ ”اس روز صبح کے وقت تھامس یہ گن لے کر میرے دفتر آیا تھا اور اس نے جو کہانی سنائی وہ انتہائی احمقانہ معلوم ہو رہی تھی۔ تب سے ہی میں اس کی تحقیقات کر رہا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کہانی اب بھی پہلے کی طرح بعید از قیاس ہے۔ اب مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تھامس نے ہی اینڈریو کونر کو عمداً قتل کیا ہے اور یہ گن آلۂ قتل ثابت ہو گی۔“

یہ سنتے ہی تھامس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر اس نے ہک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جولیس سے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ اس نے میری بیوی کو روہائپ نول کی گولیاں فروخت کی تھیں اور تم اتنے احمق ہو کہ یہ جاننے کے باوجود نہ سمجھ سکے کہ اس نے میری اسکاچ میں یہ گولیاں ڈال دی تھیں۔“ یہ کہتے ہی اس نے اپنا منہ سختی سے بند کر لیا۔ وہ ضرور جان گیا ہو گا کہ یہ بات کہہ کر وہ کتنی بری طرح پھنس گیا ہے۔ اسے یہ یاد ہی نہ رہا کہ پہلے وہ اصرار کر رہا تھا کہ اس کی شراب میں کوئی نشہ آور دوا نہیں تھی۔ وہ یہ بھی کہہ چکا تھا کہ اس کی بیوی کونر کے قتل میں ملوث نہیں ہے۔“

جولیس نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ہک کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تمہاری بچت کی جو تھوڑی بہت امید تھی وہ اس انکشاف کے بعد دم توڑ گئی ہے۔ اب تمہارے پاس اپنے آپ کو بچانے کا ایک ہی موقع ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ کیا ایلس نے تم سے کسی قسم کی منشیات خریدی تھی؟“

ہک اب پہلے سے زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پہلے کبھی اس عورت کو نہیں دیکھا۔“ پھر وہ تھامس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس نے مجھے پچاس ہزار ڈالر کی پیشکش کی تھی اگر میں تمہیں یہ کہانی سناؤں۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کسی شخص کو قتل کرنے والا تھا۔ اسی لیے میں سچ بتانے آج تمہارے پاس آیا۔“

گوکہ ہک بھی پورا سچ نہیں بول رہا تھا لیکن جولیس نے اسے نہیں جھٹلایا اور نہ ہی اس کا تحریری بیان نکالا۔ وہ گن تھامس کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی تھی لیکن ہک کی

گواہی سے قتلِ عمد کا الزام بھی ثابت ہو جاتا اور جولیس نے وہ بیان اسی لیے محفوظ کر لیا تھا تاکہ ہک اپنی گواہی پر قائم رہ سکے۔ مجھے یقین تھا کہ جولیس یہ ضرور چاہے گا کہ ہک پر شریکِ جرم ہونے کا الزام عائد کیا جائے لیکن اس کے لیے زیادہ اہم یہ تھا کہ تھامس کو فرسٹ ڈگری مرڈر کا مجرم قرار دیا جائے کیونکہ اس نے جولیس کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔

سب سے آخر میں بیاسی سالہ میری پکرلنگ نے انکشاف کیا کہ ہک نے ایک ماہ قبل اس کے دروازے پر دستک دے کر ایلس تھامس کی تصویر دکھائی۔ اس سے یہ ثابت تو نہیں ہوا کہ ہک نے کونز کے قتل میں معاونت کی تھی۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ ایلس کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا اور تھامس نے ہی اسے پٹی پڑھائی تھی۔ اس کے بعد کریمر نے تھامس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور جولیس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلا گیا۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اگر تھامس کی نیت اپنی بیوی کو پھنسانے کی تھی تو اس نے قتل کی رات ان تین افراد کو فون کیوں کیے اور جان بوجھ کر انہیں مشتبہ بنانے کی کوشش کیوں کی۔ جب سب چلے گئے تو میں نے یہی بات جولیس سے پوچھی تو اس نے کہا۔ ”پولیس کو غلط سمت میں ڈالنے کے لیے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی بیوی کے سوا سب پر انگلیاں اٹھیں اور بعد میں وہ یہ ظاہر کر سکے کہ اسے خود بھی اس پر حیرت ہوئی۔ وہ جھوٹا ہونے کے ساتھ ساتھ شعبدہ باز بھی ہے۔ اس نے قتل کی تحقیقات میرے سپرد کر کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔“

میں نے ایک اور سوال کیا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کے بجائے خاموشی سے گن کہیں دفن کر دیتا۔ کیا اس طرح وہ کونز کو قتل کرنے کے الزام سے نہیں بچ جاتا؟“

”مجھے شبہ ہے۔“ جولیس نے کہا۔ ”اگر ایسا کوئی ثبوت نہ ہوتا جو اسے جرم سے جوڑ سکے تب بھی واقعاتی شہادتیں اس کے خلاف تھیں۔ خاص طور پر جب اسے کونز سے اپنی بیوی کے تعلق کے بارے میں معلوم ہوا تو اس کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ ان میں سے کسی ایک کا قتل کر دے۔ کونز کو قتل کرنا اس لیے اہم تھا کہ اس طرح اس کا حریف راستے سے ہٹ جاتا اور اس کی بیوی جیل چلی جاتی۔“

میرا تجسس ابھی بھی برقرار تھا۔ میں نے جولیس سے پوچھا کہ پہلی بار اسے تھامس کے مجرم ہونے کے بارے میں کب معلوم ہوا تو وہ بولا۔ ”مجھے پہلے دن سے ہی اس پر شبہ تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ ایک مکمل طور پر گمراہ کن کہانی تھی۔ اسی طرح مجھے اس وقت بھی شک ہوا جب اس نے میری خدمات صرف یہ جاننے کے لیے حاصل کیں کہ آیا اس نے اپنی مفروضہ مدہوشی کے دوران کونز کو قتل کیا تھا یا نہیں۔ یہ سوال میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا کہ اسے یہ جاننے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ مان لیا کہ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے وہ مدہوش ہو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک گلی میں پڑا ہوا پایا پھر یہ کہ کوٹ کی جیب میں گن کی موجودگی بھی اس کے لیے حیرت کا سبب بنی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی اسی طرح حیران و پریشان ہو سکتا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ پولیس کو اس بارے میں بتاتا لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے فرار ہونا مناسب سمجھا۔ اگر وہ قاتل نہیں تھا تو روپوش کیوں ہوا پھر چار دن بعد ایک من گھڑت کہانی لے کر میرے پاس کیوں آیا۔ دراصل یہ سب اس کی منصوبہ بندی کا حصہ تھا۔ اس نے معاملے کو اتنا الجھا دیا تھا کہ میں اس کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا لیکن جب ہم اس مسخرے ہک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور اس نے پانچ سو ڈالر کے عوض سب کچھ سچ بتا دیا تو مجھے تھامس کے مجرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔“

مجھے اب بھی جولیس کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا۔ اس نے ضرور ایسا سوچا ہو گا کہ تھامس ہی اصل قاتل ہے لیکن وہ یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے جب اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو یہی بات سامنے آئی کہ اس بار بھی قسمت نے جولیس کا ساتھ دیا۔ دراصل تھامس کی تضاد بیانی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اگر وہ جولیس کے الزام کے جواب میں مختلف ردِ عمل ظاہر کرتا تو جولیس کے لیے اس الزام کو ثابت کرنا مشکل ہو سکتا تھا۔ تھامس نے اپنا بیان بدل لیا تھا۔ پہلے اس نے کہا کہ ایلس اس قتل میں ملوث نہیں ہے اور بعد میں اس پر شراب میں نشہ آور گولیاں ڈالنے کا الزام عائد کر دیا۔ اگر چارلی ہک سچ نہ بولتا تو تھامس کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا اور اس کے بجائے ایلس سلاخوں کے پیچھے ہوتی۔ اس لحاظ سے جولیس ایک بار پھر خوش قسمت ثابت ہوا۔ اگر ہک اس کے ہاتھ نہ لگتا تو وہ بھی اصل مجرم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔
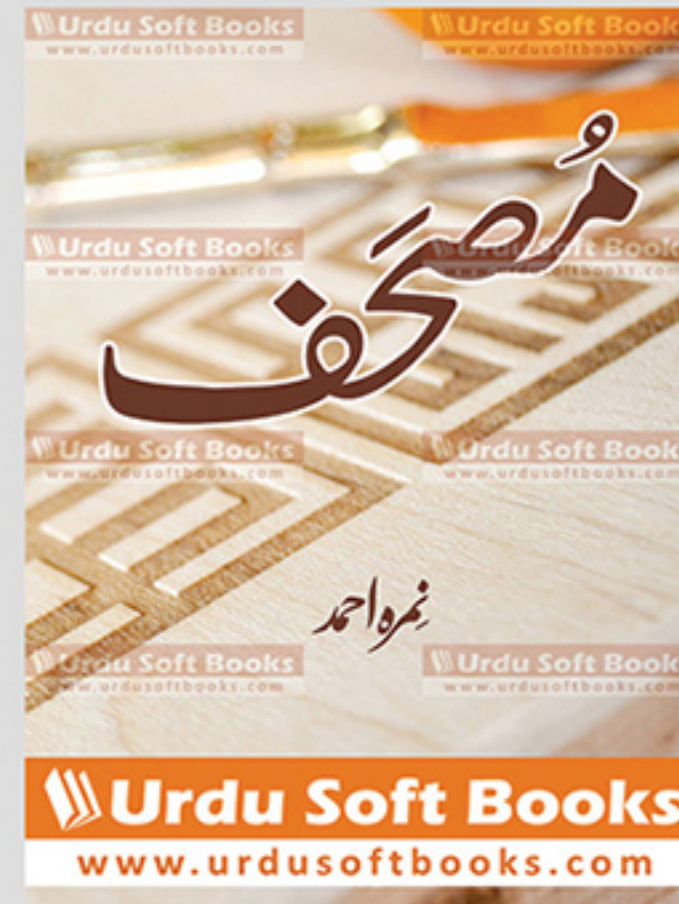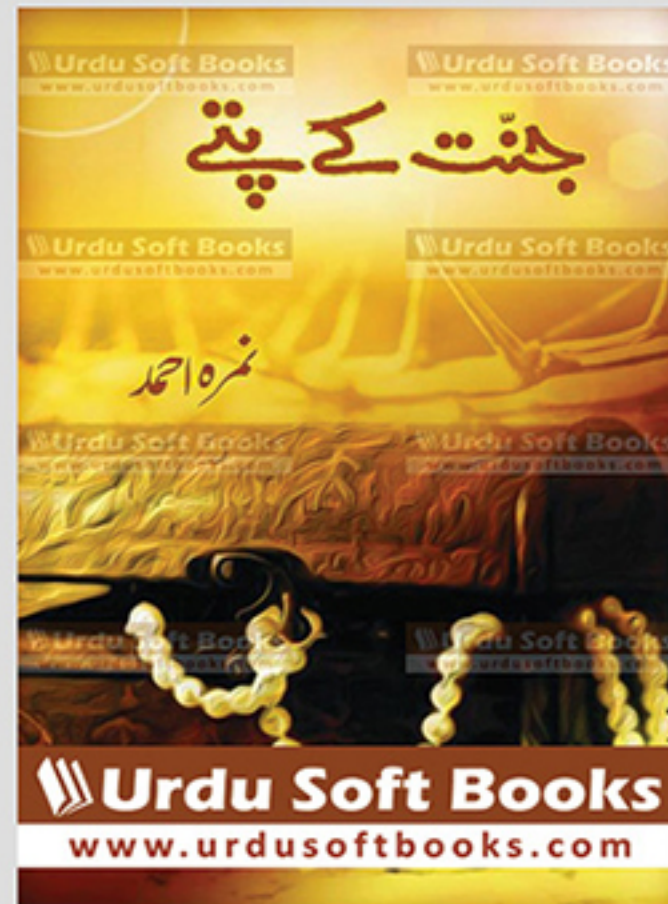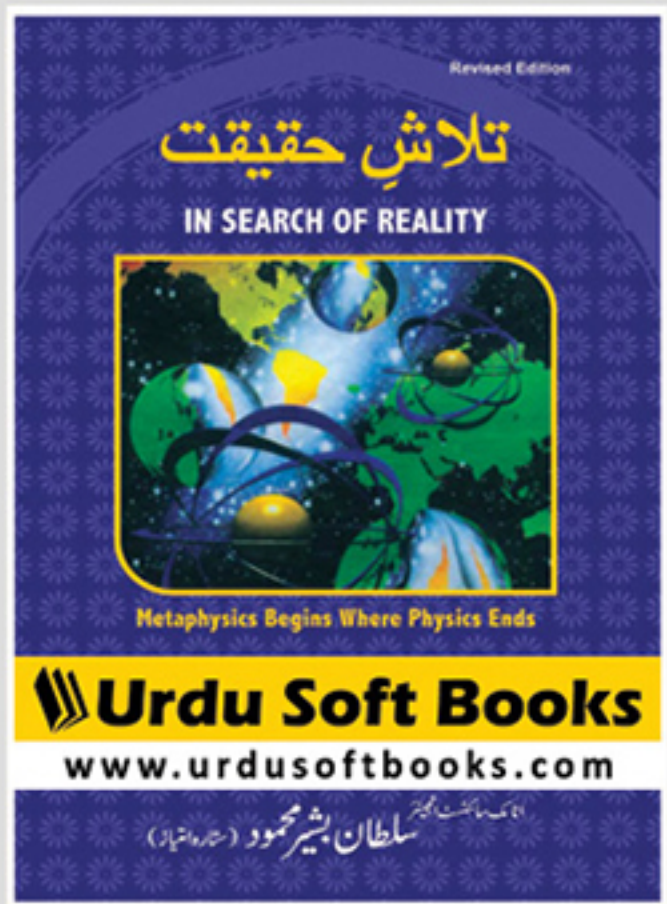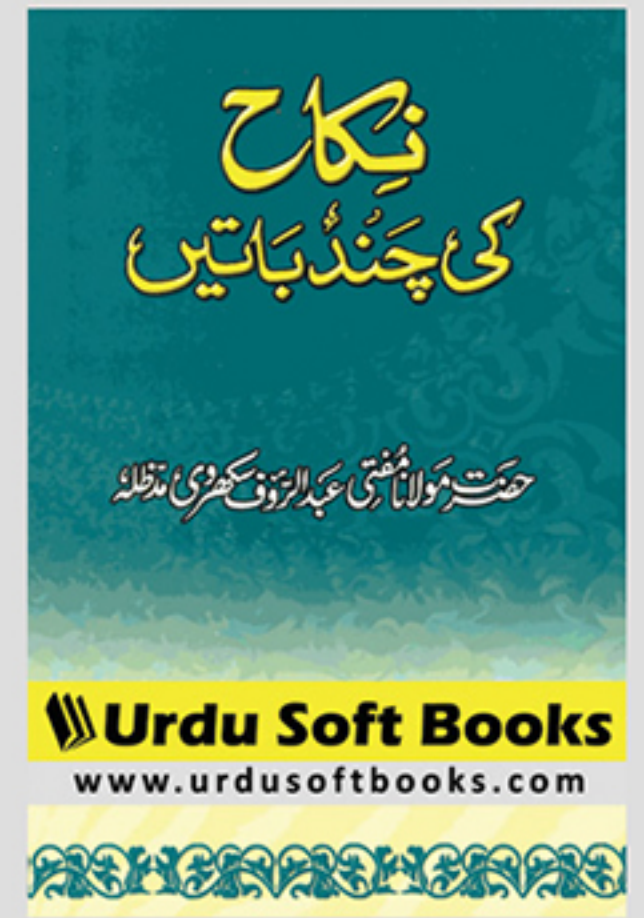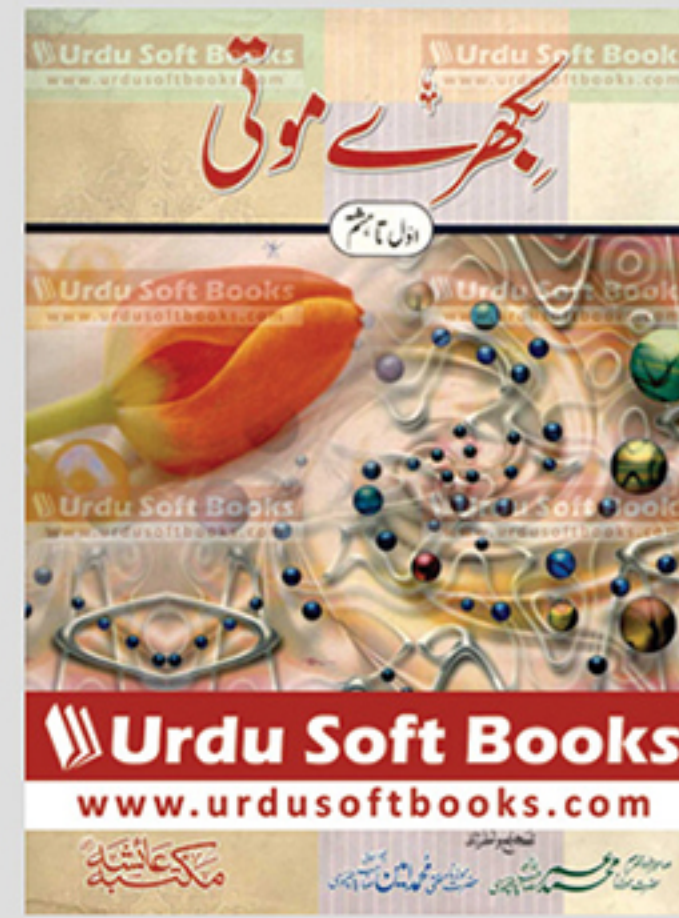
"تم کسی طرح بھی ایک سراغ رساں کی معاون نظر نہیں آتیں۔" اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے چونک کر اس سنہرے بالوں والی عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی پشت پر ایک بڑے عقاب کا ٹیٹو بنا ہوا تھا جس نے اس کے دائیں کندھے اور غالباً کمر تک کو گھیر رکھا تھا۔ میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ سفید قمیص، سیاہ اسکرٹ اور سیاہ جوتوں میں کسی قانونی فرم کی مددگار لگ رہی تھی۔ لیکن یہ لباس میری باس کا تجویز کردہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ

ناقابلِ برداشت

جمال دستی

سائنسی ایجادات نے زندگی کو نہایت سہل بنا دیا ہے... گھر بیٹھے جو حاصل کرنا چاہو... وہ دستیاب ہے... مگر ذہنی کج روی اور مجرمانہ اذیت پسندی کا کوئی علاج نہیں... تعمیری چیزوں کو تخریب کا ذریعہ بنانے والوں کا قصہ... جو کسی بھی انسان کی زندگی کو بہ آسانی عذاب بنا سکتی ہے... مغربی انداز و اطوار سے پردہ اٹھاتی ایک چشم کشا تحریر...

جذبات و احساسات کی انتہاؤں کو چھونے والوں کا انجام......

اس عورت کے ذہن میں سراغ رساں کی معاون کا کیا تصور ہے لہٰذا میں نے پوچھ ہی لیا۔ اس پر وہ ہکلانے لگی اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

''تم اس بارے میں پریشان نہ ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ کسی کیس کے سرے کو کہاں سے پکڑنا چاہیے۔''

اس کی ہکلاہٹ بے ساختہ قہقہے میں تبدیل ہوگئی اور یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ میں نو گیارہ کو فون کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں نے ڈائل کرنا شروع کیا ہی تھا کہ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ کیا مسز گیلانٹ سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''بدقسمتی سے نہیں۔'' میں نے رٹے رٹائے جملے دہراتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ڈھائی بج رہے ہیں۔ مسز گیلانٹ دو سے چار اور شام ساڑھے چھ بجے کے بعد موجود نہیں ہوتیں۔ بہتر ہے کہ تم صبح میں آؤ۔''

''لیکن.....'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''تم چاہو تو انتظار کرلو۔ ورنہ چار بجے کے بعد آجانا یا تم مجھے اپنا مسئلہ بتادو۔ میں باس سے بات کرلوں گی۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی بڑی بہن کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔ اسے کچھ لوگ آن لائن ہراساں کررہے ہیں، ان میں سے زیادہ تر کو تو آسانی سے نظرانداز یا بلاک کیا جاسکتا ہے لیکن وہ اس ایک فرد کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔''

''مرد یا عورت؟''

''ظاہر ہے کہ وہ مرد ہی ہے۔ لڑکیاں سوشل میڈیا پر ایسے قابلِ اعتراض تبصرے نہیں کرتیں جن میں عورتوں سے نفرت جھلکتی ہو۔''

میں اس سے مکمل طور پر متفق نہیں تھی کیونکہ آٹھ مہینے پہلے ایک ایسے ہی کیس پر کام کیا تھا اور یہ جان کر حیران رہ گئی کہ عورتیں بھی اس حد تک گھٹیا اور بدکردار ہوسکتی ہیں، جب وہ اپنی حقیقی شناخت کھو بیٹھیں لیکن میں نے اس عورت سے کچھ نہیں کہا جس نے اپنا تعارف لوسی سمینز کے نام سے کروایا تھا۔ البتہ اس کے بجائے یہ پوچھا کہ اس کی بہن کیوں پریشان ہے؟

''وہ ایک ویب سائٹ پر کالم لکھنے کے علاوہ چند دوسری جگہوں پر بھی فری لانسر کے طور پر کام کرتی ہے۔''

اس نے جو نام لیے۔ ان سب کو جانتی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح کی بکواس اسے خاص طور پر فیس بک اور ٹوئیٹر پر مل رہی ہے جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھی لیکن اس کی پہلی کتاب کے شائع ہونے کے بعد حالات اور خراب ہوگئے۔ یہ کتاب تحریک نسواں کی موجودہ صورت حال کے بارے میں ہے۔ اس پر لوگوں نے انٹرنیٹ کے ذریعے تبصرے کیے لیکن صورت حال اس وقت خراب ہوگئی جب اسے تمام ای میلز کو ضائع کرنا پڑا کیونکہ یہ سب جسمانی زیادتی کی دھمکیوں پر مبنی تھیں لیکن اب اسے پیغامات، وائس میل اور خطوط کے ذریعے ہراساں کیا جارہا ہے اور ان سب میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔''

''اسی لیے اسے یقین ہے کہ یہ کسی مرد کی حرکت ہو سکتی ہے؟''

''یہ دیکھو۔'' اس نے اپنا فون آن کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری بہن نے بھیجا ہے۔'' اس نے دو مرتبہ اسکرین پر ہاتھ پھیرا اور فون مجھے تھماتے ہوئے بولی۔ ''تم یہ تمام پیغامات دیکھ سکتی ہو۔ سب ایک ہی نمبر سے بھیجے گئے ہیں لیکن یہ نمبر بھی جعلی ہے کیونکہ اگر اس پر کال کی جائے تو فیکس مشین کی آواز آتی ہے۔''

میں نے ان پیغامات کو دیکھنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا لیکن جیسا کہ بتایا گیا تھا وہ سب دھمکیوں پر مبنی تھے اور ان میں ایک ہی بات دہرائی گئی تھی۔

''یہ بہت افسوسناک ہے۔'' میں نے کہا۔

''افسوسناک بہت چھوٹا لفظ ہے۔ تم ان پیغامات کی شدت کو گھٹا کر بیان کررہی ہو۔ گریٹا تقریباً گھر میں قید ہوکر رہ گئی ہے۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتی ہے لیکن گھر میں بھی اسے سکون نہیں ہے اور یہ سب کسی ایسے ذہنی مریض کی طرف سے ہورہا ہے جو میری بہن کی شخصیت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کردینا چاہتا ہے۔''

یہ سب باتیں میں نے اس چھوٹی سی نوٹ بک میں لکھ لیں جو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ جب سے میں نے باس کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تھا اگر ایسا نہ کرتی تو کلائنٹ کی کہی ہوئی باتیں مجھے یاد نہ رہتیں اور ریکارڈ کے بغیر میرے لیے آگے بڑھنا مشکل ہوجاتا۔

''کیا تم مسز گیلانٹ کی خدمات اس لیے حاصل کرنا چاہ رہی ہو کہ وہ اس شخص کا پتا لگائیں اور اسے ان حرکتوں سے روکیں؟''

لوسی نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو اور بولی۔ ''بالکل۔ اسی لیے یہاں

آئی ہوں تاکہ تمہاری بلکہ مسز گیلانٹ کی خدمات حاصل کر سکوں۔ میں نے ان کی بہت تعریف سنی ہے۔ چند برس پہلے گریٹا کی ایک دوست ان کے ساتھ کام کر چکی ہے۔ وہ بہت جینیئس ہیں۔“

مجھے وہ کیس یاد آگیا۔ اسے حل کرنے میں باس کے دو اور میرے دس گھنٹے صرف ہوئے تھے اور اس کا معاوضہ تین ماہ بعد ملا تھا۔ میں اپنی کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تاکہ اپنے اندر کی بے چینی پر قابو پا سکوں جو میرے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔

میں نے نوٹ بک سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں ہر بات مسز گیلانٹ تک پہنچا دوں گی لیکن مجھے سب کچھ شروع سے بتاؤ۔ گریٹا کو اس شخص کی جانب سے سب سے پہلی دھمکی کب ملی؟“

لوسی نے بولنا شروع کیا اور میں پوری توجہ سے اس کی کہانی قلم بند کرنے لگی۔ اس محویت میں مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب وہ اپنی لمبی چوڑی پُرجوش تقریر ختم کر رہی تھی تو میں نے لفٹ کی کھڑکھڑاتی آواز سنی جو میرے بالکل عقب میں تھی۔ اس کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ یہ لفٹ انیس سو چونتیس میں نصب کی گئی تھی۔ اس کے باوجود باس نے ہمیشہ سیڑھیوں کو ترجیح دی لیکن اب وہ خرابی صحت کی وجہ سے اسے استعمال کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

باس نے لفٹ سے باہر آتے ہی بہ آواز بلند کہا۔ ”جیسیکا! چار بج گئے ہیں۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ یہاں کوئی کلائنٹ موجود ہے؟“ اس کی وہیل چیئر سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں اور اس کے پہیوں کو تیل دینے کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بھی مجھے ہی کرنا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ وقت گزرنے کا خیال ہی نہ رہا۔ یہ لوسی سیکنز ہے۔ کوئی نامعلوم شخص اس کی بہن کو تنگ کر رہا ہے۔ یہ اسے پکڑنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہے۔“

باس کو دیکھتے ہی لوسی کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی اور وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔ ”اوہ مسز گیلانٹ! یہ میرے لیے باعثِ مسرت ہے......“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ باس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ہماری فیس معلوم ہے، اس خدمت کے عوض ہم تین ہزار ڈالر لیتے ہیں جبکہ روزانہ الاؤنس تین سو ڈالر اس کے علاوہ ہے۔“

لوسی نے اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے کہا۔ ”یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔“

”شاید تمہارے اندازے سے کچھ زیادہ ہو۔“ باس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم کسی دوسرے پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کر سکتی ہو جس کی فیس ہم سے بہت کم ہوگی لیکن وہ ہماری طرح کام نہیں کرتے۔“

لوسی چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، ہاں، بالکل، میں چیک کاٹ دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے چیک بک نکال کر اس میں رقم بھری اور دستخط کر کے چیک مجھے دے دیا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر اسے اپنی نوٹ بک میں رکھ لیا۔

”تم دو دن بعد اپنی بہن کو ساتھ لے کر آنا کیونکہ حقیقی موکل تو وہی ہے۔“

”میں نہیں جانتی......“

باس نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور سختی سے بولی۔ ”یہ کوئی درخواست نہیں بلکہ ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں دو دن بعد آؤں گی۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے باس کو پوری تفصیل بتائی اور اپنے شبہات سے بھی آگاہ کیا۔ مسز گیلانٹ اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔ اس کہانی میں جو سوراخ ہیں انہیں بھرنے کے لیے دو دن کافی ہیں لیکن کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ خوف زدہ لگ رہی تھی؟“

”خوف سے زیادہ وہ غصے کی کیفیت میں تھی۔“ میں نے کہا۔ ”جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس پر اس کی ناراضی بجا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بہن سے کتنی محبت کرتی ہے اور اس کے لیے پریشان ہے۔“

”ممکن ہے کہ میں آن لائن زیادہ وقت نہ دے سکوں۔“ باس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”لیکن دھمکی بہرحال دھمکی ہوتی ہے۔ اس کی تحقیقات مناسب انداز میں ہونا ضروری ہے۔ دیکھو تم اس بارے میں کیا معلوم کر سکتی ہو اور ہاں...... کیا تم نے اپنا کمرا صاف کر لیا؟“

میرے پاس سر جھکا کر ہاں کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ مسز گیلانٹ صرف باس ہی نہیں۔ میری ماں بھی ہے۔

اگلے اڑتالیس گھنٹوں کے دوران میں نے گریٹا سیکنز کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ اس کی عمر بتیس سال ہے اور اسے دو مرتبہ طلاق ہو چکی تھی۔ پہلی مرتبہ ایک مرد

سے جس کے دو جوان بیٹے تھے اور دوسری بار ایک عورت سے جو بے اولاد تھی اور جیسا کہ لوسی نے مجھے بتایا کہ وہ کثرت سے مختلف اخبارات اور جرائد کے لیے مضامین لکھا کرتی تھی۔ اس نے ایک سال سے ٹیکس نہیں دیا تھا لیکن اپنے دو کمروں کے اپارٹمنٹ کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کر رہی تھی۔

گریٹا نے ٹوئیٹر پر بھی خاصا وقت گزارا تھا۔ البتہ رات دو بجے سے صبح آٹھ بجے تک اس میں وقفہ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس دوران وہ سوتی ہوگی۔ میں نے وہ تمام چونتیس ہزار چھ سو پچاسی ٹوئیٹ نہیں پڑھے جو اس نے مارچ دو ہزار آٹھ سے اب تک بھیجے تھے کیونکہ انہیں پڑھنے میں کئی سال لگ جاتے لیکن ان کا مضمون واضح ہوتا۔ وہ اپنے سارے کام آن لائن ہی کرتی جن میں کھانے اور ملبوسات کا آرڈر دینا، دوستوں سے سیاست، تاریخ اور خاص طور پر حقوق نسواں کے بارے میں گفتگو کرنا بھی شامل تھا۔

لوسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کی بہن کو ڈھیروں کی تعداد میں ناشائستہ پیغامات موصول ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کو پڑھ کر مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میری طبیعت اتنی مکدر ہوئی کہ اس کام کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ لیکن مجھے اپنا فرض پورا کرنا تھا لہٰذا میں نے ایسے تمام پیغامات کے پرنٹس نکالے جن میں گریٹا کو انتہائی خطرناک اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں تاکہ مسز گیلانٹ ان کا ماہرانہ جائزہ لے سکیں۔

''لوگ انٹرنیٹ پر بڑی خوفناک باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''برائے کرم مجھے بتاؤ کہ یہ واحد نتیجہ نہیں جو تم نے اخذ کیا ہے۔''

میں نے باس کے سامنے وہ فائل رکھ دی جس میں گریٹا کے بارے میں تمام دستاویزات موجود تھیں۔ اس وقت ہم نشست گاہ میں تھے اور میں اسی کرسی پر براجمان تھی جس پر دو روز قبل لوسی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ پورے گھر میں میری پسندیدہ کرسی تھی اور میں ہمیشہ اسی پر بیٹھا کرتی تھی۔

مسز گیلانٹ نے ایک نظر فائل پر ڈالی۔ اپنا چشمہ درست کیا اور کہا۔ ''بس یہی ہے؟''

''گریٹا کے مالی معاملات کے بارے میں زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ دونوں بار طلاق کے بعد اسے یک مشت رقم مل گئی اور اب ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے ان دونوں کو فیس بک اور ٹوئیٹر پر بلاک کر دیا ہے۔ گریٹا کے پاس ذاتی اپارٹمنٹ نہیں ہے۔ وہ صرف کھانا منگوانے یا کبھی کبھی کتابیں خریدنے کے لیے کریڈٹ کا استعمال کرتی ہے۔ اس نے اپنی آخری تصویر نئی کتاب کے سرورق کی پشت پر شائع کی ہے۔''

''اس مبینہ شخص کے بارے میں کچھ معلوم ہوا جو اسے دھمکیاں دے رہا ہے؟''

''ابھی مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''جو کچھ لوسی نے بتایا اس کے سوا ہمارے پاس اس معاملے میں کوئی معلومات نہیں جب تک کہ گریٹا خود ہمیں کچھ نہ بتائے۔''

باس نے غصے سے کہا۔ ''گریٹا کو بیس منٹ پہلے آ جانا چاہیے تھا۔''

ان کا غصہ بجا تھا کیونکہ ہم نشست گاہ میں بیٹھے اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اپنا فون نکال کر گریٹا کا ٹوئیٹر اکاؤنٹ چیک کیا اور میرے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے جسے باس نے بھی نوٹ کیا اور بولی۔ ''کیا معاملہ ہے؟''

''گریٹا نے گزشتہ چار گھنٹوں کے دوران کوئی ٹوئیٹ نہیں کیا جو کہ خلاف معمول اور تشویشناک ہے۔''

اسی وقت لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔ میں اٹھ کر گئی اور ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے لوسی بول رہی تھی۔

''تمہیں اس وقت یہاں ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے دردبھرے لہجے میں کہا اور میں بُری طرح گھبرا گئی، نہ جانے وہ کیا کہنے والی تھی۔

''میری بہن۔'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''کسی نے اسے قتل کر دیا۔''

''کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں آ رہی ہوں اور پولیس کو فون کر دو۔''

یہ کہہ کر میں نے فون باس کو تھما دیا اور کہا۔ ''وہ مر چکی ہے۔''

مسز گیلانٹ نے اپنے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا لوسی۔ جیسیکا کا انتظار کرو اور وہی کرنا جو وہ کہے۔''

میں نے فون اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ہم لوگوں نے اس کے ساتھ سخت رویہ تو اختیار نہیں کیا کیونکہ اس کی بہن کا قتل چند گھنٹے پہلے ہی ہوا ہے۔''

''نہیں۔'' میری ماں نے غصے سے کہا۔ ''تمہیں اب

تک نکل جانا چاہیے تھا۔''

''میں جا ہی رہی تھی۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

میں گریٹا کے اپارٹمنٹ کے باہر لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھی تو بیرونی دروازے پر مجھے ایک پولیس والے نے روک لیا۔ میں نے ایک سراغ رساں کا حوالہ دیا جو چند بلاک کے فاصلے پر رہتا تھا تو اس کے چہرے کی سختی کچھ کم ہوئی اور وہ بولا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ اس کی بہن نے تمہیں فون کیا تھا؟''

میں نے اپنا فون اس کے سامنے کر دیا تاکہ وہ لوسی کی کالوں کی فہرست دیکھ سکے۔

''اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم اس میں جعل سازی بھی کر سکتی ہو۔''

''میں ایسا کیوں کروں گی۔ میں ان لوگوں کی طرح کسی اخبار کی رپورٹر نہیں ہوں جو اس وقت یہاں موجود ہیں۔''

اس سے پہلے کہ یہ بحث آگے بڑھتی، میرا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف لوسی تھی۔ ''تم کہاں ہو؟ یہ لوگ مجھے اپارٹمنٹ سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہے۔''

''تمہارے گھر کے باہر۔ کیا تم مجھے اندر بلا سکتی ہو؟''

میں نے پولیس آفیسر کی جانب دیکھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے تو وہ میرے راستے سے ہٹ گیا اور میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی لوسی کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے آگے زرد فیتہ لگا دیا گیا تھا۔ لیکن وہاں ایک اور پولیس آفیسر کی موجودگی میرے لیے رکاوٹ بن سکتی تھی۔ اسی وقت دروازے پر لوسی نمودار ہوئی۔

''یہ میرے ساتھ ہے۔'' لوسی نے کہا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''لوسی، اب تم کرائم سین کا حصہ ہو میں نہیں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔

''لیکن تمہیں اندر آنا ہوگا، میری بہن......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے لیے اپنے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے میں ہمدردی سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اپنے آپ پر قابو رکھو اور بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟''

''میں بہت پریشان تھی۔ گریٹا نے اپنی ای میل بند کر دی تھی اور میں ایس ایم ایس یا فون کے ذریعے اس سے رابطے میں تھی۔ لیکن وہ کئی گھنٹوں سے میری فون کال یا پیغام کا جواب نہیں دے رہی تھی اور نہ ہی اس نے کچھ پوسٹ کیا۔ میں پریشان ہو کر یہاں آئی تو اسے مردہ حالت میں پایا۔''

''تمہارے پاس اس جگہ کی چابی ہے؟''

لوسی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ تم اس سے سوالات نہیں کر سکتیں۔ یہ موقع کی گواہ ہے۔'' پولیس والے نے کہا۔

میں نے اسے اپنا کارڈ پکڑا دیا جسے اس نے تین مرتبہ الٹ پلٹ کر دیکھا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''مسز گیلانٹ!''

''اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی وہ نیویارک پولیس کو بہت پسند کرتی ہے اور میں بھی۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''اندر چلی جاؤ۔ تمہارے فنگر پرنٹ لیے جائیں گے۔''

میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جب فنگر پرنٹ لیے جا چکے تو لوسی مجھے اپارٹمنٹ کے اس حصے میں لے گئی جو کرائم سین کا حصہ نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک کاؤچ پڑی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گئی اور اس جگہ کا سرسری طور پر جائزہ لینے لگی۔ ٹیک کی لکڑی سے بنے ہوئے فرنیچر کے علاوہ لکڑی کے فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا لیکن ان کی تعداد میری توقع سے بہت کم تھی۔ دراصل مسز گیلانٹ کی دس ہزار کتابوں کے ذخیرے کو ہی میں ایک معیار سمجھتی تھی۔ میز اور کرسیوں کے علاوہ ایک چھوٹا سا اندرونی کچن بھی تھا جو ایک بیڈروم کی ضرورت کے لیے کافی تھا۔

''میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی کیونکہ ان لوگوں کو اپنا کام کرنا ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''لہٰذا میں صرف دو سوالات کروں گی۔ تمہارے علاوہ اس اپارٹمنٹ کی چابی اور کس کے پاس ہے؟''

لوسی نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی اور بولی۔ ''ہماری ماں کے پاس لیکن وہ لندن میں رہتی ہے اور صرف سال میں دو مرتبہ یہاں آتی ہے۔ ایک چابی میرے پاس ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کے سابقہ شوہر کے پاس اس جگہ کی چابی نہیں ہے کیونکہ وہ دونوں کبھی یہاں اکٹھے نہیں رہے۔''

''اس نے ایک شادی اور بھی کی تھی۔ اس کے پاس یہاں کی چابی ہو سکتی ہے؟''

لوسی نے اپنی انگلی دانتوں میں دبالی۔ یہی خاموشی میرے سوال کا جواب تھی۔

''اس کے علاوہ کوئی اور؟''

''ایک ہستی اور ہوسکتی ہے۔ مجھے گریٹا کے گھر پر ہونے والی وہ میٹنگ یاد ہے جس میں اسے تقریر کرنا تھی اور وہ حیران رہ گئی جب اس نے اپنی ایک دوست کو دیکھا جو اسی کی طرح حقوقِ نسواں کی علمبردار تھی۔''

''کون؟'' میں چاہ رہی تھی کہ وہ غیر ضروری طوالت کے بجائے مختصر بات کرے۔

''لائیرالی۔ میں خود بھی حیران تھی کیونکہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتی ہیں۔''

اس کی حیرانی بجا تھی۔ یہ مجھے چند گھنٹوں بعد معلوم ہوا کہ گریٹا سمز اور لائیرالی دونوں ہی حقوقِ نسواں کی علمبردار کے طور پر پہچانی جاتی تھیں۔ انہیں ایک دوسرے کا حریف بھی سمجھا جاتا تھا۔ مجھے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہوسکی لیکن اس پر بحث ہوتی رہتی تھی کہ دونوں میں سے کون اپنے نظریات پر سختی سے قائم ہے اور کون اعتدال پسند ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

''تمہارا دوسرا سوال کیا تھا؟'' لوسی اپنا ناخن چباتے ہوئے بولی۔

''گزشتہ دو روز کے دوران گریٹا کو اس اجنبی کی جانب سے کوئی دھمکی آمیز پیام ملا؟''

لوسی اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نہیں جانا چاہ رہی تھی لیکن اس کا تحکمانہ انداز دیکھ کر انکار نہ کرسکی۔ اس نے بیڈروم کی طرف بڑھنا شروع کیا جبکہ وہاں زرد فیتہ لگا ہوا تھا۔

''اندر دیکھو۔'' اس نے کہا۔ میں اس کے پیچھے کھڑی رہی۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ گریٹا کی لاش پر چادر پڑی ہوئی تھی لیکن اس کے عقب میں بیڈروم کی دیوار پر مجھے نفرت کی انتہائی زوردار اور اصلی مثال نظر آئی جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور اس لفظ کو دیکھ کر میں جان گئی کہ لوسی نے یہ بات اتنے یقین سے کیوں کہی تھی کہ اسی اجنبی نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

رات کو کھانے کے دوران میں نے مسز گیلانٹ کو تفصیل بتائی تو انہوں نے میری اس صلاحیت کی تعریف کی کہ میں جائے وقوعہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی اور یہ بھی پوچھا کہ میں نے لاش کو ٹھیک طرح سے کیوں نہیں دیکھا۔

''تم نے کبھی آج تک کوئی لاش نہیں دیکھی، جب سے میں پیدا ہوئی ہوں۔'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف ستائیس سال کی ہوں جبکہ یہ ایجنسی میری پیدائش سے دو سال پہلے وجود میں آگئی تھی۔''

''اب بھی کوئی لاش نہیں دیکھوں گی تاوقتیکہ اس گھر میں کسی کی موت نہ ہوجائے۔'' میری باس نے جل کر کہا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارا پیارا سراغ رساں دوست ہماری مدد کرے گا۔ درحقیقت وہ پہلے ہی وعدہ کر چکا ہے۔''

مجھے مسز گیلانٹ کے ٹیلی فون استعمال کرنے کی مہارت پر کبھی شبہ نہیں رہا جو ہر ممکن حد تک ایس ایم ایس اور ای میل کو ترجیح دیتی تھیں۔ انہوں نے دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ای میل اکاؤنٹ چیک کرو۔ شاید کچھ تصویریں آرہی ہوں۔''

مسز گیلانٹ کا کہا ہوا ٹالنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی چنانچہ میں نے کمپیوٹر کا رخ کیا۔ وعدے کے مطابق تصویریں آگئی تھیں۔ ابھی ہمارا ڈنر ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم یہ تصویریں دیکھنا چاہوگی؟''

''شاید تم ابھی کھا رہی ہو لیکن میں ختم کر چکی ہوں۔''

میں نے ان تصویروں کے پرنٹ نکال کر باس کے حوالے کردیے اور یوں ظاہر کیا جیسے میں نے ان کا طنز آمیز جملہ نہیں سنا۔ باس نے ان تصویروں کو سرسری انداز میں دیکھا البتہ ان کی بائیں آنکھ کی پلک میں ہلکی سی تھرتھراہٹ نمودار ہوئی جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ باس کو ان تصویروں میں کوئی خاص بات نظر آگئی ہے۔ انہوں نے وہ تصویریں میز پر رکھیں اور بولیں۔

''کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اسی اجنبی نے قتل کیا ہے؟''

''لوسی کو یقین ہے کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے لیکن اگر یہ وہی ہے تو اسے اپارٹمنٹ کا تالا کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت بھی پیش آئی ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ چابی کیسے حاصل کی۔ دوسری بات یہ کہ وہ عمارت کے بیرونی دروازے پر لگے کیمرے کی گرفت میں کیوں نہیں آیا۔ میں نے وہاں سے واپس آتے وقت کیمرا چیک کیا تھا۔ وہاں موجود پولیس والے نے بتایا کہ یہ کئی ماہ سے خراب ہے اور کسی نے اسے ٹھیک کروانے یا تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''اس آفیسر کو پریشان ہونا ہی چاہیے۔'' مسز گیلانٹ نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ نااہلی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ کہ گریٹا کے اپارٹمنٹ کی چابی کن

لوگوں کے پاس تھی؟"

لوسی نے اس بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں وہ میں نے باس کے گوش گزار کردیں۔

"لائیرالی۔" مسز گیلانٹ نے آہستہ سے اس کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے۔" ان کی آواز میں تخی نمایاں ہوگئی تھی۔

"تم اس کی پرستار نہیں ہو جبکہ ہر کوئی اسے پسند کرتا ہے۔" میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"اس نے پچیس سال پہلے معروف مصنفہ اور حقوقِ نسواں کی علمبردار جرمین گریر کے قافلے میں شمولیت اختیار کی تھی اور مجھے شبہ ہے کہ اس کے بعد سے اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تم اس سے رابطہ کر کے کل کے لیے ملاقات کا وقت طے کرلو۔ اس کے علاوہ گریٹا کے پہلے شوہر کو بھی بلالو۔ میں اپنے طور پر تفتیش کروں گی۔ تم انٹرنیٹ پر تلاش جاری رکھو۔"

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے باس خود ہی وہیل چیئر گھسیٹتی ہوئی لفٹ تک گئی تاکہ اپنے کمرے میں جا کر آن لائن جوا کھیل سکے۔ مسز گیلانٹ نے پانچ سال پہلے چھان بین کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال شروع کیا تھا جب وہ گھوڑوں کی ریس پر شرط لگانے والے ایک نامعلوم گروہ کے بارے میں تحقیقات کررہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود بھی اس کھیل کو پسند کرنے لگی لیکن وہ بڑی ہوشیار تھی اور اتنا ہی نقصان اٹھاتی جتنا کہ برداشت کرسکتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے غلطی سے یہ موضوع چھیڑ دیا تو اس نے اس بری طرح مجھے گھورا کہ دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اگر وہ اس طرح چھوٹی موٹی خوشیاں سمیٹ رہی تھی تو اسے اس راستے سے ہٹانا زیادتی ہوتی۔

اس شام میں دیر تک انٹرنیٹ پر بیٹھ کر اپنے مطلب کا مواد تلاش کرتی رہی جیسے شکاری دریا میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑتا ہے۔ ہر بار میں ایک نئی گلی میں داخل ہوتی اور تھک ہار کر واپس آجاتی۔ میں نے بار بار یہ عمل دہرایا۔ کمپیوٹر کی اسکرین کو مسلسل دیکھنے سے میری آنکھوں میں درد ہونے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ زیادہ دیر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھنے سے میری بینائی متاثر ہوسکتی ہے۔ دس بج چکے تھے لیکن میری آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ لوسی کی خوفناک آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور گریٹا کے اپارٹمنٹ کی دیواروں پر لگے خون کے چھینٹے میرے دماغ میں چپک کر رہ گئے تھے۔

صبح اٹھ کر میں نے ایک بار پھر انٹرنیٹ پر تلاش شروع کردی۔ اس بار میں نے مختلف معیار اپنایا جس کا تعلق گریٹا سیمز اور میری باس سے تھا اور مجھے یوٹیوب پر ایک ایسی وڈیو مل گئی جو چند ماہ پہلے ایک طالب علم نے یوٹیوب پر ڈالی تھی۔ گوکہ وہ نرم لہجے میں بول رہا تھا لیکن اسے اپنے لہجے کی گھبراہٹ اور بے ڈھنگے لباس کا احساس نہیں تھا۔ میں نے اپنے اطمینان کے لیے اس وڈیو کو تین بار دیکھا اور اس کے بعد میں نے دوبارہ انٹرنیٹ پر تلاش شروع کردی جیسے میری زندگی کا انحصار ہی اس پر ہے اور ایک طرح سے یہ ٹھیک ہی تھا۔ جب مسز گیلانٹ لفٹ سے آئی تو میرے پاس اس کے ہر سوال کا جواب موجود ہوتا لیکن اس کے لیے مجھے لائیرالی کے آنے کا انتظار کرنا تھا۔

وہ بیس منٹ تاخیر سے آئی جو مسز گیلانٹ کی توقع سے دس منٹ زیادہ تھی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میری مخصوص نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کے سیاہ بال، سرخ پھولے ہوئے گال اور نیم وا آنکھوں نے اسے پرکشش بنادیا تھا۔ میں بھی اس کی ظاہری حالت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی لیکن یہ سحر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا کیونکہ صبح نیٹ پر کام کرتے ہوئے میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔

"میں نے اسے نہیں مارا۔ اگر تم یہی جاننا چاہتی ہو۔" اس نے آتے ہی جارحانہ انداز اپنایا۔

اگر میں اکیلی ہوتی تو شاید اس کا جملہ سن کر گھبرا جاتی لیکن باس بالکل پُرسکون تھی لہٰذا میں نے بھی اس کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

"یہ جان کر خوشی ہوئی۔" باس نے کہا۔ "لیکن میں نے سنا ہے کہ تم نے گریٹا کے ساتھ دوبارہ تعلقات استوار کرلیے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

لائیرالی کا پورا چہرہ اس کے گالوں کی طرح سرخ ہو گیا۔ "ہمارے درمیان باہمی تعاون تھا۔" اس نے کمزور آواز میں کہا۔ "ہمیں حیرت تھی کہ کیوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہے پھر احساس ہوا کہ شاید یہ نفرت نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔"

مسز گیلانٹ اور میں خاموشی سے سنتے رہے۔

"کچھ عرصے کے لیے تو یہ ٹھیک تھا۔" لائیرا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن ہمیں ان باتوں کو خفیہ رکھنا تھا۔ ورنہ جذباتی طور پر پیچیدگی پیدا ہوسکتی تھی۔ اس کی بہن لوسی نے مجھے ایک مرتبہ اس کے اپارٹمنٹ پر دیکھا تھا جس پر وہ حیران ہوئی تھی لیکن میں نے کہہ دیا کہ ہمارے

درمیان کاروباری معاملہ تھا۔ بظاہر یہی لگا کہ اسے ہماری بات پر یقین آگیا یا ہمیں ایسا محسوس ہوا اور بات ختم ہوگئی لیکن پھر اس کی کتاب شائع ہوگئی۔ میں واقعی نہیں جانتی کہ وہ اس نئی کتاب کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے ہر اس بات سے قطع تعلق کرلیا جس کے لیے وہ لڑتی رہی۔ وہ اپنی بنیاد سے ہٹ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے گلے میں حقوقِ نسواں کا طوق پڑا ہوا تھا جس سے وہ اپنے آپ کو آزاد کروانا چاہ رہی تھی۔ میں اسے بالکل نہ سمجھ سکی اور اس طرح ہم الگ ہوگئے۔'' اس کی بائیں آنکھ سے ایک قطرہ ٹپکا اور وہ بولی۔ ''لیکن لگتا ہے کہ اب میں سمجھ گئی ہوں۔''

''اور ایسا کیوں ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ مسز گیلانٹ نے ناگواری سے سر ہلایا کیونکہ وہی پوچھ گچھ کررہی تھی لیکن میں اپنے آپ کو نہیں روک سکی۔ جاننا چاہ رہی تھی کہ کیا لائیرا کا جواب میرے نظریے کی تصدیق کرتا ہے۔

''جب میں نے آخری بار گریٹا کو دیکھا تو وہ مجھے کافی گھبرائی ہوئی دکھائی دی۔ ہمارے درمیان پرانی محبت تھی اور ہم ایسا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ اب بھی دوستوں کی طرح رہ سکیں۔ میں نے کبھی اسے اتنا وحشت زدہ نہیں دیکھا تھا پھر اس نے مجھے ڈھیروں ایس ایم ایس دکھائے اور کہا کہ ٹیلی فون پر بھی اسے دھمکیاں موصول ہورہی ہیں اور اگر یہ بے ہودہ نہ ہوں تب بھی زیادہ تر میں ایک ہی جملہ دہرایا جاتا ہے 'تم نے اس کی زندگی تباہ کردی' ایس ایم ایس میں یہ بڑے حروف میں لکھا ہوتا ہے جبکہ فون پر چلا کر یہ بات کہی جاتی ہے۔''

''اس نے کہا کہ اسے سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ کتاب لکھنا، کہیں دورے پر جانا وغیرہ وغیرہ۔ میرا خیال تھا کہ وہ پاگل پن میں ہتھیار ڈالنے کی بات کررہی ہے لیکن جب میں کہتی ہوں کہ وہ شکست خوردہ لگ رہی تھی تو تم دیکھ سکتی ہو کہ یہ کیوں اتنی خوفناک بات تھی۔''

مسز گیلانٹ نے اب بھی کچھ نہ کہا۔ میں بہ آواز بلند اپنا جواب دینا چاہ رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر ایسا کیا تو مجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جائے گا۔

اس نے میری طرف اداس نظروں سے دیکھا۔

لائیرا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''میں تو اسے جانتی بھی نہیں پھر اس کی زندگی کیسے تباہ کرسکتی ہوں اور اسے بھی میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ میں پیچھے ہٹ گئی اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ ایک بار آپ اپنے لباس میں تبدیلی کریں تو اس کے نشانات باقی رہتے ہیں۔ اس کے بعد گریٹا نے مجھے چلے جانے کے لیے کہا۔''

لائیرا نے اپنی بات ختم کی اور ہچکیاں لینے لگی۔ مسز گیلانٹ اور مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ ہم اتنے رقیق القلب نہیں تھے کہ بات بات پر آنسو بہانے بیٹھ جاتے۔ ویسے بھی یہ ہمارے منصب اور وقار کے خلاف تھا۔ لائیرا نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ ''مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے اس کی بات سنی اور چلی آئی۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے دور چلی گئی ہے۔''

اس کے بعد لائیرا نہیں رکی۔ جب وہ گئی تو ڈھائی بج رہے تھے اور ہمارا کافی وقت ضائع ہوگیا تھا۔ مسز گیلانٹ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جیسیکا! اب تم مجھے بتا سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اس کیس کو بہت جلد اختتام تک پہنچا سکیں گے۔''

''لیکن تم پہلے ہی سب کچھ جانتی ہو۔ یہ تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے۔''

''اس کے سابقہ شوہروں کی طرف سے مجھے پریشانی ہے۔'' باس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ تو معلوم کرلیا کہ طلاق کے بعد اسے ایک مثبت رقم مل گئی تھی اور سابقہ شوہروں سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اس کا پہلا شوہر ایک کالج پروفیسر تھا۔''

''تم تو اسے جوانی کے دنوں سے جانتی ہو۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

باس کے چہرے پر رونق آگئی جو کہ ایک مثبت علامت تھی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میں اس کی پہلی بیوی کو بھی جانتی ہوں اور وہ اسکینڈل بھی۔'' مسز گیلانٹ نے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''یہی وہ بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہ رہی ہو۔''

میں نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے باس کو گریٹا سیکنز کے بارے میں وہ تمام معلومات بتادیں جو میں نے صبح میں حاصل کی تھیں۔ اس کی شادی اپنے پہلے شوہر سے انیس سال کی عمر میں ہوئی تھی جب اس نے یونیورسٹی میں تحریک نسواں کے حق میں آواز اٹھانا شروع کی تھی۔ یہ شادی صرف اس لیے حیران کن نہیں تھی کہ دونوں کی عمروں میں واضح فرق تھا۔ اس وقت پروفیسر چوالیس سال کا ہوچکا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ دس سال قبل اس کی پہلی بیوی اسے اور دو بیٹوں کو چھوڑ کر چلی گئی تھی اور ان کے درمیان اس بات پر اتفاق ہوگیا تھا کہ پروفیسر

دوبارہ کسی عورت سے شادی نہیں کرے گا۔ پروفیسر ایسا نہیں سمجھتا تھا اور اس نے اپنے بیٹوں کو بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی کہ شادیاں ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتیں اور وہ ایسی کسی شرط پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہے لیکن اس کے بیٹوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

میں نے یوٹیوب کی اس ویڈیو کے بارے میں سوچا جو میں نے صبح دریافت کی تھی۔ وہ ویڈیو نفرت، تحریک نسواں کی مخالفت اور گریٹا پر تنقید سے بھری ہوئی تھی۔ وہ نوجوان شخص اتنا ہوشیار تھا کہ اس نے ایک مرتبہ بھی گریٹا کا نام نہیں لیا تھا پھر میں نے اسی چینل کی دوسری ویڈیوز پر غور کیا جو سب تحریک نسواں کے خلاف نفرت انگیز مواد پر مبنی تھیں۔ میں نے دیگر متعلقہ ویڈیوز کے بارے میں چھان پھٹک کی تو یہ انکشاف ہوا کہ اس چینل کا مالک پروفیسر کا بڑا بیٹا ہے اور گریٹا کے اپارٹمنٹ سے صرف دس بلاک کے فاصلے پر رہتا ہے۔

اپنی کہانی ختم کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ گزشتہ شب کیا ہوا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔ ”رات تم نیٹ پر جو نہیں کھیل رہی تھیں؟“

مسز گیلانٹ نے نادم ہوئے بغیر کہا۔ ”میں نے ایک نظریہ قائم کیا تھا اور اسی پر کام کر رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تم بھی اپنے طور پر اس کی تصدیق کرلو۔ اب ہم پانچ بجے والی ملاقات منسوخ نہیں کریں گے۔“

وہ میری باس ہی نہیں ماں بھی تھی اور کبھی برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ میں اس سے دو قدم آگے چلوں لیکن اس لمحہ نے مجھے یہ احساس دلا دیا کہ میں واقعی مسز گیلانٹ جیسی اچھی سراغ رساں بننا چاہتی ہوں۔

ٹھیک پانچ بجے گریٹا کا سابق شوہر اور یمبس یونیورسٹی میں ہیومینیٹیز کا پروفیسر پیٹر لاروس اپنے دو بیٹوں جیسی اور سائمن کے ساتھ پہنچ گیا۔ سائمن میرا ہم عمر تھا جبکہ جیسی اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ دونوں میں سے کسی کے سر پر بھی پورے بال نہیں تھے۔ سائمن کا قد سب سے زیادہ یعنی چھ فٹ ایک انچ جبکہ جیسی کا قد اس سے ایک انچ اور باپ کا قد تین انچ کم تھا۔ وہ مسز گیلانٹ کے بلاوے پر آئے تھے کیونکہ اس کی نظر میں وہ تینوں مشتبہ تھے اور ان کے پاس انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ انہیں اسموکنگ روم میں بٹھایا گیا جو دراصل میرا دفتر تھا۔ کیونکہ میں اور باس دونوں ہی سگریٹ نوشی نہیں کرتے تھے۔ اس لیے میں نے اس جگہ کو اپنا دفتر بنا لیا تھا۔ جس کی مجھے اشد ضرورت تھی اور میں اپنی ریسرچ کے لیے اس جگہ کو استعمال کرتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر باس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

ہمارے بیٹھنے کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ میں اپنی چیئر اور باس اپنی وہیل چیئر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پروفیسر پیٹر ایک کونے میں کھڑا رہا جبکہ دونوں بیٹے کمرے کے دوسری جانب ایک کاؤچ پر بیٹھ گئے۔ مسز گیلانٹ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کتنی دلچسپ بات ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں سائمن پر جما دیں۔ ”ایک بھائی نے یہ کام کیا لیکن دوسرا بھائی اس سے بھی زیادہ ذمے دار ہے۔“

جیسی اور سائمن دونوں نے چونک کر دیکھا لیکن اپنے جذبات ظاہر نہ ہونے دیے۔ سائمن نے بور ہونے کی اداکاری کرنے کی کوشش کی لیکن جیسی اپنی دلچسپی نہ چھپا سکا۔ ممکن ہے کہ وہ خوف محسوس کر رہا ہو۔ پیٹر نے غصے سے کہا۔ ”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے ایلین۔“

میں اپنی ماں کا پہلا نام سن کر حیران رہ گئی۔ کوئی بھی اسے اس نام سے نہیں پکارتا تھا۔ پیٹر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ہمیں ان لڑکوں پر قتل کا الزام لگانے کے لیے بلایا ہے؟“

”گریٹا سیمز نے ان کی زندگی تباہ کردی۔ یہ وہ جملہ ہے جو اس کو پریشان کرنے والے شخص نے بار بار استعمال کیا۔ اس نے تمہاری بیوی بننے کے بعد ان لڑکوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی ماں کی جگہ ہے اور ان سے ویسی ہی محبت کرے گی لیکن وہ بھی ان کی حقیقی ماں کی طرح انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔“

مسز گیلانٹ نے بات ختم کر کے سائمن کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”تم فلم اسکول میں تھے؟“

سائمن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اور وہاں تمہاری ملاقات ایلیسا گورڈن سے ہوئی۔ وہ تمہاری ٹیچر تھی۔ جب اس کی شادی گریٹا سے ہوئی تو تمہیں اس بات کا پتا کب چلا؟“

”تمہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں۔“ پیٹر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”پیٹر، اسے جواب دینا ہوگا۔ تم اس وقت میرے گھر میں ہو اور تمہیں یہاں کے اصولوں پر عمل کرنا ہوگا جن میں میرے سوالوں کا جواب دینا بھی شامل ہے۔“ باس نے سخت لہجے میں کہا۔

”دسمبر کے اختتام پر۔“ سائمن نے کہا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو اس کی مترنم آواز میرے لیے باعث کشش

ہو سکتی تھی۔ ’’اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں ہماری کلاس کو الوداعی پارٹی دی تھی۔‘‘

’’جو کہ گریٹا کا بھی اپارٹمنٹ تھا۔‘‘ مسز گیلانٹ نے کہا۔

’’میں نے وہاں شیلف میں گریٹا کی ایک کتاب دیکھی اور پروفیسر سے پوچھا کہ کیا یہ کتاب اسے پسند آئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس پر اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ مجھے پسند کرنا ہی ہو گی۔ وہ میری بیوی ہے مجھے اس پر یقین نہیں آیا۔ میرا اندازہ ہے کہ صحیح سمت میں نہیں سوچ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جانا چاہیے لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں سے کچھ لے کر جانا ہے۔‘‘

’’اپارٹمنٹ کی چابی!‘‘ مسز گیلانٹ نے خیال ظاہر کیا۔

جیسی خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ ’’تم غلط سمجھ رہی ہو۔ یہ چابی میں نے حاصل کی تھی جب میں ایک ٹیم کے ساتھ کام کررہا تھا جو عمارت کی بھٹیوں کا معائنہ کیا کرتی تھی۔ اس طرح میرے لیے چابی کا حصول آسان ہو گیا۔‘‘

باس نے پیٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’ماں کے جانے کے بعد ان لڑکوں کے ساتھ کبھی بھی تمہارے اچھے تعلقات نہیں رہے اور جب گریٹا کے ساتھ بھی تمہاری شادی کامیاب نہ ہو سکی تو ان تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہو گیا، خاص طور پر جیسی کے ساتھ......‘‘

’’تم کیسے جانتی ہو؟‘‘ جیسی پھٹ پڑا۔

’’میں ایک سراغ رساں ہوں اور مجھے ایسی باتوں کو جاننے کا معاوضہ ملتا ہے۔‘‘

مجھے مزید سننے کی خواہش نہیں تھی کیونکہ جانتی تھی کہ واقعات کس ترتیب سے پیش آئے ہوں گے۔ سائمن کو جب اپنی فلم اسکول ٹیچر اور سابق سوتیلی ماں گریٹا کے تعلقات کا علم ہوا تو اسے شدید غصہ آیا اور اس نے جیسی کے دل میں بھی گریٹا کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا۔ ان دنوں وہ اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ تین ماہ قبل جب وہ اسپتال سے فارغ ہوا تو اس نے ایک کمپنی میں ملازمت کرلی جو رہائشی عمارتوں میں مرمت اور دیکھ بھال کا کام کرتی تھی۔ ادھر سائمن نے ای میل کے ذریعے اپنے آپ کو ایک نوجوان فلم میکر ظاہر کیا جو گریٹا سے اس کی کتاب کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا اور اس طرح وہ گریٹا کا سیل فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے گریٹا کو ٹیلی فون کال اور ایس ایم ایس کے ذریعے دھمکیاں دینا شروع کردیں۔ اگر وہ کبھی شہر سے باہر جاتا تو اس کی غیر موجودگی میں جیسی یہ فریضہ سرانجام دیتا۔

ایک دن موقع ملتے ہی دونوں بھائی گریٹا کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور اسے قتل کردیا۔ سائمن ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ اس نے دیوار پر وہ بے ہودہ لفظ نہیں لکھا۔ یہ کام جیسی نے کیا تھا لیکن اس نے کئی مرتبہ گریٹا کے جسم پر چاقو سے وار کیے ہوں گے۔ ان وڈیوز سے اس کا برتاؤ ظاہر ہو گیا تھا۔

کلاک نے چھ کا گھنٹا بجایا تو مسز گیلانٹ بولی۔ ’’میں بہت کچھ کہہ چکی ہوں اور تم نے بھی اعتراف کرلیا ہے۔ جب تم باہر نکلو گے تو ایک پولیس سراغ رساں تمہیں اس جگہ لے جائے گا جہاں تمہیں جانا چاہیے۔‘‘

سائمن کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا جیسے وہ بھاگنے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ اب میرے بولنے کی باری تھی۔ میں نے کہا۔ ’’شاید تم پولیس کو چکما دے کر فرار ہو جاؤ لیکن مسز گیلانٹ سے نہیں بچ سکتے۔‘‘

دونوں لڑکے اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے باپ کے ساتھ کمرے سے باہر چلے گئے۔ مسز گیلانٹ کا سراغ رساں دوست پورے وقت باہر انتظار کرتا رہا اور اس نے پوری گفتگو ریکارڈ کرلی۔ جیسے ہی سائمن اور جیسی باہر نکلے۔ اس نے دونوں کو گریٹا سیجز کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا۔ جب وہ دونوں کو ان کے حقوق کے بارے میں بتا چکا تو میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

’’سائمن!‘‘

’’ہاں۔‘‘ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

’’وڈیوز کے لیے بہت شکریہ۔ ان سے ہمیں بہت مدد ملی۔‘‘

مسز گیلانٹ نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور دونوں لڑکوں نے مجھے ایسے دیکھا کہ جان سے مار دیں گے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انہیں ہتھکڑی لگ چکی تھی۔

گریٹا کی کتاب کئی ہزار کی تعداد میں فروخت ہوئی اور اس پر سوشل میڈیا میں سنگین نوعیت کی بحث چھڑ گئی۔ گریٹا کی بہن لوسی نے صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ اس کے بارے میں آخری خبر یہ سنی کہ وہ سکون کی تلاش میں مین چلی گئی۔ ان لڑکوں کی گرفتاری کے بعد مسز گیلانٹ اور میں نے ان خبروں پر توجہ دینا ختم کردی۔ ویسے بھی ہمارے پاس ایک نیا کیس آگیا تھا۔
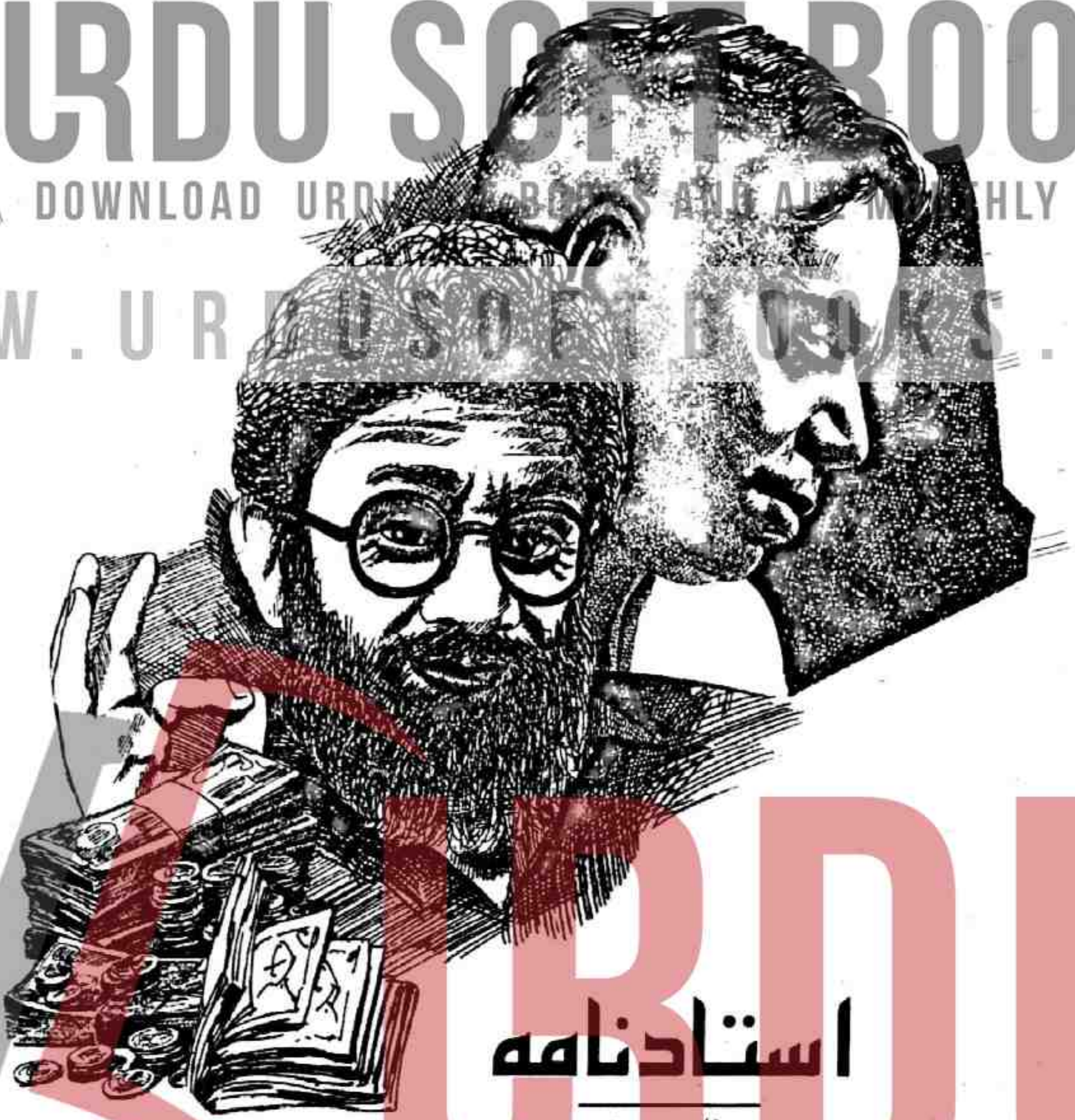
استاد نامہ

منظر امام

زبانِ اردو کو جدید الفاظ اور ترکیبات سے نوازنے کا سہرا استاد کے سر باندھا جاسکتا ہے... اپنے ہی انداز کی خاص شخصیت ہونے کے ساتھ وہ جدید اردو زبان کے بانی ہیں... جو نہ سمجھے اسے خدا کوئی... نئے سال کے آغاز پہ استاد کے قدر دانوں اور مداحوں کے لیے خاص تحفۂ عقیدت...

نیکی اور بدی کے راستوں کی ہمواری اور ناہمواری کا پتا دیتی مختصر نویسی......

بہت دنوں سے استاد کی طرف جانا نہیں ہوا تھا۔ میں استاد کی خیریت معلوم کرنے جب ان کے محل میں پہنچا تو وہاں ایک عجیب صورت حال تھی۔

یاد رہے کہ استاد اپنی جھونپڑی کو محل کہا کرتے تھے۔ تو استاد کے محل میں عجیب طرح کے لوگ بھی تھے۔ عورتیں، مرد، گندے سے بچے۔ جس طرح کے بھکاری ہوا کرتے ہیں۔

استاد ان کے سامنے ایک تخت پر بیٹھے تھے۔ استاد مجھے دیکھ کر چہک اٹھے۔ ”تم بالکل وقتِ فیض یاب میں آگئے ہو۔ اب ان سیر چشموں اور کج کلاہوں کو میرے افتخارِ بے جا سے گنجے شا نگاہ کرو۔ یہ مرلی دھرن میری زبان مبارک کو آثارِ بے مہابہ سمجھ کر اہرام مصر ہوئے جارہے ہیں۔“

مطلب یہ تھا کہ میں بالکل ٹھیک وقت پر استاد کے پاس پہنچا ہوں۔ استاد یہ چاہتے تھے کہ میں ان کی گفتگو کو آسان کرکے ان لوگوں کو سمجھاؤں۔

”وہ تو ٹھیک ہے استاد۔ میں ان لوگوں کو سمجھا دوں گا لیکن آپ ان کو کہاں سے پکڑ لائے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سب سیر چشمیِ فلک امروز ہو رہے تھے۔“ استاد نے بتایا۔ ”گلی کوچے میں سنگِ آرزوؤں کی طرح موسمِ فراقِ فغاں تھے۔ میں اپنی کج کلاہی اور سلطانِ آشنائی کے لیے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔“

اچانک ان میں سے ایک بوڑھے نے مجھے مخاطب کیا۔ ”بھائی جان! تم کچھ سمجھ دار لگتے ہو۔ اس بڈھے سے پوچھو کہ یہ ہمیں یہاں کیوں لے آیا ہے؟“

”لیکن تم لوگ ہو کون؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے بابو صاحب! ہم منگتے لوگ ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”بھیک مانگنے کے لیے دوسرے شہروں سے آئے ہیں۔“

”یہ تو سمجھ گیا لیکن تم سب جمع ہو کر یہاں کیوں آ گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے بابو! یہ پتا نہیں کیوں ہم سب کو یہاں لے آیا ہے اور اس کی کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ یہ بولتا کیا ہے۔ زبان کون سی ہے اس کی؟“

”زبان تو خیر اردو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ویسے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ تم لوگوں کو کیوں لائے ہیں۔“

”ہاں بابو اس سے بات کرو۔ ہم سب تو کھانے پینے کے لالچ میں چلے آئے تھے۔ یہاں آ کے پتا نہیں کیا کیا سننا پڑ رہا ہے۔“

”اُستاد یہ سب کیا ہے۔ کیوں لائے ہیں ان سبھوں کو؟“

”مرغانِ غلا یا کرنے کے لیے۔“ استاد نے بتایا۔ ”آمادۂ سنگِ یشب سے فرقان و خفقان کرنے کے لیے۔ تاکہ سایۂ ابرِ پاکیزہ ان کو مقلاق ہو جائے۔“

”خدا کے لیے استاد کچھ رحم کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری ایسی گفتگو سے تو میں بے موت مر جاتا ہوں۔ یہ تو پھر بھی دوسری قسم کے سادہ لوگ ہیں۔“

”ابے ان سے فرماؤں واستادہ ہو جاؤ کہ یہ دغائے بے خطر میں ہیں۔ سفر میں ہیں... اور حضر میں ہیں۔ کوئی کفرانِ نعمت ان کو دستِ طلب دراز کرنے سے افسردہ و رنجور نہیں کر سکتا۔ محافظ قانون اور جنون ان کے ہمراہ ہیں۔“

مطلب یہ تھا کہ استاد نے ایک طرح سے ان بھکاریوں کو پروٹیکشن دے دی تھی کہ وہ بے دھڑک بھیک مانگتے رہیں۔ کوئی ان کو منع نہیں کرے گا۔ کیونکہ قانون کے محافظ ان کے ساتھ ہیں۔

”استاد! یہ آپ نے کون سا کام سنبھال لیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ نے ان بھکاریوں کا ٹھیکا کیوں لے لیا؟“

”میں ان کے لیے فرستادۂ شب خون ہوں۔ چشمِ گریہ ناک سے الم ناک ہو گیا ہوں۔“

استاد کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان بھکاریوں کے لیے بہت سنجیدہ ہیں اور ان کے غم میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔ اسی دوران میں پولیس کا ایک سب انسپکٹر جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر بھکاریوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔

”سنجان بنو۔“ استاد نے ڈانٹ کر کہا۔ ”وجہ بے گانگ کا کوئی وطیرہ دوا اور یا قفا نہیں ہے۔ یہ معاونت سیرِ طلب کے لیے حاضرِ محلات میں فروکش ہوئے ہیں۔“

اس پولیس والے کو میں بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”رفیق صاحب! یہ سب کیا چکر ہے، کیا ہو رہا ہے یہاں؟“

پھر اس پولیس والے نے جو کچھ بتایا۔ اس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا، اس کا کہنا تھا۔ ”صاحب! آپ خود دیکھتے ہیں۔ رمضان کے ہوتے ہی سیکڑوں بھکاری اس شہر پر یلغار کر دیتے ہیں۔“

”ہاں، وہ تو میں بھی دیکھتا ہوں لیکن اس کا استاد سے کیا تعلق؟“

”استاد سے تعلق یہ ہے کہ استاد نے ان بھکاریوں کا ٹھیکا لے لیا ہے، بلکہ ٹھیکا لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”بھائی رفیق کھل کر بتاؤ۔“

پھر پتا چلا کہ استاد نے یہ سازش کی تھی کہ پولیس والے ان بھکاریوں سے ہر شام کو پیسے چھین لیا کریں گے۔ اس کے لیے استاد نے رفیق کو ٹھیکا دیا تھا پھر جب یہ بھکاری پولیس والوں کے ہاتھوں تنگ ہو جائیں گے تو استاد ان کو اپنی امان میں لے لیں گے۔ امان میں لینے کے بعد اس علاقے کے پولیس والے ان کو تنگ نہیں کریں گے۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ یہ بھکاری ہر شام اپنی دن بھر کی کمائی استاد کے پاس جمع کرا دیں گے۔ اور عید سے دو تین دن پہلے پیسوں کا حساب لگا کر پچھتر فیصد ان بھکاریوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ بقیہ پچیس فیصد میں رفیق اور اس کے ساتھی پولیس والے شامل ہوں گے۔ تھوڑا سا حصہ استاد کو بھی مل

جائے گا۔

”یہ تو بہت بے تکی بات ہے رفیق صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بھکاری استاد پر بھروسا کیوں کرنے لگے؟“

”ہمارے ڈر سے۔“ رفیق ہنس دیا۔ ”اب مجھے استاد کے پاس دیکھ کر ان کو یقین آگیا ہوگا کہ استاد اور پولیس والے ملے ہوئے ہیں۔“

”بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر یہ بھکاری پولیس کے ہاتھوں تنگ ہو رہے ہیں تو کسی اور علاقے کی طرف نکل جائیں۔“

”آپ کو یہی بات تو نہیں معلوم۔“ رفیق نے کہا۔ ”اب شہر میں جگہ کہاں ہے، ہر جگہ کی بکنگ فل ہو چکی ہے۔ دو دو مہینے پہلے سے بکنگ کرانی پڑتی ہے۔“

”اور اس بکنگ میں کون کون شامل ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس والے اور ان کے ٹھیکے دار۔“ رفیق نے بتایا۔

”لیکن استاد کیوں ان کا درد لے کر بیٹھ گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”استاد کا یہ کہنا ہے کہ وہ بھکاریوں کے درمیان مساوات چاہتے ہیں۔ انصاف چاہتے ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”وہ اس طرح کے ہر بھکاری اپنے اپنی جگہ محنت کرتا ہے۔ دن بھر بھیک مانگتا ہے لیکن کسی کو بہت کم بھیک ملتی ہے۔ کسی کو بہت زیادہ مل جاتی ہے۔ اسی لیے استاد چاہتے ہیں کہ ان سبھوں کی کمائی اکٹھی کر کے ان میں برابر برابر تقسیم کر دی جائے۔ تاکہ سب ہنسی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔“

”خدا جانے یہ سب کیا چکر ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”استاد کو یہ کیا سوجھ گئی ہے لیکن ان بھکاریوں کو کون سمجھائے گا؟“

”ان کو میں سمجھاؤں گا۔“ رفیق نے بتایا۔ ”اسی لیے تو آیا ہوں۔“

استاد ابھی تک بھکاریوں سے اپنی جناتی زبان میں الجھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت صرف تماشا دیکھ رہا تھا۔

رفیق نے ان بھکاریوں کو مخاطب کیا۔ ”اوئے، میری بات سنو۔ یہ جو استاد تم لوگوں کو یہاں لے کر آئے ہیں، یہ تمہاری بھلائی کے لیے لائے ہیں۔ یہ بہت نیک اور پرہیزگار انسان ہیں۔ یہ تم بھکاریوں کو اپنی حفاظت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تم ان کی حفاظت میں آگئے تو پھر کوئی پولیس والا شام کے وقت تمہاری کمائی نہیں چھین سکے گا۔“

”ہاں جی، ہم تو بہت تنگ آچکے ہیں۔“ ایک بوڑھے بھکاری نے کہا۔ ”تین چار دنوں میں تم لوگوں نے ہماری ساری کمائی چھین لی ہے۔“

”اسی لیے استاد نے تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم ان کی پناہ میں آگئے تو پھر کوئی پولیس والا تمہیں تنگ نہیں کر سکے گا۔ خود دیکھ لو میں استاد کے پاس آیا ہوں۔ استاد کے ساتھ ملا ہوا ہوں۔“

”ارے بھائی تو ہم کس طرح ان کی پناہ میں آئیں؟“

”تم سب اپنے دن بھر کی کمائی استاد صاحب کے پاس جمع کرا دیا کرو۔“ رفیق نے بتایا۔ ”یہ پوری ایمان داری کے ساتھ رجسٹر میں تمہاری دن بھر کی کمائی لکھتے جائیں گے۔“

”واہ، یہ کیا بات ہوئی..... اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو؟“

”پھر بہت مشکل ہو جائے گی۔ کمشنر صاحب کا آرڈر ہے کہ اس علاقے میں بھکاریوں کو داخل نہ ہونے دو۔ پھر تم لوگوں کو یہاں سے بھگا دیا جائے گا۔“

”یہ تو ظلم ہے، ناانصافی ہے۔ اب تو ہمیں دوسری جگہ بھی نہیں ملے گی، پورا شہر بک ہو چکا ہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ استاد صاحب کی پناہ میں آجاؤ۔“

”اگر خود تمہارے استاد نے ہمیں دھوکا دے دیا تو؟“ ایک بھکاری نے پوچھا۔

استاد اس کی بات سن کر بھڑک اٹھے۔ ”سخن تاب تشنۂ آب۔ بلبلِ خود ساختہ، فراغِ بے جا، مجھ فرازِ ماہ کو سیارگان افتاد سمجھتا ہے۔ ناشاد سمجھتا ہے۔ میں زنجبار ہوں۔ موسلا دھار ہوں۔ میں سڑک ننی ہوں۔ روز رندانہ ہوں۔ پیمانہ ہوں۔ میخانہ ہوں۔“

”ایک تو یہ جو کہہ رہے ہیں، وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“ ایک نوجوان بھکاری منہ بنا کر بولا۔ ”اردو تو یہ بولتے ہی نہیں ہیں۔“

”یہ اردو ہی ہے۔“ رفیق نے کہا۔ ”استاد صاحب کو تمہاری بات سن کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔ وہ ناراض ہو رہے ہیں کہ اس جیسے فرشتہ انسان پر شک کیا جا رہا ہے۔“

”حوالدار صاحب۔“ ایک جوان بھکارن نے رفیق

کومخاطب کیا۔ ”وہ تو سب ٹھیک ہے۔ پھر بھی ہم لوگوں کو کوئی جمانت تو چاہیے نا، ہم اتنی دور سے دکھ اٹھا کر آئے ہیں۔ ٹھیکے دار کو پیسے دیے ہیں۔ دن بھر محنت کرتے ہیں۔ پھر اپنی محنت کی کمائی کسی اور کے حوالے کیسے کردیں؟“

”ہاں، ہاں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سارے بھکاریوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

استاد پھر بھڑک اٹھے۔ ”بدلحاظ، بدقماش، تم شوریدہ ہو، آب دیدہ ہو، رنگ ساز ہو۔“

”دیکھو استاد صاحب۔“ ایک بھکاری اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تمہارے فارسی بولنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہم لوگوں کو پوری گارنٹی چاہیے کہ تم ہمارے پیسے لے کر نہیں بھاگو گے۔“

”اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔“ رفیق نے کہا۔ ”میں پولیس والا ہوں۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ ایک ذمے دار آفیسر ہوں میں۔ پورا علاقہ استاد صاحب کو جانتا ہے۔ تم بدبخت لوگ ہو کہ ایک بندہ تمہاری بھلائی کا سوچ رہا ہے اور تم اس پر شک کر رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے، تو پھر ہم آپس میں پھیسلہ کرلیں۔“ ایک نے کہا۔

”چلو، آپس میں بات کرلو۔“

سارے بھکاری ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگے۔ میں استاد پر برس پڑا۔ ”کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ کیوں اپنی رہی سہی عزت خاک میں ملا رہے ہیں؟“

”میں ثوابِ دارین و بحرین حاصل بے مہار کر رہا ہوں۔“ استاد نے کہا۔

”اس میں کس قسم کا ثواب ہے۔ اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو یہ سارے بھکاری آپ کی زندگی عذاب کردیں گے۔“

”شہیدانِ راہِ وفا کے ساتھ سلوک گلفام و بیرام تو ہوتا ہی ہے۔“ استاد لاپروائی سے بولے۔ ”دیکھنا یہ ہے کہ گنج شائگاں کہاں ہے۔ استغفراللہ۔ بغداد و قسطنطنیہ کہاں ہے۔ خطِ اسود سے بحرِ مروارید کا کیا فاصلہ ہے؟“

”بس آپ اپنی بکواس کرتے رہیں۔“ مجھے بھی استاد کے بے تکے پن پر غصہ آگیا تھا۔ ”جب یہ لوگ آپ کی جان کو آجائیں اس وقت مجھے کچھ نہیں کہیے گا۔ میں نے آپ کو سمجھا دیا ہے۔“

”تمہیں یار پورن ماشی کو چشمک فرہاد و مجنوں سے کیا لینا دینا۔“ استاد نے کہا۔ ”تم یہ اندازہ پیراں کرلو کہ میں ان کے درمیان بول بالائے انصاف و اوتان کر کے رہوں گا۔ چاہے خود گنجلک اور سال خوردہ ہو جاؤں۔“

مقصد یہ تھا کہ وہ ان بے چاروں کے درمیان انصاف کر کے رہیں گے۔ چاہے خود ان کا جو بھی حال ہو۔ اور لوگ انہیں کچھ بھی کہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے بھکاریوں کی بھلائی کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔

وہ سب آپس میں الجھے رہے۔ اور میں ان سبھوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر ان کے محل سے باہر آگیا۔ دو چار دنوں کے بعد اسی رفیق سے پتا چلا کہ ان بھکاریوں کا استاد سے معاہدہ ہوگیا ہے۔ وہ سب اس انتظام سے بہت خوش ہیں تو میں استاد کے پاس پہنچ گیا۔

”استاد! آپ نے یہ کیا لگا رکھا ہے؟ کیوں اپنی زندگی کو عذاب میں ڈال رہے ہیں۔“

”میں طبقاتِ مظلومان کا چراغ پا اور میستری کار ہوں۔“ استاد نے کہا۔ ”میں ان کی بہتری کا برازیل اور ملک شام اور دمشق ہوگیا ہوں۔ یہ سب ترسیدہ اور خوابیدہ ہیں۔ میں انہیں رنجیدۂ دل گیر نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان کے لیے بساطِ خوں آشام بنوں گا۔ گلفام بنوں گا۔“

”گلفام بننے کے چکر میں کہیں مارے نہ جائیں۔“

”ایسا دشتِ امکان نہیں ہے۔“ استاد نے کہا۔ ”یہ سب صحرائے بےخودی ہی کے ہینگ ٹھیکے دار ہیں۔ قید حیات و رنج و غم ہو رہے ہیں۔ یہ سربریدہ اور آسماں کبیدہ لوگ ہیں۔ مسافرت شب ہائے حاتم طائی کر کے یہاں امید و صال و انتقال پر آئے ہیں۔“

اس لمبی چوڑی بات کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب بے چارے اتنی دور سے کمائی کے لیے آئے ہیں۔ یہ مظلوم اور بے چارے قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا ضرور ساتھ دینا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔

”آپ کی مرضی ہے استاد۔“

”اب ایک فرمانِ بےحجاب سن لو۔“ استاد نے کہا۔ ”میں کوئی بے وقوفانِ رستم و افراسیاب نہیں ہوں۔ اور نہ ہی سبیل بے مہار و گرسنگ ہوں بلکہ جو بھی کر رہا ہوں، وہ بحیرۂ احمر اور دانش ور ہے۔“

”اب میں کیا کہوں، آپ جس کو اپنی عقل مندی سمجھ رہے ہیں۔ وہ آپ کے گلے بھی پڑ سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ میری ان باتوں کا استاد پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جو بات ان کے ذہن میں آجائے، اس کو نکالنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

جو سوچ لیا وہ سوچ لیا۔ اسی لیے میں بک بک کر کے واپس آ گیا۔

چار پانچ دنوں کے بعد افطار سے فارغ ہو کر پھر ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھے۔ مجھے دیکھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''فروغ افطار کو درستار تو کر ہی لیا ہو گا۔'' استاد نے پوچھا۔

''ہاں استاد، میں افطار کر کے ہی آیا ہوں۔''

''تو بس اب چکیدن باغ باغ ہو جاؤ۔'' استاد نے کہا۔

''میں تمہیں دیدا بر رنگ و بو سے قارون کر رہا ہوں۔''

پتا نہیں اس بات سے استاد کا کیا مطلب تھا۔

استاد ایک کونے سے ٹین کا ایک بکس اٹھا کر لے آئے۔ ''بہ چشم خود ملاحظہ و پرداختہ کر لو۔'' استاد نے اس بکس کو کھولتے ہوئے کہا۔

میری تو آنکھیں ہی پھٹی رہ گئی تھیں۔

وہ بکس نوٹوں اور سکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک روپے کے نوٹ۔ آٹھ آنے۔ چار آنے (اس زمانے میں اسی قسم کی کرنسی چلا کرتی تھی) میرے اندازے کے مطابق اس بکس میں کم از کم چار پانچ ہزار تو ضرور ہوں گے۔

''استاد! اتنے پیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔ یہ سب کار گیہ بھکاراں ہے۔'' استاد نے بتایا۔

''سب کے سب بحر قلزم سے آبنوس زماں ہوتے جا رہے ہیں۔ بہ اندازہ دختر مشرق ہو گئے ہیں۔ شمالاً جنوباً پرواز کاسہ گدائی اور سودائی ہیں۔ حوران پری رو ہیں۔''

مختصر یہ کہ استاد یہ بتا رہے تھے کہ یہ سارے روپے بھکاریوں نے جمع کیے ہیں اور وہ پابندی سے ہر شام کو اپنی کمائی استاد کے حوالے کر جاتے ہیں۔

''استاد! یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ پر بہت بڑی ذمے داری آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، اب میں سنگلاخ بے زمین ہو گیا ہوں۔'' استاد نے کہا۔

میں استاد کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔

رمضان کا مہینا بھی ختم ہونے والا تھا اور میری مصروفیات ایسی ہو گئیں کہ مجھے استاد کی طرف عید کے بعد جانا ہوا تھا اور جب وہاں پہنچا تو صورتِ حال ہی بدلی ہوئی تھی۔

استاد کی جھونپڑی (جس کو وہ محل کہا کرتے تھے) زمیں بوس ہو چکی تھی۔ لگتا تھا توڑ پھوڑ کی گئی ہو۔ وہاں محلے کے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ میں نے ان سے صورتِ حال معلوم کی تو ان میں سے ایک نے کہا۔ ''کیا آپ کو نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہوا ہے؟''

''نہیں بھائی، مجھے نہیں معلوم۔''

''یہ جو استاد تھے۔ انہوں نے بھکاریوں کا پتا نہیں کیا گولی پلا دی تھی۔ بہت سے بھکاری ان کے پاس اپنے پیسے رکھواتے تھے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ استاد بھکاریوں کی ساری رقم لے کر بھاگ گئے۔''

''بھاگ گئے؟''

''ہاں بھائی بھاگ گئے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ جو جھونپڑی کا حال دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان ہی بھکاریوں نے کیا ہے۔ بڑی توڑ پھوڑ مچائی ہے سب نے، پولیس والے بھی استاد کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔''

''اوہ خدا، اب وہ بھکاری کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کہاں ہوں گے۔ سب کے سب روتے دھوتے استاد کی جان کو گالیاں دیتے ہوئے اپنے شہروں کی طرف واپس چلے گئے۔ بے چارے عید کی کمائی کرنے آئے تھے۔ لیکن لٹ لٹا کر واپس چلے گئے۔''

میں یہ سب سن کر حیران ہوا جا رہا تھا۔

استاد سے ایسی امید تو کبھی نہیں رہی تھی۔ کچھ بھی ہو۔ وہ بے ایمان نہیں تھے۔ محنت کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ لیکن اب کیا ہوا کہ بھکاریوں کے پیسے ہی لے کر بھاگ گئے۔ پتا نہیں کیا چکر تھا۔

لیکن جاتے کہاں، استاد کو تو اسی شہر میں رہنا تھا۔ ملاقات تو ہونی تھی۔ اور ایک دن ان سے ملاقات ہو بھی گئی۔

استاد خود ہی میرے پاس میرے گھر تشریف لے آئے تھے۔

میں انہیں دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ ''استاد! آپ نے یہ کیسی گری ہوئی حرکت کی ہے۔ آپ جیسے آدمی سے ایسی امید تو نہیں تھی۔ کتنا بڑا دھوکا دیا ہے آپ نے۔''

استاد بے شرمی سے مسکراتے رہے۔

میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ''جواب دیں۔ یہ کیسی حرکت کی ہے آپ نے؟''

''میں عندلیب ثواب جاریہ ہو رہا ہوں۔'' استاد نے کہا۔ ''اطمینانِ قلب ناپور ہوں۔ افتاں و خیزاں ہوں کہ زردی مائل سرخ و سفید ہو گیا ہوں۔''

"ایسی بے تکی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔" میں اور بھی بھنا گیا۔ "اگر آپ نے نہیں بتایا تو میں خود آپ کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

"کیا تم مجھے فتاویٰ عالم گیری سمجھتے ہو۔ منتر اک سمجھتے ہو۔ تم ناک سمجھتے ہو۔" استاد کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ "میں تمہیں بحیرۂ کوہستان سے آشنائی دل پذیر کراتا ہوں۔ ماہیٔ بے آب کا سمندر ہوں۔ ارجمند کوتا ہوں آؤ میرے ساتھ۔"

میں بھی جھلا کر ان کے ساتھ ہولیا۔ اب وہ چاہے جہاں بھی لے جا رہے ہوں۔

استاد مجھے ایک ایسی بستی میں لے آئے جہاں بہت خستہ سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ادھوری دیواریں، بوسیدہ چھتیں، بستی پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔

استاد نے ایک دروازے پر دستک دی۔ یہ دروازہ بھی خستہ لکڑی کا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک عورت نے باہر جھانکا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس سے زیادہ ہی ہوگی۔ لیکن مفلسی کے باوجود اس کے چہرے سے اس کی شرافت اور اس کے خاندانی پس منظر کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ عورت استاد کو دیکھ کر چہک اٹھی تھی۔ "آئیں جناب آئیں اندر آجائیں۔"

استاد نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم اس گھر کے آنگن میں آ گئے۔ یہ ایک روایتی سا مکان تھا۔ ایک طرف ایک درخت، آنگن میں ایک تخت بچھا ہوا جس کے اردگرد پرانی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"لڑکیاں آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں آپ کئی دنوں سے نہیں آئے۔" اس عورت نے کہا۔

"انتظام خوش حال کن تو ماورائے امکان ہے نا۔" استاد نے اس سے پوچھا۔

وہ عورت جز بز ہو کر رہ گئی۔

استاد نے پھر پوچھا۔ "سمند افگن تو ہو رہا ہے نا؟"

"آپ مجھے بتائیں۔ یہ سب کیا ہے؟" میں نے اس عورت سے پوچھا۔ "استاد سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"میرا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اب یہی ہمارے لیے سب کچھ ہیں۔" اس عورت نے کہا۔ "خدا نے ان کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کر کہاں سے بھیج دیا ہے۔"

"بات کیا ہوئی؟ کیا کر دیا استاد نے؟"

پھر اس عورت نے بتایا کہ اس کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ تینوں کے رشتے لگ گئے تھے لیکن انہیں رخصت کرنے کے لیے اس عورت کے پاس کچھ نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے استاد آ گئے اور انہوں نے اتنے پیسے دے دیے ہیں کہ سادگی سے سہی لیکن تینوں بیٹیاں اپنے گھروں کی ہو سکتی ہیں۔

ایک لمحے میں، میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ استاد نے ان بھکاریوں کے پیسے اس مجبور عورت کو لا کر دے دیے تھے اور خود پر دھوکے دہی کا اتنا بڑا الزام لے لیا تھا۔

میں نے استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ "استاد! آپ نے وہی پیسے ان کو دیے ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" استاد مسکرا دیے۔ "کیونکہ میرے پاس اور کوئی ذریعۂ ستم گراں نہیں تھا۔ ان پیشہ ور لوگوں کے پیسے اگر کسی شریف اور مجبور خاندان کے کام آ جائیں تو اس میں کیا سیر چشمی ہے اصل حق دار فطرہ و زکوٰۃ اسی قسم کے مقہور اور رنجور لوگ ہوتے ہیں۔"

استاد نے یہ فرمایا تھا کہ وہ بھکاری پیشہ ور قسم کے دھوکے باز لوگ ہوتے ہیں۔ فطرہ و خیرات کے اصل حق دار اس قسم کے مجبور لوگ ہوتے ہیں۔ جو کسی کے آگے اپنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔

استاد نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے ایک بار اس عورت کو دیکھا تھا۔ پھر اس عورت کے محلے کے ایک آدمی نے استاد کو اس عورت کی مجبوریاں بتائیں۔

استاد نے اسی وقت اس کی مدد کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن کس طرح۔ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر انہوں نے پیشہ ور بھکاریوں کو لوٹنے کی پوری پلاننگ تیار کی۔ اس پولیس والے کو بھی اپنے ساتھ ملایا اور بھکاریوں کی ساری کمائی لا کر اس مجبور عورت کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"اب مجھے بدنامی چہ را درویش سے کوئی خاگینہ نہیں ہے۔" استاد نے کہا۔

مطلب یہ تھا کہ اس کی مدد کرنے کے بعد استاد کو بدنامی وغیرہ کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"استاد آپ ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔" فرطِ جذبات سے میری آواز کانپ رہی تھی۔

اور استاد بولے جا رہے تھے۔ "ارے، میں تو آب گینہ ہوں۔ سفینہ ہوں۔ دفینہ ہوں۔ ریگ بے چناب ہوں۔ خفقان ہوں۔ بادیان ہوں۔ زنجبار ہوں۔" وغیرہ وغیرہ۔

اب وہ چاہے کچھ بھی بولتے رہیں، وہ انسان بہت بڑے تھے۔ ان سے بھی بڑے جن کی زبان تو سمجھ میں آ جاتی ہے لیکن دل سمجھ میں نہیں آتے۔ ☺

فنکار

شکیل صدیقی

گزرا ہوا کل کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو... ماضی کا حصہ بن جاتا ہے... بیتے ہوئے وقت کا عروج حال کی کسمپرسی کو دور نہیں کرتا... ماضی کے عظیم فنکار کا المیہ۔ وہ وقت کی دھول میں کھو چکا تھا... اس کی راہیں سُونی سُونی سے لگنے لگی تھیں اور گردوپیش کے رنگ پھیکے پڑنے لگے تھے...

ایک مردم گزیدہ... زمانے کے ٹھکرائے ہوئے فنکار کا زندگی نامہ

اس کو منیجر سے سخت نفرت تھی۔ یہ نفرت رات والے واقعے کا پیش خیمہ تھی۔ اس نے اپنی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کو تھپتھپایا اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اچھے دنوں میں پیش کیا جانے والا ریوالور اب اس کے کام آنے والا تھا۔ اچھے دن! اس کے سینے سے دوبارہ ایک سرد آہ نکلی۔ اچھے دنوں میں اس کے گرد شائقین کی بھیڑ رہتی تھی اور اس کی میز اُن کے دیے ہوئے تحائف سے پُر رہتی تھی۔ اس کا نام نیون سائن کی

روشنی میں چمکتا تھا اور ......

’’گڈ مارننگ، نک!‘‘ کسی نے کہا اور اس کے خیالات کا ریلا تھم سا گیا۔

اس کے کانوں میں وہی آواز گونجی جس سے اسے نفرت تھی۔

’’گڈ مارننگ مسٹر ایٹکنس۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

ایٹکنس اس وقت مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بے رحمی جھلک رہی تھی۔ اس کے بال قرینے سے جمے تھے اور جسم پر دوسرے اسٹورز منیجر کی طرح بھورے رنگ کا سوٹ تھا جس میں داہنی جانب ایک پھول لگا ہوا تھا۔

’’تم ڈرامے کے آخری ایکٹ کے لیے تیار ہو؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’ہاں، مسٹر ایٹکنس۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’اور اس ایکٹ کے بعد پردہ گر جائے گا اور ڈراما ختم ہو جائے گا۔‘‘ اس نے تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ’’کیوں ٹھیک ہے نا، نک؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کا نام نک نہیں تھا۔ اس کا نام تھیٹر کی دنیا میں رینڈولف بلیئر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس نے بین الملکی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی طور پر بھی اُدھم مچایا تھا۔ ایٹکنس اس کی شہرت اور اس کے مرتبے سے بخوبی واقف تھا مگر اس وقت جان بوجھ کر اس کی تذلیل کر رہا تھا۔ اس کو ایک طرح سے احساس دلا رہا تھا کہ آج وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔

’’میرا نام نک نہیں ہے۔‘‘ اس نے بالآخر جھلا کر کہا۔

’’میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ ایٹکنس نے اپنی انگلیاں میز پر بجائیں۔ ’’میں تمہارا نام ہی بھول گیا تھا۔ کیا نام تھا تمہارا؟ رینڈولف اور اس کے ساتھ مزید کچھ تھا، کلیئر؟ فلیئر؟ شمیئر؟ کیا نام تھا تمہارا نک؟‘‘

’’میرا نام رینڈولف بلیئر ہے۔‘‘ اس کے لہجے میں تفاخر تھا۔ بالکل جیسے شیکسپیئر کے ڈرامے میں ہلمٹ یہ کہتا کہ وہ ڈنمارک کا شہزادہ ہے اس کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ رینڈولف بلیئر کا نام اتنا پُرکشش تھا کہ لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آتے تھے۔ ہوٹل کے کلرک اس کے سامنے مؤدب رہتے تھے۔ خوب صورت لڑکیاں اس سے آٹو گراف لینے کے لیے بے تاب رہا کرتی تھیں۔ ٹیلی فون آپریٹر اس کی کال فوراً ملا دیا کرتے تھے اور اس سے گفتگو کرنے کا اشتیاق رکھتے تھے۔ لیکن مسٹر ایٹکنس اس کے نام سے ناواقف تھا یا جان بوجھ کر اس کی حیثیت خاک میں ملا رہا تھا۔ اس نے اپنے ریوالور کو تھپتھپایا اور پوچھا۔

’’تم تو اسی شعبے کے آدمی ہو مسٹر ایٹکنس، تمہیں تو میرے نام سے واقف ہونا چاہیے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے جواباً سر ہلایا۔ ’’ایک آدھ مرتبہ تمہارا نام میرے کان میں پڑا ہے۔‘‘

’’واقعی؟‘‘ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

’’ہاں۔‘‘ اس نے بے توجہی سے کہا۔ ’’بعض اوقات لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ رینڈولف بلیئر کا کیا ہوا؟ وہ کہاں روپوش ہے۔ کیا اب وہ تھیٹر میں کام نہیں کرے گا۔ اس لیے میرے کان تمہارے نام سے آشنا ہیں۔‘‘

اس کے سراپا میں زہر گھلتا چلا گیا۔ لوگ اس کو اب تک نہیں بھولے تھے مگر ایٹکنس اس کی مسلسل تذلیل کر رہا تھا۔

’’نہیں ......‘‘ اس نے کہنا چاہا مگر پھر اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لیے۔

’’نہیں کیا؟‘‘

’’نہیں ...... مجھے گمنامی میں مت دھکیلو، مسٹر ایٹکنس۔‘‘

’’تمہیں کہاں نہ دھکیلوں مسٹر نک؟‘‘ اس نے معصومیت سے کہا۔

’’بکواس مت کرو۔ اب یہ ڈراما بازی ختم کرو۔‘‘ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ’’میرا نام نک نہیں ہے۔‘‘

’’معاف کیجیے گا مسٹر بلیئر۔‘‘ ایٹکنس نے کہا۔ ’’میں تو بھول ہی گیا تھا کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں ...... میرے دماغ سے محو ہو گیا تھا کہ میں ایک ایسے شرابی سے گفتگو کر رہا ہوں جو ایک معمولی سے کردار کے لیے میرے پاس ......‘‘

’’بکواس بند کرو۔‘‘ بلیئر غرایا۔ ’’میں شرابی نہیں ہوں۔‘‘

’’ہر شرابی یہی کہتا ہے۔‘‘ ایٹکنس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’میرا باپ بھی شرابی تھا اور میں نے بغور اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح سے اپنے خیالوں میں کھویا رہتا تھا اور اپنے جوانی کے دنوں کو یاد کر کے چیخا چلایا کرتا تھا۔ میری ماں نے اس غم میں جان دے دی ہے۔ مجھ سے زیادہ شرابیوں کی خصلت سے کون

واقف ہوگا۔ اگر تمہاری اس عادت کو اخبار والوں نے نہیں اچھالا تو کیا ہوا، تم میرے سامنے پارسا نہیں بن سکتے۔"

"تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا ایک آدمی آج غیر حاضر تھا اس لیے میں نے تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔"

"گویا میں ایک بھرتی کا کردار ہوں اور تم مجھے اپنی ضرورت کے مطابق کھپا رہے ہو؟"

"زیادہ جذباتی ہونے کی کوشش مت کرو۔" ایٹکنس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم سے اس سلسلے میں غلطی ہوئی ہے۔ تمہیں میرا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے تھا۔"

"بے تحاشا پینے والوں کی طرح تم اب تک خیالوں کی دنیا سے باہر نہیں آئے ہو۔ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے کہ آج تم کس مقام پر کھڑے ہو۔ اپنی جھوٹی انا کے خول سے باہر نکل کر دیکھو۔ حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

"نہیں، میں شرابی نہیں ہوں۔ تھیٹر کے اسٹیج پر آتے ہی میں نے شراب نوشی ترک کر دی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک میرے حلق میں ایک قطرہ بھی داخل نہیں ہوا۔"

"تم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس لیے کتراتے ہو کہ اس سے تمہاری شہرت اور عزت نفس مجروح ہوگی۔ لوگ تم سے نفرت کرنے لگیں گے۔ وہ کہیں گے کہ اسٹیج کا شہنشاہ شرابی ہے۔" اس نے مضحکہ خیز انداز میں قہقہہ لگایا۔

"معاملہ وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔" بلیئر ہکلایا۔ "میں دراصل...... اپنی ساکھ دوبارہ بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس وقت اس کام کو اس لیے قبول کر رہا ہوں کہ دوبارہ اس ماحول میں رچ بس سکوں۔ لیکن تم میرے لیے کوئی اچھا کردار تخلیق کرو۔ مجھے اپنے جوہر دکھانے کا موقع دو میں......"

"تم کو دوسرے ایک عرصے سے نظر انداز کر رہے تھے مگر میں نے تمہیں موقع دیا۔ تم کہتے ہو کہ میں نے تمہاری صلاحیتوں کا خیال نہیں رکھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم اس قدر احمق ثابت ہوگے۔"

"مگر میرے اسٹیج کا کیریئر دیکھو، میں نے ہر قسم کے کردار کیے ہیں اور مجھے بہت شہرت ملی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کبھی بھی اچھے اداکار نہیں

رہے۔ تم نے کبھی کوئی ایسا کردار ادا نہیں کیا جس سے تمہیں یاد رکھا جائے۔ دو چار احمقانہ قسم کے کردار ادا کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تم ایک اچھے اداکار بھی ہو گئے ہو۔ جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے، میرے خیال میں تم ایک ناکام ترین اداکار ہو۔''

اور یہی وہ لمحہ تھا جب بلیئر نے اس کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایٹکنس کا وہ زہر آلود جملہ اس کے ذہن سے چپک کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

تمام دن وہ اسٹور روم کے شوکیس میں بیٹھا لوگوں کو دلچسپیاں فراہم کرتا رہا۔ اس کے کانوں میں نت نئی آوازیں پڑتی رہیں اور لوگ اس سے عجیب عجیب فرمائشیں کرتے رہے۔ مگر اس کا ذہن ایٹکنس کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتا رہا۔ اسٹور روم پر میک اَپ کر کے بیٹھنا اور مضحکہ خیز حرکتیں کرنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

بالآخر اس نے ایک خاکہ بنایا اور پھر اس کے ہر پہلو پر غور کیا۔ اسٹور پانچ بجے بند ہوگا اور تمام کارکن اس وقت جلدی میں ہوں گے۔ تقریباً ہر ایک کو اس وقت گھر پہنچنے کی بے تابی ہوتی ہے۔ ان کی بیویاں اور گھر کے دوسرے افراد جو اُن سے محبت کرتے ہیں ان کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ دفعتاً اس کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ اس کا انتظار کون کرتا ہے؟ کیا کسی کو اس سے بھی محبت ہے؟

کسی نے اس کو مخاطب کیا اور مکھن کے ڈبے کی جانب اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا کر میکانیکی انداز میں کہا۔ ''ہاں...... ہاں ابھی لیجیے۔'' صبح سے اس کے ہونٹوں پر مستقل ایک دلکش مسکراہٹ چسپاں تھی۔

خیالات کی ایک رو اس کے ذہن میں در آئی۔ اچھے دنوں میں اس سے ہر ایک محبت کرتا تھا۔ عورتیں اس کی تصاویر چومتی تھیں۔ اس کے گرد ہر قسم کی عورتیں رہا کرتی تھیں۔ جوان اور امیر۔ اس کے التفات کی منتظر۔

مگر پھر اتنا عرصہ اس نے کہاں گزارا؟ وہ اسٹیج سے غائب کیوں ہوگیا؟ شہرت کی دیوی نے اس کے قدم چومنا کیوں چھوڑ دیے؟ ہاں، وہ کیلی فورنیا چلا گیا تھا۔ اس کو شراب نے بدمست کر دیا تھا۔ لوگ اس کا نام لینا بھول گئے تھے۔ رینڈولف بلیئر کا نام ان کے ذہن سے محو ہوگیا تھا۔

مگر آج جب وہ ایٹکنس کو قتل کر دے گا تو وہ دوبارہ مشہور ہو جائے گا۔ لوگ اس کے اس اقدام سے چونک جائیں گے۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے کپڑے تبدیل کیے بغیر ایٹکنس کے آفس میں جائے گا۔ اپنی تنخواہ کا لفافہ لے گا اور اسے گولی مار دے گا۔ پھر وہ ایک گلی سے دوسری گلی اور پھر تیسری میں ہوتا ہوا وہاں سے غاب ہو جائے گا۔ گویا آج رات وہ اپنی زندگی کا اہم ترین کردار ادا کرے گا مگر لوگ اس سے ناواقف ہوں گے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔

ساڑھے چار بجے کے قریب مجمع کم ہونا شروع ہوگیا۔ اس وقت تک وہ بہت تھک چکا تھا۔ اب تک یہی بات اس کو سہارا دیے ہوئے تھی کہ اسے ایٹکنس کو قتل کرنا ہے۔

پھر وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور پانچ بج گئے۔ اس نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور لفٹ کی جانب بڑھا۔ دوسرے کارکن بھی اضطرابی کیفیت میں اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ ہر شخص کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ اس نے لفٹ بلانے کے لیے بٹن دبایا۔

لفٹ آکر رکی، دروازہ کھلا اور لفٹ مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اوہ، تو تمہارا کام ختم ہوگیا؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اب تم کیشیئر سے تنخواہ لینے جا رہے ہو؟''

''مسٹر ایٹکنس مجھے اپنے آفس سے تنخواہ دیں گے۔''

''کیوں؟''

''اُن کی مرضی۔ وہ ایسے ہی مناسب سمجھتے ہوں گے۔'' اس نے بات ختم کر دی۔

''ان کا خیال ہوگا کہ تم ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہو گے۔'' لفٹ آپریٹر نے کہا اور بے ہودہ پن سے ہنسنے لگا۔

اس نے آپریٹر کی ہنسی کا کوئی جواب نہیں دیا مگر وہ بخوبی اس بات سے واقف تھا کہ ایٹکنس اس کو اپنے ہاتھ سے تنخواہ کیوں دے گا۔ اس کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ ایک رات اس نے پانچ ہزار ڈالر کمائے تھے مگر ایٹکنس اس کے ہاتھ میں اڑتالیس ڈالر بتیس سینٹ کی رقم دے کر اس کی عزتِ نفس مجروح کرنا چاہتا تھا۔ اس پر اپنی برتری جتانا چاہتا تھا۔

''میں تمہیں گراؤنڈ فلور تک لے چلوں؟''

''ہاں۔''

جب لفٹ رکی تو وہ پھرتی سے باہر نکلا اور سیدھا ایٹکنس کے آفس کی جانب بڑھا۔ اس کا سیکریٹری اور استقبالیہ پر بیٹھا ہوا شخص وہاں سے جا چکے تھے۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر دستک دی۔

''کون ہے؟'' ایٹکنس نے دریافت کیا۔

''میں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بلیئر۔''

''اوہ، ٹھیک۔ اندر آجاؤ۔'' ایٹکنس نے جواب دیا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

''اپنی تنخواہ لینے آئے ہو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

یہ سوال اس قدر بے ہودہ انداز میں کیا گیا تھا کہ اس کا جی چاہا وہ ریوالور نکال کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دے۔ مگر اس نے اپنے اوپر قابو رکھا۔ حالانکہ اس کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا مگر وہ صبر کیے رہا۔

''میرا خیال ہے پہلے تھوڑی سی پی لی جائے۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اوہو...... آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تھوڑی سی پینے میں کیا مضائقہ ہے؟''

''مگر میں شراب نہیں پیتا۔''

''میرا باپ بھی اسی انداز میں گفتگو کرتا تھا۔''

''مگر میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ایٹکنس بولا۔ ''لیکن اب تو تمہارا کام ختم ہو چکا ہے۔ اب تم پی سکتے ہو۔ زندگی سے تفریحات یکسر ختم نہیں کی جا سکتیں۔''

''نہیں۔'' وہ غرایا۔

''کیوں نہیں۔'' ایٹکنس نے ضد کی۔ ''میں تو دوستوں کے مانند تمہیں دعوت دے رہا ہوں اور تم......''

ایٹکنس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ بلیئر نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا تھا جس کا رخ اسی کی جانب تھا۔

''یہ...... یہ کک کیا......؟'' ایٹکنس ہکلایا۔

''یہ ریوالور ہے۔'' بلیئر نے اطمینان سے کہا۔ ''میری تنخواہ کا لفافہ میرے حوالے کر دو۔''

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔'' ایٹکنس نے میز کی دراز کھولتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہارا خیال تھا کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں اور تم یہ......''

''رقم میرے حوالے کرو۔'' وہ دوبارہ غرایا۔

ایٹکنس نے خاموشی سے لفافہ اس کی جانب بڑھایا جسے بلیئر نے اٹھا لیا۔

''اور یہ تمہارا معاوضہ ہے۔'' بلیئر نے ریوالور اٹھایا اور پے در پے تین فائر کیے۔ ایٹکنس دل تھام کر میز پر گرا۔

دفعتاً بلیئر کو خیال آیا کہ اس نے دروازہ بند نہیں کیا اور کوئی بھی فائر کی آواز سن کر اس طرف آسکتا ہے۔ اس نے پھرتی سے دروازے کی جانب قدم بڑھائے اور اس کا پاؤں ردی کی ٹوکری سے ٹکرایا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر اپنے آپ کو گرنے سے بچایا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ دیر تک اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کتنی دیر تک وہاں ٹھہرے۔ وہاں کافی وقت ضائع کرنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

ہوا میں اس وقت بڑی کاٹ تھی اور ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب اپنا اپنا سامان اٹھائے سواریوں کی جانب بھاگ رہے تھے۔

دفعتاً اس کے کانوں میں کسی بچے کا ننھا سا قہقہہ گونجا۔ بلیئر کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل میں چاقو پیوست کر دیا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک زرد رُو بچہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامے اس کی طرف اشارہ کر کے ہنس رہا تھا۔

اس کے اشارے سے مزید کچھ عورتیں اور مرد ہنس پڑے۔ وہ بری طرح سے سراسیمہ ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف قہقہے ہی قہقہے گونج رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ ان آوازوں سے کس طرح چھٹکارا پائے۔

پھر ایک پولیس والا اسٹور کے دروازے سے نکل کر اس کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ بلیئر کا خون خوف سے خشک ہو گیا۔ اس نے اضطراری طور پر اپنا ریوالور نکال کر ان کا نشانہ نہ لیا۔ مگر وہ کائی کی طرح پھٹ گئے۔ اس نے فائر کیا مگر کوئی گولی کارگر نہ ہوئی۔ جلد ہی اس کا ریوالور چھین لیا گیا۔

مگر بہت دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اس کو دیکھ کر کیوں ہنسے تھے۔ پھر جب اسے علم ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے جسم پر روایتی سانتا کلاز جیسا لباس تھا اور چہرے پر بھی بوڑھوں جیسا میک اپ تھا مگر اس کی داڑھی عجلت میں ایٹکنس کی میز پر رہ گئی تھی۔ ڈاڑھی والے سانتا کلاز بوڑھے کی بہ نسبت بغیر داڑھی کا بوڑھا سانتا کلاز ہر ایک کے لیے توجہ کی چیز ثابت ہو رہا تھا۔

انیسویں قسط

انگارے

طاہر جاوید مغل

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان درامتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور
دل گداز داستان...

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کردیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کردیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کررہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کردیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں **MMA** کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہوکے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آجائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کردیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جارہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ مولوی فدا یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ نمبردارنی کو زخمی کرنے والا مولوی صاحب کا شاگرد طارق تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہورہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کردیا گیا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں تاجی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہوچکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کی تلاش میں ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کرچکی تھی۔ درگاہ کے منافقت آمیز ماحول نے مجھے بہت مایوس کیا اور اس پورے نیٹ ورک کو نیست و نابود کرکے ہم فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ آگ و خون کا دریا عبور کرکے ہم بالآخر پہاڑوں کے دامن میں جا پہنچے۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرادیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کردیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کردیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کردیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے **MMA** کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی آڑ... میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو

بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما بنگلے پاراہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سب ٹھیک تھا کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پاراہاؤس پر حملہ کر دیا جن کا سرغنہ ثاقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحبہ کی جان بچائی لیکن سرغنہ ثاقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنالیا۔ مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل داراب! پھر میں نے اور سجاول نے چھوٹے صاحب کو اغواکاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ اس معرکے میں کچھ اغواکار مار دیے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ سجاول کو پاراہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پاراہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا تھا۔ یہیں مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر ارم پاراہاؤس کے ذاتی اسپتال میں موجود ہے اور اس نے دھوکے سے رضوان ٹی کو دوبارہ قابو کرلیا ہے۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پاراہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پاراہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ثاقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پاراہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلنے لگیں اور مقابلے میں سرغنہ ثاقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ پہلی رپورٹ ڈاکٹر ارم سے تیار کرائی گئی تھی۔ راز کھل جانے کے ڈر سے ڈاکٹر ارم کو بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ رضوان ٹی بھی غائب تھا۔ قتل کا الزام رضوان پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ سب کچھ آقا جان کرا رہا ہے۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر بُرا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پاراہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی شیخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ مجھے پہچان چکی تھی کہ میں ایسٹرن کنگ ہوں۔ وہ ایک خفیہ منصوبہ ترتیب دے چکی تھی اور تنہا اپنے مشن پر جانا چاہتی تھی۔ وہ ہر صورت اپنے والد کے قاتل کو انجام تک پہنچانا چاہتی تھی، وہ ریان فردوس کی پہلی بیوی اس پورے خاندان کی دشمن بن چکی تھی اور اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر جنگ کر رہی تھی۔ باپ اور بیٹے آمنے سامنے تھے۔ قسطینا دشمن کے علاقے میں مالن بن کے پہنچ چکی تھی، میں اس کے ہمراہ تھا۔ زینب محل سے غائب تھی اور انیق کی وجہ سے ہماری گرفت میں تھی۔ ابراہیم کا زینب کے بغیر برا حال تھا۔۔۔۔ دشمن کے علاقے میں جگہ جگہ ناکا بندی تھی۔ اس کے باوجود ہم ان کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے، سخت تلاشی کا سلسلہ جاری تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں اور قسطینا اپنی جگہ ساکت کھڑے ہو گئے۔ گرے وردی والا لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہمارے قریب آیا۔ اس کی تیز نگاہیں ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔

''گڈ مارننگ۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں اور قسطینا بُری طرح چونک گئے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ٹین کی چادروں کے نیچے ہم کو پہچاننے کے باوجود نہیں پہچانا تھا...... اور پھر اسپتال کے بند کوریڈور میں بھی ہماری مدد کی تھی۔ اس کا نام ہمیں بن مشہد معلوم ہوا تھا۔ اس نے اپنے تاثرات بے حد سنجیدہ رکھے اور کسی قسم کی شناسائی ظاہر کیے بغیر فوجی انداز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا؟''

''ہاں، تمہارا نام بن مشہد ہے؟''

''بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ میں کافی دیر سے یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ کل رات سے یہاں یہ افواہ ہے کہ گرین فورس کے کچھ چھاتا بردار یہاں اُترے ہوئے ہیں۔ سیکیورٹی ہائی الرٹ ہے۔ جگہ جگہ ناکے لگے ہوئے ہیں۔ آپ آگے نہیں جا سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں آپ کو روک لیا جائے گا۔''

''پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''آپ کو یہیں کہیں کسی جگہ رکنا پڑے گا۔ شہر کے اندر جانے کا پروگرام بعد میں بنایا جا سکتا ہے۔''

یہ بات چیت کچھ اس انداز سے ہو رہی تھی جیسے بن

مشہد ہم سے پوچھ گچھ کر رہا ہو..... اور قسطینا اس کے سوالوں کا جواب دے رہی ہو۔

”کہاں رکنا ہوگا ہمیں؟“ قسطینا نے دریافت کیا۔

”میں آپ کے اس ڈبے کی تلاشی لینے کے بعد یہاں سے چل پڑوں گا۔“ اس نے ڈیزی پھولوں والے چوبی باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ دونوں کچھ فاصلہ دے کر میرے پیچھے پیچھے آتے جائیں۔ ہم اس سامنے والی آبادی میں داخل ہوں گے۔ ایک جگہ رک کر میں اپنے بوٹ کا تسمہ باندھنے لگوں گا۔ وہاں بائیں جانب آپ کو ایک نیلے رنگ کا گیٹ نظر آئے گا۔ آپ نے گھنٹی دے کر اس گیٹ میں داخل ہوجانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ قسطینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ دور کھڑے فوجی دیکھتے تو یہی سمجھتے کہ وہ کسی بات پر بن مشہد کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

بن مشہد بار بار الجھن سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا، بولا۔ ”یور ہائی نس! آپ کو تو اکیلے آنا تھا؟“

اب قسطینا اسے کیا بتاتی کہ سرنگ میں کیا واقعہ پیش آیا ہے اور میں کس طرح پیر تسمہ پا کی طرح اس سے چپک گیا ہوں، وہ بولی۔ ”یہ پروگرام بعد میں بنا۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ اب یہ ایک گونگے کے طور پر میرے ساتھ ہیں۔“

بن مشہد نے اس باکس کی ہلکی پھلکی تلاشی لی جس میں نایاب ڈیزی فلاور مہک رہے تھے۔ اس رسمی کارروائی کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ ہم تھوڑی دیر وہیں پر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ بادل چھٹ گئے تھے اور سورج کی کرنیں صبح کو روشن تر کرنے لگی تھیں۔ کچھ فاصلے پر سپاہیوں کی ایک ٹکڑی موجود تھی اور کسی وقت یہ لوگ ہماری طرف دیکھ لیتے تھے۔

جب ہمارے اور مشہد کے درمیان کافی فاصلہ ہوگیا تو ہم بھی اپنی جگہ سے چل پڑے۔ قسطینا اپنے لمبے گھونگرالے بالوں کی وگ اور کاسٹیوم کے ساتھ سو فیصد اس جزیرے کی رہائشی ہی دکھائی دیتی تھی۔ میرا لباس بھی مقامی تھا۔ زخمی کندھے والا بازو میں نے گلے میں جھلا رکھا تھا۔ کیلے، کھجور اور تاڑ کے بھیگے ہوئے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہم شفاف سڑک پر آگے بڑھتے رہے۔ سمندر کا نیلگوں پانی ہماری دائیں جانب جھلک دکھا رہا تھا۔ گرے فورس کا ایک ہیلی کاپٹر مسلسل فضا میں چکر لگا رہا تھا۔ بن مشہد کے پیچھے پیچھے چلتے ہم قدرے بارونق علاقے میں داخل ہو گئے۔ ناشتے کی دکانوں پر لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں نیوسٹی کا خاکستری جھنڈا نظر آتا تھا۔ کچھ گاڑیوں کے عقب میں فربہ اندام رائے زل کی تصویر والے پوسٹ بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہ نیم رہائشی علاقہ تھا۔ دائیں بائیں گھروں کے دروازے تھے۔

اچانک ہم سے چالیس پچاس قدم آگے جاتا ہوا بن مشہد رک گیا اور جھک کر اپنے بوٹوں کے تسمے درست کرنے لگا۔ ہم اس کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ ہمیں اس کے قریب ہی ایک نیلے رنگ کا چھوٹا سا گیٹ نظر آیا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قسطینا نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہم اس گھر کے اندر تھے۔ یہاں ایک اُجلے چہرے والی ادھیڑ عمر خاتون اور چھ سات سال کی بچی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ گھر کی آرائش مقامی انداز کی تھی۔ بید کا فرنیچر، جالی دار کھڑکیاں، ان ڈور پھولوں کی بیلیں، جوتے باہر اتارے جاتے تھے اور اہلِ خانہ صاف ستھرے فرش پر ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ ہم نے بھی جوتے دہلیز پر اتار دیے۔ یہاں فرش کی چٹائیوں پر بیٹھنے کا رواج تھا۔ میں اور قسطینا بھی بیٹھ گئے۔ ادھیڑ عمر عورت قسطینا پر صدقے واری ہو رہی تھی۔ اس نے کئی بار قسطینا کے ہاتھ چومے۔ وہ قسطینا کے ساتھ ملائی زبان میں جو گفتگو کر رہی تھی اس کے چیدہ چیدہ الفاظ میری سمجھ میں آرہے تھے۔ وہ قسطینا کو بطور قسطینا اور فوجی کمانڈر جانتی تھی اور اسے اپنا نجات دہندہ تصور کرتی تھی۔

پتا چلا کہ یہ بن مشہد کی والدہ ہے۔ بن مشہد کی بیوی اور تین بچے دو سال پہلے ایک المناک حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ صرف یہ ایک بیٹی بچی تھی، جو خوش قسمتی سے حادثے کے وقت کار میں موجود نہیں تھی۔ یہ کار نیوسٹی کے مضافاتی ٹیلوں میں ایک بارودی سرنگ سے ٹکرا کر اُڑ گئی تھی۔ اس حادثے کا لیفٹیننٹ بن مشہد پر بہت گہرا اثر ہوا تھا اور اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے رائے زل کے لیے نفرت بیٹھ گئی تھی۔ اس حادثے کا اس کی بڑی بچی نازو نے بھی گہرا اثر لیا تھا۔ اس کی زبان بند ہوگئی تھی اور وہ دو سال سے خاموش تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق قوتِ گویائی سے محروم ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنی دادی سے اشاروں کنائیوں میں گفتگو کرتی نظر آتی تھی۔ جب اسے قسطینا سے معلوم ہوا کہ میں بھی قوتِ گویائی سے محروم ہوں تو وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھنے لگی اور اشاروں میں باتیں کرنے لگی۔

بن مشہد کی والدہ ان لوگوں میں سے تھی جو نیوٹی میں رہنے کے باوجود عزت مآب کے وفادار تھے اور خواہش مند تھے کہ موجودہ لڑائی میں عزت مآب کے خاندان کو فتح نصیب ہو۔

کچھ ہی دیر بعد بن مشہد بھی گھر آ گیا۔ اب وہ یونیفارم کے بغیر تھا اور پینٹ شرٹ میں ایک عام مقامی شخص نظر آتا تھا۔ وہ ایک پُرتکلف ناشتے کے لوازمات لے کر آیا تھا۔ وہ کچھ فکرمند بھی نظر آ رہا تھا۔

ناشتے کے بعد علیحدہ کمرے میں اس نے قسطینا کو بتایا کہ جگہ جگہ ناکے لگے ہوئے ہیں اس لیے تلاشی کے بغیر ہمارا ''برج کلب'' تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

برج کلب کا لفظ میں یہاں ہونے والی گفتگو میں پہلے بھی دو تین بار سن چکا تھا۔ جب کچھ دیر بعد بن مشہد اپنی والدہ کے پکارنے پر باہر چلا گیا تو میں نے قسطینا سے برج کلب کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولی۔ ''یہ وہ جگہ ہے جہاں رائے زل کی فوج کے افسر ویک اینڈ پر اپنی ''تھکن'' اتارنے کے لیے آتے ہیں۔ وہی ناچ گانا، وہسکی، ایکسٹرا ایکسٹرا......'' قسطینا کے لہجے میں نفرت آمیز طنز تھا۔

''اور آپ کا خیال ہے کہ آج رات چیف گیرٹ بھی وہاں موجود ہوگا۔''

''ہماری اطلاعات تو یہی ہیں۔ ایجنسی والے اب کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ رائے زل کے فوجی اور ایجنسی اہلکار کندھے سے کندھا ملا کر لڑ رہے ہیں اور کندھے سے کندھا ملا کر عیش بھی کر رہے ہیں۔''

''آپ کا خیال ہے کہ آپ وہاں گھس سکتی ہیں؟''

''اس کلب کا کافی بڑا حصہ اوپن ایئر ہے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی ڈینی فلاور لے کر وہاں جا چکی ہوں۔''

''فرضِ محال، آپ وہاں گھس گئیں۔ آپ کو سخت سیکیورٹی کے باوجود چیف گیرٹ کے قریب جانے کا موقع بھی مل گیا اور آپ نے اسے شوٹ بھی کر دیا، تو کیا آپ وہاں سے بچ کر نکل پائیں گی؟''

''اس کا دارومدار درست ٹائمنگ پر ہے۔ اگر برقی رو درست ٹائم پر منقطع کی گئی تو بچ نکلنا شاید مشکل نہیں ہو گا۔''

''یعنی یہاں آپ کا کوئی ایسا ساتھی موجود ہے جو عین وقت پر برج کلب کی بجلی بند کر دے گا؟''

''صرف برج کلب کی نہیں۔ اس پورے ایریا کی بجلی بند ہوگی۔ بجلی کے ''سب ڈویژنل آفس'' میں ایک اہلکار مقررہ وقت پر یہ کام کرے گا۔''

''تو کیا برج کلب میں متبادل انتظام نہیں ہے۔ مطلب کہ جنریٹر یا یو پی ایس وغیرہ؟''

''شاہ زائب! یہاں بجلی شاذ و نادر ہی کبھی فیل ہوتی ہے۔ جنریٹرز تو برج کلب میں بھی ہیں۔ لیکن ذمے دار لوگوں کو ان تک پہنچنے اور انہیں آن کرنے میں کم از کم پانچ منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔ اس دوران میں، میں اپنا کام کر سکتی ہوں۔''

''یہ سب کچھ بہت خطرناک لگ رہا ہے قسطینا۔ اگر آپ نے...... اس قسم کا اٹیک کرنا ہی ہے تو کیا آپ اسے راستے میں پلان نہیں کر سکتیں؟ میرا مطلب ہے کہ چیف گیرٹ کو کہیں آتے جاتے...... راستے میں نشانہ بنانے کا پلان؟''

''نہیں شاہ زائب! اس سلسلے میں کافی سوچا گیا ہے بلکہ دو تین ماہ پہلے دور مار رائفل سے اس طرح کی ایک کوشش ہو بھی چکی ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ تو بلٹ پروف کار ہے۔ ویسے بھی سفر کے دوران میں وہ ہر وقت سخت سیکیورٹی کے حصار میں رہتا ہے۔''

بن مشہد واپس آ گیا تھا، ہمیں اپنی گفتگو کا سلسلہ روکنا پڑا۔ بن مشہد کی عمر اٹھائیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی زندگی پر جو حادثہ گزرا تھا اس نے اس کے چہرے پر سنجیدگی اور درد کے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ وہ اندر آیا تو اس کی آنکھوں میں ایک امید کی کیفیت نظر آئی۔

وہ قسطینا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''یور ہائی نس! شام کے وقت برج کلب تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ تو نکل رہا ہے، اگر ہم فائدہ اٹھا سکیں تو......''

''بتاؤ، کیسا راستہ ہے؟''

''ابھی والدہ سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں سے تین گھر چھوڑ کر ایک فوتگی ہوئی ہے۔ یہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے انکل اسٹیفن ہیں۔ یہ قریبی مارکیٹ میں تمباکو کا کام کرتے تھے۔ فرائی ڈے کے روز دونوں طرف سے جو گولہ باری ہوئی، اس میں مارٹر کا ایک شیل ان کی دکان کی چھت پر گرا تھا۔ یہ زخمی ہوئے تھے۔ اس وقت تو ان کی حالت زیادہ بری نہیں لگتی تھی لیکن آج صبح یہ اسپتال میں انتقال کر گئے ہیں۔ ان کو شام چھ بجے کے قریب قبرستان لے جایا جانا ہے۔ یہ کرسچن قبرستان، برج کلب سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے دیکھا ہی ہوگا؟''

قسطینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ بن مشہد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''عام طور پر جنازے کے جلوس میں پھول اور عطر بیچنے والے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ آپ اس روپ میں بہ آسانی قبرستان تک جا سکتی ہیں۔ سیکیورٹی کتنی بھی سخت ہو لیکن یقینی بات ہے کہ فونرل (جنازے) کو روک کر تلاشی وغیرہ نہیں لی جا سکتی۔''

بات قسطینا کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے اس حوالے سے بن مشہد سے کچھ سوال جواب کیے اور ایک پروگرام ترتیب پا گیا۔

بچی نازو بڑی پیاری تھی۔ اشاروں کنائیوں میں بڑی پیاری اور دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ بات کرتے ہوئے اپنے بالوں کو سپید ہاتھوں کے ساتھ بار بار پیشانی سے ہٹاتی تھی۔ اس کی معذوری دیکھ کر دکھ ہوا۔ جنگ لوگوں سے کیا چھینتی ہے اور خصوصاً بچوں اور عورتوں سے۔ میں یہ سوچ کر کانپ گیا کہ اگر رائے زل کے سپاہی اس گھرانے کی اصل حقیقت جان جائیں تو پتا نہیں کہ ان لوگوں پر کیا بیتے؟

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی ہم فوتگی والے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بن مشہد کی والدہ نے قسطینا کے لیے ایک سیاہ شال فراہم کر دی تھی تاکہ وہ سوگواری کے روپ میں نظر آئے۔ بن مشہد گھر کی ایک ادھ کھلی کھڑکی میں سے مسلسل باہر گلی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جونہی ایک گاڑی پر رکھا ہوا تابوت اور اس کے عقب میں چلتے فونرل کے لوگ نظر آئے، ہم بھی لوگوں میں شامل ہو گئے۔ فونرل میں شامل لوگ سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے، ان میں عورتیں بھی تھیں۔ اکثر نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے...... کچھ لوگوں نے سیاہ عینکیں لگا رکھی تھیں۔ بن مشہد بھی ان میں شامل تھا۔ جلوس کے پیچھے کچھ لوگ پھول اور موم بتیاں اٹھائے چل رہے تھے۔ ایک دو صلیب بردار بھی دکھائی دیے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں اور چوراہوں سے گزرتے ہوئے گنجان علاقے کی طرف بڑھتے رہے۔ یہاں سڑکیں نسبتاً کشادہ اور عمارتیں عالیشان تھیں۔ جگہ جگہ فوجی گاڑیاں اور ناکے بھی دکھائی دیے۔ سیکیورٹی واقعی ہائی الرٹ تھی اور بن مشہد کی یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ ہم پوچھ گچھ اور تلاشی کے بغیر اس علاقے میں سے ہرگز نہیں گزر سکتے تھے۔

قسطینا نے میری طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں کہا۔ ''دائیں طرف جو نیلے شیشے والی بلڈنگ ہے، اس کے ساتھ ہی برج کلب ہے۔''

میں نے کن انکھیوں سے کثیر المنزلہ عمارت کی طرف دیکھا۔ اس کی چھت پر خاکستری جھنڈے لہرا رہے تھے۔ پس منظر میں سورج کی الوداعی کرنیں تھیں۔ ''یہاں سے زیادہ فاصلہ تو نہیں ہے۔'' قسطینا نے بن مشہد سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بالکل نہیں یور ہائی نس۔ اور میں آپ کو ایسا راستہ دکھاؤں گا کہ آپ دو منٹ میں برج کلب کے مین گیٹ پر ہوں گی۔''

ہم سڑک سے اتر کر ایک پتھریلے فٹ پاتھ پر چلتے قبرستان میں داخل ہو گئے۔ یہ گوروں کا قبرستان تھا۔ سنگِ مرمر کی مورتیاں، سنگی قبریں، پھول اور پری زادوں کے مجسمے جن کے ہاتھوں میں صلیبیں دکھائی دیتی تھیں۔ ہم بی بی مریم کے ایک مجسمے کے قریب کھڑے ہو گئے۔ تجہیز و تکفین کے مراحل شروع ہو گئے۔ باوردی سپاہیوں کی ایک ٹولی قبرستان میں داخل ہوئی۔ ان کے تیور خطرناک تھے۔ ان کے افسر نے معذرت کرنے کے بعد کہا۔ ''سوری لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں ایک مطلوب فرد موجود ہے۔ آپ ہمیں جائزہ لینے کی اجازت دیں۔''

ایک پادری آگے بڑھا اور اس نے افسر سے کہا کہ وہ آگے آ کر اپنا فرض ادا کر سکتا ہے۔ فوجی افسر نے اپنے ہولسٹر میں سے پستول نکال لیا تھا۔ سپاہیوں کی ٹکڑی بھی الرٹ تھی۔ رائفلوں پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یقیناً قسطینا کی بھی یہی کیفیت تھی۔ افسر لمبے ڈگ بھرتا ہوا سوگوار لوگوں کی طرف بڑھا۔ وہ ایک ایک کا چہرہ غور سے تک رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ قسطینا نے اپنے ہاتھ کو چادر کے اندر ہی حرکت دے کر پستول اپنی ٹانگ کے بالائی حصے سے جدا کر لیا ہے۔ میں بھی ریڈ الرٹ تھا۔ فوجی افسر ہمارے عین سامنے رکا۔ میرا خیال تھا کہ قسطینا اب مزید انتظار نہیں کرے گی لیکن اس نے انتظار کیا اور یہ اس کی غلطی نہیں تھی۔ اگر وہ انتظار نہ کرتی تو غلطی ہوتی۔ یہ مضبوط اعصاب کی نشانی تھی۔ افسر ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ قطار میں ہم سے آٹھ دس فٹ آگے کھڑا ہوا ایک نوجوان لڑکا اچانک بھاگا۔

''ہالٹ...... ہالٹ۔'' کی آوازیں بلند ہوئیں۔ لڑکے کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح قبروں کو پھاندتا اور اپنے جسم کو دائیں بائیں لہراتا ہوا بھاگا۔ فوجیوں نے ایک بار پھر وارننگ دی اور ساتھ ہی فائر کھول دیا۔ بھاگتے لڑکے کے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹیں۔ وہ

بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا...... ابھی دروازے سے چند قدم دور تھا کہ گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ وہ پلٹیاں کھاتا ہوا دو قبروں کے درمیان گرا اور ساکت ہوگیا۔

سوگواروں کے ہجوم میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ تابوت کو گاڑی سے اتار رہے تھے۔ وہ لڑھک کر زمین بوس ہوگیا۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بن مشہد نے قسطینا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔ تاریکی اب گہری ہورہی تھی۔ لیکن قبرستان میں مدھم دودھیا روشنی موجود تھی۔ بغلی پھاٹک سے گزر کر ہم ایک تنگ سڑک پر آگئے۔ نیلے شیشوں والی بلند عمارت کی جھلک یہاں سے بھی نظر آرہی تھی۔ بن مشہد نے کہا۔ ''سیدھے چلتے جائیں، پہلے موڑ پر بائیں ہاتھ مڑ جائیں، چند منٹ میں آپ کلب کے سامنے ہوں گے۔''

میں اور قسطینا چل دیے۔ کچھ آگے جا کر قسطینا نے اپنی سیاہ شال اتار کر جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا دی اور سائلنسر والا پستول جو اس کے ہاتھ میں تھا، چُغا اٹھا کر دوبارہ ٹانگ سے منسلک کرلیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنا پستول بھی اسے دے دوں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ ضروری ہے۔ اب ہم روشن اور بارونق علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قسطینا نے مجھے بتایا تھا کہ برج کلب گرے فورس کے فوجی افسروں کی پسندیدہ تفریح گاہ ہے۔ ابھی ہم کلب سے سو میٹر دور ہی تھے کہ میوزک اور ہاؤ ہُو کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کلب کے اوپن ایریا سے باہر گاڑیوں کی طویل قطاریں نظر آرہی تھیں۔ یہ سب شاندار اور قیمتی گاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی فوجی جیپ بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ مین گیٹ کے پاس ڈینی فلاور فروخت کرنے والے تین چار اور لڑکے بھی نظر آرہے تھے۔ لیکن وہ باہر کھڑے آتے جاتے افسران اور ان کی بیگمات وغیرہ کو متوجہ کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ تاہم قسطینا بڑے اعتماد سے اندر جانے کے لیے بڑھی۔ ڈیوٹی پر موجود سیکیورٹی گارڈز نے اسے روکا۔ اس نے بڑے بے تکلف اور بھولے بھالے انداز میں ان سے دو چار باتیں کیں۔ یہ گفتگو ملائی زبان میں تھی۔ بہرحال مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ لیکن وہ مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار کررہی تھی۔ گارڈز پہلے تو انکار کرتے رہے پھر ایک گارڈ نے مجھے سرتاپا دیکھا اور میری جامہ تلاشی لینے کے بعد مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ یقیناً وہ لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ ہم سیکیورٹی کے کئی حصاروں سے گزر کر آئے ہیں اس لیے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں۔

ہم اندر داخل ہوگئے۔ ایک پھول بیچنے والی اور بھی یہاں موجود تھی۔ خوب صورت وسیع لان میں گول میزوں کے اردگرد خوش باش خواتین و حضرات بیٹھے تھے۔ ان میں ایجنسی والے سفید فاموں کی بھی بڑی تعداد دکھائی دیتی تھی۔ وہ فتح کے نشے میں چور تھے۔ قریباً تمام سفید فام افسران کے پہلو میں خوش اندام و خوش پوش مقامی حسینا ئیں نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے ہوسکتا ہے کہ کچھ گرل فرینڈز ہوں لیکن بیشتر کا پیشہ حسن فروشی نظر آتا تھا۔ قسطینا نپے تلے انداز میں میزوں کے درمیان گھومتی رہی۔ میں زخمی بازو گلے میں لٹکائے اس کے عقب میں تھا۔

پھولوں کے شوقین دو دو چار چار یا اس سے زائد پھول خریدتے تھے۔ نرگس کے پھولوں کے مانند ان کی ڈنڈیاں لمبی تھیں۔ قسطینا پھولوں کو بڑی چابکدستی سے ایک چمکیلے ''ریپر'' میں اس طرح لپیٹتی تھی کہ ڈنڈیاں یکجا ہوجاتی تھیں اور پھول چھوٹے سے گلدستے کی شکل اختیار کرلیتے تھے۔ پھول خریدنے والے اپنی مرضی سے کچھ رقم قسطینا کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ یہ نایاب پھول تھے اور ان کی قیمت مقامی کرنسی میں فی پھول پانچ ''برونائی ڈالر'' کے لگ بھگ تھی مگر خریدنے والے اپنی خوشی سے زیادہ ہی دے رہے تھے۔

یہاں مستیوں اور رنگ رلیوں کا عجیب سا ماحول تھا۔ مرد و زن ایک دوسرے کے قرب میں سرشار تھے۔ جام گردش کررہے تھے اور فضا کھانوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ ایک دو بہکے ہوئے افراد نے قسطینا سے بھی ہلکی پھلکی زبانی شرارت کی۔

مرد حضرات اپنی جگہ سے اٹھتے تھے اور کسی ایسی خاتون یا لڑکی کو اپنے ساتھ رقص کی دعوت دیتے تھے جو اکیلی ہوتی تھی۔ عام طور پر یہ دعوت قبول کی جارہی تھی۔ جوڑا ڈانسنگ فلور کی طرف بڑھ جاتا تھا اور وہ لوگ محوِ رقص ہو جاتے تھے۔ یہ رقص کی رسم بھی مغربی اقوام نے خوب نکالی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان مہینوں اور سالوں کا فاصلہ منٹوں میں طے ہوجاتا ہے۔ جب ہاتھ میں ہاتھ لے لیا جائے۔ مرد اپنا بازو عورت کی کمر میں حمائل کردے اور عورت کا جسم اس کو چھونے لگ جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ یہاں بھی جسم تھرک رہے تھے، نگاہیں بجلیاں گرا رہی تھیں اور شراب کا نشہ اس باہمی طلب کو دو آتشہ کررہا تھا۔ کئی مناظر تو ایسے تھے جن سے قسطینا کو یقیناً آنکھ چرانا پڑ

رہی ہوگی۔ اگر آؤٹ ڈور میں یہ حال تھا تو اندر کیا کچھ ہوگا۔ قسطینا کے باکس کے قریباً آدھے پھول ختم ہو چکے تھے۔ ہم میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک جانب آ گئے۔ کلب کے اندرونی حصے میں جائے بغیر ہمارا مقصد پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ جیسا کہ قسطینا نے بتایا تھا، بڑے فوجی افسران اور چیف گریٹ کا ٹھکانا اندرونی حصہ ہی تھا۔ لیکن اندر جانے والے دروازے پر واک تھرو گیٹ تھا اور تلاشی ہورہی تھی۔ یہاں مردانہ کے علاوہ زنانہ تلاشی کا بھی انتظام تھا۔ سیکیورٹی کی دو لیڈیز اہلکار بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

''اب تو بجلی جانے کا انتظار ہی کرنا پڑے گا۔'' قسطینا نے سرگوشی میں کہا۔

''کیا ٹائم ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے اسکرٹ نما چغے کی آستین سرکا کر وقت دیکھا۔ ''نو بجنے میں بائیس منٹ ہیں۔ بجلی پورے پونے نو بجے بند ہوگی۔ یعنی ابھی سات آٹھ منٹ ہیں ہمارے پاس۔ جونہی لائٹ بند ہوگی، میں اندر گھسنے کی کوشش کروں گی۔ تم کو اسی جگہ موجود رہنا ہے۔ اگر میں بچ گئی تو باہر نکلنے کی کوشش کروں گی اور سیدھی تمہاری ہی طرف آؤں گی۔ تم کو اپنے پستول سے مجھے کور دینا ہے، یہ دیکھو...... یہاں سے باؤنڈری وال کم اونچی ہے۔ ہم یہاں سے پھلانگ کر نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن پستول میرے پاس ہے کہاں؟''

قسطینا نے احتیاط سے اپنے اسکرٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور میرا پستول مجھے واپس کر دیا جسے میں نے شرٹ کے نیچے اپنی کمر کی طرف اڑس لیا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا قسطینا، آپ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کلب کے ہال میں گھس بھی گئیں تو سیدھی چیف گیرٹ تک کیسے پہنچ جائیں گی؟''

اس نے باکس کے خانے میں رکھی پنسل ٹارچ کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس کی مددلوں گی اور اسی کی مدد سے تم میری واپسی پر مجھے پہچانو گے۔ تم اس کی لائٹ دیکھ ہی رہے ہو۔ بالکل سیدھی اور باریک ہے۔''

''اتنے بڑے ہال میں آپ چیف تک کیسے پہنچیں گی؟''

''مجھے معلوم ہے شاہ زائب کہ وہ اس ہال میں کس میز پر بیٹھتا ہے۔ تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔ بس ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''میں ایک بار پھر کہوں گا قسطینا! آپ اس ایکشن کا خطرناک ترین حصہ خود پرفارم کرنا چاہ رہی ہیں...... یہ ٹھیک نہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے...... کیونکہ بلٹ پروف جیکٹ تمہارے جسم پر نہیں میرے جسم پر ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ سے ٹچ کیا۔

اور تب مجھے احساس ہوا کہ اس نے اسکرٹ نما چغے کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن رکھی ہے لیکن جب میں نے اسے اسپائی کیمرے کی آنکھ سے لباس اتارتے اور پہنتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت تو اس نے یہ جیکٹ نہیں پہنی تھی۔ مجھے اس ہوش رُبا منظر کا ایک ایک لمحہ یاد تھا (بعدازاں معلوم ہوا کہ یہ جیکٹ پہننے کا خیال اسے بعد میں آیا تھا)

ایک افسر ڈینی فلاورز والے باکس کو دلچسپی سے دیکھتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اس ادھورے لباس میں تھی جسے عرفِ عام میں ٹاپ لیس کہا جاتا ہے۔ کندھوں سے ''کافی'' نیچے تک سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے۔ افسر سادہ لباس میں تھا تاہم اس کے طور اطوار اور گرما گرم انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ گرے آرمی سے تعلق رکھتا ہے۔ لڑکی کے بالوں کو تین ڈینی فلاورز کا تحفہ دے کر اور اسے بغل میں داب کر وہ آگے بڑھ گیا۔

گھڑی کی سوئیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ کلب کے ہنگامے بتدریج جوان ہو رہے تھے۔ موسیقی، مستی، لذتِ دہن، سب کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ شاید واقعی یہ پرسوں رات والی فتح کا جشن تھا لیکن جشن منانے والوں کو خبر نہیں تھی کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ جنگ نہ صرف جاری ہے بلکہ ان کے درمیان دو ایسے نفوس بھی پہنچ چکے ہیں جو اُن کی اس مستی بھری رات کو تہ و بالا کر سکتے ہیں۔

تفصیلات طے ہو چکی تھیں۔ اب مجھے اور قسطینا کو لائٹ آف ہونے کا انتظار تھا۔ ذہن میں کئی شکوک بھی جنم لے رہے تھے جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ کیا الیکٹریسٹی کے کسی ڈویژنل آفس میں بیٹھا ہوا بندہ وقتِ مقررہ پر بجلی کی رو منقطع کر سکے گا یا نہیں؟ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں مقررہ وقت کی طرف بڑھ رہی تھیں، ہماری دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ میں نے دودھیا گارڈن لائٹ میں دیکھا قسطینا کے چہرے پر مصمم ارادے کی جھلک تھی۔ اس کی نم آنکھوں میں جیسے اپنے پیارے والد کی موت کا غم دہک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کلب کے ہال کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جنگی ماحول

کی وجہ سے ہال کی دیوار گیر کھڑکیوں پر سیاہ کاغذ چپکا دیے گئے تھے تاکہ روشنی باہر نہ آسکے، تاہم جب ہال کا دروازہ کھلتا تھا، اندر سے ڈسکو لائٹ کے رنگ اپنی جھلک دکھاتے تھے۔ موسیقی کی دھما دھم اور پُرمسرت قہقہوں کی بوچھاڑ چند سیکنڈ کے لیے سماعت کو جھنجوڑ کر غائب ہو جاتی تھی۔

اب نو بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ یہی مقررہ ٹائم تھا۔ اچانک روشنیاں گل ہو گئیں۔ برج کلب ہی نہیں اردگرد کی کئی عمارتیں بھی تاریکی میں ڈوب گئیں۔

''اوکے...... شاہ زائب...... میں جاتی ہوں، اس نے میرا ہاتھ ہولے سے دبایا اور ایک عزم سے اندرونی حصے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ آٹھ دس قدم ہی گئی ہوگی کہ یکایک سارا برج کلب ایک بار پھر پوری آب و تاب سے روشن ہو گیا۔ قسطینا ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ نظر آ رہی تھی مگر اپنا سائلنسر لگا پستول ابھی اس نے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔

وہ جلدی سے میرے پاس واپس آگئی۔ پھولوں والا چوبی باکس بدستور اس کے گلے میں تھا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا سا تھا۔ ''مائی فٹ'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''لگتا ہے کہ جنریٹرز کا سسٹم ''اپ ڈیٹ'' کر دیا گیا ہے۔''

یہ بہت بڑا سیٹ بیک تھا۔ اردگرد کی بلند عمارتیں ابھی تک تاریک تھیں۔ ان میں بس جزوی طور پر ہی کہیں کہیں ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی...... مگر برج کلب کے جنریٹرز پوری انرجی سے چل رہے تھے۔ ''اب کیا ہوگا؟ یہ تو پورا پلان ہی ڈسٹرب ہو گیا۔'' میں نے سرگوشی کی۔

قسطینا کی حالت زخمی شیرنی کی سی تھی۔ تاہم وہ اپنے تاثرات کو حتی الامکان کنٹرول میں رکھے ہوئے تھی۔ کسی وقت دھیمی سی میٹھی آواز میں ''ڈینی فلاور'' کی آواز بھی لگا دیتی تھی۔ بظاہر تو یہی لگ رہا تھا کہ ہم اندرونی حصے میں نہیں جاسکیں گے۔ یہاں دروازے پر واک تھرو گیٹ سے آگے دو بھٹی کٹی لیڈی اہلکار کھڑی تھیں...... اور جس خاتون پر شک ہوتا تھا، اسے چند سیکنڈ کے لیے سرچ روم میں لے جاتی تھیں۔

قسطینا کے چوبی باکس میں پھول مسلسل کم ہوتے جا رہے تھے اور اس نے کرنسی ڈالنے کے لیے اپنے کندھے سے جو بٹوا نما بیگ ڈالا ہوا تھا، وہ بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''سارے پھول ختم ہو گئے تو ہمارے یہاں کھڑے ہونے کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور زیادہ فکرمند نظر آنے لگی۔ اسی دوران میں بجلی کی رو دوبارہ آگئی اور جنریٹرز آٹومیٹک طریقے سے بند ہو گئے۔ قسطینا نے ٹھنڈی سانس لی۔ موسیقی کی دھما دھم پھر پورے زور و شور سے گونجنے لگی۔ سامنے اوپن ائر رقص گاہ پر جسم پھر تھرکنا شروع ہو گئے۔ لہراتے آنچل، جھومتی زلفیں، بہکی ادائیں اور بھونرا صفت مرد، پھولوں کا رس چوسنے کو بے قرار۔

ایک ٹن مقامی فوجی ہمارے قریب سے گزرا اور رک کر چند سیکنڈ قسطینا کو گھورتا رہا۔ اپنے سیاہ گھونگرالے بالوں اور کاسٹیوم کے ساتھ وہ جزیرہ جاماجی کی ایک الہڑ لڑکی ہی نظر آتی تھی۔ رخساروں پر گلاب کھلے ہوئے، لانبی شفاف گردن، رسیلے ہونٹ اور دل میں اترتی ہوئی نگاہیں۔ فوجی اپنے رینک اور اطوار سے کوئی درمیانے درجے کا آفیسر ہی لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شراب کی سرخی تھی، اس نے مسکرا کر ملائی زبان میں قسطینا سے کچھ کہا۔

قسطینا پہلے تو جھجکی پھر اس نے مختصر جواب دیا۔ پتا نہیں کیا جواب تھا لیکن مجھے لگا کہ اس جواب سے گرے فورس کے اس آفیسر کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ وہ قریب آگیا اور بہکے بہکے انداز میں باکس کے اندر ڈینی کے پھول گننے لگا۔ ''ون ٹو تھری فور......''

اس نے قریباً پچیس پھول گنے، پھر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین چار بڑے نوٹ نکال کر قسطینا کے ہاتھ میں تھما دیے۔ باکس میں سے سارے پھول نکال کر اس نے دو اپنے کانوں میں اُڑسے اور تین چار قسطینا کے بالوں میں ٹانک دیے۔ اس نے اپنے کسی ملازم کو آواز دی۔ وہ دوڑا ہوا آیا۔ آفیسر نے باقی پھول اسے تھما دیے اور قسطینا کے گلے سے خالی باکس اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی للچائی ہوئی نگاہیں مسلسل قسطینا کے سراپا پر گردش کر رہی تھیں۔ اس نے ملائی میں قسطینا سے کہا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ اس کے ساتھ رقص کرنا چاہتا ہے۔

قسطینا تذبذب دکھا رہی تھی مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اندر سے اس کام کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ ''پلیز...... پلیز سویٹ ہارٹ۔'' مدہوش فوجی نے ایک بار پھر قسطینا کو کندھوں سے تھام کر کہا۔

...... چند ہی سیکنڈ بعد قسطینا اور وہ آفیسر لان کے ڈانسنگ فلور پر تھے۔ وہ قسطینا کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر ناچنے لگا۔ سب اپنے اپنے حال میں مست تھے۔ ایک دو کے سوا شاید ہی کسی نے نوٹ کیا ہو کہ گرے فورس کا آفیسر جس لڑکی کو ڈانسنگ پارٹنر بنائے ہوئے ہے وہ

کوئی ''ماڈرن محترمہ'' نہیں بلکہ ڈینی فلاور بیچنے والی لڑکی ہے اور اگر کوئی نوٹ کر بھی لیتا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ یہاں ہر کوئی بس اپنی خواہش کی آبیاری کر رہا تھا، اپنی ہی مستی کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔

ملگجے سنگین خدوخال والا آفیسر قسطینا کو اپنے قریب تر کرتا جارہا تھا۔ پھر میں نے وہ دیکھا جو مجھے واقعی اچھا نہیں لگا۔ آفیسر کے ہونٹ قسطینا کے ہونٹوں سے پیوست تھے۔ وہ اسے بار بار چوم رہا تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی تو پھر یقیناً اس کے پیچھے کوئی وجہ تھی۔ کوئی پلان تھا اس کے ذہن میں۔ مجھے خدشہ یہ تھا کہ اس کا ڈانسنگ پارٹنر کہیں اس پستول کی موجودگی سے آگاہ نہ ہوجائے جو اس کی ٹانگ سے منسلک تھا یا پھر وہ دھماکا خیز ڈیوائس جو قسطینا نے اپنے پہلو سے اٹیچ کر رکھا تھا...... یا پھر قسطینا کی بلٹ پروف جیکٹ جو اس کے لبادے کے نیچے تھی، لیکن یوں لگتا تھا کہ آفیسر قسطینا کی خوب صورتی اور اس کے چہرے میں اس قدر منہمک ہے کہ اسے باقی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ طرّہ یہ کہ شراب نے اس کے حواس مختل کر رکھے تھے۔ رقص کرنے والے جوڑے ناچتے ناچتے ایک بار گھومتے اور دوبارہ اپنے پاؤں کو آگے پیچھے حرکت دینے لگتے۔

ایک دو منٹ مزید گزرے پھر میں نے دیکھا کہ تمتمائے چہرے والا آفیسر قسطینا کو اپنی بغل میں دبا کر فلور سے اتر آیا اور ان سیڑھیوں کی طرف بڑھا جو کلب کی بالائی منزل کی طرف جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر بھی سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے آفیسر کو دیکھ کر سیلیوٹ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ آفیسر قسطینا کو لے کر بڑی شتابی کے ساتھ سیڑھیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے ذہن میں تو یقیناً یہی تھا کہ وہ ایک من پسند لڑکی کو اپنے بیڈ روم میں لے جارہا ہے۔ جو اس کی شب کو رنگین تر بنائے گی لیکن وہ جانتا نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو دعوت دے رہا ہے۔ قسطینا نے کمالِ ہمت سے اپنے ہونٹوں اور اپنے چہرے پر اس کا لمس برداشت کیا تھا اور اب یقیناً وہ اس کی قیمت وصول کرنے والی تھی۔ اس کے سینے میں اپنے والد کے انتقام کی جو آگ بھڑکتی تھی، میں اس کی تپش کو اچھی طرح جانتا تھا۔

میں وہیں ایک کونے میں گھاس پر بیٹھ گیا اور کلب کے اندر اور باہر کی رونقیں دیکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں اخلاقی قدریں بہت پیچھے چلی جاتی ہیں۔ یہی کچھ میں یہاں دیکھ رہا تھا۔ کچھ مقامی رقاصائیں تقریباً بے لباس ہو گئی تھیں اور ڈانسنگ فلور پر اپنے حسن کے جلوے بکھیر رہی تھیں۔ ایک ایسی ہی مدہوش لڑکی میز پر چڑھ کر ناچ رہی تھی اور تین چار حضرات نے میز کو تھام رکھا تھا تاکہ وہ گر نہ جائے۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ قسطینا کے بارے میں میری تشویش بڑھتی جارہی تھی۔ پتا نہیں کہ اندر اس کو کیا حالات پیش آتے۔ اس کے لباس کے نیچے چھپی ہوئی چیزیں کسی بھی وقت آرمی آفیسر پر آشکار ہو سکتی تھیں۔ اس کی وگ اترنے کا اندیشہ بھی موجود تھا اور یہ اندیشہ بھی کچھ ایسا غلط نہیں تھا کہ کوئی اسے شکل سے ہی پہچان لیتا۔

اچانک میں ٹھٹکا۔ ایک اردلی ٹائپ شخص سیدھا میری ہی طرف آرہا تھا، اس نے آکر اشارے سے مجھ سے کہا کہ اوپر مجھے بلایا جارہا ہے۔ وہ مجھے گونگا ہی سمجھ رہا تھا اور اشاروں سے مجھے سمجھا رہا تھا کہ میری ساتھی لڑکی (قسطینا) اور باس مجھے بلا رہے ہیں۔ مجھے اوپر جانا مناسب لگا۔ پھولوں والا خالی باکس میرے پاس تھا۔ میں نے اس چوکور باکس کو اٹھا لیا اور ملازم کے ساتھ چل پڑا۔ سیڑھیوں پر موجود گارڈز نے مجھے اوپر جانے دیا۔ دس پندرہ زینے طے کر کے ہم بالائی منزل کے ایک کوریڈور میں آگئے۔ یہاں اسنوکر، بلیرڈ اور بیڈمنٹن وغیرہ کے لیے ہال بنے ہوئے تھے۔ کچھ آگے جا کر رہائشی کمرے شروع ہو جاتے تھے۔ ہر کمرے کا ایک نمبر تھا۔ نیچے ہال میں گونجنے والی موسیقی اور مخمور قہقہوں کا شور یہاں بہت مدھم آواز میں پہنچ رہا تھا۔

ایک دروازے کو کھول کر اردلی نما شخص اندر داخل ہو گیا۔ یہ دو تین کمرے پر مشتمل ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا۔ مجھے بیرونی کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ دو تین منٹ کے اندر میرے سامنے کھانے پینے والی اشیا کا انبار لگا ہوا تھا۔ روسٹ مچھلی، چکن کباب، ایگ فرائڈ رائس اور کئی مقامی ڈشیں۔ ملازم نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... تمہاری ساتھی، اندر میرے صاحب کو ''سروس'' مہیا کرنے میں مصروف ہے تم یہاں بیٹھ کر کھاؤ پیو۔

ملازم کو دکھانے کے لیے میں چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگا۔ ملازم جہازی سائز کے ریفریجریٹر کی طرف متوجہ ہو گیا، اس نے وہاں سے ووڈکا کی بڑی بوتل نکالی۔ ساتھ میں برف کی ٹکڑیوں کا ''باؤل'' برآمد کیا۔ دونوں اشیا کو بڑے سلیقے سے ایک خوب صورت منقش ٹرے میں سجایا اور اندرونی کمرے کی طرف لے گیا۔ یقیناً وہاں جام کی

سپریم کمانڈر قسطینا ایک گل فروش لڑکی کی حیثیت سے موجود تھی۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا اور پھر وہ ہوگیا۔

مجھے سائلنسر لگے پستول کا فائر سنائی دیا۔ یہ آواز جیسے اس اپارٹمنٹ کے اندر ہی گونج کر رہ گئی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے دو فائر مزید ہوئے۔ میں نے اپنا پستول نکال لیا اور اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد اپارٹمنٹ کے اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے قسطینا کو دیکھا سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

''آپ خیریت سے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سرہلایا۔

اسی دوران میں میری نگاہ قسطینا کے عقب میں گئی۔ وہاں اردلی کی لاش پڑی تھی۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی اور خون کا ریلا قالین کو بھگو رہا تھا۔

''آفیسر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔'' قسطینا نے سفاک لہجے میں کہا۔

اردلی کی لاش پھلانگ کر میں اندرونی کمرے میں پہنچا۔ گرے فورس کا افسر بیڈ پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کی پتلون اس کے گھٹنوں پر تھی اور اس کی پیشانی خون سے رنگین ہورہی تھی۔ اس کا اگلا دھڑ بیڈ سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ جیسے اس نے آخری وقت میں بھی قسطینا کو دبوچنے کی کوشش کی ہو۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پیٹ میں لگنے والی بلٹ پہلے فائر ہوئی تھی۔

یکایک بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔

''کہیں فائر کی آواز باہر تو نہیں سنی گئی؟'' میں نے پُراندیش لہجے میں کہا۔

''ہوسکتا ہے...... اور نہیں بھی۔'' قسطینا نے کہا۔ وہ بھی میری طرح دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد دستک دوبارہ ہوئی...... مگر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ دستک کی وجہ کچھ بھی ہوسکتی تھی مگر ہمارے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اب دروازے کے باہر کوئی موجود نہیں تھا۔

ہم نے دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر لگژری باتھ روم میں پھینکا۔ آفیسر کی تلاشی سے چند اشیا ملیں جن میں اس کا سیل فون بھی تھا۔ اس کا سروس پسٹل اور آئی ڈی کارڈ وغیرہ بھی ہم نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کی گرے پتلون اب مزید کھسک کر اس کے ٹخنوں تک پہنچ چکی تھی۔ اسے باتھ روم میں چھوڑ کر ہم واپس کمرے میں پہنچے۔ قالین اور بستر پر کئی جگہ خون کے بڑے بڑے دھبے موجود تھے۔ انہیں صاف کرنا تو ممکن نہیں تھا۔ ہم نے انہیں ''فٹ میٹ'' اور چادروں وغیرہ سے چھپانے کی کوشش کی اور جزوی طور پر کامیاب رہے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

وہ خونچکاں لاشوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''ہم کارروائی شروع کرچکے ہیں۔ اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔ آگے ہی بڑھنا ہوگا۔''

''کیسے بڑھیں گی آگے؟''

''میری معلومات کے مطابق اس فلور پر کم از کم دو راستے ایسے ہیں جو سیدھے مرکزی ہال میں اترتے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے، سیڑھیاں ہیں؟''

''ہاں...... میں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ آپ خودکشی کا ارادہ رکھتی ہیں۔''

''گھبراؤ مت شاہ زائب، میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گی اور اگر مروں گی تو اس کی کم سے کم قیمت چیف گیرٹ کی موت ہوگی۔''

''لیکن میں آپ کو اس طرح اکیلے نہیں جانے دوں گا۔''

اس نے جلتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''شاہ زائب، تم پہلے سے زخمی ہو۔ ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ تم میری ہدایات پر عمل کرو گے، میں بطور کمانڈر تمہیں حکم دے رہی ہوں کہ تم ابھی یہیں رکو گے، ویسے بھی میں ابھی صرف جائزہ لینے جارہی ہوں۔ کارروائی کرنا ہوگی تو تمہیں بتاؤں گی۔''

''اور اگر کارروائی خودبخود شروع ہوگئی تو؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو۔ اگر بالفرض محال ایسا ہو ہی گیا تو پھر تم اپنی سمجھ اور حالات کے مطابق جو چاہو کر سکتے ہو۔''

وہ ان سنی کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق داخلی دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ جاتے وقت قسطینا نے خود کو ایک شال میں چھپا لیا تھا...... شال کے نیچے سائلنسر والا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں اپارٹمنٹ میں الماریوں وغیرہ کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گیا۔ اس تلاشی سے پتا چلتا تھا کہ کلب کے یہ کمرے اور اپارٹمنٹ صرف عیاشیوں کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔

اچانک میری نظر اس آفیسر کے ذاتی سیل فون پر پڑی جو اس وقت باتھ روم کے ٹب میں مردہ پڑا تھا۔ سیل فون پر میسج کا سگنل تھا۔ میں نے میسج پڑھا۔ اس کے کسی ماتحت لیفٹیننٹ نے لکھا تھا۔ ''سر لوکاس! کلب کی چھت والی اینٹی کرافٹ بالکل درست ہے اور کام کررہی ہے۔''

IN BOX میں مزید پیچھے گیا۔ آج ہی کی تاریخ میں اس میں کئی پیغامات موجود تھے۔ کچھ کی نوعیت نجی تھی اور کچھ کی آفیشل۔ ایک میسج میں بارڈر کی صورتِ حال کا تذکرہ بھی تھا۔ قریباً چالیس منٹ پہلے آفیسر کو ایک اہم پیغام موصول ہوا تھا۔ یہ پیغام اسی لیفٹیننٹ کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''سر میں نے دونوں گنیں خود جا کر چیک کی ہیں۔ دونوں ہی کے کوائل سسٹم میں فالٹ ہے۔ وہ کام نہیں کررہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں یہ خطرناک ہے۔ کلب اور اردگرد کا سارا ایریا غیر محفوظ ہے۔'' جواب میں آفیسر لوکس نے جو ٹیکسٹ میسج کیا تھا وہ بھی SENT MSG میں موجود تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ فوراً چھت والی گن کو چیک کرو اور مجھے بتاؤ۔'' ساتھ ہی ذمے دار شخص کے لیے انگلش کی ایک عام فہم گالی بھی درج تھی۔ اس میسج کے جواب میں ماتحت لیفٹیننٹ نے وہ میسج ارسال کیا تھا جو میں نے سب سے پہلے دیکھا تھا یعنی'' ...... سر لوکاس! کلب کی چھت والی اینٹی کرافٹ بالکل درست ہے اور کام کررہی ہے۔''

یہ آخری ٹیکسٹ پیغام آفیسر لوکاس کو قریباً بیس منٹ پہلے موصول ہوا تھا۔ یعنی یہ وہ آخری پیغام تھا جو اس نے اپنی زندگی میں موصول کیا تھا۔ صورتِ حال کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ اس علاقے کا ایئر ڈیفنس کافی گڑبڑ تھا۔ غالباً رازداری کے خیال سے دونوں افسران نے وائس کال کرنے کے بجائے ٹیکسٹ پیغامات کا ذریعہ استعمال کیا تھا۔

ابھی میں یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر مدھم سی مخصوص دستک ہوئی۔ یہ قسطینا تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے کر پشت کی طرف چھپالیا اور دروازہ کھولا۔ قسطینا جلدی سے اندر آگئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور جھلاہٹ کے آثار تھے۔ اس نے شال کا گھونگھٹ سا نکال رکھا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور شال کے نیچے پوشیدہ تھا۔

اندر آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کردیا اور بے دم سی ہوکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''حرامزادے ...... سور کے بچے۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''اپنے اس باپ کے گرد انسانی ڈھال بنائی ہوئی ہے انہوں نے۔'' یقیناً وہ چیف گیرٹ اور اس کے محافظوں کا ذکر کررہی تھی۔ تب میری نگاہ اس کی کلائی پر پڑی۔ کشادہ آستین میں سے اس کی گوری چٹی کلائی پر تازہ زخم نظر آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دو چوڑیاں ٹوٹ کر گوشت پر چرکا لگا گئی ہیں۔ میں نے ایک کپڑے سے اس کے خون کو مزید رسنے سے روکا اور پھر وہی کپڑا زخم پر باندھ دیا۔ وہ بولی۔ ''دونوں سیڑھیوں پر سخت پہرا ہے۔ سیڑھیوں کے اوپر بھی گارڈز کھڑے ہیں۔ نیچے جانا ناممکن ہے۔''

''یہ آپ کی کلائی ......؟''

''ایک حرامی گارڈ نے مجھے نیچے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ میری طرف آیا، میں ایک دروازے میں گھس گئی۔ یہ ٹیبل ٹینس کا خالی ہال تھا۔ وہ اندر آیا تو میں نے پستول کا دستہ مار کر اسے ڈھیر کردیا۔''

''بے ہوش ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ...... میں نے گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا ہے۔ دروازے کو باہر سے لاک کر ڈالا ہے۔'' اس نے لاک کی چابی مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کی بے قراری عروج پر تھی۔ وہ اپنے والد کے قاتل کے آس پاس پہنچ چکی تھی مگر اس کی گردن دبوچنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ تلملا رہی تھی۔ آنکھوں سے آتشیں نمی چھلک رہی تھی۔ نیچے ہال کمرے میں محفلِ نشاط و طرب جاری تھی۔ کسی وقت بہت سے لوگ کورس کی شکل میں ہنستے تھے اور اس آواز کی گونج بالائی کمروں تک محسوس ہوتی تھی۔ بے شک ہم دونوں کلب کے اندرونی حصے میں پہنچ چکے تھے مگر اس مقام تک رسائی اب بھی ناممکن تھی جہاں چیف گیرٹ اور دیگر اعلیٰ افسران موجود تھے۔

قسطینا کی بے بسی دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''مجھے ایک بات کا پتا چلا ہے ......''

''کیا؟'' وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی۔

''یہ دیکھیں۔'' میں نے آفیسر لوکاس کی یونیفارم سے برآمد ہونے والا سیل فون قسطینا کی طرف بڑھا دیا۔

میں نے پیغامات پڑھنے میں اس کی مدد کی۔ قسطینا کے چہرے پر توجہ اور دلچسپی کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ پُرسوچ لہجے میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس علاقے میں صرف ایک اینٹی کرافٹ ہے جو اس عمارت کی چھت پر ہے اور اگر اسے بھی بیکار کردیا جائے تو اگلے ایک آدھے گھنٹے میں کلب پر بھرپور فضائی

حملہ کیا جاسکتا ہے۔''

''بالکل یہ ممکن ہے۔''

وہ سنسنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے، یقینی بات تھی کہ ہم دونوں ایک ہی انداز سے سوچ رہے تھے۔ وہ بولی۔ ''شاہ زائب! یہ چار منزلہ عمارت ہے۔ مطلب یہ کہ قریباً پینتالیس زینے چڑھ کر ہم اوپر چھت پر پہنچ سکتے ہیں اگر گن کے قریب زیادہ افراد نہیں ہیں تو پھر ہمارے لیے کچھ کر گزرنا مشکل نہیں ہو گا۔''

''اگر سیڑھیوں کے بجائے لفٹ سے چڑھا جائے تو؟''

''نہیں، میں دیکھ کر آئی ہوں لفٹ کی طرف کافی گارڈز ہیں۔ مگر سیڑھیوں کی طرف بھی کنفرم نہیں کہ گارڈز ہیں یا نہیں۔''

''اگر ہم گن کا کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں تو پھر؟''

''مجھے پتا ہے شاہ زائب کہ اینٹی کرافٹ کو ناکارہ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس کو ایسا کر دیں گے کہ وہ کم از کم اگلے دس بارہ گھنٹے تک کسی کام کی نہیں رہے گی۔ اس کام کے فوراً بعد ہم کلب کی عمارت سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

''اور نکلنے کے بعد؟''

''میری کوشش ہوگی کہ پہلی فرصت میں برج کلب پر فضائی حملے کا حکم دوں۔''

''کیسے دیں گی یہ حکم؟''

''یہی سیل فون استعمال کیا جاسکتا ہے۔'' قسطینا نے ہلاک ہونے والے آفیسر لوکاس کے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہاں ہماری موجودگی زیادہ دیر چھپی نہیں رہے گی۔ ہمیں جو کرنا ہے جلدی کرنا ہو گا۔''

اس نے ایک بار پھر میرے زخمی بازو کی طرف دیکھا۔ ''شاہ زائب، تمہارا بازو بہت زخمی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے مزید نقصان پہنچے۔ تمہارے پاس بلٹ پروف بھی نہیں۔ تمہارے لیے یہاں رکنا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں اوپر جاتی ہوں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو پتا ہی ہے کہ کبھی کبھی کمانڈروں کو اپنے ماتحتوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ سمجھیں کہ آپ کو بھی یہی صورت حال درپیش ہے۔ میں ہر صورت آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ آپ کی اجازت سے اور آپ کی اجازت کے بغیر بھی......''

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور چپ ہوگئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب میں باز نہیں آؤں گا۔ بے شک اس کا سامنا اپنے ہی جیسے ایک ڈھیٹ سے تھا۔ میں نے آخری جملہ مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔ کبھی کبھی تناؤ اور خطرے کے بھرپور ماحول میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ حیرت انگیز طمانیت اور حوصلے کا باعث بنتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے قسطینا کے جوش میں نمایاں اضافہ محسوس کیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا۔ اس کی اپنی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں لیکن فی الوقت اس نے گہرے سیاہ آئی لینز لگا رکھے تھے۔ وہ اپنی ان سیاہ پتلیوں کو خلا میں مرکوز کر کے جیسے آنے والی گھڑیوں کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت یہاں کلب کے جشنِ طرب میں صرف چیف گیرٹ ہی نہیں، گرے فورس کے بہت سے اور سینئر کمانڈرز موجود تھے۔ ممکن تھا کہ حکومت کے کئی اعلیٰ عہدیدار بھی ہوں۔ اگر اس وقت کلب پر فضائی حملہ ہوسکتا تو رائے زل کا ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا تھا۔

دو چار منٹ بعد ہم دونوں اس لگژری اپارٹمنٹ سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ دروازہ قسطینا نے ہی کھولا۔ ہم کوریڈور میں آئے۔ اوپر جانے والے زینے دس بارہ قدم دور تھے۔ قالین پوش زینوں کو طے کرتے ہوئے جب ہم گھومے تو ایک مدہوش منظر دکھائی دیا۔ یوں لگتا تھا کہ جزوی فتح کو رائے زل کے فوجیوں اور افسروں نے مکمل فتح سمجھ لیا ہے اور کھل کھلا کر اس کا جشن منا رہے ہیں۔ ایک جوڑا قالین پوش زینوں پر ہی مصروفِ گل تھا۔ ایک قدرے فربہ شخص نے روم سروس کی ایک ملازمہ کو بانہوں میں لیا ہوا تھا اور عشق و محبت کی مختلف منازل طے کر رہا تھا۔ شاید دونوں ہی نشے میں تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ ہم ان کے قریب سے گزرتے ہوئے بالائی زینوں پر آئے۔ ان زینوں کے آغاز پر ہی ایک مسلح گارڈ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گن کے بجائے اس کے ہاتھ میں شیمپین کی بوتل تھی اور گن دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی تھی۔ گارڈ کے ایئر فونز میں سے یقیناً موسیقی برآمد ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور غنودگی میں تھا۔

میں نے آواز پیدا کیے بغیر اس کی رائفل اٹھالی۔ دبے پاؤں چلتے ہم چوتھی منزل پر پہنچے۔ اور یہاں ہمیں پہلی بار مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ دو گارڈز تھے۔ ایک کی کنپٹی

پر میں نے رائفل کے وزنی دستے کا تباہ کن وار کیا۔ یہ وار میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے کیا تھا، مگر ایسا ''ٹو دی پوائنٹ'' تھا کہ گارڈ نے ''مزید'' کی ڈیمانڈ نہیں کی۔

دوسرے گارڈ کے سینے پر قسطینا نے سائلنسر لگے پستول سے فائر کیا...... اور پھر اسے اپنے بازوؤں پر سہارا تاکہ وہ گرتے وقت آواز پیدا نہ کرے۔ اس کی رائفل کی سنگین قسطینا نے اتار لی۔

فائر بے شک سائلنسر لگے پستول سے کیا گیا تھا۔ نچلی سیڑھیوں پر موجود گارڈ جاگ گیا۔ پہلے تو یقیناً اس نے اپنی گمشدہ رائفل کو دیکھا ہوگا پھر وہ دہاڑا۔ ''کون ہے؟''

ہم اسے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ بھاگتے ہوئے چھت پر پہنچے۔ کافی کھلی چھت تھی۔ نیوسٹی میں آج مکمل بلیک آؤٹ نہیں تھا۔ کچھ عمارتیں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں لیکن کچھ میں ہلکی روشنیاں موجود تھیں۔ ایک قریبی چوراہے کے ٹریفک سگنلز جلتے بجھتے نظر آرہے تھے۔ چوراہے کے قریب ہی ایک ٹاور نما عمارت تھی۔ اس کی مختصر چھت پر ریڈار کے آثار دکھائی دیتے تھے جس قبرستان سے ہمارا گزر ہوا تھا، اس کے گرجے کی بلند صلیب بھی یہاں سے دکھائی دیتی تھی۔ چھت کے عین درمیان ریت کی بہت سی بوریاں چنی گئی تھیں۔ ان بوریوں کے درمیان سے اینٹی ایئر کرافٹ کی لمبی نال نظر آرہی تھی۔ گن کے اوپر ایک جال تان دیا گیا تھا۔ چھت پر پہنچتے ہی ہم دونوں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے اپنی رائفل نیچے رکھ دی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی جس گارڈ کی رائفل پر میں نے قبضہ جمایا تھا، وہ بوکھلایا ہوا سا چھت پر آیا۔ میں نے عقب سے اسے اس طرح دبوچا کہ وہ آواز نہیں نکال سکا۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے اس کے ہونٹوں کو مضبوطی کے ساتھ ڈھانپ لیا تھا اور یہ کارروائی میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے ہی کی تھی۔ قسطینا نے بڑی صفائی سے کوئی ایک فٹ لمبی سنگین گارڈ کے سینے میں گھونپ دی۔ میں مضروب کو گھسیٹ کر اوٹ میں لے گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ میں نے اسے چھت کے فرش پر ڈال دیا۔

تب تک قسطینا چھپتی ہوئی بوریوں سے بنے ہوئے مورچے تک پہنچ چکی تھی، میں نے اوپر تلے تین فائرز کی آواز سنی۔ یہ تینوں فائر قسطینا نے اپنے سائلنسر لگے پستول سے کیے تھے۔ میں بوریوں تک پہنچا۔ اندر جھانکا دو سپاہی ساکت پڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ابھی تک ادھ کھایا ہوا چکن پیس تھا۔ اس کی ٹانگیں جان کنی کے عالم میں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

''ٹائم زیادہ نہیں ہے ہمارے پاس۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کریں۔'' میں نے قسطینا سے کہا۔

وہ چھلانگ لگا کر مورچے کے اندر اتر گئی۔ مورچے کی دیواریں ریت کی تھیلا نما بوریوں کی مدد سے بنائی گئی تھیں اور قریباً چار فٹ اونچی تھیں۔ میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ رائفل دوبارہ میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اس طرح کھڑا تھا کہ مورچے کے اندر قسطینا کو دیکھ سکتا تھا اور چھت پر کھلنے والے دروازے پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اینٹی کرافٹ گن کو ناکارہ کرنے کے لیے قسطینا اس کے کسی پرزے سے چھیڑ چھاڑ کرے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ پوری اسلحہ شناس تھی اور اس گن کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے نوک دار سنگین کی ضرب سے ریت کی ایک بوری کو پھاڑا اور ریت سے مٹھی بھر لی۔

''کیا کر رہی ہیں؟''

''بس دیکھتے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

گن کے چیمبر کے پاس سے اس نے ایک چوکور ڈھکن کا کلپ ہٹایا اور ڈھکن اٹھا کر مٹھی بھر ریت اس میں ڈال دی۔ ڈھکن دوبارہ بند کر کے اس نے ہاتھ جھاڑے اور بڑے اعتماد سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ''گن مین'' اب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ان کے جسموں سے بہنے والا خون، ان کی وردیوں کو بھگونے کے بعد اب مورچے کی چٹائی کو بھگو رہا تھا۔

یکایک عمارت کے کسی نچلے فلور پر الارم بجنے لگا۔ یقیناً سیڑھیوں پر پڑے گارڈز کو دیکھ لیا گیا تھا یا پھر باتھ روم میں آفیسر لوکاس کی نیم برہنہ لاش کی رونمائی ہوگئی تھی۔ ''لو جی گڑبڑ شروع ہوگئی۔'' قسطینا نے زقند بھر کر مورچے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس طرف بھی ایک دروازہ دیکھا ہے۔ شاید سیڑھیاں ہیں۔'' میں نے چھت کے مغربی گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم اُس جانب دوڑے۔ دروازہ کھولا۔ وہاں واقعی سیڑھیاں تھیں جو نیچے جارہی تھیں۔ ساتھ ہی لفٹ کا دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لفٹ موجود تھی۔ میں نے بٹن دبایا۔ دروازہ کھل گیا۔ لفٹ میں لفٹ بوائے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک اسٹول پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ سیڑھیوں کے بجائے لفٹ استعمال کرنا کہیں زیادہ مناسب تھا۔ ہم

لفٹ میں گھس گئے۔ میری آستین پر خون دیکھ کر اور الارم کی آواز سن کر لفٹ بوائے کو خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ دبلا پتلا لڑکا کوئی حرکت کرتا، قسطینا نے وہی کیا جو وہ پہلے کرتی آئی تھی۔ (اور یقیناً اس وقت ہم جس طرح کی سچویشن میں تھے، کسی طرح کی صلہ رحمی کی گنجائش نہیں تھی)

اس نے لڑکے کی پیشانی پر دو فٹ کے فاصلے سے گولی ماری اور وہ جو چلّانے کا ارادہ کر رہا تھا، مٹی کا ڈھیر بن کر فرش پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ جیسے تعجب کے عالم میں ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پیشانی پر خون کی بس ایک چھوٹی سی لکیر تھی۔ میں نے گراؤنڈ فلور کے لیے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ نیچے جانے لگی۔ اب معلوم نہیں تھا کہ باہر نکلنے پر کیا حالات پیش آنے ہیں۔ میں نے اپنی خون آلود آستین کو چھپانے کے لیے اوپر تک اڑس لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ رائفل کو لفٹ کے اندر ہی رہنے دوں گا۔ میرا پستول شرٹ کے نیچے موجود تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا غیر متوقع تھا۔ لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکنے کے بجائے مزید نیچے جانا شروع ہو گئی۔ ہم نے کنٹرول پینل پر ہاتھ مار کر اسے بار بار روکنے کی کوشش کی مگر اس میں کوئی خرابی تھی۔ وہ دو فلورز کے درمیانی حصے میں کہیں رکی اور پھر سے اوپر چڑھنے لگی۔ لفٹ بوائے ہی اسے راہِ راست پر لا سکتا تھا لیکن وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔ ایک دو فلور اوپر چڑھنے کے بعد ہم اسے روکنے اور دوبارہ نیچے لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس مرتبہ بھی وہ گراؤنڈ فلور پر رکنے کے بجائے دو منزلیں نیچے جا کر رکی۔ یعنی ہم بیسمنٹ کے زیریں حصے میں تھے۔ بٹن دبا کر دروازہ کھولا۔ خوش قسمتی سے سامنے کوریڈور خالی تھا۔ نیچے آنے والی سیڑھیوں پر بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایجنسی کے کسی اہلکار نے چلّا کر انگلش میں کہا۔ ”لفٹ نیچے گئی ہے...... تین نمبر لفٹ ہے۔ اس میں دیکھو۔“

سیڑھیوں پر گونجنے والی بھاری قدموں کی دھما دھم مزید تیز ہو گئی۔ ہم کوریڈور میں دس پندرہ قدم آگے گئے۔ مسلح گارڈز بیسمنٹ میں پہنچنے والے تھے۔ ہمیں دائیں جانب ایک بھاری بھرکم دروازہ نظر آیا۔ ہم نے اس کے ہینڈل کے ساتھ کوشش کی اور دروازہ کھل گیا۔ ہم اندر گھسے، یہ عجیب وضع کا مستطیل کمرا تھا۔ دروازہ بند کیا اسے بولٹ کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی چرخی لگی ہوئی تھی۔ ہم نے چرخی گھما کر دروازے کو لاک کر دیا۔

مختلف دروازے کھلنے اور بند ہونے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں کوئی اور دروازہ تو دور کی بات کھڑکی یا روشن دان تک نہیں تھا...... ہاں دو تین دیوار گیر الماریاں موجود تھیں۔ ہم نے الماریاں کھول کر دیکھا وہ مختلف اشیا سے بھری ہوئی تھیں، ان میں اشیائے خورونوش بھی تھیں۔ کسی الماری میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ اس میں چھپا جا سکے۔ مستطیل کمرے کے اندر ہی دو چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے معلوم ہوا کہ یہ واش رومز ہیں۔ اسی دوران میں باہر سے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی پھر اسے دھڑا دھڑ بجایا جانے لگا۔ یہ دروازہ کافی مضبوط تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خاصی موٹی آہنی چادر سے بنایا گیا ہے...... اور اسے کھولنا آسان نہیں لیکن عین ممکن تھا کہ اس پر آٹو میٹک گن سے فائر کیے جاتے تو اس کا لاک ٹوٹ جاتا مگر ایسی کوئی نوبت نہیں آئی۔ پندرہ بیس سیکنڈ تک دروازہ بجایا گیا، پھر خاموشی چھا گئی۔ لگتا تھا کہ تلاش کرنے والے عمارت کے دوسرے حصوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں...... یا پھر انہوں نے عارضی طور پر اس کمرے کو نظرانداز کر دیا ہے۔

فرش پر ایک باریک سا قالین بچھا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کمرا بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ قالین پر ہلکی سی گرد موجود تھی۔ قسطینا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کو دیکھ کر میں بھی بیٹھ گیا۔ ”تمہارا بازو تو ٹھیک ہے؟“ اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”ابھی تو ٹھیک ہے۔“

”آئندہ بھی ٹھیک ہی رہے گا۔“ وہ بولی۔

ہم دونوں نے اپنے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیے۔ بھاگ دوڑ کی آہٹیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ گارڈز کے پکارنے کی مدھم آوازیں بھی ہم تک پہنچتی تھیں۔ اس کے علاوہ الارم کی آواز تھی جو غالباً گراؤنڈ فلور سے ابھر رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں وہی سیون ایم ایم رائفل تھی جو میں نے سوئے ہوئے بے خبر گارڈ کے پہلو سے اٹھائی تھی۔ قسطینا کے ہاتھ میں سائلنسر لگا طاقتور پستول تھا جس کے ساتھ اب اس نے نیا میگزین اٹیچ کر لیا تھا۔ ”کیا خیال ہے تمہارا شاہ زائب! ہوائی حملے کا کہہ دیا جائے؟“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پہلی بار پتا چلا کہ آپ مذاق بھی کر لیتی ہیں۔“

”یعنی تمہارا مطلب ہے کہ اس برج کلب پر حملہ ہوا تو ہم بھی دوسروں کے ساتھ ہی بھسم ہو جائیں گے؟“

”کیا آپ کو اس میں کوئی شک ہے؟“ میں نے الٹا

سوال کیا۔

''بالکل شک ہے بلکہ یقین ہے...... کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ حملہ کتنا بھی زوردار ہوا ہم بخیریت رہیں گے۔''

''وہ کس طرح؟''

وہ غیر محسوس انداز میں مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں چمک فزوں تر ہوگئی۔ وہ بولی۔ ''شاہ زائب! تمہیں معلوم ہے، ہم اس وقت کہاں ہیں؟'' پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''ہم اس وقت اس عمارت کے مضبوط ترین زیرِ زمین بنکر میں ہیں۔ ایسے بنکر بنائے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ فضائی حملوں سے محفوظ رہا جاسکے۔ برج کلب میں زیادہ تر اعلیٰ فوجی افسران اور انتظامیہ کے عہدیدار ہی آتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر حفاظت کے خاص انتظام کیے جاتے ہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے بھی اس علاقے پر ڈیڈز نے ایک زوردار فضائی حملہ کیا تھا اور یہ کلب تقریباً تباہ ہوگیا تھا۔ شاید تب ہی یہ بنکر بنایا گیا ہوگا۔'' اس نے تنقیدی نظروں سے اس مستطیل ہال کمرے کے در و دیوار کا جائزہ لیا۔

اس نے پستول کے دستے سے ایک دیوار کو ٹھونکا۔ عجیب سی آواز آئی۔ کچھ ایسی ہی آواز بھاری بھرکم دروازے سے بھی آئی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ''میرے اندازے کے مطابق یہ دیواریں ڈیڑھ فٹ موٹے کنکریٹ سے بنائی گئی ہیں۔ مزید حفاظت کے لیے ان میں اندر کی طرف کئی انچ موٹی آہنی پلیٹیں لگی ہوئی ہیں۔ چھت کی بناوٹ بھی یہی ہے اور دروازہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔''

میں نے بھی رائفل کے دستے سے دیواروں کو ٹھونکا تو لوہے سے لوہا ٹکرانے کی صدا ابھری۔ میں نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم میں جنگ زدہ علاقوں میں ایسے مضبوط ترین بنکر بنائے جاتے تھے جو سیکڑوں ٹن بارود کی بارش برداشت کرلیتے تھے اور ان میں پناہ لینے والے اس ''بارش'' کے بعد زندہ سلامت باہر نکل آتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہم اتفاقاً ہی اس زیرِ زمین پناہ گاہ یعنی ائر ریڈ ار شیلٹر میں گھس آئے ہیں۔ اسے ہماری خوش قسمتی بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس کمرے نے کم از کم وقتی طور پر تو ہمیں مرحوم یا گرفتار ہونے سے بچالیا تھا۔

قسطینا نے ایک بار پھر آہنی چرخی کو حرکت دی اور دروازے کے لاک سسٹم کو چیک کیا۔ وہ پوری طرح مطمئن نظر آرہی تھی اور اس کی آنکھوں میں شعلوں کا عکس تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ وہ اب وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زائب! میں برج کلب پر فضائی حملے کا حکم دے رہی ہوں......''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ حکم دے رہی ہیں تو یقیناً آپ نے سب کچھ سوچ سمجھ لیا ہوگا۔ میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں۔''

''شاہ زائب! کسی بات کی سو فیصد گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم یہاں محفوظ رہیں گے۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور پھر آفیسر لوکاس کے سیل فون کے ذریعے ڈی پیلس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ سگنل یہاں کمزور آرہے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح آقا جان سے بات کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے آقا جان کو چچا کہہ کر مخاطب کیا اور اسے ساری صورت حال کے بارے میں بتا کر فوراً ہیلی کاپٹرز کو بھیجنے کا حکم دیا۔ آخر میں وہ بولی۔ ''چچا جان! یہ بہترین موقع ہے۔ دیر بالکل نہ کی جائے۔ بھرپور حملہ ہو۔ کم از کم چار ہیلی کاپٹر ضرور ہونے چاہئیں۔ دو تین منٹ کے اندر آپریشن ختم کردیں۔ جہاں تک میں دیکھ رہی ہوں، یہاں کوئی بچہ موجود نہیں۔ زیادہ تعداد فوجی افسروں اور ان کی گرل فرینڈز یا بیگمات کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ چیف گیرٹ خود یہاں موجود ہے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ قسطینا بولی۔ ''نہیں چچا! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے ناکہ یہ بڑی سیف جگہ ہے۔ آپ بس پائلٹوں کو پرواز کا حکم دیں۔''

چند مزید فقروں کے تبادلے کے بعد قسطینا نے گفتگو ختم کردی۔ حالات بھی کس طرح رنگ بدلتے ہیں۔ قسطینا کسی اور پلاننگ کے ساتھ نیوسٹی کے علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ کسی بھی طرح چیف گیرٹ کے قریب پہنچنا چاہتی تھی۔ اطلاعات کے مطابق چیف گیرٹ ڈیڈی فلاورز اور ان فلاورز سے کشید کیے گئے عطر کا شیدائی تھا۔ غالباً اسی حوالے سے قسطینا نے پھول بیچنے والی دیہاتن کا روپ دھارا تھا اور یہاں پہنچی تھی۔ یہاں پہنچ کر صورتِ حال یکسر تبدیل ہوئی تھی۔ اور اب وہ برج کلب پر فضائی حملہ کرانے جارہی تھی۔

گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کسی آنے والے طوفان کی منادی کررہی تھی۔ اس ''شیلٹر'' سے باہر نسبتاً خاموشی تھی۔ لگتا تھا کہ ہماری تلاش کی سرگرمی ماند پڑگئی ہے یا پھر کسی وجہ سے اس

سرگرمی کا رخ بالائی منزلوں کی طرف ہو گیا ہے۔ میں نے ایک الماری کھولی۔ یہ اشیائے خورونوش سے بھری ہوئی تھی۔ یہ سب کا سب خشک راشن تھا۔ بسکٹس، چاکلیٹس، انرجی بارز، ہنٹر بیف اور مشروبات کی سربمہر بوتلیں وغیرہ۔ فرسٹ ایڈ کا سامان، مختلف ادویات اور آکسیجن کے سلنڈر وغیرہ بھی یہاں موجود تھے۔ یقیناً یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے تھا جنہیں ہنگامی طور پر اس بنکر میں پناہ لینا پڑتی۔

قسطینا نے کہا۔ ''یہاں کم و بیش پچاس افراد کی ''پناہ'' کی گنجائش موجود ہے۔ اگر ہمیں یہاں کچھ دیر رکنا بھی پڑ گیا تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ کافی خوراک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں پچاس افراد کی گنجائش ہے اور ہم دو ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم کم از کم اڑتالیس افراد کی حق تلفی کریں گے۔''

''اور ان کی سفاک جارحیت جس طرح عام لوگوں کی ''جان تلفی'' کررہی ہے، وہ کس کھاتے میں جائے گی۔ میں مستقبل قریب کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں شاہ زائب! اگر رائے زل، ڈی پیلس تک پہنچ گیا تو وہاں خون کا دریا بہا دے گا۔''

ہماری یہ ہلکی پھلکی گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک بار پھر الارم بجنے لگا۔ تاہم اس بار اس الارم کے ساتھ ساتھ فضائی حملے کی اطلاع دینے والے سائرن بھی گونج رہے تھے۔ اس بیسمنٹ تک ان کی بہت مدھم آواز ہی پہنچ پا رہی تھی۔ چند سیکنڈ مزید گزرے ہوں گے جب یکایک اس بنکر کے آہنی دروازے کی دوسری جانب بھونچال سا آ گیا۔ آہنی دروازہ کھولنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ پہلے دروازے کو دھڑا دھڑ بجایا گیا پھر اس پر جیسے ہتھوڑے برسنے لگے۔ باہر موجود افراد چلا رہے تھے اور دروازہ کھولنے کے لیے کہا جارہا تھا۔

یہی وقت تھا جب ہمیں پہلا زوردار دھماکا سنائی دیا۔ شدید آواز تو اندر تک نہیں پہنچی مگر گونج سے پتا چل رہا تھا کہ دھماکا برج کلب کی حدود میں ہوا ہے اور خاصا زوردار ہے۔ چند سیکنڈ بعد اوپر تلے چار پانچ دھماکے مزید ہوئے۔ یوں لگا کہ ایک شدید زلزلے نے زمین کو دہلا دیا ہے۔ ہمیں شیلٹر کا فرش اپنے قدموں کے نیچے لرزتا محسوس ہوا۔

میں نے آہنی دروازے سے کان لگا کر سنا۔ لوگ چلّا رہے تھے۔ دروازے پر دوہتڑ برسا رہے تھے۔ چلّانے والوں میں خواتین کی آوازیں بھی تھیں۔ یقیناً یہ وہی مرد و زن تھے جو برج کلب کے ہال کمرے میں اور سبزہ زار پر کچھ دیر پہلے دادِ عیش دے رہے تھے، رقص کررہے تھے اور شیمپین کے فوارے ہوا میں اچھال رہے تھے۔ اب وہ دردناک موت سے بچنے کے لیے اس پناہ گاہ میں گھسنا چاہتے تھے لیکن اب یہ پناہ گاہ ان کے لیے نہیں تھی۔

ایجنسی کا کوئی سفید فام آفیسر غصے میں دہاڑا۔ اس نے کسی ذمے دار کو گالی دے کر کہا۔ ''اوپر آگ لگ گئی ہے۔ اوپر نہیں جاسکتے ہو، اس حرامزادے سے کہو دروازہ توڑ دے۔'' میں نے یہ مدھم آواز دروازے سے کان لگا کر سنی۔

کسی نے دہشت زدہ آواز میں پکار کر کہا۔ ''یہ نہیں ٹوٹے گا۔ یہ اب اندر سے ہی کھلے گا۔''

یکایک درودیوار ایک بار پھر ہولناک دھماکوں سے لرز اٹھے۔ ہیلی کاپٹرز چکر کاٹ کر دوبارہ حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ جنگی طیاروں کے مانند نیچے پرواز کر کے برج کلب پر بم پھینک رہے تھے۔ یہ دوسرا حملہ پہلے سے بھی شدید تھا۔ برج کلب کی چار منزلہ عمارت کا کوئی بڑا حصہ مسمار ہو گیا تھا۔ گڑگڑاہٹ ہیبت ناک تھی۔ آہنی دروازے کی دوسری جانب موجود فوجی افسران اور ان کی خواتین اب کربناک انداز میں آہ و بکا بلند کررہے تھے۔ کوئی شخص گھٹی گھٹی آواز میں پکارا۔ ''پیچھے ہٹو...... سب پیچھے ہٹو۔ ہم فائر کررہے ہیں۔''

چند سیکنڈ بعد یوں لگا کہ شیلٹر کا آہنی دروازہ چکنا چور ہو کر اندر آ گرے گا۔ اس پر آٹومیٹک رائفل سے اندھا دھند برسٹ مارے جارہے تھے۔ ہم نے دونوں واش رومز کے اندر پوزیشن لے لی اور ادھ کھلے دروازوں میں چوکس ہو کر کھڑے ہو گئے۔ آئندہ چند لمحوں میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ دروازہ ٹوٹ جاتا تو یقیناً ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی جاتی مگر دروازہ ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے قسطینا کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ بھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ چند لرزہ خیز دھماکے مزید ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ آگ نیچے تک پہنچ گئی ہے اور شیلٹر کے سامنے جمع ہو جانے والے لوگ کربناک انداز میں چلّا رہے ہیں۔ آہنی دروازے پر ہونے والی اندھا دھند فائرنگ بھی یکسر تھم گئی تھی۔

''لگتا ہے یہاں کا ٹمپریچر بڑھ رہا ہے۔'' میں نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں...... آگ نیچے تک پہنچ گئی ہے۔'' وہ بولی اور واش روم والی پوزیشن چھوڑ کر باہر آ گئی۔

میں بھی باہر نکل آیا۔ اس پناہ گاہ سے باہر جیسے کہرام

سا مچا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ دیواریں ابھی تک گر رہی ہیں مگر اب بارودی دھماکوں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید ''اٹیک ہیلی کاپٹرز'' تیز رفتار کارروائی کے بعد واپس لوٹ گئے تھے۔ بنکر کی دیواریں گرم سے گرم تر ہوتی جارہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آس پاس ہر طرف شعلے پھنکار رہے ہیں۔ شاید اس شیلٹر کے سوا پوری عمارت شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ درجہ حرارت بڑھتا جارہا تھا۔ ہمارے جسم پسینے سے تر ہو گئے۔ سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ مجھے ان گیس سلنڈرز کا خیال آیا جو تھوڑی دیر پہلے الماری میں دیکھے تھے۔ وہ شاید کسی ایسی ہی صورتِ حال کے لیے رکھے گئے تھے۔ میں نے دو سلینڈر نکالے یہ قریباً دو فٹ لمبے اور پانچ چھ انچ قطر کے تھے۔ نوزل کھول کر دیکھا ان میں گیس موجود تھی۔ میں نے ان کے ساتھ پائپ اور ماسک اٹیچ کر لیے اگر گھٹن زیادہ ہو جاتی تو ہم یہ سلنڈر استعمال کر سکتے تھے۔ بہرطور ابھی گزارا ہو رہا تھا۔

آہنی دروازہ بری طرح تپنے لگا تھا۔ اب اس پر ہاتھ دھرنا بھی مشکل تھا فرش اور دیواریں کنکریٹ کی تھیں لہٰذا وہ قدرے کم گرم تھیں۔ شدید گرمی سے بچنے کے لیے قسطینا ہال کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے میں گئی۔ اس نے چُغہ اتار کر اپنی بلٹ پروف جیکٹ جسم سے علیٰحدہ کی اور چُغہ دوبارہ پہن لیا۔ گرمی میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔

قسطینا نے کہا۔ ''ایسی دیواروں کے اندر تھرماپول کی شیٹس رکھی جاتی ہیں ورنہ شاید اب تک ہم جھلسنا شروع ہو جاتے۔''

''پاؤں تو اب بھی جھلس رہے ہیں۔'' میں نے ایک پاؤں فرش سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''شاید ہمیں پانی کی ضرورت ہے۔'' وہ بولی اور اس مرتبہ واش روم میں چلی گئی۔ اس نے خود کو شاور کے نیچے کھڑا کیا اور شاور کھول دیا۔ اس پر پانی گرنے لگا۔ تاہم اس سے پہلے اس نے لوکاس والا سیل فون اور پستول اپنے جسم سے علیٰحدہ کر دیا تھا۔ یہ طریقہ مناسب تھا۔ میں نے دوسرے واش روم میں جا کر یہی طریقہ اختیار کرنا چاہا تو وہاں پانی نہیں تھا۔ وہ پکار کر بولی۔ ''پانی نہیں ہے تو اِدھر ہی آجاؤ شاہ زائب۔''

میں دوسرے واش روم میں گیا اور اس کے ساتھ ہی شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ پانی ٹھنڈا تو نہیں تھا مگر پھر بھی سکون دے رہا تھا۔ قسطینا کے سیاہ گھونگھرالے بالوں کی لٹیں بھیگ کر اس کے چہرے اور گردن سے چپک گئی تھیں۔ اس کے طویل پھول دار چغے کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی جسمانی موزونیت نمایاں ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی جل پری پانی سے نکل کر ساحل پر آن کھڑی ہوئی ہو۔ میرا اپنا لباس بھی تربتر ہونے لگا تھا۔ اچانک قسطینا نے مجھے کھینچ کر شاور کے نیچے سے ہٹا دیا۔ کیا کر رہے ہو شاہ زائب! تمہارے بازو پر پلاستر ہے۔ اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ میں نے یہاں ایک پولیتھین دیکھا تھا۔''

وہ الماری کی طرف گئی اور وہاں سے ایک بڑی پولیتھین کی شیٹ نکال لائی۔ اس نے اس میں سے ایک ٹکڑا چاک کیا اور میرے مضروب بازو اور کندھے کو اس میں لپیٹ کر اچھی طرح ایک ڈوری سے کس دیا۔ میں محویت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پانی کے قطرے اس کے بالوں اور تھوڑی سے ٹپک کر اس کے گلے میں رینگ رہے تھے اور لباس میں گم ہو رہے تھے۔

ہم دونوں ایک بار پھر شاور کے نیچے آن کھڑے ہوئے۔ وہ بولی ایسے ''اٹر ایڈ شیلٹرز'' کے اندر ائر کنڈیشنگ کا سسٹم بھی موجود ہوتا ہے لیکن یہاں شاید اس ضرورت کا خیال نہیں رکھا گیا۔''

گرمی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ اب شاور کا پانی بھی نیم گرم ہونا شروع ہو گیا تھا مگر پھر بھی اس پانی کی موجودگی غنیمت تھی۔ ہم آمنے سامنے بالکل ساتھ ساتھ شاور کے نیچے کھڑے تھے۔ بالائی لباس بھیگ جانے کے بعد قسطینا کے زیرجامہ کے رنگ بھی نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دھماکا خیز ڈیوائس بھی عیاں ہونے لگی جو اس نے اپنی دبلی پتلی کمر سے باندھ رکھی تھی۔ اس کا سائز سگریٹ کے پیکٹ سے تھوڑا ہی بڑا تھا۔ اس کے دو سرخ بٹن بھیگے چغے کے اندر سے صاف دکھائی دے رہے تھے اور وہ براؤن بیلٹ بھی جس نے ڈیوائس کو اس کی کمر سے منسلک کر رکھا تھا۔

''یہ کیا ہے قسطینا؟'' اب میں نے پوچھنا ضروری سمجھا۔

''اپنا تحفظ۔'' وہ بولی۔ ''اگر کوئی ایسی صورتِ حال بن جائے کہ میں یہاں سے نکل نہ سکوں تو پھر...... ان لوگوں کے ہاتھ آنے کے بجائے، میں مرنا بہتر سمجھوں گی۔''

میں نے ڈیوائس کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ واٹر پروف ہے؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے اپنا تحفظ کر لیا...... لیکن میرا......؟''

''تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''یہ

میرے دل کی گواہی ہے۔''

''لیکن آپ نے خود ہی کہا ہے کہ سو فیصد گارنٹی کسی چیز کی نہیں دی جا سکتی۔ غیب کا علم تو بس اللہ کو ہے۔''

''دل کی گواہی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔'' وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

''شاید اسی کو چھٹی حس کہا جاتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی چھٹی حس تو بہت تیز ہوتی ہے مگر باقی پانچوں حسیں بس ایویں ہوتی ہیں۔'' میں نے کچھ ایسے انداز سے کہا تھا کہ اس کے چہرے پر بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہو؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ کچھ کچھ سمجھ رہی ہیں۔''

اس نے پُردرد انداز میں میرے زخمی کندھے کو ہولے سے سہلایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بولی۔

''شاہ زائب! تمہارے کندھے کے زخمی ہونے کا دکھ میرے دل میں ایک گہری چوٹ کی طرح ہے۔ یہ دکھ ہی کچھ کم نہیں ہے، لیکن اگر اس خطرناک ایڈونچر میں میرے ساتھ تمہیں بھی کچھ ہو گیا تو میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکوں گی۔''

''یہ خوب کہی آپ نے...... جب ہم دونوں ہی وفات پا جائیں گے تو پھر خود کو معاف کرنے یا نہ کرنے کی بات کا کیا مطلب؟''

''روحوں کو بھی تو اذیت ہوتی ہے۔ وہ بھی تو بھٹکتی رہتی ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک غم ناک مسکراہٹ ابھری۔ وہ دوبارہ بولی۔ ''تم ایک لیجنڈ ہو شاہ زائب! تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔''

ایک اور خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ عمارت کا کوئی اور حصہ زمین بوس ہو گیا تھا۔ یوں لگا تھا کہ پورا آسمان ٹوٹ کر اس شیلٹر کی چھت پر آن گرا ہے۔ کچھ دیر تک ہم دونوں سکتہ زدہ رہے۔ قسطینا نے کہا۔ ''ایسے شیلٹرز کی چھتیں خاص طور سے محفوظ بنائی جاتی ہیں۔ ان میں اسٹیل کے موٹے جال ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن محترمہ! بات تو پھر وہیں پر آ جاتی ہے۔ کسی بھی صورت حال کے لیے سو فیصد گارنٹی تو نہیں دی جا سکتی۔ سنا ہے کہ نائن ٹیز میں ایران عراق جنگ میں ایک ایسے ہی مضبوط ترین شیلٹر میں تین چار سو ''سویلین'' لقمۂ اجل بن گئے تھے۔''

''ہاں، یہ ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو نا کہ وہ حملہ کس نے کیا تھا۔ انہی امریکیوں نے۔ انہوں نے لیزر گائیڈڈ میزائل اور اسمارٹ بم استعمال کیے تھے۔ وہی سب کچھ جو یہ لوگ یہاں کر رہے ہیں۔ نئے ہتھیاروں کے نئے اور کامیاب تجربے۔'' قسطینا کے چہرے پر پھر نفرت اور طیش کی یلغار ہو گئی۔ شاید ان لمحوں میں اسے پھر اپنے پیارے والد کی موت یاد آ گئی۔

اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے شیلٹر کے آہنی دروازے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کتنا اچھا ہو کہ اس اٹیک میں چیف گیرٹ کا بوجھ بھی زمین سے اتر گیا ہو۔''

''ابھی تو شاید ہر طرف شعلے بھڑک رہے ہیں۔ صورت حال کنٹرول میں آئے گی تو پھر ہی کچھ پتا چل سکے گا۔ آپ سیل فون بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے اس میں کافی بیلنس موجود ہے اور چارجنگ بھی ہے۔''

اب گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ ''ائر ٹائٹ شیلٹر'' پوری طرح ائر ٹائٹ تھا، پھر بھی کہیں نہ کہیں سے دھوئیں کی بو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ہال کمرے کے اندر بہت ہلکا سا دھواں محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ قسطینا کھینچ کر سانس لے رہی تھی اور ہر سانس پر اس کی گردن میں سامنے کی طرف چھوٹا سا گڑھا نمودار ہو جاتا تھا۔ مجھے بھی سانس لینے میں دشواری ہونے لگی تھی۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں سلنڈرز کی ضرورت ہے۔'' قسطینا نے کہا۔

میں نے تیار سلنڈر کو قسطینا کی کمر سے اٹیچ کیا اور ماسک اس کے منہ پر چڑھا کر نوزل کھول دی۔ مجھے بھی ڈائیونگ کا تجربہ تھا اور آکسیجن سلنڈر کو استعمال کرنا اسی تجربے کا نتیجہ تھا۔ غوطہ خوری میں مہارت کی وجہ سے مجھے سانس لینے کی دشواری بھی نسبتاً کم محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال سلنڈر کا استعمال میں نے بھی شروع کر دیا۔

اچانک سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ قسطینا نے فون اٹھایا اور منہ سے ماسک ہٹا کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آقا جان کی آواز ابھری۔ ''تم خیریت سے ہو بیٹی؟''

''ہاں چچا! میں ٹھیک ہوں، حملے کا کیا بنا؟''

''زبردست...... بہت کامیاب، برج کلب کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے۔ بہت بڑا حصہ گر گیا ہے۔ آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ہمارا ایک انفارمر اَپ ڈیٹس دے رہا ہے۔ اردگرد کی کچھ عمارتوں میں بھی آگ نظر

آئی ہے۔ مرنے والوں اور زخمیوں کو کلب کے ملبے سے نکالا جارہا ہے۔ ہر طرف ایمبولینسیں بھاگ رہی ہیں۔ تم بتاؤ کہاں ہو اس وقت؟'' آقا جان کی آواز فون کے اسپیکر میں سے ابھر رہی تھی۔

''میں نے کہا ہے نا چچا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں ہمارا کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ اطلاع سو فیصد درست تھی۔ اینٹی ائر کرافٹ گنیں خاموش رہیں...... واپسی پر ہمارے صرف ایک ہیلی کاپٹر کو جزوی نقصان پہنچا لیکن وہ بھی ائرپورٹ پر خیریت سے لینڈ کر گیا۔ مجھے تمہاری طرف سے فکرمندی ہے...... تم شاید گھٹن محسوس کر رہی ہو۔ ٹھیک سے سانس نہیں لے رہی ہو۔'' آقا جان کی آواز رک رک کر آرہی تھی۔ کبھی بالکل مدھم ہو جاتی تھی، یہ کمزور سگنلز کی وجہ سے تھا۔ قسطینا نے آقا جان کو بتایا کہ کلب کے زیرِ زمین شیلٹر میں ہونے کی وجہ سے آواز صاف سنائی نہیں دے رہی۔ عیار آقا جان اب تک اندازہ لگا چکا تھا کہ قسطینا کے ساتھ کوئی اور بھی شیلٹر میں موجود ہے۔ آقا جان نے اس بارے میں استفسار کیا تو قسطینا نے صاف بتا دیا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ اس نے بتایا کہ مجھے ساتھ لانے کا فیصلہ اس نے آخری لمحوں میں کیا تھا اور اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ آقا جان نے اس بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کی۔

قسطینا نے ایک بار پھر اپنے حوالے سے آقا جان کو تسلی دی اور کہا کہ وہ جلد از جلد چیف گیرٹ کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔

اس نے دوبارہ ماسک چڑھا لیا۔ دو چار منٹ بعد ٹمپریچر میں کچھ کمی محسوس ہونے لگی۔ ہم نے دیواروں اور فرش وغیرہ کو ہاتھ لگا کر دیکھا وہ اسی طرح گرم تھے مگر صورتِ حال میں تھوڑی بہت بہتری محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے میں نے اپنا ماسک اتارا پھر قسطینا نے بھی اتار دیا۔ اب سانس لینے میں نسبتاً آسانی محسوس ہوئی۔ اچانک میری نگاہ چھت کی طرف گئی اور اٹھی رہ گئی۔ چھت پر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ایک سیاہ لائن سی دکھائی دے رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ کریک قسم کی چیز ہے قسطینا کی نگاہیں بھی اس لائن پر جم کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے پہلی بار ہراس کی کیفیت دیکھی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''ایسا ہو تو نہیں سکتا...... یہ ڈیڑھ فٹ کے قریب موٹی کنکریٹ اور لوہے کی چھت ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس پر بہت بڑے ملبے کا بوجھ ہے۔ شاید ہزاروں ٹن۔''

جو سوچیں ذہن پر حملہ آور ہوئیں وہ بہت ہولناک تھیں۔ اگر یہ چھت بیٹھ جاتی تو شاید ہماری ہڈیاں بھی سرمہ ہو جاتیں۔ اس دراڑ سے دھیان ہٹانے کے لیے ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ قسطینا کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ اس فضائی آپریشن کے نتیجے میں چیف گیرٹ اپنے انجام کو پہنچ گیا ہو اور یہ کوئی ایسا بعید بھی نہیں تھا۔ رقص و سرود اور مستی کی اس محفل میں جتنے لوگ بھی موجود تھے وہ گراؤنڈ فلور پر تھے اور آقا جان کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ گراؤنڈ فلور نا پید ہو کر رہ گیا ہے۔

بالائی منزلوں سے ایک بار پھر اکھاڑ پچھاڑ اور گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ملبا ہٹانے کا کام زور و شور سے ہو رہا ہے۔ شاید وہ لوگ زخمیوں کو ریسکیو کرنا چاہ رہے تھے اور کرینوں، بلڈوزروں وغیرہ کا استعمال کر رہے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ اب آگ بجھائی جا چکی ہے۔

قسطینا نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ اب رات کے قریباً دو بج رہے تھے۔ اس رات کی صبح تک پتا نہیں کیا ہو جانا تھا۔ میری نظر ایک بار پھر چھت کی دراڑ پر پڑی۔ یہ تشویش ناک انکشاف ہوا کہ وہ پہلے سے کچھ چوڑی اور نمایاں ہو چکی ہے۔ شاید چھت غیر محسوس طور پر بیٹھ رہی تھی۔ بہت غور سے دیکھنے پر اس میں ہلکا سا خم بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے قسطینا سے پوچھا۔ ''کیا اتنے مضبوط بنکر بھی اس طرح مسمار ہو سکتے ہیں؟''

''ایسا ہوتا تو نہیں لیکن جب ملٹی اسٹوری بلڈنگز گرتی ہیں تو بہت کچھ توقع کے خلاف ہو جاتا ہے۔''

وہ ایک بار پھر دھیان سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا، بولی۔ ''مجھے اپنی کوئی پروا نہیں شاہ زائب! لیکن یہاں اس وقت تمہارا میرے ساتھ ہونا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں باہر نکل جاتا ہوں۔'' میں نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

''کیسے؟''

''دروازہ کھول کر۔''

''اور تمہارا مطلب ہے کہ دروازہ کھول کر تم آرام سے چہل قدمی کرتے گراؤنڈ فلور پر پہنچ جاؤ گے...... اور وہاں سے کوئی ہیلی کاپٹر تمہیں اچک کر ڈی پیلس کی چھت پر اتار دے گا...... شاید تمہیں اندازہ نہیں، اس دروازے کے

باہر بھی بہت کچھ مسمار ہو چکا ہوگا اور مجھے تو لگتا ہے کہ اب یہ دروازہ آسانی سے کھلے گا بھی نہیں۔ یہ باہر کو کھلتا ہے۔''

''ہم کوشش کر کے تو دیکھ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ابھی یہ آگ کی طرح گرم ہے۔ اسے کچھ ٹھنڈا ہونے دو۔'' قسطینا نے کہا۔

ہم فرش پر ایک موٹا نمدہ بچھا کر بیٹھ گئے۔ سیل فون کے سگنل اب بالکل غائب ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار سگنل کا ایک نقطہ سا ابھر کر اوجھل ہو جاتا تھا۔ میرا ذہن باہر کے حالات میں الجھنے لگا۔ پتا نہیں تھا کہ وہاں ڈی پیلس میں کیا صورت حال ہے۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ انیکسی میں میری غیر موجودگی محسوس کی گئی ہے یا نہیں۔ میں نے آخری کال میں انیق سے یہی کہا تھا کہ میں کل رات تک واپس لوٹ آؤں گا۔ وہاں انیق زبردست آزمائش سے... دوچار تھا۔ اس کو زینب کو سنبھالنا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی موجودگی کو راز ہی رکھنا تھا۔ وہ سجاول والے کمرے میں تھی اور اس کمرے میں وہ ہرگز محفوظ نہیں تھی۔ کسی بھی وقت یہ پول کھل سکتا تھا۔ زینب کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس حوالے سے بھی میرا دھیان بار بار آقا جان کی طرف ہی جاتا تھا۔ انیق نے آخری فون کال میں جو خاص بات بتائی تھی وہ بھی ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق زینب نے ایک پوسٹر پر کمانڈر افغانی کی تصویر دیکھی تھی اور پہچان لیا تھا کہ یہی بندہ ہے جو اسے خواجہ سرا خیام کی خطرناک تحویل میں چھوڑ کر گیا تھا۔ کمانڈر افغانی نے ایسا کیوں کیا؟ ایک اہم سوال ابراہیم کے بارے میں بھی بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا۔ پتا نہیں کہ زینب کی موت (جھوٹی موت) کے بعد اس پر کیا بیت رہی تھی۔ وہ دیوانگی کی حد تک اسے چاہنے لگا تھا اور اب اپنے تئیں وہ اسے کھو چکا تھا۔

اچانک ایک تڑاقا سا سنائی دیا جیسے کسی بہت سخت لوہے کو توڑا یا موڑا گیا ہو۔ ایک دھول سی ہمارے سروں پر گری۔ ہم نے ایک ساتھ اوپر دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ وہ منظر بہت دہشت ناک تھا۔ چھت کی دراڑ مزید چوڑی ہو گئی تھی۔ وہ اب تک طویل سیاہ ناگ کی طرح بل کھاتی ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلی گئی تھی۔ بہر حال چھت کا خم اب بھی زیادہ نمایاں نہیں تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں اس دروازے پر کوشش کرنی چاہیے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی آہنی چرخی ابھی تک تپ رہی تھی۔ اسے کسی کپڑے کی مدد سے ہی چھوا جا سکتا تھا۔ قسطینا ایک الماری سے بڑا سا تولیا نکال لائی۔ اس کی مدد سے ہم دونوں نے مل کر چرخی کو بمشکل گھمایا۔ میں صرف ایک بازو ہی استعمال کر پا رہا تھا۔ دروازے کے اندر سے ابھرنے والی آواز نے بتا دیا کہ وہ ''ان لاک'' ہو چکا ہے۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اسے آہستہ آہستہ باہر کی طرف دھکیلا۔ جلے ہوئے گوشت اور بارود کی بو تیزی سے اندر آئی۔ کہیں اوپر ملبے میں حرکت کرتی ہوئی بھاری مشینوں کی گڑگڑاہٹ کچھ واضح ہو گئی۔ بہر حال نظر کچھ نہیں آرہا تھا۔ ہم نے کافی قوت صرف کی مگر دروازہ دو تین انچ سے زیادہ نہیں کھل سکا۔ قسطینا کی یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ ملبے نے دروازے کو کھلنے سے روک دیا ہوگا۔

کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ باہر کا منظر کیا ہے۔ قسطینا الماری میں سے ایک چھوٹی ٹارچ ڈھونڈ لائی۔ میں نے اس ٹارچ کی روشنی دو تین انچ کی درز سے باہر پھینکی جو منظر مجھے دکھائی دیا وہ دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ یہ بس اس منظر کی ایک جھلک ہی تھی۔ میں نے اس شیلٹر کے آہنی دروازے کے سامنے درجنوں جلی اور ادھ جلی لاشیں دیکھیں۔ وہ جیسے ایک ڈھیر کی صورت دروازے کے سامنے پڑی تھیں۔ ان میں نیوسٹی کے باوردی اور بے وردی فوجی افسران تھے۔ ان کی ساتھی خواتین تھیں۔ اس کے علاوہ ایجنسی کے افسران تھے اور ان کی گرل فرینڈز تھیں (مقامی فوج تو ظاہر ہے زیادہ تر اپنی بیگمات کے ساتھ تفریح کرتے تھے لیکن بدیسی افسران کو یہاں مقامی لڑکیاں اور کال گرلز ''ساتھ'' فراہم کرتی تھیں) آگ، ان میں سے کئی افراد کے جسموں کو بے لباس کر چکی تھی۔ چہروں پر موت کی اذیت نقش ہو کر رہ گئی تھی اور آنکھوں میں نزع کا کرب جامد تھا۔ وہ سب کے سب اس شیلٹر میں پناہ لینے کے لیے اس طرف امڈ آئے تھے اور بند دروازے کے سامنے اپنے انجام کو پہنچے تھے۔

میں نے ٹارچ بند کر دی۔ ''کیا ہوا شاہ زائب؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس کچھ تکلیف دہ سین ہے۔''

''لاشیں ہوں گی۔ بمباری کے بعد وہ لوگ یقیناً اندر گھسنے کے لیے بھاگے ہوں گے؟''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔''

''کاش ان میں گیرٹ بھی ہو۔'' قسطینا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا اور ٹارچ میرے ہاتھ سے لے لی۔

''کوئی فائدہ نہیں قسطینا، کوئی چہرہ بھی پہچانا نہیں جا رہا۔''

’’لیکن میں دیکھوں گی۔‘‘ وہ مصمم انداز میں بولی۔

اس نے دروازے کی درز میں سے ٹارچ کی روشنی باہر پھینکی۔ کچھ دیر جبڑے بھینچ کر باہر جھانکتی رہی۔ میں نے بھی ایک نظر باہر ڈالی۔ وہ منظر یقیناً نگاہوں کو عذاب میں مبتلا کرنے والا تھا۔ مجھے اس فوجی افسر کی لاش بھی دکھائی دی جسے میں نے اوپر، اوپن ایئر حصے میں دیکھا تھا۔ وہ دو دوسرے حضرات کے ساتھ مل کر ایک میز کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا اور میز پر چڑھ کر ایک نیم عریاں لڑکی رقص کر رہی تھی۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد قسطینا نے ٹارچ بند کر دی اور اس نے اچھا ہی کیا۔ ٹارچ کی روشنی ہمارے لیے کوئی مسئلہ بھی پیدا کر سکتی تھی۔ ٹارچ بند کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر دروازے سے زور آزمائی کرنے لگے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ہم اس میں زیادہ سے زیادہ تین چار انچ کی درز ہی پیدا کر سکے۔ پھر یہ درز اس سے بھی کم ہو گئی۔ شاید باہر موجود انسانی ڈھانچوں کے انبار اور ملبے نے دروازے پر مزید دباؤ ڈال دیا تھا۔ ہم نے دروازے کو پھر سے لاک کر دیا۔

اس مشقت نے ہم دونوں کو ہانپنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی ایک وجہ شاید آکسیجن کی کمی بھی تھی۔ اب اس زیرزمین بنکر میں دھوئیں اور جلے ہوئے گوشت کی بو بھی داخل ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ دروازہ کھولنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

دیواریں اب نسبتاً ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ قسطینا نے نیچے بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائی اور بولی۔ ’’سیڑھیوں کا پورا اسٹرکچر تباہ ہو گیا ہے۔ اب زینوں کی جگہ ہزاروں ٹن ملبا پڑا ہے اور اس میں سے بہت سا ابھی تک سلگ رہا ہے۔‘‘

’’لاشوں میں گیرٹ کا کھوج ملا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں، کوئی واضح ثبوت تو نظر نہیں آیا مگر یہاں موجود لاشیں زیادہ تر بڑے افسروں کی ہیں۔‘‘

میں سیل فون کے سگنل وصول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سگنل اب قریباً زیرو تھے۔ چھت کی ہولناک دراڑ ہمیں مسلسل ڈرا رہی تھی۔ تاہم تھوڑی سی خوش آئند بات یہ تھی کہ اب اس میں مزید کشادگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

’’آپ کا کیا خیال ہے، کیا یہ یہاں رک جائے گی؟‘‘

’’امید تو بہت ہے لیکن اوپر جس طرح بھاری بھرکم مشینری کام کر رہی ہے اور ملبا بھی اپنی جگہ چھوڑ رہا ہے...... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔‘‘

اس نے سیل فون میرے ہاتھ سے لے لیا اور رخ پھیر پھیر کر سگنل وصول کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ سگنل نہ ہونے کے برابر تھے اور مسئلہ یہ تھا کہ چارجنگ تیزی سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے پاس کوئی چارجر بھی موجود نہیں تھا۔ وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی اور مایوسی سے فون کی اسکرین دیکھنے لگی۔ اس کی چمکیلی پیشانی پر ابھی تک وہ چھوٹا سا ابھار موجود تھا جو سرنگ میں میرے ساتھ دھینگا مشتی کا نتیجہ تھا۔ اس ابھار کو میں نے بے ساختہ چوما تھا اور وہ جز بز ہوئی تھی، میں نے کہا۔ ’’آپ کی پیشانی کی چوٹ پر کچھ لگا دوں؟‘‘

اس نے اپنی پیشانی کو انگلیوں سے ٹٹولا اور مجھ پر ایک تیکھی نظر ڈال کر پھر فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو۔ جو کچھ لگایا تھا وہی کافی ہے......

میں نے کہا۔ ’’آپ نے جواب نہیں دیا؟‘‘

وہ بولی۔ ’’معمولی سا ابھار ہے۔ اس سے کہیں زیادہ چوٹ تو کمر پر آئی ہے لیکن ابھی علاج معالجے میں پڑنے کا وقت نہیں۔‘‘

’’کیسے آئی چوٹ؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’جب اوپر بیڈ روم میں اس خبیث آفیسر سے گتھم گتھا ہونا پڑا تھا۔ شاید کسی میز کا کونا لگا ہے۔‘‘ وہ بولی۔

’’میری آنکھوں کے سامنے آفیسر لوکاس کا شرابی چہرہ گھوم گیا۔ وہ بڑے بپھرے ہوئے انداز میں ’’گل فروش قسطینا‘‘ کو اوپر کمرے میں لے کر گیا تھا اور پھر چند منٹ بعد لاش میں بدل گیا تھا۔

میں نے قسطینا کی پشت کو پہلی بار دھیان سے دیکھا۔ کندھوں سے ذرا نیچے بھول دار اسکرٹ پر خون کے چھوٹے دھبے تھے جو نہانے کے دوران میں بھیگ کر پھیل گئے تھے۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’قسطینا! یہ کافی چوٹ ہے۔ مجھے دیکھنے دو۔‘‘

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے پشت کی زپ کھولی اور اس کی کمر میری نگاہوں کے سامنے آگئی۔ یہ گہری رگڑ تھی جو قریباً ڈیڑھ فٹ تک چلی گئی تھی۔ ایک دو جگہ سے یہ زخم کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

’’کافی گہری خراش بلکہ رگڑ آئی ہے۔ دو تین جگہ سے خون رس رہا ہے اسے بینڈیج کی ضرورت ہے۔‘‘ میں نے کہا اور اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔

یہاں مرہم پٹی کا وافر سامان موجود تھا۔ زخموں کا ابتدائی علاج کیا جا سکتا تھا۔ میں نے دو میڈیسن لیں۔ پائیوڈین کا محلول بھی لیا۔ پہلے پائیوڈین سے ’’رگڑ‘‘ کو صاف کیا پھر آئنٹمنٹ وغیرہ لگا کر روئی رکھی اور چار پانچ جگہ میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ وہ بغیر کوئی آہ کیے خاموش بیٹھی رہی۔

اس کی حسین کمر میرے سامنے تھی۔ بے حد موزوں اور شفاف کمر۔ اس نے جیسے میری نگاہوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے ہاتھ پیچھے موڑے اور زپ بند کرلی۔ اس نے ایک بار پھر تیز نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن ان نظروں میں غصہ یا بیگانگی نہیں تھی۔

اس نے اپنی کہنی زمین پر ٹیکی اور ذرا نیم دراز ہو کر پہلو کے بل بیٹھ گئی۔ میری طرف کھوئے کھوئے انداز میں دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”کتنا اچھا ہوتا، ہم کہیں اور ملے ہوتے، کسی اور وقت...... کچھ اور حالات میں......“

”مثلاً! کہاں......اور کب؟“

”اسی ڈی پیلس میں...... کسی برسات والی شام میں، یا سردیوں کی کسی چمکیلی دوپہر میں...... یہاں کی چمکیلی دوپہریں زبردست ہوتی ہیں۔ دو تین سال پہلے تک یہ سب کچھ کتنا خوب صورت تھا۔“

”کیسا تھا دو تین سال پہلے تک؟“

”میں تھی، میری والدہ تھیں...... میرے پیارے والد تھے اور زندگی کی گاڑی ڈینی فلاور سے بھی زیادہ خوب صورت پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی بڑے ہموار راستوں پر چل رہی تھی۔ پھر یہ سب کچھ بدل گیا۔ اقتدار کی ہوس ہماری خوشیوں کو کھانے لگی۔ جنگ کا ماحول پیدا ہونے لگا۔ چنگاریاں شعلے بننے لگیں۔ ایجنسی والوں نے رائے زل کے ساتھ مل کر ہماری جڑیں کاٹنا شروع کر دیں۔ ہم پر جینا حرام کر دیا، جاماجی کی رونقوں کو نظر لگ گئی۔ یہاں کے سبزہ زاروں میں کھیلتے ہوئے بچے، اور یہاں زندگی گزارنے والے بے گناہ لوگ موت کے منہ میں جانے لگے۔“

اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر پھر بولی۔ ”عزت مآب ریان فردوس تو پہلے ہی بروناٸی چھوڑ کر پاکستان جاچکے تھے۔ ساری ذمے داریاں میرے والد کے کندھوں پر تھیں۔ وہ لڑتے رہے، اپنا دفاع کرتے رہے مگر مسئلہ یہی تھا...... وہ ایجنسی کے حرام خور امریکنوں کو اپنا مددگار سمجھ رہے تھے لیکن یہ ”خبیث گھس بیٹھیے“ رائے زل کے ساتھ مل کر سازشیں کر رہے تھے۔ اپنے پنجے گاڑ رہے تھے۔ یہ ان کی پشت پناہی ہی تھی کہ رائے زل ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتا جا رہا تھا۔ وہ آئے روز ہمارے علاقوں پر حملہ کرتا تھا اور ہمیں امتحان میں ڈالتا تھا اور پھر ہمیں لڑنا پڑا۔ اس لڑائی میں رائے زل نہیں جیتا، سازشیں جیتیں اور امریکنوں کی چالبازی جیتی۔ جن دنوں لڑائی کا ماحول بن رہا تھا انہی دنوں والدہ بیمار ہو کر چل بسی تھیں۔ لڑائی میں والد نے بھی اپنی جان قربان کر دی۔ میں جانتی ہوں رائے زل اور گیرٹ نے ان کی موت کا جشن منایا تھا۔“ قسطینا کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ ”یہ رائے زل کیا چیز ہے قسطینا؟“

وہ بولی۔ ”تم نے اسے دیکھا ہے؟“

”بس اس وڈیو میں دیکھا تھا جو آپ نے ڈی پیلس کے ڈائننگ ہال میں دکھائی تھی یا پھر یہاں ان پوسٹروں میں جو گاڑیوں کے پیچھے لگے نظر آتے ہیں۔ وہ موٹا سا گول مٹول بندہ جس نے چیف گیرٹ سے خفیہ ملاقات کی تھی۔“

”بہت خطرناک شخص ہے اور اس سے بڑھ کر اس کی ماں۔ وہ ہر صورت عزت مآب کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ عزت مآب نے اسے طلاق دی اور ان کا یہ گناہ کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں۔ بہت برس گزر گئے۔ وہ ان کو دن رات انگاروں پر چلا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سارے معاملے میں عزت مآب کا بھی تھوڑا بہت قصور رہا ہو لیکن ایسی کینہ پروری اور عداوت شاید ہی کسی عورت میں ہو جیسی اس ہاناوانی میں ہے۔“

”یہ رائے زل کی والدہ کا نام ہے؟“

”ہاں، اس کا مطلب مقامی زبان میں بہت اچھا ہے لیکن یہ ہاناوانی اس نام کے بالکل الٹ ہے۔ پرلے درجے کی بے رحم اور سنگدل۔ وہ ایک آسیب بن کر اس جزیرے پر مسلط ہے۔“

”ہاں، یہ بات تو میں نے خود بھی محسوس کی ہے قسطینا! جب بھی رائے زل کی والدہ کا ذکر آتا ہے، لوگوں کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرا جاتا ہے۔ وہ کس عمر میں ہے؟“

”عمر ساٹھ کے قریب پہنچ چکی ہے مگر اس کی کمینگی اور شیطانیت کمزور ہونے کے بجائے جوان ہے، بلکہ جوان ہوتی جا رہی ہے۔“

”کیا آپ کچھ تفصیل بتائیں گی؟“

قسطینا نے چھت کی دراڑ پر ایک نظر دوڑائی۔ دراڑ جوں کی توں تھی مگر کبھی کبھی باریک دھول جیسی چیز ہم پر گرنے لگتی تھی۔ اس دراڑ کو دیکھنا اور اس کے اوپر پڑے ہوئے بے پناہ بوجھ کا تصور کرنا بڑا لرزہ خیز تھا۔ ایسی دراڑوں اور ”کریکس“ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ رکی رہیں تو برسوں بلکہ...... صدیوں رکی رہیں اور حرکت میں آ گئیں تو سیکنڈوں میں موت اور بربادی کا بے مثال دہانہ کھول دیں۔ سر پر تلوار لٹکنے کا محاورہ بہت استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے سر پر تلوار نہیں تھی، موت کی دراڑ لٹک رہی تھی اور ہم

کچھ نہیں جانتے تھے وہ ہمیں کب تک مہلت دے گی۔

قسطینا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”تم ماورائی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟ میرا مطلب ہے ایسی چیزیں جن کو سائنس کی رُو سے ثابت نہ کیا جا سکے مگر ان کی موجودگی سے انکار بھی ممکن نہ ہو۔“

میں نے چند لمحے کے لیے سوچا، پھر کہا۔ ”اب سے کچھ عرصہ پہلے تک تو بالکل یقین نہیں رکھتا تھا...... مگر پاکستان آنے کے بعد، میں ایک انوکھے شخص سے ملا اور اس کے حوالے سے میں نے کچھ ایسے مناظر دیکھے جنہوں نے مجھے کسی حد تک ماورا اور غیر معلوم کا قائل کیا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”اگر زندگی رہی تو اس کے بارے میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔“

(میرے ذہن میں وہی سجاول کے ڈیرے والے واقعات تھے۔ جب میں نے اسے ایک بند کمرے میں عجیب طرح کی مصروفیت میں دیکھا تھا۔ باگھ کا سوکھا ہوا جگر چبانا، کوئی مہلک شراب پینا...... اور پھر وہ غیر معمولی جسمانی قوت جو سجاول میں مقابلے کے وقت در آئی تھی۔ اس کا ناقابلِ بیان غیظ و غضب اور وہ مُکا جس کی ایک اچٹتی ہوئی ضرب میں اب تک اپنے کندھے پر جھیل رہا تھا)

قسطینا نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”شاہ زائب! کبھی کبھی بہت روشن خیال ہونے کے باوجود ہمیں انہونیوں پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ انہونیاں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں اور ہم انہیں جھٹلا نہیں سکتے۔ ماناوانی کے حوالے سے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غیر معمولی قوتوں کی مالک ہے اور ان کی مدد سے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ وہ وہی کرتے ہیں جو وہ ان سے چاہتی ہے۔ کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پیش گوئی کی خداداد صلاحیت رکھتی ہے اور یہ صلاحیت اس کے اندر دھیرے دھیرے اتنی ترقی کر گئی ہے کہ اسے بہت سی باتوں کا پتا وقت سے پہلے چل جاتا ہے اور اپنی اس صلاحیت کے زور پر وہ لوگوں کو اپنا مطیع کرتی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے اردگرد اسرار کا ایک ہالہ سا بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگ اسے ماذو وارا بھی کہتے ہیں، یہ مقامی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے، قبروالی ملکہ۔“

”قبروالی ملکہ؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں، یہ ہر ہفتے کم از کم ایک رات قبرستان میں گزارتی ہے۔ یہ قبرستان اس نے اپنے ہی محل کے اندر ہی بنا رکھا ہے۔ یہاں اس کے خاندان والوں اور عزیزوں کی قبریں ہیں۔ کچھ وفادار ساتھی بھی وہاں دفن ہیں۔ سو کے لگ بھگ قبریں تو وہاں ہوں گی...... ہر بدھ کی رات وہ قبر کے اندر سوتی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”تمہیں یہ سب کچھ عجیب لگے گا مگر حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ اس نے پچھلے بیس برس سے اپنی قبر کھدوا رکھی ہے اس پر کتبہ بھی موجود ہے جس پر اس کا نام اور تاریخ ولادت وغیرہ لکھی ہے۔ یہ قبر اندر سے پختہ ہے۔ لحد میں باقاعدہ اس کا بستر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے کوئی منت مان رکھی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ وہ کوئی درویشانہ زندگی گزار رہی ہے؟“

”توبہ توبہ۔“ قسطینا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”پرلے درجے کی رنگ باز اور حرصی عورت ہے۔ عزت مآب سے طلاق کے بعد اس نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک شوہر بیمار ہو کر مر گیا، دوسرا جو ایک فوجی افسر تھا، اسے چھوڑ کر یورپ بھاگ گیا اور کبھی واپس نہیں آیا۔ یہ کوئی چودہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ اب بھی وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتی ہے۔ قیمتی لباس اور کروڑوں کی جیولری پہنتی ہے جس میں نایاب اور پُراسرار پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ اس نے عزت مآب اور میری محترمہ پھوپی نورل نسا کی زندگی جہنم بنانے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور وہ کر رہی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے رائے زل میں ہمارے خاندان کے خلاف کوٹ کوٹ کر زہر بھر دیا ہے اور وہ جیسے سب کچھ برباد کرنے کی قسم کھائے بیٹھا ہے۔“

رائے زل کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں فربہ جسم اور چال ڈھال میں عجیب سا غرور...... میں نے ابھی اس کی آواز نہیں سنی تھی مگر قیافہ تھا کہ آواز بھی اس کی شکل کی طرح بے حد غصیلی ہوگی۔

قسطینا نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ”ایسا کیوں ہوتا ہے شاہ زائب! دنیا میں طاقتور اور شرارتی ذہنوں والے لوگ امن پسند لوگوں کا جینا کیوں حرام کرتے ہیں۔ کیوں ان کے سامنے مارنے یا مر جانے کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں چھوڑتے......؟“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ چھت کا ایک کونا ایک زوردار تڑاخے سے لرز گیا۔ یہ آواز دھماکے سے مشابہ تھی اور بے حد کرخت۔ ہمیں

یہی لگا جیسے ہم ہزاروں ٹن کنکریٹ کے نیچے دب کر ناپید ہونے والے ہیں۔ بالکل اضطراری طور پر میں قسطینا کے اوپر گرا اور اسے ڈھانپ لیا۔ وہ جیسے میرے نیچے چھپ گئی۔

وہ قیامت کے لمحے تھے۔ ہماری دہشت زدہ نظریں چھت کے اس گوشے پر تھیں جو اچانک ہی تین چار فٹ نیچے آگیا تھا۔ وہاں سے دراڑ ایک دم مل کر سات آٹھ انچ چوڑی ہو گئی تھی۔ بہت سی سیمنٹ ملی ریت وہاں سے دھول کی طرح گری تھی اور پورے ہال میں پھیل گئی تھی۔ اگلا لمحہ کیسا ہوگا، کچھ معلوم نہیں تھا۔

یوں محسوس ہوا کہ آخری لمحے آگئے ہیں۔ فرش پر قسطینا میری بانہوں میں تھی۔ اس نے اپنا سر میری چھاتی پر ڈال دیا تھا۔ اس وقت شاید ہم عورت مرد نہیں تھے صرف دو جسم تھے جو موت کے دہانے پر تھے اور کسی بھی وقت ہمارا گوشت پوست سیکڑوں ٹکڑوں کی شکل اختیار کرسکتا تھا۔

نجانے کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ ہم ایک دوسرے سے لگے ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ موت ایک بار پھر مہلت دے رہی تھی۔ دراڑ کا پھیلاؤ رک گیا تھا۔ وہ یوں ساکت ہوگئی تھی جیسے اب مدتوں تک اسی طرح رہے گی اور یہ کوئی بعید بھی نہیں تھا۔ اٹلی میں پیسا کا مینار جھکا ہوا ہے۔ صدیوں سے یوں لگ رہا ہے کہ ابھی آندھی چلے گی یا زلزلہ آئے گا اور وہ گر جائے گا، لیکن وہ نہیں گرا۔

اس کی نگاہ میرے بازو پر تھی۔ وہ جیسے جاننا چاہ رہی تھی کہ اس اتھل پتھل میں میرے بازو کو کوئی گزند تو نہیں پہنچا۔

اوپر بھاری مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور زمین کی مدھم تھرتھراہٹ تھی۔ خطرے کی شدت کم ہوئی تو ہم ایک بار پھر دو انسانی جسموں کے بجائے مرد اور عورت کے قالب میں ڈھلنے لگے۔ ایک دوسرے کے لمس اور نشیب و فراز کو محسوس کرنے لگے۔

وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں دروازے پر پھر کوشش کرنی چاہیے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ اس سے کچھ حاصل ہوگا...... لیکن آپ کہتی ہیں تو ٹرائی کر لیتے ہیں۔''

دروازے کا لوہا اب بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہم نے چرخی گھمائی اور زور لگا کر ایک بار پھر دروازے کو باہر کی جانب دھکیلا۔ دوبارہ وہی کچھ ہوا جلے ہوئے گوشت اور دھوئیں و بارود کی بُو نے ہماری حسِ شامہ کا امتحان لیا۔ تھوڑا سا پانی بھی رس کر اندر آنے لگا۔ غالباً یہ وہی ہزاروں گیلن پانی تھا جو آگ بجھانے کے لیے بالائی منزلوں پر استعمال کیا گیا تھا۔ اب بالائی منزلوں پر نسبتاً سکون تھا۔ مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور ریسکیو والوں کی بلند آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ شاید تلاش کا کام صبح کے اجالے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا یا پھر ورکروں کو کچھ ریسٹ دیا جارہا تھا۔

میں نے اور قسطینا نے ہر ممکن کوشش کی مگر دروازے کی درز کو تین چار انچ سے بڑھا نہیں سکے۔ اس کوشش کا نقصان یہ ہورہا تھا کہ یہ ''شیلٹر ہال'' بارود، دھوئیں اور جلے ہوئے گوشت کی بُو سے بھر گیا تھا۔ اس کے علاوہ فائر بریگیڈز کا استعمال شدہ پانی بھی تیزی سے اندر آنا شروع ہوگیا تھا۔ اگر یہ زمین دوز بنکر بھر جاتا تو ہم، جو بارود اور آگ سے ابھی تک بچے ہوئے تھے پانی میں ڈوب کر ختم ہوجاتے۔ ہم نے وزنی دروازے کو دوبارہ بھیڑا اور چرخی گھما کر لاک کردیا۔

پانی پورے فرش پر پھیل گیا تھا اور واش روم کی طرف بہہ رہا تھا۔ ہماری نگاہیں بار بار بے ساختہ چھت کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ دراڑ نے کم از کم تین مرتبہ ہمیں موت کی جھلکی دکھائی تھی اور پھر دم سادھ لیا تھا۔ جیسے کوئی خونی درندہ اپنے شکار کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہو۔

اچانک ایک مدھم آہٹ نے ہم دونوں کو بری طرح چونکا دیا۔ محسوس ہوا کہ کوئی ملبے میں سے راستہ بناتا نیچے آرہا ہے۔ یہ کوئی کرین یا بلڈوزر وغیرہ تو ہرگز نہیں تھا۔ شاید کچھ لوگ مشینری کے بغیر ہی کوششیں کررہے تھے۔ پانچ دس منٹ مزید گزرے اور یہ آوازیں مزید قریب سے ابھرنے لگیں۔ ملبے کے سرکنے، بھاری چیزوں کے گرنے اور شاید کسی کے بولنے کی آواز بھی ان آوازوں میں شامل تھی۔

ہمارے ذہنوں میں اب تک دراڑ کا خوف ہی حاوی تھا اور اس خوف نے دوسرے ہر طرح کے خطرات کو ذرا فاصلے پر کردیا تھا مگر اب ایک بار پھر بیرونی خطرے کا احساس ہونے لگا۔ ہم نے اپنے ہتھیار اٹھالیے اور سوچنے لگے کہ اگر دروازے کو باہر سے توڑنے کی دوبارہ کوشش کی گئی تو ہمیں کیا ردِعمل دکھانا ہوگا۔

اگلے دو تین منٹ میں وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہمیں اس شیلٹر کے عین سامنے کچھ لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دروازے کو پہلے زور زور سے دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی گئی پھر اس پر ہتھوڑے سے ضربیں لگائی گئیں۔ لیکن ان ضربوں کی شدت اور نوعیت کچھ اور طرح کی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے دروازے کو نقصان نہیں پہنچایا جارہا بلکہ اس پر دستک دی جارہی ہے۔ ضربوں میں ایک ردھم سا تھا۔ پہلے تین ضربیں

اکٹھی...... پھر دو ضربیں...... پھر دو ضربیں...... پھر تین ضربیں اکٹھی......

میں نے قسطینا کے چہرے پر ہیجانی کیفیت دیکھی۔ وہ ایک دم دروازے کی طرف آئی۔ ''مجھے لگتا ہے...... یہ اپنے لوگ ہیں۔'' اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔

''یہ دھوکا بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

اس نے اپنے کولٹ پسٹل کے دستے کو مخصوص انداز میں دروازے سے ٹکرایا۔ دوسری طرف ضربوں کا ردھم کچھ بدل گیا۔ قسطینا کی آنکھوں میں چمک ابھری وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔ ''یہ اپنے لوگ لگتے ہیں...... لیکن بات پھر وہی ہے کہ......''

''سو فیصد گارنٹی کسی چیز کی بھی نہیں دی جاسکتی۔'' میں نے جلدی سے اس کی بات مکمل کردی۔

جس طرح یہ بھاری بھرکم چھت بیٹھتی چلی جارہی تھی، اب ہمارے لیے باہر نکلنے کا رسک لینا ضروری ہوگیا تھا۔

''کون ہے باہر......؟'' قسطینا نے چلّا کر اپنی آواز باہر پہنچائی۔

لیکن باہر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہتھوڑے یا ہتھوڑی سے ہی مخصوص ضرب لگائی گئی۔ اب اس کی کوئی سی وجہ بھی ہوسکتی تھی۔ ممکن تھا کہ جو لوگ باہر موجود ہوں وہ واقعی چکمادے رہے ہوں۔ مگر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ واقعی ہمارے مددگار ہوں لیکن بوجوہ پکار کر جواب نہ دے سکتے ہوں۔ اس دروازے کے آر پار آواز پہنچانے کے لیے بہت بلند آواز سے بولنا ضروری تھا۔

یہ شدید کشمکش کے لمحات تھے۔ قسطینا کو فیصلہ کرنا تھا اور ایک کمانڈر کی حیثیت سے اس میں فیصلے کی قوت موجود تھی۔ میں اس کی منشا سمجھتے ہوئے واش روم کے اندر چلا گیا اور رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا کر پوزیشن لے لی۔ قسطینا نے پستول چادر کے نیچے چھپایا اور چرخی گھما کر دروازہ کھول دیا۔ اس کام میں اسے کافی دقت ہوئی لیکن اس کا جو رزلٹ نکلا، وہ برا نہیں تھا۔ دروازے کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹائی جاچکی تھیں اس لیے دروازہ کھل گیا جو پہلا شخص تیزی سے اندر داخل ہوا وہ اجنبی نہیں تھا وہ بن مشہد تھا۔ وہ گرے فورس کی مکمل وردی میں تھا۔ بلٹ پروف جیکٹ، سر پر ہیلمٹ، ہاتھوں پر دستانے اور گیس ماسک گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک شخص اور تھا۔ وہ اپنی وردی سے گرے فورس کا لیفٹیننٹ نظر آتا تھا۔

''پلیز یور ہائی نس...... جلدی کریں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ ملبا ہٹانے کا کام کسی بھی وقت دوبارہ شروع ہوسکتا ہے۔'' وہ عجلت میں بولا۔

''شاہ زاائب، آجاؤ۔'' قسطینا نے آواز دی۔

میں رائفل بدست واش روم سے نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر بن مشہد اور لیفٹیننٹ کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ غالباً وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ قسطینا اس انڈر ریڈ شیلٹر میں اکیلی ہے (اور میں پکڑا جاچکا ہوں یا اوپر کاٹکٹ کٹا چکا ہوں) ہم شیلٹر کی حبس زدہ فضا سے باہر نکلے۔ بن مشہد کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹارچ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں بھرا ہوا سروس پستول تھا۔ دروازے کے سامنے جلے ہوئے ڈھانچوں اور ادھ جلے جسموں کا منظر لرزہ خیز تھا۔ یہی لاشیں تھیں جنہوں نے شیلٹر کے دروازے کو باہر کی طرف کھلنے سے روک رکھا تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ایک ڈھلوان پر چڑھے۔ اگر ہمارا خیال تھا کہ ہم کوئی خاص دقت اٹھائے بغیر ملبے کے اس عظیم الشان ڈھیر سے نکل جائیں گے تو یہ خام خیالی تھی۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں ہمیں دانتوں پسینے آگئے۔ ہمیں آہنی سریوں اور کنکریٹ کے لاتعداد ٹکڑوں اور تودوں کے درمیان سے، کہیں پر رکوع کے بل جھک کر اور کہیں پیٹ کے بل رینگ کر گزرنا پڑا۔ کچھ جگہیں اتنی گرم تھیں کہ ہماری جلد جھلسنے لگی۔ ہمیں احساس ہوا کہ بن مشہد اور اس کا ساتھی کتنی جاں گسل کوشش سے ہم تک پہنچے ہیں۔ ایک جگہ لیفٹیننٹ کی ٹانگیں لکڑی کے بڑے بڑے ادھ جلے تختوں کے درمیان پھنس کر رہ گئیں اور بن مشہد اور قسطینا اسے وہاں سے بمشکل نکال پائے۔ میں اپنے بازو کی وجہ سے اس کٹھن سفر میں کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا، خود کو گھسیٹتا چلا جارہا تھا' یہی بڑی بات تھی۔ اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ بن مشہد کو آقا جان وغیرہ کی طرف سے ہمارے بارے میں معلومات ملی تھیں اور وہ ہماری مدد کے لیے زمین دوز شیلٹر تک پہنچے تھے۔ ایک مسمار راہداری میں ہم نے پیرا کی کے لباس میں چند خوبرو لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ نہارہی تھیں لیکن اپنے ہی خون میں۔ ایک چھت کے نیچے آکر ان کی لاشیں بری طرح کچلی مسلی گئی تھیں۔ انہیں مرے ہوئے اور وہاں پھنسے ہوئے دو تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ ایک کچن پر شاید براہِ راست کوئی راکٹ یا بم گرا تھا، وہ بری طرح تباہ ہوا تھا۔ وہاں دو خوب صورت ٹانگیں پڑی نظر آئیں، یہ کسی ایسے جوان فوجی کی ٹانگیں تھیں جس نے گرے نیکر پہن رکھی تھی مگر فوجی کا بالائی حصہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بن مشہد کے عقب میں چلتے ہم پتا نہیں کس طرح اس ''عظیم الشان'' ملبے کے اندر سے نکلے۔ ملبے کا یہ ڈھیر قریباً سات گھنٹے پہلے تک ایک مشہور تفریحی کلب تھا جس کے اندر زندگی کی رنگینیاں دیوانہ وار ناچتی تھیں، وہاں داخل ہونے والے ہر فرد کو وہ ''سب کچھ'' ملتا تھا جس کی وہ تمنا کرتا تھا، مگر اب وہاں داخل ہونے والے افراد کو صرف بچے کھچے زخمی اور لاشیں مل رہی تھیں۔ کلب کے اطراف میں بے شمار ایمبولینسز اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اپنی ریوالونگ لائٹس چمکا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی سرچ لائٹس تھیں جو ملبے کے ان حصوں کو فوکس کر رہی تھیں جہاں کسی زندہ شخص کی موجودگی کے شواہد تھے باقی سارا نیوسٹی مکمل بلیک آؤٹ کی زد میں تھا۔

بن مشہد ہمیں ملبے سے نکالتے ہی سیدھا ایک بند فوجی گاڑی میں لے آیا۔ یہ ایک بڑے سائز کی جیپ تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے سے ایک باوردی اہلکار موجود تھا۔ بن مشہد نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں یور ہائی نس، لیکن مجبوری ہے۔ آپ نشستوں کے درمیانی خلا میں لیٹ جائیں...... اور آپ بھی مسٹر شاہ زیب، جب تک ہم نہ کہیں، آپ اپنی جگہ پر موجود رہیں۔''

''او کے۔'' قسطینا نے کہا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''آرمی اسپتال، اس وقت وہی جگہ سب سے محفوظ ہے۔'' بن مشہد نے جواب دیا۔ اس کی یونیفارم کا برا حال تھا۔ ایک طرف سے سر کے بال بھی جلے ہوئے تھے۔ لیفٹیننٹ کی حالت اس سے بھی بری تھی۔ ہمیں ملبے سے نکالنے کے لیے ان دونوں نے یقیناً جان توڑ محنت کی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کوشش میں ان کا ایک ساتھی جو انجینئرنگ یونٹ سے تھا، شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکا تھا۔

جو بمباری قسطینا نے چند گھنٹے پہلے برج کلب پر کرائی تھی اس نے اردگرد کی بہت سی عمارتوں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ کئی کھنڈرات سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا اور امدادی ٹیمیں کارروائیوں میں مصروف تھیں۔ یہ سب کچھ آفیسر لوکاس کے سیل فون سے ملنے والے MESSAGES کی بدولت ہوا تھا اور شاید اس لیے بھی ہوا تھا کہ اس نے اپنی رات چمکانے کے لیے ایک ''پھول بیچنے والی'' کو بیڈروم میں لے جانا چاہا تھا...... ہاں غلطیاں اپنا خراج وصول کرتی ہیں۔

ہم دونوں نشستوں کے درمیانی خلا میں سیدھے لیٹ گئے تھے، بس میرے گھٹنے تھوڑے سے اوپر اٹھے ہوئے تھے ان پر بن مشہد نے ایک ترپال نما کپڑا ڈال دیا۔ فوجی جیپ مختلف سڑکوں پر سے گزرتی رہی مگر ہم لیٹے ہونے کے سبب یہ مناظر نہ دیکھ سکے۔ تاہم ایمبولینسز اور سیکیورٹی کی گاڑیوں کے سائرن ہر جگہ سنائی دے رہے تھے۔

دس منٹ بعد ہم کسی عمارت میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی ایمبولینسز کے سائرن چنگھاڑ رہے تھے۔ ملائی اور انگلش میں ''بہادر فوجیوں'' کے لیے خون کے عطیات کی اپیل کی جا رہی تھی۔ جیپ کھڑی ہو گئی۔ بن مشہد اور لیفٹیننٹ اتر کر چلے گئے۔ ڈرائیور جیپ کے آس پاس ٹہلتا رہا۔ ذہن میں کسی وقت شکوک بھی ابھرنے لگتے تھے مگر قسطینا چونکہ بن مشہد پر پورا اعتماد کر رہی تھی اس لیے میں بھی کر رہا تھا۔ یہ یقیناً آرمی اسپتال تھا اور جس جگہ جیپ کھڑی تھی یہ اسپتال کا عقبی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہاں بھی مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسپتال کے اس عقبی گیٹ پر بھی چیکنگ ہو رہی تھی اور آتی جاتی گاڑیوں کو روکا جا رہا تھا۔

اچانک بن مشہد کی دھیمی لیکن تیز آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ ''اب آپ نکل آئیں اور میرے پیچھے تشریف لائیں۔''

ہم نے اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک نیم تاریک راہداری پر چل کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ کھڑکیوں پر سیاہ کاغذ چپکائے گئے تھے۔ کمرے میں پہنچتے ہی قسطینا کو پُرجوش سیلوٹ کیا گیا۔ یہ سیلوٹ بن مشہد اور اس کے ساتھی لیفٹیننٹ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ قسطینا نے سیلوٹ کا جواب دیا اور بن مشہد سے سب سے پہلا سوال یہ کیا۔ ''چیف گیرٹ کا کچھ پتا چلا؟''

بن مشہد نے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''یور ہائی نس! وہ بچ گیا ہے مگر شدید زخمی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ شاید اسے ایجنسی والے علاج کے لیے امریکا بھجوا رہے ہیں۔ وہ لاشوں اور زخمیوں کے ایک ڈھیر میں دبا ہوا تھا۔ اس کے سر، چہرے اور سینے پر گہری چوٹیں آئی ہیں۔ اس کے کم از کم تین قریبی جرنیل موقع پر ہی ہلاک ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو اس شیلٹر کے بند دروازے کے سامنے مرے ہیں جس میں آپ دونوں موجود تھے۔''

بن مشہد نے تینوں جرنیلوں کے نام قسطینا کو بتائے اور ان کی موت کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ یہ سب بڑی خبریں تھیں مگر قسطینا کے چہرے پر دکھ تھا۔ اس دکھ کا تعلق یقیناً اصل ٹارگٹ چیف گیرٹ کے زندہ بچ جانے کا تھا۔

دفعتاً میری نگاہ بائیں جانب ایک بیڈ کے نیچے گئی اور میں بری طرح چونک گیا۔ یہاں دو افراد لمبے لیٹے ہوئے تھے۔ ان میں ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ دونوں کے

MEDICAM
Bleach Cream
Whiteness
in 14 days
*No Side Effects
MEDICAM
BLEACH CREAM
MEDICAM
Bleach Cream
MEDICAM
BLEACH CREAM
Skin Whitening Cream
رُکے ہر نظر.... آپ پر!

جسموں پر عزت مآب کی گرین فورس کی وردی تھی۔ غور سے دیکھنے پر انکشاف ہوا کہ یہ دونوں لاشیں ہیں۔ اب قسطینا کی نظر بھی لاشوں پر پڑ گئی تھی۔ دونوں لاشوں کی یونیفارمز پر خون کے دھبے موجود تھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لڑائی کے دوران میں مرے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہلکی سی نیلاہٹ تھی اور اعضا سردی کے سبب اکڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ جیسے انہیں کولڈ اسٹوریج سے نکالا گیا ہو۔

”یہ کیا ہے؟“ قسطینا نے بن مشہد سے پوچھا۔

”یہ گرین فورس کے شہید ہیں جی...... ان کو وہاں دفنانے کا پروگرام ہے۔“ بن مشہد نے بغلی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ہم دیکھ کر حیران ہوئے۔ اس دوسرے کمرے کا فرش اکھاڑا گیا تھا۔ ایک کونے میں مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور چار پانچ فٹ گہرا گڑھا نظر آ رہا تھا۔

”یہ سب کس لیے بن مشہد؟“ قسطینا نے تعجب سے پوچھا۔

”ان دونوں کی جگہ آپ نے لینی ہے یور ہائی نس؟“ بن مشہد نے کہا۔

اس نے جو تفصیل بتائی اس سے پتا چلا کہ یہ سب کچھ ہمیں واپس اپنے علاقے میں بھیجنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ آج دونوں طرف سے لڑائی میں ہلاک ہو جانے والے فوجیوں کی لاشوں کا تبادلہ کیا جا رہا تھا۔ گرین فورس کی چالیس کے قریب لاشیں تھیں جو جاماجی بھیجی جا رہی تھیں۔ اسی طرح وہاں سے کچھ لاشیں نیو سٹی آ رہی تھیں۔ اس آپریشن کا انچارج لیفٹیننٹ بن مشہد ہی تھا۔ آج کسی وقت چالیس تابوت بارڈر پر پہنچانا اور وہاں سے قریباً اتنے ہی تابوت واپس ملٹری اسپتال لانا بن مشہد کی ذمّے داری تھی۔ بن مشہد نے دو لاشوں کو یہیں دفنانے کا پلان بنا کر دو تابوت خالی کر لیے تھے۔ اب ہمیں بطور لاش ان تابوتوں میں سفر کر کے نیو سٹی کے زیرِ قبضہ علاقے سے نکلنا تھا۔

قسطینا نے بن مشہد سے تمام تفصیلات پوچھیں اور اس پلان سے مطمئن نظر آئی۔ ابھی ہمیں کم از کم چار پانچ گھنٹے اسپتال کے اسی پرائیویٹ کمرے میں گزارنا تھے۔ بن مشہد نے بھی دیکھ لیا تھا کہ قسطینا کی کمر پر بینڈیج موجود ہے...... اور خون بھی رس رہا ہے۔ اس نے فوراً بہتر مرہم پٹی کا انتظام کیا۔ فی میل نرس کا حصول مشکل تھا۔ قسطینا کے لیے ایک بار پھر مجھے ہی نرسنگ کی ڈیوٹی انجام دینا پڑی۔ ایک بار پھر اس کی حسین کمر کی دل دھڑکا دینے والی تراش خراش سے واسطہ پڑا۔ قسطینا کو اینٹی بائیوٹک انجکشن بھی لگایا گیا۔ اکھاڑ پچھاڑ نے میرے کندھے کو بھی درد سے بھر دیا تھا۔ ایک پین کلر انجکشن اور کچھ ادویات میں نے بھی لیں۔

چیف گیرٹ کے زندہ بچ جانے کا سن کر قسطینا کچھ چپ چپ سی تھی۔ پاس ہی پارکنگ میں کھڑی کسی فوجی گاڑی میں رائے زل کی گرے فورس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ وہ اپنا پسندیدہ ترانہ گا رہے تھے۔

ہم بزدل دشمن کو اس کے بِل میں سے نکال کر ماریں گے

اور ہماری بہادری دیکھ کر دشمن کی سرزمین ہمارے قدم چومے گی

پھل دار درختوں کی ساری ٹہنیاں ہمارے لیے جھک جائیں گی

اور وہاں کی خوبرو عورتیں

بڑی خوشی سے ہمارے گلے میں محبت کے ہار ڈالیں گی

بن مشہد نے کہا۔ ”رات والے فضائی حملے کے بعد ان لوگوں کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ ورنہ انہوں نے تو ہر جگہ آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اسپتالوں میں زخمی بھی اٹھ اٹھ کر ناچ رہے تھے۔ آج بہت سے گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔“

”بارڈر کی کیا پوزیشن ہے مشہد؟“ قسطینا نے پوچھا۔

”جوں کی توں ہے یور ہائی نس، وہ لوگ ٹیلوں تک تو پہنچ گئے تھے لیکن آگے نہیں بڑھے اور امید ہے کہ اب فوری طور پر بڑھیں گے بھی نہیں۔ ایک دو دن تو وہ لاشیں سنبھالیں گے اور نئی صف بندی کریں گے۔ اس فضائی حملے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔“

مجھے گفتگو میں شریک رکھنے کے لیے بن مشہد اور قسطینا انگلش میں بات کر رہے تھے۔ میرا دھیان بار بار سجاول کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اسی جگہ کہیں موجود تھا۔ میں نے اس سے سجاول کا ذکر کیا تو وہ ذرا چونک گیا۔ بولا۔ ”رات کو ایمرجنسی میں چند زخمی لائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک دراز قد بندے پر مجھے کچھ شک ہوا تھا...... شاید میں اسے چیک کرتا مگر پھر برج کلب پر فضائی حملہ ہو گیا اور ہم سب اس طرف متوجہ ہو گئے...... میں ابھی دوبارہ دیکھتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ قسطینا نے پوچھا۔

”شاید وہ ابھی ایمرجنسی میں ہو۔ اس کے ماتھے اور

آنکھوں پر بھاری بینڈیج تھی۔ شلوار قمیص میں تھا...... میں دیکھتا ہوں۔“

”اگر ہو سکے تو اس کی فوٹیج بنالاؤ۔“ میں نے کہا۔

بن مشہد نے اثبات میں سر ہلایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ لیفٹیننٹ ڈکی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میری دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اگر سجاول مل جاتا تو میری ایک بہت بڑی پریشانی دور ہو جاتی۔ ڈی پیلس میں بھی اس کے لیے تشویش محسوس کی جارہی تھی۔ خاص طور سے بیگم نورل اس کے لیے بے حد فکر مند تھیں کہ انہوں نے سجاول کو بھائی کا درجہ دیا ہوا تھا۔

اگلے چند منٹ بڑی مشکل سے گزرے۔ آخر بن مشہد اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ”وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہا ہے۔ میں اس کی فوٹیج بنالایا ہوں۔“

میں نے بن مشہد کے سیل فون پر یہ فوٹیج دیکھی اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسپتال کے بیڈ پر جو کیم شحیم شخص لیٹا ہوا تھا، وہ سجاول نہیں تھا۔

میرے تاثرات دیکھ کر قسطینا نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ ہم بہت جلد اس کا کھوج لگالیں گے۔

سجاول کا پاکستان سے یہاں آنا اور آتے ساتھ ہی اوجھل ہو جانا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا۔ دوستی کی حد تک میرے لیے برا ثابت نہیں ہوا تھا۔ ہتھ جوڑی والی لڑائی میں، میں نے اس کے سیکڑوں ساتھیوں کے سامنے اس کی عزت رکھی تھی اور اس سلوک کو اس نے فراموش نہیں کیا تھا۔ بے شک اس کے اندر لالچ موجود تھا مگر پارا ہاؤس میں کروڑوں کی چوری والے معاملے میں وہ نہ صرف بے گناہ ثابت ہوا تھا بلکہ وہ اصل مجرم قادر اور مسروقہ سامان بھی پارا ہاؤس میں واپس لایا تھا۔

میں اور قسطینا دیر تک سجاول کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اسی دوران میں گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز سنائی دی۔ یہ آواز کافی فاصلے سے آئی تھی مگر اس کی گونج اسپتال کے اس کمرے تک پہنچی تھی۔ بن مشہد نے فون کیا تو اس بات کی تصدیق ہوئی کہ ملبا ہٹانے کے دوران میں برج کلب کا بچا کھچا حصہ بھی زمین بوس ہو گیا ہے۔ مجھے اور قسطینا کو شیلٹر ہال کی چھت کی خوفناک دراڑ یاد آگئی۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ شیلٹر بھی اب نہیں رہا ہوگا۔

☆☆☆

یہ دو بڑی فوجی گاڑیوں پر قریباً چالیس عدد تابوت تھے۔ ان تابوتوں میں گرین فورس کے مرنے والوں کی لاشیں اور باقیات تھیں لیکن دو تابوت ایسے تھے جن میں لاشوں کے بجائے زندہ انسان تھے...... میں اور قسطینا۔ یہ انوکھا تجربہ تھا۔ ہم دونوں کے جسموں پر گرین فورس کی خون آلود وردیاں تھیں۔ ہمارے چہروں پر ہلکی سی نیلاہٹ اور مردنی پیدا کرنے کے لیے لیفٹیننٹ ڈکی نے کوئی لوشن سا لگایا تھا۔ تابوت بند کرنے سے پہلے بن مشہد نے قسطینا کا کولٹ پسٹل اس کے ساتھ ہی رکھ دیا تھا، ایک پستول میرے ساتھ بھی کر دیا گیا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ ہمارے پاؤں کے انگوٹھے پر ایک ایک ٹیگ تھا جس پر ”مردہ نمبر“ تھا۔

دونوں گاڑیاں مختلف سڑکوں سے گزرتی آگے بڑھتی رہیں۔ یہ ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ ٹریفک کا شور میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ گاہے بگاہے ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ اور ایمبولینسز کے سائرن بھی سنائی دیتے تھے۔ ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ اندازہ ہوا کہ ہم بارڈر پر پہنچ چکے ہیں۔ اب تابوتوں کو اتار کر گرین فورس کی گاڑیوں میں لادا جانا تھا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا اور پول کھلنے کا سبب پیدا ہو سکتا تھا۔ دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا اور میں نے خود کو ہر ممکنہ صورت حال کے لیے تیار کر لیا۔ بہر طور یہ مرحلہ بھی بخیریت گزر گیا۔ چند منٹ بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے تابوت کو بھی چند افراد نے کندھے پر لادا ہے اور کسی دوسری گاڑی میں بار کر دیا ہے۔

یہ گاڑیاں روانہ ہوئیں تو اطمینان کا احساس ہوا۔ اب ہم زیر قبضہ علاقے سے نکل چلے تھے۔ بس پندرہ منٹ کی سواری کے بعد ہم کسی وسیع عمارت کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ایک بار پھر ہمارے تابوتوں کو کندھوں پر لاد کر گاڑیوں سے نکالنے کا عمل شروع ہوا۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں جانب مسلح دستے کھڑے ہمیں سیلوٹ کر رہے ہیں اور سلامی دے رہے ہیں۔ کسی جنگی ترانے کا میوزک بھی سنائی دے رہا تھا۔

تابوتوں کو کسی سرد جگہ پر رکھ دیا گیا۔ یہاں آتے ہی خنکی کا واضح احساس ہوا۔ اگلے آٹھ دس منٹ کافی تناؤ بھرے تھے۔ بن مشہد اور قسطینا کی ہدایت میرے لیے یہی تھی کہ میں خود تابوت میں سے نہیں نکلوں گا۔

آخر تابوت کا ڈھکنا اٹھایا گیا۔ ڈھکنا اٹھانے والی خود قسطینا ہی تھی۔ وہ مجھ سے تھوڑی دیر پہلے اپنے تابوت سے نکل آئی تھی۔ ”نکل آؤ۔“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک مردے کی مدد کا شکریہ۔“ میں نے جواب دیا

اور اٹھ کر باہر نکل آیا۔ دوسرا شخص جو یہاں موجود تھا وہ حلمی تھا۔

''ویل ڈن یور ہائی نس۔'' اس نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ویل ڈن مسٹر شاہ زیب۔''

یہ ایک ڈیڈ ہاؤس تھا۔ ٹمپریچر کافی کم تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ کم و بیش چالیس تابوت بڑی ترتیب سے یہاں رکھے تھے ان کو جاماتی کے دو رنگے پرچم میں لپیٹا گیا تھا۔ ڈیڈ ہاؤس میں اس وقت حلمی اور اس کے ایک باوردی ساتھی کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔

قسطینا نے کہا۔ ''مسٹر حلمی! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے رش کم کر دیا گیا ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے یور ہائی نس۔''

''اب ان خالی تابوتوں کا کیا ہوگا؟''

''ان میں کچھ نہ کچھ بھر دیا جائے گا۔'' حلمی نے جواب دیا۔

ڈیڈ ہاؤس کے بغلی دروازے کے پاس ایک چینج روم موجود تھا۔ یہاں میرے اور قسطینا کے ناپ کے لباس موجود تھے۔ پہلے قسطینا اور پھر میں نے اپنی خون آلود یونیفارم اتاری، چہرہ صاف کیا اور بغلی دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے کے ساتھ ہی دو کاریں کھڑی تھیں۔ ان کی کھڑکیوں کے شیشے ''ٹینٹڈ'' تھے۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' قسطینا نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''میں جلد رابطہ کروں گی۔''

وہ بڑی کار میں بیٹھ گئی۔ کار میں اس کی سہیلی ڈاکٹر ماریہ پہلے سے موجود تھی۔ میں چھوٹی کار میں بیٹھ کر ڈی پیلس کی طرف روانہ ہوگیا۔ آدھ گھنٹے بعد میں ڈی پیلس کی انیکسی میں انیق کے ساتھ موجود تھا۔ حسبِ معمول وہ اوٹ پٹانگ صورتِ حال میں تھا۔ وہ میرے والے کمرے میں بلند آواز میں کوئی کلام سن رہا تھا۔ کوئی کافی قسم کی چیز تھی۔ میں نے دستک دی تو اس نے دروازہ کھولا اور مجھے بخیریت دیکھ کر نہال ہوگیا۔ ''آپ کی خیریت بہت نیک مطلوب تھی۔'' وہ چہکا۔

میں نے کہا۔ ''زینب کا کیا حال ہے؟''

''وہ بھی ٹھیک ہے۔'' انیق کی آواز بمشکل میرے کانوں تک پہنچی۔

میں نے کہا۔ ''یار یہ میوزک تو بند کرو۔''

''آپ اسے میوزک کہہ رہے ہیں۔ یہ تو بہت اونچا کلام ہے۔ ملنگی ڈیرے سے پاک بہن کی کیسٹ لے کر آیا تھا میں...... پاک بہن کا نام آپ کو بھولا تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں نہیں یاد ہے۔ لیکن یہاں اس پاک بہن کو لوگوں کے کان پھاڑنے کے لیے کیوں استعمال کر رہے ہو؟''

''یہ معرفت کی اور تصوف کی باتیں ہیں جناب! اور میں روز بروز اس معرفت میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں...... مجھ پر نئے نئے راز آشکار ہو رہے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن میں ہوا میں ہی نہ اڑ جاؤں۔''

''اگر یہ کام ہونا ہے تو اللہ کرے جلدی ہو جائے۔'' میں نے کہا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ کیسٹ پلیئر کی آواز بند کر کے میں نے بغلی دروازہ کھولا اور اس کمرے میں جھانکا جہاں زینب مقیم تھی۔ یہ دراصل سجاول والا کمرا ہی تھا۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ بال منتشر، چہرے پر معصومیت اور مظلومیت۔ اس کی گردن اور ہاتھوں وغیرہ پر ابھی تک اس تشدد کے نشانات موجود تھے جو خواجہ سرا خیام نے اس پر کیا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کے رخساروں پر ان خشک آنسوؤں کا نمک چمک رہا ہے جو وہ سونے سے پہلے بہاتی رہی ہے۔ وہ کسی سازش کے چنگل میں تھی اور میں اس سازش کے تانے بانے توڑے بغیر چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔

ہم نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور واپس میرے والے کمرے میں آگئے۔ انیق یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ میں دو راتیں کہاں گزار کر آیا ہوں؟ اور نیوٹی کے کلب پر جو بہت بڑا اور کامیاب حملہ ہوا ہے، اس میں میرا بھی کوئی کردار ہے یا نہیں۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں آگاہ کیا۔ اس نے بھی مجھے مختصراً یہاں کے حالات بتائے۔ اس نے انکشاف کیا کہ ڈی پیلس کے رہائشی حصے میں زبردست بے چینی ہے۔ چھوٹے صاحب ہز ہائی نس ابراہیم کی طبیعت مسلسل خراب ہے۔ چند دنوں میں ہی ان کا وزن چودہ پندرہ پاؤنڈ کم ہوگیا ہے۔ وہ کچھ کھا پی نہیں رہے۔ ڈاکٹروں نے انہیں مسلسل ٹرینکولائزرز پر رکھا ہوا ہے۔

''ٹرینکولائزرز کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اٹھتے ہیں تو زینب کو پکارتے ہیں اور اس کی قبر پر جانا چاہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے پاکستان جا رہے ہیں...... بیگم نسا نورل بیٹے کی حالت دیکھ کر غش کھا جاتی ہیں۔ ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر بہت سی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیم اپنی دلہن کی موت کا ذمے دار اپنے والد عزت مآب ریان فردوس کو قرار دے رہا ہے۔

”ابراہیم کی حالت خطرے میں تو نہیں؟“

”کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈی پیلس کے ہی ایک حصے کو اسپتال کی شکل دے دی گئی ہے اور ڈاکٹروں کا ایک گروپ ابراہیم کو مانیٹر کر رہا ہے۔“

ایک دم میرا دھیان کبڈی پہلوان سیف کی طرف گیا۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ ”وہ سیف کہاں ہے؟“

”وہ بھی ایک نمونہ ہے جی......“

”تمہاری طرح۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”چلیں، میری طرح ہی سمجھ لیں۔ ہر وقت اپنے سیل فون سے چمٹا رہتا ہے۔ اب بھی اپنے مقامی یار کرخت سنگھ کے ساتھ اپنا موبائل ٹھیک کرانے گیا ہے۔ دونوں پنجابیوں میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ اب بہانہ تو موبائل ٹھیک کرانے کا ہے لیکن پی کر آئیں گے لسی، اور ساتھ میں برفی شرفی کھائیں گے۔“

”اسے زینب کے بارے میں کوئی شک تو نہیں ہوا؟“

”ابھی تک تو نہیں ہوا۔ اس کا کمرا دوسری سائڈ پر ہے۔ ہاں آپ کے بارے میں پریشان تھا۔ کئی بار پوچھ چکا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”زینب کی یہاں موجودگی زیادہ دیر راز نہیں رہے گی۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ کچھ لوگ اسے مارنا چاہتے تھے اور وہ اب بھی اس کے اردگرد موجود ہیں۔“

”شاہ زیب بھائی! کسی طرح اس ہیجڑے خیام کا پتا چل جائے اور اس سے کچھ اگلوایا جا سکے تو بات بن سکتی ہے۔“

لیکن اس تک پہنچا کیسے جائے؟ پکی بات ہے کہ تمہاری کارروائی کے بعد وہ بہت چوکس ہو چکا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ساحلی گھر پر ٹھیک ٹھاک سیکیورٹی ہو۔“

”ویسے میں ایک نیا چلہ... کاٹ رہا ہوں۔ اس میں چوتھی رات کے بعد ہزار ہزار کے کرنسی نوٹوں کی دھونی درکار ہے۔ تین چار نوٹ ہوں گے آپ کے پاس؟“

”کیا مطلب؟“

”دھونی کا مطلب نہیں سمجھتے آپ......؟“

میں اسے ٹانگ رسید کرنے کا ارادہ کر رہا تھا جب ایک کھٹکا سن کر چونک گیا۔ آواز اس چھوٹے سے ملحقہ کمرے سے آئی تھی جو کچن کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا لیکن اب وہاں فالتو اشیا پڑی تھیں۔ میں اس کچن کی طرف بڑھا۔ ہلکی آواز پھر آئی۔ یہاں ایک بڑا ڈیپ فریزر بھی رکھا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ آواز یہاں سے آئی ہے۔ میں نے انیق کی طرف دیکھا وہ بھی ڈیپ فریزر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈھکن اٹھایا اور بے طرح ٹھٹک گیا۔ ڈیپ فریزر میں کھانے پینے کی اشیا نہیں تھیں، ایک بے حرکت انسانی جسم پڑا تھا...... بلکہ یہ دو جسم تھے جو اوپر تلے پڑے تھے۔ میں نے بالائی جسم کو دیکھا اور دوسری بار کرنٹ سا لگا۔ اگر میں غلط قیافہ نہیں لگا رہا تھا تو یہ ہیجڑے خیام مانش کا جسم تھا۔ آدھا سر گنجا، رخساروں پر پاؤڈر، آنکھوں میں کاجل، کانوں میں بالے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ست رنگا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی چوڑی ٹیپ مضبوطی سے چپکائی گئی تھی۔ فریزر کی ٹھنڈک کے سبب اس کے سر کے بالوں اور بھنوؤں پر برف کے ذرات دکھائی دے رہے تھے۔

کیا وہ مر چکا تھا؟ لیکن اچانک اس نے آنکھیں کھولیں۔ میری طرف دیکھ کر ذرا حیران ہوا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ مضبوط چوڑی ٹیپوں کے ذریعے اپنے نیچے والے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ نیچے یقیناً ایک لاش تھی، کیونکہ اس کا چہرہ خون سے لتھڑا تھا اور فریزر کے پیندے میں بھی خون جما نظر آ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے فریزر کا ڈھکن بند کر دیا۔ اندر ہیجڑے نے ایک بار پھر حرکت کرنے کی ناکام کوشش کی اور فریزر میں سے ہلکی آواز بلند ہوئی۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ پہلے بھی یہی آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی اور...... انیق نے شاید یہی آواز دبانے کے لیے اونچی آواز میں کیسٹ پلیئر آن کر رکھا تھا۔ میں نے حیران پریشان ہو کر انیق کی طرف دیکھا۔ اس نے اسٹائل سے کندھے اچکائے جیسے خود بھی حیران ہو۔

میں اسے کھینچ کر کمرے میں لے آیا۔ ”یہ کیا تماشا ہے انیق؟“

”آپ فریزر کو تماشا کہہ رہے ہیں۔“

”میں تھپڑ ماردوں گا انیق، یہ کیا کیا ہے تم نے؟ کس کی اجازت اور مشورے سے کیا ہے؟ میں جب بھی واپس آتا ہوں تم نے کوئی نہ کوئی ”سرپرائز“ کھڑا کر رکھا ہوتا ہے۔“ میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

وہ سنبھل کر بولا۔ ”یقین کریں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے اسی کی طرف سے ہوا ہے۔ اس کی مصیبت اسے کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔“

”لیکن کیسے؟“

”آہستہ بولیں جی۔ زینب کو کسی گڑبڑ کا پتا چل گیا تو نیا سیاپا پڑ جائے گا...... یہ خود یہاں پہنچا ہے۔ کہتے ہیں ناکہ

کبھی کبھی کنواں بھی پیاسے کے پاس آجاتا ہے۔ یہ ڈی پیلس کے خواجہ سراؤں کا انچارج ہے۔ کل رات یہ اپنے کسی کام سے یہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے کہیں انیکسی کے آس پاس دیکھا اور بالائی منزل سے اتر کر نیچے آگیا۔ اسے شک ہوگیا تھا کہ چند دن پہلے اس کے گھر پر حملہ کرنے والا میں ہی ہوں۔ یہ اپنے ایک مسلح ساتھی کے ساتھ میرے پیچھے یہاں انیکسی میں آگیا۔ میں کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا جب ان دونوں نے مجھے روک لیا۔ خیام دراصل سری لنکا کا رہنے والا ہے۔ بنگالی کے علاوہ تھوڑی بہت اردو بھی جانتا ہے۔ اس نے مجھ سے اردو میں سوال جواب کیے۔ میں نے کہا کہ یوں راستے میں کھڑے ہو کر بات کرنا ٹھیک نہیں۔ میں انہیں کمرے میں لے آیا۔ اندر آتے ہی خیام نے اپنی ریشمی قمیص کے نیچے سے کوئی ایک فٹ لمبا چھرا نکال لیا۔ اس کے ساتھی ہیجڑے کے پاس پستول تھا۔

انیق نے بیڈ کے نیچے سے ایک چھرا نکال کر مجھے دکھایا۔ اس کا پھل نو دس انچ سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا کہ یہ کمینہ مجھے پہچان چکا ہے۔ میں نے ٹائم ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پستول والے خواجہ سرا پر حملہ کیا۔ میں نے اچانک ہاتھ مار کر اس کا پستول گرا دیا۔ اس کمینے خیام نے بڑی طاقت سے میری کمر پر چھرے کا وار کیا۔ اگر یہ مجھے لگ جاتا تو کمر کی طرف سے دل میں اتر جاتا۔ میں نے خود کو بچایا اور یہ چھرا پانچ چھ انچ تک اس کے ساتھی کے سینے میں گھس گیا۔ ساتھ ہی میں نے اس کا سر بھی دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ کٹے شہتیر کی طرح بیڈ پر جا گرا۔ میں نے گرا ہوا پستول اٹھا کر خیام پر تان لیا۔ کہانی ختم ہوگئی۔ ٹکے تے کلا گیا ٹھک...... ''

''زینب کو کچھ پتا نہیں چلا؟''

''درمیان والا دروازہ بند تھا اور وہ دوا کھا کر سوئی ہوئی تھی۔ یہ سارا واقعہ کل رات گیارہ بجے کے قریب ہوا تھا۔ پہلے تو جناب میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر میں نے اس موٹے خیام کی مشکیں کس دیں اور منہ پر ٹیپ لگا دی۔ آج سویرے میں نے سوچا کہ دوپہر تک تو لاش بو دینے لگے گی۔ میں نے ڈیپ فریزر خالی کر کے اس میں لاش ٹھونس دی۔ پھر خیام کو بھی اس میں ٹھونس دیا اور اسے ٹیپوں کے ساتھ لاش سے جکڑ دیا۔ اسٹائل دیکھا ہے آپ نے؟ ایسا لگتا ہے کہ ایک ہیجڑا دوسرے کی گود میں تشریف فرما ہے۔''

انیق کی رُوداد سنسنی خیز تھی۔ وہ لاہور کے نامی گرامی گینگسٹر داؤد بھاؤ کا تربیت یافتہ تھا۔ بظاہر سیدھا سادہ اور بے ضرر لیکن وقت پڑنے پر اس کا ایک دوسرا روپ سامنے آتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''خیام سے کچھ پوچھ گچھ بھی کی؟''

''ابھی اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹائی تو یہ چلانا شروع کر دے گا۔ بڑی آگ ہے اس میں۔ لیکن اب فریزر میں جا کر کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ دو تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ تھوڑا ٹائم اور نکل گیا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اگر مر ہی گیا تو؟''

''نہیں جناب، میں نے تھرما اسٹیٹ تین پر سیٹ کیا ہوا ہے۔ اگر اب بھی زبان نہیں کھولے گا تو پھر کولنگ کچھ اور بڑھا دیں گے۔''

میں نے انیق کی طرف دیکھا۔ اس کی ذہانت اور ہوشیاری پر پہلے بھی شبہ نہیں تھا۔ اب یقین اور بڑھ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف خیام پر غلبہ پایا تھا بلکہ اسے ایسے شکنجے میں جکڑ دیا تھا کہ وہ روایتی تشدد اور مار پیٹ کے بغیر ہی سب کچھ اگلنے پر آمادہ ہو رہا تھا۔ میں اس کی صورت دیکھ کر ہی جان گیا تھا کہ وہ برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ شاید انیق نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کنواں خود چل کر پیاسے بلکہ...... پیاسوں کے پاس آگیا تھا۔ میں نے انیق سے پوچھا۔

''سیف کو تو اس بارے میں پتا نہیں چلا؟''

''نہیں جی، ابھی تو نہیں لیکن ہے بڑا کھوچل۔ اسے شک ہے کہ ان دو کمروں کے اندر کچھ گڑبڑ چل رہی ہے۔''

میں نے اسے کہا کہ وہ میرے کمرے سے باہر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا سائن لگا دے وہ بولا۔ ''میں آپ کا رمز شناس ہو چکا ہوں، یہ سائن میں نے پہلے ہی لگا دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسے دیکھو، کہیں زیادہ ہی ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ آخر کو تو ہیجڑا ہی ہے۔''

وہ مسکرا کر کچن کی طرف چلا گیا۔ اس دوران میں، میں نے ایک بار پھر زینب والے کمرے میں جھانکا۔ وہ سو رہی تھی۔ میں نے دروازہ ہولے سے لاک کر دیا۔ یہاں پہنچنے سے پہلے میں نے قریباً دو گھنٹے تک ایک مرے ہوئے شخص کی خون آلود یونیفارم پہنے رکھی تھی۔ نہانے کی ضرورت تھی۔ میں فریش ہو کر واش روم سے نکلا تو انیق، خواجہ سرا خیام کو سوال جواب کے لیے تیار کر چکا تھا۔ خواجہ سرا کی حالت ناقابل بیان تھی۔ وہ ابھی تک فریزر کے اندر ہی تھا لیکن انیق نے فریزر کا ڈھکنا اٹھا دیا تھا اور خواجہ سرا خیام کے جسم کی کچھ ٹیپس اتار دی تھیں۔ ان ٹیپس کے کھلنے سے یہ ہوا تھا کہ وہ

اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا مگر وہ بیٹھا اپنے ساتھی کی لاش پر ہی تھا۔ اس نے انیق کے سامنے اپنے نیلگوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور رحم کی درخواست کر رہا تھا۔ یہ درخواست صرف غوں غاں کی صورت میں ہی تھی کیونکہ اس کے ہونٹ بند تھے۔ چوڑی ٹیپ نے بدستور منہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔

تیز دھار چھرا انیق کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر خیام سے تصدیق چاہی کہ اس کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹائی جائے تو وہ بلند آواز میں کچھ نہیں کہے گا۔ اس نے شدومد سے سر کو اوپر نیچے ہلا کر یقین دلایا۔ انیق نے ٹیپ ہٹا دی۔ اس کے بھدے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگی تھی مگر باقی چہرہ ناقابلِ برداشت سردی کے سبب نیلا ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلا ورنہ وہ انیق کے قدموں میں گر پڑتا اور سردی کے عذاب سے جاں بخشی کی درخواست کرتا۔

ہم دونوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ بھیک مانگنے والے انداز میں بولا۔ ’’ہمار کو اِدھر سے اٹھاؤ۔ ہمار کے اندر بروف (برف) جم گیا ہے۔ ہام مرجائے گا۔‘‘

’’نہیں مرو گے۔‘‘ انیق نے اطمینان سے کہا۔ اب ڈھکن کھلا ہے اور تم جب تک سچ بولو گے، کھلا ہی رہے گا۔‘‘

اس نے ڈیپ فریزر کے کھلے ڈھکن کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ ڈھکن نہیں کوئی گلیشیئر ہے جو اس پر گرا تو وہ مر جائے گا۔

اس کی حالت قابلِ رحم تھی لیکن وہ رحم کا حق دار نہیں تھا۔ وہ کوئی نشیلا پان کھاتا تھا جس کے سبب اس کے جسم میں آگ بھر جاتی تھی۔ اپنی اسی کیفیت کے زیرِ اثر اس نے اپنی دسترس میں آئی ہوئی زینب... کو یوں مارا اور نوچا کھسوٹا تھا کہ وہ سرتاپا درد بن گئی تھی۔ اس قسم کے رویے کا مظاہرہ وہ اب تک نجانے کتنی عورتوں سے کر چکا تھا...... اس کی شکل سے تو کچھ خاص ظاہر نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا اندر کالا تھا۔

اس بدخصلت خواجہ سرا نے آخری بار ہمیں نتائج سے ڈرانے کی ناکام کوشش کی جب انیق نے اسے پھر برف کی قبر (ڈیپ فریزر) میں لٹا کر ڈھکن لاک کرنا چاہا تو اس کا پتا پانی ہو گیا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں اس نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں رک رک کر جو کچھ بتایا وہ بڑا انکشاف انگیز تھا۔ اس کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

یہ چند دن پہلے کی بات تھی جب کمان دار افغانی اس کے پاس آئے۔ یہ رات کا وقت تھا اور خیام اپنے ساحلی گھر میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ افغانی، خیام کو اپنے رازدار کی حیثیت دیتے تھے اور اعتماد کرتے تھے۔ انہوں نے خیام پر یہ انکشاف کیا کہ کل ڈی پیلس سے لاپتا ہو جانے والی دلہن زینب ان کے پاس ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ کچھ دن تک پوری حفاظت سے خیام کے پاس رہے۔ خیام کے گھر کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ موجود تھا۔ افغانی اور خیام کے درمیان پروگرام بنا کہ دلہن زینب کو اسی تہ خانے میں رازداری کے ساتھ رکھا جائے گا۔ افغانی صاحب نے خیام پر یہ انکشاف بھی کیا کہ عام لوگوں پر دلہن زینب کی موت ظاہر کرنی ہے۔ زینب کا شاہی لباس کسی دوسری لڑکی کو پہنا کر اور اس کے چہرے کو مسخ کر کے یا اس کے بالائی دھڑ کو بارود سے اُڑا کر اس کی موت کا تاثر پیدا کیا جائے گا۔ اسی رات کمان دار افغانی نے بڑی رازداری کے ساتھ زینب کو خواجہ سرا خیام کے سپرد کر دیا اور ہر طرح اس کے آرام کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ خیام کے ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے تھے مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ گرین فورس کے اہم ترین کمان دار سے کوئی استفسار کر سکتا۔

سب کچھ پلان کے مطابق چلتا رہتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی لیکن یہاں ایک گڑبڑ ہوئی۔ اگلے روز شام کے بعد خواجہ سرا خیام کو افغانی کا فون آیا کہ زینب کے شاہی کپڑے درکار ہیں۔ کپڑوں کی اس تبدیلی کے دوران میں ہی کہیں خواجہ سرا خیام کی شیطانیت نے اس کے اندر زور مارا اور اس کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے تہ خانے کی تنہائی میں زینب کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ اس کے احتجاج پر وہ اس سے مار پیٹ کرنے لگا۔ وحشت کے عالم میں چلّانے لگا۔ دنیا کی ساری خوب صورت عورتوں کو گالیاں دینے لگا اور ان سے طرح طرح کے نازیبا رشتے جوڑنے لگا۔ اسی دوران میں زینب کو موقع ملا اور وہ تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ کسی بھی طرح یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اوپر آ کر وہ بیرونی دروازہ ڈھونڈ رہی تھی۔ خیام اس کے پیچھے تھا۔ وہ بالکونی کی طرف نکل آئی۔ (یہی وقت تھا جب ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے انیق نے اس کی پکار سنی اور یہ دیکھا کہ کوئی اسے واپس کھینچ کر کمرے میں لے گیا ہے)

ہیجڑے خیام مانش کی رُوداد ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے اس کی وڈیو بھی بنائی تھی۔ وہ اسی طرح جہازی سائز کے ڈیپ فریزر میں اپنے ساتھی ہیجڑے کی لاش پر بیٹھا ہوا تھا۔ آنسو اس کے غازہ لگے رخساروں کو بڑی حد تک دھو چکے تھے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کچھ خطرناک ترین لوگوں کی زد میں ہے اور وہ واقعی اسے زندہ فریز کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ وہ زینب کے ساتھ اپنے سلوک کے لیے بھی بار

بار معافی مانگ رہا تھا اور وعدے کر رہا تھا کہ اگر ہم اسے چھوڑ دیں تو وہ سب کچھ اپنے سینے میں دفن کر لے گا۔ بولتے بولتے کسی وقت اس کی آواز کافی بلند ہو جاتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی یہ پھٹی ہوئی آواز قریبی کمرے میں زینب کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

میں نے انیق سے کہا۔ ''اپنا کیسٹ پلیئر آن کر آؤ۔''

اس نے فوراً عمل کیا۔ وال کلاک اب سہ پہر چار بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ ہمیں خیام سے پوچھ گچھ کرتے قریباً ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''زینب کے شاہی کپڑے تم سے کون لے کر گیا تھا۔''

وہ بنگالی لہجے کی اردو میں بولا۔ ''خود افغانی شوب لے کر گیا۔ اگلے دن ہام نے یہ خبر شنا کہ بی بی کا لوش (لاش) ملا ہے۔''

''ظاہر ہے کہ وہ کسی اور لڑکی کی لاش ہو گی، اسے کیسے مارا گیا؟''

''ہمارے جتنی بڑی قوشم (قسم) چاہے لے لو۔ ہمار کو کچھ پتا نا ہیں۔'' وہ اپنی پھٹی ہوئی آواز میں گھگیایا۔

''افغانی صاحب! زینب کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''افغانی شوب (صاحب) یہی جانتے ہیں کہ لڑکی ابھی تک ہمارے پاس تہ خانے میں ہے۔''

''تم اس بات کو کب تک راز رکھ سکتے ہو؟'' انیق نے پوچھا۔

جواب میں خیام پھر ہچکیاں لینے لگا۔ اس نے کہا کہ ''وہ بے حد پریشان ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ افغانی صاحب کو غصہ آ جائے تو بہت برا آتا ہے، وہ سوچ رہا تھا کہ ویسے ہی کہیں غائب ہو جائے۔''

انیق نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن اب تو تمہیں غائب ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تو تمہیں پتا چل گیا ہے کہ زینب ہمارے پاس ہے۔ اب تم جا کر افغانی صاحب کو بتاؤ اور بری الذمہ ہو جاؤ۔''

وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑنے لگا اور اپنے نرخرے کو چھو کر عجیب و غریب انداز میں دوہائی دینے لگا کہ اگر اس کی جان بخشی ہو جائے تو وہ چپ چاپ یہاں سے نکل جائے گا اور انڈیا میں کہیں ٹھکانا کر لے گا۔ اس کا حلیہ ویسے ہی بھونڈا تھا۔ روتے ہوئے وہ اور بھونڈا لگنے لگتا تھا۔ اس کی توند کو ہچکو لے لگتے تھے اور گال تھرا اٹھتے تھے۔ وہ بار بار فریاد کر رہا تھا کہ اسے اس کے ساتھی کی لاش پر سے اٹھا لیا جائے اور فرش پر بٹھا دیا جائے۔ مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد انیق نے اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر ٹیپ چپکا دی اور اس کے ہاتھ بھی اسی مضبوط ٹیپ سے جکڑ دیے۔ اس کی کمر اور ٹانگوں کی ٹیپس اتار کر اسے اس کے ساتھی کی لاش سے جدا کیا گیا اور ڈیپ فریزر سے نکال لیا گیا۔

اسی دوران میں میرے سیل فون پر قسطینا کی کال آ گئی۔ وہ مجھے اپنے پاس آفس میں بلا رہی تھی۔ وہ کسی طرح کی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی کو بتائے بغیر مجھے اپنے ساتھ نیوسٹی کی ''مہم'' پر لے گئی تھی اور آقا جان، حلمی اور افغانی جیسے اہم لوگوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی ہو گی، اس کے باوجود اب وہ فوراً ہی مجھے دوبارہ اپنے پاس طلب کر رہی تھی۔

پندرہ منٹ بعد میں اس کے سامنے موجود تھا۔ اس نے نہا دھو کر لباس بدل لیا تھا۔ وہ پینٹ اور بنگی طرز کی ہاف سلیو شرٹ میں تھی۔ بوائے کٹ شہد رنگ بالوں میں ایک طرف مانگ نکالی گئی تھی اور وہ جچ رہے تھے۔ وہ ایک بڑے سے نقشے کو جدید طرز کی متحرک میز پر بچھا کر اس پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے نقشے کو لپیٹا اور بولی۔ ''چلو آؤ، دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں تو ہر وقت دفتری ماحول رہتا ہے۔''

بغلی دروازہ کھول کر ہم اسی ریٹائرنگ روم میں آ گئے جہاں ہم ایک بار پہلے بھی بیٹھ چکے تھے اور ڈنر کر چکے تھے۔ یہیں پر ایک ڈیکوریشن پیس کے اندر وہ بے مثال اسپائی کیمرا نصب تھا جس نے مجھے کچھ نہایت پرائیویٹ مناظر دکھائے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے کن انکھیوں سے اس ڈیکوریشن پیس کی طرف دیکھا۔ اس میں کئی رنگوں کے پتے اور کونپلیں وغیرہ تھیں۔ انہی میں وہ ''ہم رنگ کیمرا'' بھی چھپا ہوا تھا۔ بادی النظر میں وہ مجھے نظر نہیں آیا لیکن میں جانتا تھا وہ موجود ہے۔

کچھ دیر تک ہم اس یادگار ''ائیر ریڈ'' کی بات کرتے رہے جس نے نیوسٹی میں کھلبلی مچا دی تھی اور رائے زل کی گرے فورس کو کئی اہم کمانڈروں سے محروم کر دیا تھا۔ پھر گفتگو کا رخ ان سنگین ترین چھ گھنٹوں کی طرف مڑ گیا جو ہم دونوں نے برج کلب کے شیلٹر میں گزارے تھے۔ قسطینا نے اس دراڑ کا ذکر کیا جو موت کی تلوار بن کر ہمارے سروں پر لٹکتی رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں اس منظر کو بھول نہیں پا رہی جب دھماکے کے ساتھ چھت کئی فٹ نیچے آ گئی تھی اور تم میرے اوپر گر گئے تھے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اگر دس بیس ہزار ٹن ملبا

تمہارے اوپر گر پڑتا تو میں پھر بھی بچی رہتی۔"

اسے مسکراتے دیکھ کر میں بھی مسکرا دیا۔ "چلیں...... اپنی سی کوشش تو کی میں نے۔"

"تمہاری یہ کوشش اچھی لگی۔"

"اور مجھے بھی اس طرح آپ کے قریب آنا اچھا لگا۔" میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرا گئی۔ یقیناً اسے وہ لمحات یاد آ گئے تھے جب ہم دونوں شیلٹر کے فرش پر تھے اور میں نے اسے مضطرب ہو کر ڈھانپ لیا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ اسے برا نہ لگ گیا ہو، کچھ دیر بعد اس نے دو کپس میں کولڈ کافی انڈیلی اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "شاہ زائب! میں جیسی بھی ہوں لیکن ایک صاف گو اور اسٹریٹ فارورڈ لڑکی ہوں، میری کچھ باتیں لوگوں کو اور خاص طور سے میرے بزرگوں کو بری بھی لگتی ہیں لیکن جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ اپنے ذاتی معاملات میں بھی میرا یہی رویہ ہے۔ میں نے کبھی اپنے بارے میں کچھ چھپایا نہیں۔ کالج کے ابتدائی دور میں ایک اسکول فیلو لڑکے سے میری دوستی ہوئی۔ دھیرے دھیرے اس دوستی کی نوعیت بدلنا شروع ہوئی۔ اس موقع پر بھی میں نے اپنے گھر والوں اور خصوصاً اپنے پیارے والد سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ پھر وہ لڑکا برونائی کے ساحل پر ایک اسپیڈ بوٹ کے حادثے میں جان کی بازی ہار گیا۔ اس کے بعد دو تین سال تک میری زندگی بہت ڈسٹرب رہی پھر والد کی محبت نے مجھے مایوسی اور دکھ کے اس بھنور سے نکال لیا...... وہ لڑکا میری پہلی محبت تھا......"

وہ میری طرف دیکھے بغیر کافی کے گھونٹ لے رہی تھی۔

"اور دوسری محبت؟" میں نے اچانک پوچھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر کافی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "دوسری محبت کوئی نہیں...... لیکن ایک سایہ سا میں اپنے آس پاس...... ضرور محسوس کرتی ہوں۔"

"کیسا سایہ؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔

اس نے پھر میری طرف دیکھا اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر نشست سے ٹیک لگائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاہ زائب! شاید میں اس طرح معنی خیز گفتگو نہ کر پاؤں جس طرح لڑکیاں کرتی ہیں۔ اگر تم سننا چاہتے ہو تو میں اپنے دل کی کیفیت صاف صاف تمہیں بتا دیتی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں تو شاید یہ غلط ہوگا۔ ہاں یہ بات ہے کہ تم ایسٹرن کی حیثیت سے مجھے بہت زیادہ FASCINATE کرتے ہو۔ تم میرے لیے ایک محبوب لیجنڈ کی طرح ہو۔ ایک من پسند افسانوی شخصیت۔ تم سے مل کر اور جان کر یہ پسندیدگی مزید بڑھی ہے۔ میں تمہارے اور قریب آنا چاہتی ہوں...... تمہیں اور جاننا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ سیدھی بات کر رہی ہیں تو میں بھی سیدھی بات کرنا چاہوں گا۔ کیا قریب آنے سے آپ کا مطلب...... جسمانی قرب ہے؟"

اس کے چہرے پر پھر سرخی سی لہرائی لیکن وہ مختلف لڑکی تھی۔ جھینپنے کے بجائے بولی۔ "شاید...... ایسا بھی ہو۔ جو لیجنڈ ہوتا ہے، جس کی پرستاری کا دعویٰ ہوتا ہے اسے چھونے کو بھی دل چاہتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ محبت ہوتی ہے یا "فینٹسی" ہی کی ایک قسم...... میرا خیال ہے کہ "فینٹسی" ہی ہوتی ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "یعنی چارم ختم، تجسس ختم اور فینٹسی بھی ختم؟"

"شاید...... یا شاید نہیں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

بالفاظِ دیگر وہ صاف گوئی سے مجھے بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ میرے قریب تو آنا چاہتی ہے مگر مجھ سے محبت کا دعویٰ نہیں کرتی۔

میں بھی اس سے کچھ ایسی ہی بات کہنا چاہ رہا تھا کہ میرا دل تو میرے پہلو میں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ کہیں کھو چکا ہے، میں تو صرف ایک وقتی فرار چاہتا ہوں۔ خود کو کسی کی بانہوں اور گرم سانسوں میں گم کر دینا چاہتا ہوں......

"کیا سوچ رہے ہو ایسٹرن؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے پھر ایسٹرن کہہ رہی ہیں۔"

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ اکیلے میں، میں تمہیں اس نام سے پکار سکتی ہوں۔ ہاں سب کے سامنے اصل نام لوں۔"

"لیکن مسئلہ تو یہ ہے یور ہائی نس کہ آپ سب کے سامنے بھی اصل نام نہیں لیتیں۔ میرا نام شاہ زیب ہے...... شاہ زیب۔" میں نے "زیب" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور آپ مجھے زائب کہتی ہیں۔"

وہ ہنس دی۔ ”یہ تو زبان کا مسئلہ ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ایسے مسئلوں کو ٹھیک ہوتے کتنی دیر لگے گی۔“

خون نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف چڑھائی کی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی اور سنجیدہ ہو گئی۔ چند ساعتوں میں ہی ایک لڑکی کے بجائے ایک کمانڈر نظر آنے لگی۔ کافی کی چسکی لے کر سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”شاہ زائب! ابھی تو میں خود کو جنگ کے بھنور میں محسوس کر رہی ہوں۔ اپنے والد کے قاتلوں سے انتقام کا خیال ایک بہت بڑے انگارے کی طرح میرے سینے میں دہک رہا ہے۔ میرے پاس اور کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ہے......“

بالفاظ دیگر وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ابھی تو وہ صرف ایک کمانڈر ہے اور صرف زندگی موت کی اس لڑائی کے بارے میں سوچ رہی ہے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اگر زندگی نے مہلت دی اور یہ لڑائی بھی ختم کی تو پھر شاید وہ اپنے بارے میں سوچے اور جاماجی کی ان خوشگوار چھیلی دوپہروں کے بارے میں سوچے جن کا تذکرہ اس نے کیا ہے۔

یہ بڑا ٹھنڈا ٹھار سا جواب تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کافی ختم ہو چکی تھی۔ قسطینا کے سیل فون کی مدھم گھنٹی بھی بار بار سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ ڈی پیلس کے احاطے میں ایک بار پھر رضا کاروں کے جتھے جمع ہو رہے تھے اور ان کے پُرجوش نعروں کی گونج یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ کل رات کے کامیاب فضائی حملے نے یقیناً ان لوگوں میں نئی روح پھونک دی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب مجھے اجازت ہے؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”تمہارے وقت کا بہت شکریہ شاہ زائب! ابھی اہم افسروں سے میری ایک میٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ اس میں محاذ کی بات ہو گی اور سوچا جائے گا کہ فضائی حملے کے نتیجوں کو کس طرح اپنے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے...... میں تمہیں بھی باخبر رکھنے کی کوشش کروں گی۔“

”شکریہ۔“ میں نے کہا اور اس سے اجازت لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے اٹھ کر میرا بازو پکڑ لیا...... اور بالکل غیر متوقع طور پر میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ ایک طرح سے الوداعی بوسہ تھا لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ میں یہ الوداعی لمس لے کر چپ چاپ دروازے سے نکل جاؤں گا تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ میں نے جوابی کارروائی کی اور اسے اپنے اکلوتے صحت مند بازو کے حلقے میں لے کر کئی بوسے اس کے چہرے پر ثبت کیے۔ وہ گلنار ہو گئی۔ کچھ کچھ خفا...... کچھ کچھ خوش۔ قریباً ایک منٹ تک ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوئے رہے پھر میں اسے خدا حافظ کہہ کر ریٹائرنگ روم سے باہر آ گیا۔

یہ ایک فرار تھا۔ کسی سے دور بھاگنے کی ایک کامیاب تگ و دو تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ سوچوں کی دھار کند ہو رہی ہے۔ کسی کا چہرہ اب خیالوں میں دھندلاتا جا رہا تھا۔ کسی دانشور کا کہا ہوا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے، ایک ہی جگہ کھڑے رہنے والے پتھرا جاتے ہیں۔

میں انیکسی میں پہنچا تو سیف واپس آ چکا تھا۔ انیق، سیف والے کمرے میں ہی موجود تھا۔ دونوں پاکستان کی پنجابی فلموں اور سلطان راہی وغیرہ پر گرما گرم تبصرے کر رہے تھے۔ بلند آواز میں ہنستے اور گپیں لگاتے انیق کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس نے قریبی کمرے میں ایک لاش کو ڈیپ فریزر میں بند کر رکھا ہے اور ڈی پیلس کے انچارج خواجہ سرا کی مشکیں کس کے اس کا حشر نشر کیا ہوا ہے۔

سیف مجھے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا...... اور آگے بڑھ کر مجھ سے معانقہ کیا۔ ”استاد جی! آپ اِدھر اُدھر ہوتے ہیں تو میرا دل ڈولنے لگتا ہے۔ بڑے برے برے خیال آنے لگتے ہیں...... آپ کے بازو کا کیا حال ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے تو ٹھیک تھا لیکن تم نے ابھی جو کبڈی والی جھپی ڈالی ہے اس سے پھر درد شروع ہو سکتا ہے۔“

”اوہو...... سوری سوری...... بس آپ کو دیکھ کر کچھ ہوش ہی نہیں رہتا، یقین کریں کچھ دیر پہلے تک آپ کے بارے میں اتنا فکر مند تھا کہ......“

”دو کلو کڑاہی گوشت بھی سارا نہیں کھایا گیا۔“ انیق نے جلدی سے لقمہ دیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ہنستے ہوئے سیف کا چوڑا سینہ ڈھول کی طرح بجتا تھا اور رنگ سرخ ہو جاتا تھا۔ اپنے رنگ دار کُرتے اور پرنے (بڑے رومال) کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں پنجابی جوان نظر آتا تھا۔ وہ ویسے تو اپنا سیل فون ٹھیک کرانے گیا تھا لیکن کرخت سنگھ کے ساتھ دیسی مرغے کا کڑاہی گوشت اور بکرے کی چانپیں کھا کر آیا تھا۔ ساتھ ساتھ دونوں نے دیگر قسم کے گوشت پر بھی توجہ دی تھی۔ یعنی بے حد چست لباس

والی وہ مقامی لڑکیاں جو بازاروں میں مختلف اشیا فروخت کرتی نظر آتی تھیں۔ سیف کا چہرہ شکم سیری کے سبب دمک رہا تھا۔ آتے ہوئے وہ کوئی پھل بھی لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سنگھاڑے کی کوئی قسم ہے اور اسے ابال کر اور نمک لگا کر کھانے سے مردوں کی کمر بڑی پکی ہو جاتی ہے۔ میرا حال احوال پوچھ کر وہ ایکسی کے مین کچن کی طرف چلا گیا تاکہ ان ''سنگھاڑوں'' کو ابالا جا سکے۔ ایق نے مجھ سے کہا کہ وہ خیام کی حالتِ زار کا جائزہ لے کر آتا ہے۔

میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ میری نظر بیڈ پر پڑی۔ سنگھاڑوں کے چکر میں سیف اپنا سیل فون وہیں چھوڑ گیا تھا۔ فون میں وال پیپر کے طور پر اس نے اپنے خوب صورت گاؤں کی تصویر لگا رکھی تھی۔ سرسبز کھیت، لہلہاتے درخت اور ان کے پس منظر میں کچے پکے گھر۔ کتنی دلکشی ہوتی ہے اپنی مٹی اور اپنی دھرتی کے مناظر میں۔ دیہی پس منظر کی کچھ اور تصویریں بھی تھیں۔ میں یونہی بٹن پریس کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ اچانک ایک ایسی تصویر میرے سامنے آئی جس نے مجھے ششدر کر دیا۔ مجھے لگا میرا دماغ چکرانے لگا ہے...... یہ تاجور تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تک میں کسی اور دنیا میں تھا۔ میں نے قسطینا کو چھوا تھا، اسے بانہوں میں لیا تھا اور مجھے لگا تھا کہ میں اپنے ''فرار'' میں کچھ اور آگے بڑھ آیا ہوں جو چہرہ پیچھے رہ گیا تھا، وہ اور پیچھے چلا گیا ہے، دھندلا گیا ہے، اب میں اس کی یادوں کے بندھنوں سے نکل رہا ہوں۔ مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ اس دور دراز جزیرے میں وہ اچانک ایک بار پھر پوری رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے آن کھڑی ہوگی...... ہاں وہ کھڑی تھی...... وہ اس تصویر میں کھڑی تھی...... یہ کسی کھیت کی منڈیر تھی۔ تیز ہوا نے اس کی اوڑھنی اور اس کی دور یشمی لٹوں کو ہوا میں اُڑا رکھا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی پھول دار قمیص اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی، اس کی دلکشی کو نمایاں کر رہی تھی...... ہاں وہ تاجور ہی تھی...... اور اس کی تصویر کبڈی شاہ سیف کے موبائل فون میں تھی...... میں واقعی چکرا کر رہ گیا۔

میں نے جلدی جلدی بٹن پریس کیا۔ فون کی فوٹو گیلری میں اس کی دو تین تصویریں اور بھی تھیں۔ ایک میں صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ دوسری میں سائڈ پوز تھا، وہ کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ہاتھوں میں ایک رنگ دار چنگیر تھی جس میں موم بتیاں روشن تھیں۔ یہ تصویر شاید مہندی یا ابٹن کی کسی تقریب میں اتاری گئی تھی۔

میرا دھیان سکھیرا اپنڈ کی طرف چلا گیا۔ چاند گڑھی سے نکل کر تاجور کی فیملی اس سکھیرا اپنڈ میں ہی رہائش پذیر ہوئی تھی۔ سیف بھی سکھیرا اپنڈ کا تھا۔ تو کیا یہ تصویریں وہیں پر اتاری گئی تھیں، میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ سیف ابھی مین کچن میں ہی مصروف تھا۔ میں اس کے موبائل کو چیک کرنے لگا۔ فوٹو گیلری سے میں ان باکس میں آیا۔ یہاں ایک بار پھر مجھے بری طرح چونکنا پڑا۔ میں نئے اور پرانے میسج دیکھ رہا تھا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ پرانے کچھ ''میسجز'' دکھائی دیے۔ میں نے ایک میسج پڑھا اور ششدر رہ گیا۔ یہ سیف کی طرف سے تھا اور کچھ یوں تھا۔ ''نہیں تاجور! اتنا لمبا انتظار مجھ سے نہیں ہوگا۔ کل شام کا موقع نکالو۔''

اس کا جواب دیا گیا تھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر بعد بات کریں گے۔''

ایک جگہ سیف کا میسج یوں تھا۔ ''آج ایک میچ کھیلنے سیالکوٹ جا رہا ہوں، دو دن لگ جائیں گے لیکن اتنی تسلی تو ہے کہ تمہاری تصویر میرے پاس ہے۔''

جواب میں لکھا گیا تھا۔ ''تمہاری خیر خیریت کے لیے دعا کرتی ہوں۔''

یہ سارے میسج اردو ٹیکسٹ میں تھے۔ میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ مجھے پہلوان حشمت سے ہی معلوم ہوا تھا کہ سکھیرا گاؤں میں تاجور کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ دین محمد صاحب نے یہ رشتہ اپنی ہی طرح کے ایک زمیندار گھرانے میں طے کیا ہے۔

تو کیا تاجور کا رشتہ اسی سیف سے طے ہوا تھا؟

سوال کا جواب میرے اندر سے ہی آ رہا تھا اور یہ ''ہاں'' میں تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ سیف ہی تاجور کا ہونے والا شوہر ہے۔ میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ میں سیف کو سکھیرا گاؤں سے اپنے پیچھے لگا کر لیۃ کے پارا ہاؤس تک لے آیا تھا...... اور پھر پارا ہاؤس سے یہاں اس دور دراز جزیرے میں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں جس کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں وہ سیف کی صورت میں یہاں تک آ پہنچی ہے۔

پہلے جب میں اس سے فرار کی کوئی کوشش کرتا تھا...... (جاناں کی گھنی زلفوں میں پناہ لیتا تھا یا گلاس کو منہ لگاتا تھا) تو وہ تصور کی شکل میں میرے سامنے آتی تھی سرسوں کے زرد کھیت میں کھڑی دکھی نظروں سے میری طرف دیکھتی تھی۔ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھی مگر آج وہ کیمرے کی تصویروں کی شکل میں میرے سامنے آ گئی تھی۔ اس نے مجھے سرتاپا جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زرق برق لباس پہنے...... گول

چنگیر میں موم بتیاں سجائے وہ کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھ سے پوچھ رہی ہے...... مجھے بتائیں، کیا میں اتنی ہی معمولی تھی کہ مجھے اس طرح بھلا دیا جاتا؟

میرے سینے میں آگ سی دہکنے لگی۔ یہ کیسی جلن تھی؟ دکھ تھا یا رقابت تھی؟ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سیف کو چاہتی ہے کیا وہ اس لیے چاہتی تھی کہ وہ اس کا منگیتر تھا...... یا وہ اس لیے منگیتر تھا کہ وہ اسے چاہنے لگی تھی...... اور ابھی تو ٹھیک سے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ کیا وہ سیف ہی ہے جس سے اس کے رشتے کی بات ہوئی ہے۔

پتا نہیں کیوں آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور وہ کسی نہ کسی صورت میں سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ اس نے مجھے دل نہیں دیا تھا...... اور ٹھیک ہی کیا تھا۔ اس نے تین چار ماہ کے ''ساتھ'' میں جانچ لیا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جنہیں عرف عام میں شریف کہا جاتا ہے، مجھ میں خرابیاں تھیں میرے پیچھے کچھ بلائیں تھیں اور میں کچھ بلاؤں کے پیچھے تھا۔ وہ کئی موقعوں پر مجھے خطرناک روپ میں دیکھ چکی تھی...... وہ میرے قریب آنے سے پہلے ہی مجھ سے دور ہو گئی تھی۔

لیکن اب اگر وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ایک شریف گھریلو قسم کے زمیندار زادے کو اپنی زندگی میں شامل کر رہی ہے تو یہ بھی غلط تھا۔ سیف جو کچھ بھی تھا، میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کسی ایک کا بن کر رہنے والا نہیں ہے۔ اس کے مزاج میں رنگینی و بے قراری تھی...... اور اس کی کچھ خطرناک مصروفیات بھی تھیں۔ اس نے اپنے گاؤں میں مختار جھارا جیسے گینگسٹر سے دشمنی پال رکھی تھی اور بھرا ہوا پسٹل ہر وقت اس کے لباس میں رہتا تھا اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ بھی ایک چھوٹا موٹا گینگسٹر ہی تھا۔

راہداری کی طرف سے قدموں کی چاپ ابھری اور میں سمجھ گیا کہ سیف واپس آرہا ہے۔

اس نے آتے ساتھ ہی ایک مسرت بھرا بلند بانگ قہقہہ لگایا اور ابلے ہوئے سنگھاڑوں کی طشتری میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیں جی استاد صاحب! دیکھیں کیسی مزیدار چیز ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ سنگھاڑے سے بھی آگے کی شے ہے۔ مزہ بھی اس سے بڑھ کر ہے۔'' اس نے کئی سنگھاڑے چھیل کر میرے سامنے رکھ دیے۔ ساتھ میں کالا نمک اور مرچیں وغیرہ تھیں۔

اس کے بہت اصرار پر میں نے ایک ٹکڑا لیا، وہ بولا۔ ''جناب! یہ جو سنگھاڑا ہے نا، جوڑوں اور کمر کے لیے بڑا فائدے مند ہے اور آپ کو پتا ہی ہوگا جب کبڈی کھیلنے والا کسی کو جھپا مار کر روکتا ہے تو سارا زور جھپا مارنے والے کی کمر پر ہی پڑتا ہے یا پھر کلائیوں وغیرہ پر......''

میں نے آج تک اس سے اس کے ذاتی معاملات پر بات نہیں کی تھی۔ آج پہلی بار کی۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''کیسی زندگی گزار رہے ہو، کوئی شادی وغیرہ کا بھی سوچا ہے یا نہیں؟''

''شادی بھی کر لیں گے جناب، اتنی کون سی چھیتی پڑی ہے۔ اب آپ جیسا گرو ملا ہے۔ کچھ سیکھ سکھا لیں آپ سے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی نظر میں تو ہوگی؟''

''میں نے شاید پہلے آپ کو...... یا پھر انیق کو بتایا تھا...... کہ ایک آئی ہوئی ہے نظر میں...... اپنے ہی پنڈ کی ہے...... منگنی تک بات پہنچ گئی ہوئی ہے...... ٹھہریں میں اس کی فوٹو دکھاتا ہوں آپ کو......''

اس نے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کے بعد بستر سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور اس میں سے تاجور کی تصویر نکال کر میرے سامنے کر دی۔ یہ وہی تصویر تھی جس میں وہ کسی منڈیر پر تیز ہوا کے سامنے کھڑی تھی۔ بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

''زبردست بھئی، ماشاء اللہ بہت اچھا میچ ہے۔''

''میچ تو ابھی شروع نہیں ہوا جی...... ابھی تو وہ ہو رہے ہیں...... وہ کیا کہتے ہیں وارم اپ۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''کس طرح کے لوگ ہیں؟''

''بڑی اچھی فیملی ہے جی۔ ان لوگوں کو سکھیرا میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ لڑکی کے والد کا نام چودھری دین محمد ہے۔ بڑی اچھی طبیعت والے ہیں۔ ایسے لگنے لگا ہے جیسے ہمیشہ سے ہمارے ہی پنڈ میں رہتے ہیں۔ فیملی بھی چھوٹی ہے، لڑکی کے دو چھوٹے بھائی ہیں اور ماں باپ...... بس۔''

''انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے ایک دوسرے سے؟''

''اوہو، انڈر اسٹینڈنگ تو ایسی ہے جی کہ کیا بتاؤں۔ دو چار دن کہیں اِدھر اُدھر ہو جاؤں تو پسوڑیاں پڑ جاتی ہیں

دوسری طرف۔'' وہ ایک بار پھر زور سے ہنسا اور اس کا سینہ ڈھول کی طرح بجنے لگا۔

میں نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ تیز ہوا میں اپنا دوپٹا سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سیف نے سنگھاڑوں کے ڈھیر میں سے ایک موٹا دانہ ڈھونڈا اور اسے چھیلتے ہوئے بولا۔ ''لو جی، یہ والا کھا کر دیکھیں...... بس ایک کھالیں۔''

اس سے پہلے کہ میں ہاں یا نہ میں جواب دیتا، دروازے پر انیق نظر آیا۔ اس کی طرف سیف کی پشت تھی۔ اس نے مجھے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی آواز بھی دے دی۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا میں ابھی آتا ہوں۔''

سیف کو وہاں چھوڑ کر میں کمرے میں پہنچا۔ انیق پریشان لگ رہا تھا بولا۔ ''وہ مسلسل روئے جارہی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے اسے کچھ ہو نہ جائے۔''

ہم درمیانی دروازہ کھول کر سجاول والے کمرے میں داخل ہوئے۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں زینب کی حالت تبلی نظر آرہی تھی۔ چند ہی دنوں میں وہ ہفتوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے دوپٹا مضبوطی سے اپنے سر پر جمار کھا تھا۔ ایک طرف کھانے کی ٹرے پڑی تھی جس میں سے بمشکل دو چار نوالے ہی اس نے لیے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ بلک پڑی۔ ''بھائی جی، میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس قید خانے سے نکال دیں۔ میرا سانس رک رہا ہے۔ میں یہاں مرجاؤں گی۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''دیکھو زینب! ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ تم جانتی ہو یہاں باقاعدہ لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ جونہی کوئی موقع ملتا ہے ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔''

''مم...... مجھے لگتا ہے، مجھے بس تسلیاں دی جارہی ہیں۔ مجھ سے جھوٹ بولے جارہے ہیں۔ مجھے ابراہیم کے بارے میں بھی ٹھیک سے کچھ نہیں بتایا جارہا۔ ان کی حالت اب کیسی ہے۔ وہ کہاں ہیں؟ میں ایک بار ماں جی سے بھی بات کرنا چاہتی تھی۔ مجھے ان سے بھی نہیں ملوایا گیا۔'' (ماں جی سے مراد بیگم نورل تھی)

وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ ڈر تھا کہ اس کی آواز بلند نہ ہوجائے۔ میں نے اسے بمشکل چپ کرایا...... اور یقین دلایا کہ اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں موجودہ صورتِ حال ضرور تبدیل ہوگی۔ میں نے اسے اپنے سامنے کھانا کھلایا اور انیق کو اس کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔

ہم دوسرے کمرے میں پہنچے۔ کچن کا جائزہ لیا۔ ڈیپ فریزر میں لاش ٹھنڈی ہورہی تھی۔ خواجہ سراخیام کو انیق نے اچھی طرح باندھ کر ایک کونے میں ڈالا ہوا تھا اور اسے پرسکون رکھنے کے لیے کوئی ٹرینکولائزر دے دیا تھا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔ ہمارے لیے شکر کا مقام تھا کہ زینب ابھی تک اس کچن کی صورتِ حال سے یکسر بے خبر تھی۔ جب کچن کا اور کمرے کا دروازہ لاک ہوجاتا تھا تو زینب تک آواز پہنچنے کے امکانات معدوم ہوجاتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ کچھ دیر اکیلا رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سیف سے بات چیت ہوئی تھی اور جو کچھ میں نے اس کے موبائل فون میں دیکھا تھا، اس نے مجھے تہ و بالا کر دیا تھا لیکن حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے کہ آرام سے بیٹھ کر غمزدہ ہونے کا وقت بھی نہیں تھا۔

اچانک میرے فون کا میوزک بج اٹھا۔ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''السلام علیکم۔ ام کمانڈر افغانی بول رہا ہے۔ کیا تم شاہ زیب بات کر رہا ہے؟''

میں چونک گیا۔ سنبھل کر کہا۔ ''جی ہاں، میں شاہ زیب ہوں۔ آپ نے کیسے زحمت کی؟''

''ام کو تمہارا نمبر حلیمی نے دیا ہے۔ ام تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ کیا تم اس وقت ہمارے پاس آسکتا ہے؟''

''اگر آپ کا حکم ہے تو حاضر ہوجاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے ام انتظار کرتا ہے۔'' خشک لہجے میں کہا گیا اور جگہ کا بتا کر فون بند کر دیا گیا۔

ایک طرح سے تو یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ خواجہ سرا خیام نے جو سنسنی خیز بیانات دیے تھے، اس کے بعد کمانڈر افغانی سے ملنا ضروری ہوگیا تھا۔ زینب کی موت کا ڈراما رچانے میں کمانڈر افغانی بھی برابر کا شریک نظر آتا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ مجھے کس حوالے سے اپنے پاس طلب کر رہا تھا۔ میں نے سن گن لینے اور مشورہ کرنے کے لیے قسطینا کو کال کی۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ وہ شاید بہت مصروف تھی۔ اچانک مجھے اپنے اسپائی کیمرے کا خیال آیا۔ میں نے اپنے موبائل کو کیمرے کے ریسیور کی

شکل دی دے۔ معمولی کوشش کے بعد قسطینا کے ریٹائرنگ روم کا منظر نظر آیا۔ کمرا خالی تھا۔ اس کی یونیفارم جو عین سامنے دیوار پر جھول رہی ہوتی تھی موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی میٹنگ میں شریک ہے یا اگلے مورچوں کی طرف گئی ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں کمانڈر افغانی کی طرف جا رہا تھا۔ کمانڈر افغانی کی رہائش گاہ ڈی پیلس کے وسیع و عریض احاطے کے اندر ہی ایک جانب واقع تھی۔ میں رضا کاروں کے جتھوں کے درمیان سے پیدل گزرتا ہوا پانچ منٹ میں اس کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے وہ سیل فون بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا جس پر انیق نے خیام کا اعترافی بیان ریکارڈ کیا تھا۔ یہ میرے بہت کام آنے والا تھا۔

گیٹ پر مشین گنوں والے دو لمبے تڑنگے قبائلی پہرا دے رہے تھے۔ میری شناخت کے بعد مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ میرا پستول میرے ساتھ ہی رہنے دیا گیا تھا۔ ایک شخص مجھے دو راہداریوں سے گزار کر گھر کی وسیع نشست گاہ میں لے گیا۔ یہاں فرش پر قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ دیواروں پر ہر طرح کا اسلحہ آویزاں تھا...... شیر کے سر کی دو ٹرافیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

لمبا تڑنگا افغانی پھیل کر ایک غالیچے پر نیم دراز تھا اور ڈرائی فروٹ کھا رہا تھا۔ میں افغانی کو کئی بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ سراپا ایک جنگجو تھا۔ اس کے ایک بازو پر اب بھی کچھ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ان زخموں کی نشانی تھی جو اسے دو روز پہلے والی لڑائی میں آئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ قہوے اور ڈرائی فروٹ کی طشتری میری طرف کھسکا دی۔ ”تمہارا بازو اب کیسا ہے جوان؟“

”اب بہتر ہوں۔ بس ہلکا سا درد ہے۔“

”درد والے کام تو تم خود کرتے ہو۔ تم کو بی بی قسطینا کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر امارے اختیار میں ہوتا تو ام تم کو ایسے کام کا اجازت ہرگز نہ دیتا۔“ اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”ام ایک اور بہت ”زیادہ ٹھیک“ بات کرنا چاہ رہا ہے اور ام کو امید ہے کہ تم اپنے مغز کا استعمال کرے گا اور اس بات کو ردی کے ٹوکرے میں نہیں پھینکے گا۔“

میں نے چونک کر افغانی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ نشست گاہ کے دروازے بند تھے۔ اردگرد بھی شاید کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”بی بی قسطینا کو جانتے ہو کون ہے؟...... بی بی قسطینا محترم آدم شہید کا بیٹی ہے۔ وہ یہاں فوج کا سپریم کمانڈر رہے...... اور وہ اس جنگ کا سرداری کر رہا ہے جو ہمارے لیے زندگی موت کا جنگ بنا ہوا ہے۔ اس پر بہت بھاری ذمے داریاں ہیں۔ ام ہرگز ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی اس کی ان ذمے داریوں میں خلل ڈالے۔“

”میں...... سمجھا نہیں؟“

”تم سب سمجھ رہے ہو۔ ام کو ایک شہید کی بیٹی کا نام بار بار زبان پر لانے پر مجبور مت کرو۔ وہ ام سب کے لیے بہت قابلِ احترام ہے...... ام اپنا سارا بات بس ایک فقرے میں کہہ دیتا ہے۔ تم اس سے اپنا بار بار کا میل جول بند کر دو۔“ افغانی کے لہجے میں کسی شیر کی دبی دبی دہاڑ تھی۔

میں سب کچھ سمجھ رہا تھا، پھر بھی پوچھا۔ ”محترم کمانڈر آپ کس میل جول کی بات کر رہے ہیں؟“

”اپنا زبان بند کر لو۔“ وہ نہایت سخت لہجے میں پھنکارا۔ ”بس، ام نے اپنا بات ایک فقرے میں کہہ دیا...... اب تم جاسکتے ہو۔“ اس نے ڈرائی فروٹ کی طشتری میرے سامنے سے ہٹا دی۔

ایک توقف کے بعد میں نے کہا۔ ”اگر میں نہ جاؤں تو؟“

اس نے میری طرف یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے میں ابھی ابھی زمین شق کر کے برآمد ہوا ہوں۔ وہ بولا کچھ نہیں بس کئی لمحوں تک جگر پاش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ تب اس نے اٹھ کر نشست گاہ کے قالین پر ننگے پاؤں ایک چکر لگایا اور دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ کر تین بار تالی بجائی۔ ایک گرانڈیل قبائلی اندر آیا اور سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ ”زمان اس لڑکی کو یہاں لے کر آؤ۔“ افغانی نے میری طرف دیکھ کر خونخوار لہجے میں کہا۔

میرے دل نے گواہی دی کہ میری نگاہیں چند ہی لمحوں میں کوئی لرزہ خیز منظر دیکھنے والی ہیں۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

ادھورا انتقام

اسفندیار

زخم جتنے پرانے ہو جاتے ہیں... بے قراری اور بے کلی کی چبھن اور کسک میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے... کچھ نہ کرنے کا احساسِ بے بسی... رفتہ رفتہ انتقام کی صورت اختیار کر لیتا ہے... ایسے ہی زخم خوردہ شخص کا قصہ... جو برسوں سے زخموں کی آبیاری کررہا تھا... اب وقت آگیا تھا کہ اس کا خراج سود سمیت وصول کیا جائے... ان لمحوں کی تڑپ... جو آنے والے دنوں کے لیے حسابی گوشوارہ تیار کررہے تھے...

وقت و حالات سے پیمان باندھنے والے گھائل کا سفرِ وجدان......
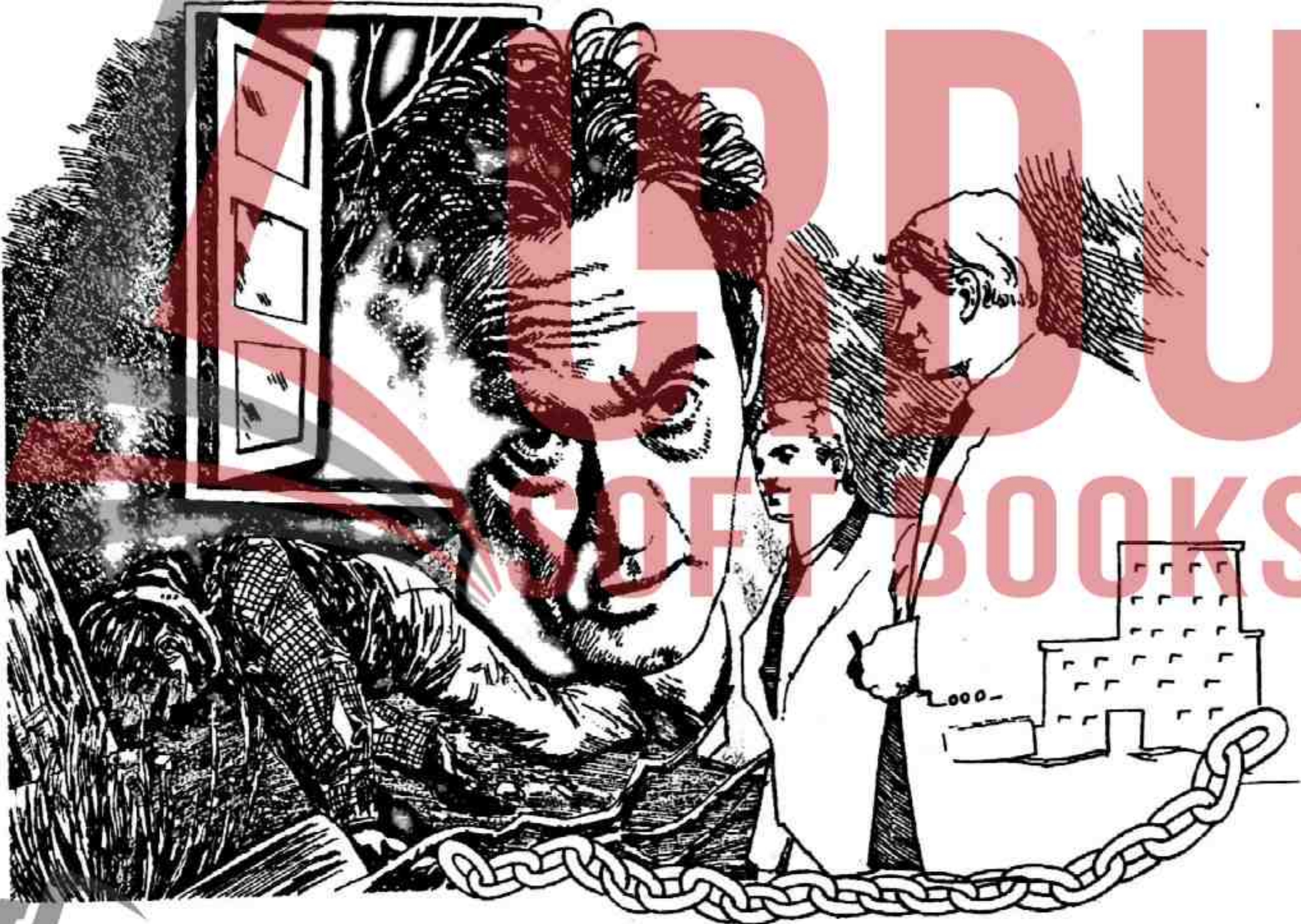
"ڈیڈی، تم نے اپنی سب چیزیں رکھ لیں۔ دوائیں، سیل فون اور نوٹس وغیرہ؟"

"میں کوئی لیکچر دینے نہیں بلکہ سیمینار میں شرکت کرنے جارہا ہوں۔" پروفیسر میر یوئیل نے جواباً کہا۔

"کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے ساتھ ائرپورٹ تک جاؤں۔ کاش تم مجھے پہلے بتادیتے تو میں بھی تمہارے ساتھ اس شو میں جاتا۔"

"خدا کے واسطے سوچ سمجھ کر بولا کرو ڈیوڈ۔ میرے

گھٹنوں میں تکلیف ضرور ہے لیکن معذور نہیں ہوا ہوں ورنہ کبھی اس سیمینار میں نہ جاتا جسے تم شو کہہ رہے ہو۔"

نوجوان نے ترچھی نظروں سے باپ کو دیکھا اور بولا۔ "پھر تم اسے کیا نام دو گے؟"

"دراصل ہمیں اپنی لائبریری کے لیے کچھ کتابوں کی تلاش ہے۔ یہ جدید طبیعیات کے کلاسیکل دور کو جاننے کا ایک نادر موقع ہے جو مجھے سو سال تک زندہ رہنے کے باوجود نصیب نہ ہوتا اور وہ مجھے اس کا معاوضہ بھی دے رہے ہیں۔"

"کیونکہ کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔" بیٹے نے فخریہ انداز میں کہا۔ "تمہارے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔"

☆☆☆

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟" سراغ رساں سارجنٹ ڈولنگر نے بھناتے ہوئے کہا۔ "کہ کمپیوٹر ہمیشہ تمہاری خطرناک غلطیوں کو ختم کر دیتا ہے؟"

لیفٹیننٹ سائرس اوبرن نے اس کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "یہ مت پوچھو۔ میرا پرنٹر گزشتہ جمعرات سے روٹھا ہوا ہے اور اب میں اس خرابی کو دور کرنے میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ان دونوں کو فوری طور پر کیپٹن مینگ کے دفتر میں طلب کیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح پریشان نظر آرہا تھا اور اس کے چہرے پر کھنچاؤ کے آثار تھے۔ جب تک وہ منہ سے کچھ نہ بولتا، اس کے ماتحتوں میں سے کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

"شکاگو پولیس ڈپارٹمنٹ نے ایک لاپتا شخص کے معاملے میں ہم سے مدد مانگی ہے۔" مینگ نے ان کو بتایا۔ اس نے اپنی میز پر پڑے ہوئے تین کاغذات پر نظر ڈالی اور کہا۔ "آسٹن میریویل، طبیعیات کا پروفیسر، عمر اڑسٹھ سال، بیوی مر چکی ہے۔ وہ ہوائی جہاز کے ذریعے تنہا سفر کر کے گزشتہ جمعرات کی دوپہر یہاں پہنچا تھا۔ اسی روز سہ پہر میں اس نے یونیورسٹی کے سیمینار میں شرکت کی۔ جمعے کا سارا دن اس نے یونیورسٹی کی لائبریری میں ان کتابوں کو دیکھنے میں گزارا جنہیں اس کا کالج خریدنا چاہ رہا تھا۔ اسی شام اس نے فون پر اپنے بیٹے سے بات کی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ کتابوں کے سودے کا بہت زیادہ خواہش مند ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب وہ یہاں نہیں ہے اور نہ ہی گھر واپس پہنچا۔ اس کا بیٹا اور کالج انتظامیہ اس کے لیے بہت پریشان ہیں کیونکہ وہ کئی بیماریوں بشمول لبلبے کے سرطان میں مبتلا ہے جس کے لیے اس کی کیموتھراپی بھی ہو رہی ہے۔"

"وہ اس شہر میں کہاں ٹھہرا ہوا تھا؟" اوبرن نے پوچھا۔

"یونیورسٹی کیمپس کی ایک عمارت میں واقع مہمانوں کے لیے مخصوص ریسٹ ہاؤس میں۔"

"اس کا سامان کہاں ہے؟"

"لگتا یہی ہے کہ اس نے مختصر سامان کے ساتھ سفر کیا کیونکہ اس کا قیام صرف دو راتوں کے لیے تھا لیکن اس کی ساری چیزیں بھی غائب ہیں۔"

"کیا اس کا امکان ہے کہ اسے مطلوبہ پرواز میں جگہ نہ ملی ہو اور اسے دوسری پرواز کے لیے رکنا پڑ گیا ہو؟" ڈولنگر نے پوچھا۔

"اختتام ہفتہ اس کا امکان ہوتا ہے لیکن فضائی کمپنی کا کہنا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، اگر اسے جہاز بدلنا ہوتا تو اپنی قیام گاہ پر واپس آجاتا۔ کسی شخص نے اسے ائرپورٹ یا دوسری جگہ لے جانے کا اعتراف نہیں کیا اور اس پورے ہفتے میں صرف ایک پروفیسر یونیورسٹی سے ٹیکسی میں سوار ہوا ہے جو یورپ جا رہا تھا۔"

"کیا میریویل کے پاس شکاگو کے لیے واپسی کا ٹکٹ تھا؟" اوبرن نے پوچھا۔

مینگ نے کاغذات چھانٹتے ہوئے کہا۔ "ریکارڈ سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا۔ اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال اس کے فون سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔"

"ایسی کوئی وجہ ہے کہ اس کے قتل کا شبہ کیا جائے؟"

"اب تک تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ وہ نہ تو کسی اسپتال میں ہے اور نہ ہی اس کی لاش کسی مردہ خانے میں رکھی ہوئی ہے۔ یہ کہانی یونیورسٹی سے شروع ہو کر بظاہر وہیں ختم ہو رہی ہے۔" مینگ نے اپنے کاغذات سمیٹے اور گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کیس کو ہینڈل کرو کیونکہ اوبرن تم ہوزے کو اچھی طرح جانتے ہو۔"

اوبرن نے ہوزے کے ساتھ ہی پولیس اکیڈمی سے گریجویشن کیا تھا جو کیمپس سیکیورٹی کا ڈائریکٹر تھا۔ اوبرن نے اس سلسلے میں کچھ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ ہوزے بھی اس کی طرح افریقی امریکن تھا۔ کیپٹن نے اسے شکاگو پولیس کی جانب سے موصول ہونے والی معلومات پر

مشتمل ایک کاغذ پکڑا دیا۔ اس کے ساتھ ہی آسٹن میریویل کی ایک تصویر، یونیورسٹی کے ان لوگوں کی فہرست جن سے رابطہ کیا جا سکتا ہے اور ٹیکسی کمپنیوں، اسپتالوں اور مردہ خانے سے ملنے والی معلومات کا ریکارڈ تھا۔

دفتر واپس آنے کے بعد ڈولنگر نے اسکین کر کے ان تمام کاغذات کو کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا جبکہ اوبرن نے پروفیسر کے بیٹے سے فون پر رابطہ کیا جو خود بھی ایک پروفیسر تھا۔ ڈیوڈ میریویل نے اپنے باپ کے بارے میں بتایا کہ وہ صاف ذہین، سنجیدہ، بااصول اور مکمل طور پر قابلِ یقین شخص ہے۔ اس نے جمعے کی شام فون کر کے بتایا کہ کام ختم ہو گیا ہے اور وہ ہفتے کی سہ پہر شکاگو پہنچ جائے گا۔ اس نے خریدی جانے والی کتابوں کا معائنہ کر لیا تھا۔ وہ اسے پسند بھی آئی تھیں لیکن وہ ان کی خریداری کے بارے میں پُرامید نہیں تھا۔

اس کے بیٹے کا خیال تھا کہ پروفیسر نے واپسی کا ٹکٹ بھی خریدا ہو گا لیکن اسے حقیقت معلوم نہیں تھی۔ اس نے مکمل طور پر اس امکان کو رد کر دیا کہ اس کا باپ طے شدہ پروگرام سے ہٹ کر کہیں جا سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ پہلے سے کئی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہے اور اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی ہو گی یا پھر وہ کسی ڈاکو یا ٹھگ کا نشانہ بن گیا ہو......

''کیا اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح غائب ہوا ہے؟''

''کبھی نہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سرطان کا علاج ہو رہا تھا۔ کیا اس کی ذہنی صحت کے بارے میں کسی مسئلے کا امکان ہے؟''

''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اس کی خودکشی کے بارے میں سوچوں تو میرا جواب نہیں میں ہو گا۔ یہ خارج از امکان ہے۔''

ڈولنگر نے ٹیلی فون پر فضائی کمپنی سے تصدیق کر لی کہ آسٹن میریویل نے شکاگو سے یک طرفہ ٹکٹ لیا تھا اور یہ حقیقت اس کے پروگرام سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

جب ڈولنگر اور اوبرن یونیورسٹی پہنچے تو وہاں کے ٹاور کلاک میں سوا دس بج رہے تھے۔ انہوں نے سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ کے باہر گاڑی کھڑی کی۔ ہوزے انہی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے شاندار اور صاف ستھرے دفتر میں ان کا استقبال کیا اور انہیں کافی پیش کی۔ باہر بیٹھے ہوئے افسروں کے برعکس اس نے وردی کے بجائے سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ انہیں ان لوگوں سے ملوانے پر رضامند ہو گیا جو لاپتا پروفیسر کے اس شہر میں قیام کے دوران کسی بھی طرح اس سے رابطے میں رہے تھے۔ ''سوائے پروفیسر گلیڈ جونز کے جو غالباً اس وقت جرمنی کے کسی شہر میں بیٹھا بچھڑے کے پارچوں اور پنیر سے لطف اندوز ہو رہا ہو گا۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

سب سے پہلے وہ لائبریری گئے جہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ولیم سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پروفیسر آسٹن میریویل سے اس کی پہلی ملاقات جمعے کی صبح اس کے دفتر میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ان کا رابطہ ای میل کے ذریعے ہوا تھا۔ اس کی آمد کا مقصد ان کتابوں کو جانچنا تھا جو اس کا ادارہ خریدنا چاہ رہا تھا۔

''یہ سب کتابیں ہمیں کئی سال پہلے میراث میں ملی تھیں۔'' ولیم نے کہا۔ ''یہ سب نایاب ہیں اور ان میں سے کچھ انتہائی قیمتی بھی ہیں۔ ان میں سے کئی ایک سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں۔ لیکن یہاں صرف الماری میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اور زیادہ تر جرمن یا روسی زبان میں ہیں۔''

''کیا ان کتابوں کو نقد قیمت پر فروخت کیا جا رہا تھا؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''ہاں یہ سچ ہے کہ ہمیں جگہ چاہیے لیکن اس سے بھی زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ پروفیسر کے غائب ہو جانے سے یہ سودا کھٹائی میں پڑ گیا۔''

''اس کا انحصار اس کی رپورٹ پر ہے۔''

''کیا اس نے اس رپورٹ کے بارے میں تمہیں کوئی اشارہ دیا تھا؟''

''نہیں، گو کہ متعلقہ کاغذات پر میرے دستخط ہوں گے لیکن ان کی لگائی ہوئی قیمت پر فروخت کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ میں نہیں بلکہ بورڈ آف ٹرسٹیز کرے گا۔''

''کوئی اور ممکنہ خریدار بھی میدان میں ہے؟''

''مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔''

''کیا میریویل نے یہاں تمہارے علاوہ کسی اور شخص سے بھی بات کی مثلاً لائبریری یا فیکلٹی کا کوئی فرد؟''

''نہیں۔ دراصل اس نے دن کا بیشتر حصہ سب سے الگ رہ کر نایاب کتابوں کے کمرے میں گزارا۔ البتہ اس نے کارل گلیڈ جونز کے ساتھ فیکلٹی کے ڈائننگ روم میں دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔''

’’یہ وہی پروفیسر ہے جو گزشتہ ہفتے یورپ کے لیے روانہ ہوا تھا؟‘‘

’’ہاں، وہ ریٹائر ہو چکا ہے لیکن اس کی اعزازی حیثیت قائم ہے ویسے بھی وہ اسّی سال سے زیادہ کا ہے۔‘‘

’’کیا یہ وہی شخص ہے جسے میریویل پہلے سے جانتا تھا؟‘‘

’’ہاں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ میری موجودگی میں وہ جرمن بولتے تھے جبکہ میں اس زبان سے ناواقف ہوں۔‘‘

اوبرن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ’’کیا تم یہ تصویر دیکھ کر شناخت کر سکتے ہو کہ یہی پروفیسر میریویل ہے جو گزشتہ جمعے یہاں آیا تھا؟‘‘

’’ہاں یہ وہی ہے۔‘‘ ولیم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن یہ تصویر پرانی ہے۔ مجھے دیکھنے میں وہ بہت بیمار لگ رہا تھا اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو اسے یرقان بھی ہو گیا ہے۔‘‘

ان کی اگلی منزل مناسب فاصلے پر تھی لیکن انہوں نے سیکیورٹی آفس واپس جا کر گاڑی میں سوار ہونے کے بجائے پیدل چلنے کو ترجیح دی گو کہ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

’’تم ہماری گفتگو کے دوران کچھ نہیں بولے۔‘‘ اوبرن نے ہوزے سے کہا۔

’’میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہاں ایک عرصہ گزارنے کے بعد سیکھا ہے کہ یہ پروفیسر اور منتظمین اپنی قابلیت کے حصار میں بند ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہر مسئلے کو اپنی ذہانت سے حل کر سکتے ہیں۔ اس لیے میں خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔‘‘

’’اب ہم اسٹیوارٹ ڈیلری سے ملنے جا رہے ہیں جو حساب اور فزیکل سائنس کا ڈین ہے جسے افواہوں کے مطابق ذہنی طور پر نابالغ کہا جاتا ہے اور کسی نہ کسی طرح پروفیسر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اب اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا جب تک کہ وہ کسی سنگین جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ انتظامیہ نے طالب علموں اور والدین کی شکایات کے پیشِ نظر اسے کلاس روم سے ہٹا کر ڈین بنا دیا لیکن اب بھی وہ ہمیشہ کی طرح بے وقوف ہے۔‘‘

وہ ایک بڑی عمارت میں داخل ہوئے۔ ڈین اپنے کسی ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ ہوزے نے مداخلت کرتے ہوئے ڈولنگر اور اوبرن کا تعارف کرایا اور ان کی آمد کا مدعا بیان کیا۔ ڈین نے انہیں بتایا کہ وہ اور پروفیسر میریویل کئی برس پہلے ایسٹ کوسٹ انسٹی ٹیوشن میں پوسٹ گریجویٹ فیلوشپ کر رہے تھے اور تب سے ہی وہ رابطے میں ہیں۔ اسی نے جمعرات کو اسے ائرپورٹ سے لیا اور سہ پہر میں اس کے سیمینار میں بٹھا رہا پھر وہ اسے کیمپس کے قریب ہی ایک ریستوران میں لے گیا۔ البتہ اس کے بعد اس نے پروفیسر کو نہیں دیکھا۔‘‘

’’تم نے کتنے عرصے بعد اسے دیکھا تھا؟‘‘ اوبرن نے پوچھا۔

’’کئی برس گزر گئے۔‘‘

’’اتنے عرصے بعد وہ تمہیں کیسا لگا؟‘‘

’’وہ مجھے بہت بُری حالت میں نظر آیا۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ دواؤں کی وجہ سے ہے۔‘‘

’’کیا اس نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی بات کی؟‘‘

’’نہیں، اس کی بیوی دس سال پہلے مر چکی ہے اور اس کا بیٹا بھی تیس سال سے زیادہ کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پوری زندگی پڑھانے میں ہی گزر رہی ہے۔‘‘

’’اس کا موڈ کیسا تھا؟‘‘

’’بیمار ہونے کے باوجود وہ بہت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ تمام وقت اسی کام میں لگا رہا جس کے لیے آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مزید انتظار نہیں کر سکتا اور چاہتا ہے کہ جلد از جلد ان کتابوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔‘‘

’’تم ان کتابوں سے محروم ہونے پر کیا محسوس کرتے ہو؟‘‘

’’میں تو یہی سمجھوں گا کہ اچھا ہوا ہمیں ان کتابوں سے نجات مل گئی۔ میں تو اخبار بھی نہیں پڑھتا اور شاید آنے والے دنوں میں لائبریریوں کا وجود بھی نہیں ہو گا۔ الیکٹرانک میڈیا کتابوں کو پیچھے دھکیل رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے ریکارڈز اور آڈیو ٹیپ کی جگہ سی ڈی اور ویڈیو کیسٹ کی جگہ ڈی وی ڈی نے لے لی ہے۔‘‘

جب وہ فزیکل سائنس کی عمارت سے روانہ ہوئے تو بارش رک چکی تھی لیکن ٹھنڈی اور تیز ہوا نے ماحول کو سرد بنا دیا تھا۔ اب وہ ڈیسمنڈ بش ہال کی طرف جا رہے تھے جہاں آسٹن میریویل نے قیام کیا تھا۔ یہ ایک پتھروں سے بنی ہوئی عمارت تھی جس میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ دیکھنے میں یہ ایک قدیم طرز کا ریسٹ ہاؤس لگتا تھا جسے تمام تر کوششوں کے باوجود جدید نہیں بنایا جا سکا۔

استقبالیہ پر ہوزے نے ان کا تعارف جنکی میڈوک سے کروایا جسے اس نے ہوم مدر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میریویل کو جو سوئٹ دیا تھا وہ لابی سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میڈوک نے انہیں یقین دلایا کہ یہ کمرے ابھی تک اسی حالت میں ہیں جس طرح وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا اور ابھی تک ان کی صفائی بھی نہیں کی گئی جب حکام نے ہفتے کی شام تحقیقات شروع کیں تو اسے چابی دروازے میں لگی ہوئی ملی اور اپارٹمنٹ خالی تھا۔

''یہ بات میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔'' وہ ان کے ساتھ اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرا مطلب ہے کہ اس نے جانے کی اطلاع نہیں دی اور نہ ہی کسی نے اسے جمعے کے روز جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ کوئی ہاسٹل نہیں پھر بھی استقبالیہ پر ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود ہوتا ہے۔''

اوبرن نے بڑی ہوشیاری سے اسے دروازے سے رخصت کر دیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر اس جگہ کو جائے واردات کی حیثیت دے دی گئی تو لوگوں کے آنے جانے سے ثبوت ضائع ہو سکتے ہیں۔ اپارٹمنٹ تاریک اور سرد تھا۔ اس کی سجاوٹ میں بھی کفایت شعاری سے کام لیا گیا تھا۔ تاہم اس میں تمام سہولتیں موجود تھیں۔ لیونگ روم، کچن بمع ڈائننگ ٹیبل بیڈ روم بمع باتھ اور ایک دوسرا بیڈ روم جسے اسٹڈی بنا دیا گیا تھا۔

''بستر کے نیچے کوئی لاش نہیں ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''یہاں تک کہ مٹی بھی دکھائی نہیں دے رہی۔''

تمام ٹوکریاں، الماریاں اور درازیں بالکل خالی اور صاف تھیں۔ یہاں تک کہ چیونگم کا ریپر یا بالوں کا گچھا بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پروفیسر بہت زیادہ صفائی پسند تھا یا اس کے جانے کے بعد کسی نے اس جگہ کو صاف کیا تھا۔

اوبرن اور ڈولنگر نے ہوزے کو اس کے دفتر چھوڑا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر لنچ کیا اور ایک بجے کے قریب دفتر واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ڈیسک کلرک مارتھا دروازے پر نمودار ہوئی اور بولی۔ ''لیفٹیننٹ اوبرن۔ کیپٹن نے تمہیں اپنے دفتر بلایا ہے۔''

کیپٹن مینگ نے اوبرن سے اب تک کی پیش رفت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اس کیس سے الگ ہو جاؤ۔ کتنی بری بات ہے کہ شکاگو پولیس نے اپنا ہوم ورک کرنے سے پہلے ہی یہ نام نہاد گمشدگی کا کیس ہماری گود میں ڈال دیا۔''

اس نے اوبرن کو ایک فہرست پکڑائی جس میں آسٹن موروویل کے کریڈٹ کارڈ سے ہونے والے حالیہ اخراجات کی تفصیل دی گئی تھی۔ کیمپس سے پُراسرار طور پر غائب ہونے کے بعد اس نے گرے ہاؤنڈ بس اسٹیشن سے فلاڈیلفیا کا یک طرفہ ٹکٹ خریدا تھا۔ اس رات وہ فلاڈیلفیا کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ وہاں اس نے رات کا کھانا اور دوسرے دن صبح میں ناشتا کیا پھر کرائے پر کار لی جس میں اس نے نیو بیڈفورڈ سے گیس ڈلوائی اور ہفتے کی دوپہر لنکیٹی

کٹ پہنچا۔ اس کے بعد اس کارڈ کا مزید استعمال نہیں کیا گیا۔

''تم دل برداشتہ نظر آ رہے ہو۔'' مینگ نے کہا۔

''اگر تمہیں اور ڈولنگر کو ڈونٹ شاپ سے فرصت ملے تو کام پر توجہ دو۔''

''ہمیں کیا معلوم کہ یہ کارڈ میریویل کا ہے؟''

''اس کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟''

''ٹھیک ہے مان لیا کہ یہ وہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ چیک آؤٹ یا کسی کو بتائے بغیر اپارٹمنٹ سے چلا گیا۔ دوسری بات یہ کہ وہ ایک بیمار شخص ہے لیکن ٹیکسی کے بغیر ہی سامان سمیت بس اسٹیشن تک پہنچ گیا اور نمبر تین یہ کہ اس نے اپنے بیٹے کو اطلاع دیے بغیر ایسٹ کوسٹ کا سفر کیا جو ہفتے کی سہ پہر اس کی شکاگو واپسی کی توقع کر رہا تھا۔''

''اب میں تمہیں چوتھی بات بتاتا ہوں۔'' مینگ نے کہا۔ ''وہ شخص ہماری حدود سے کوئی نشان چھوڑے بغیر چلا گیا ہے اور تمام اشاروں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کنیکٹی کٹ میں ہی کہیں موجود ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو شکاگو پولیس کو ایک رپورٹ دے کر ڈونٹ شاپ کا رخ کرتا۔''

اوبرن سمجھ نہیں سکا کہ مینگ سنجیدہ ہے یا اس نے طنز کیا ہے کیونکہ اس نے کیس ختم کرنے کے واضح احکامات نہیں دیے تھے۔ اس لیے اوبرن نے اپنا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور وہ ڈولنگر کے ساتھ دستیاب معلومات کو ترتیب دینے لگا۔ اوبرن کو یقین تھا کہ کسی نے میریویل اور اس کے سامان کو یونیورسٹی یا اس کے قرب و جوار میں ٹھکانے لگا دیا ہے اور اس کا کریڈٹ کارڈ استعمال کر کے مشرق کی طرف چلا گیا ہے۔ اس کارڈ کو آخری بار استعمال ہوئے اتنا وقت گزر چکا ہے کہ ان کی فہرست میں شامل کوئی بھی شخص اس سے پہلے کنیکٹی کٹ سے واپس آ سکتا ہے جب میریویل کے بیٹے نے ہفتے کی سہ پہر شکاگو پولیس سے رابطہ کیا تھا۔ ''سوائے گلیڈ جونز کے۔ وہ منظر سے باہر دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس وقت وہ جرمنی میں تھا جب میریویل کے کریڈٹ کارڈ سے گیس ڈلوائی گئی تھی۔'' اوبرن نے کہا۔

''اگر وہ واقعی گیس تھی۔'' ڈولنگر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ایک گیس اسٹیشن پر نو ڈالر اور چند سینٹ میں دو سینڈوچز، ایک سوڈے کا کین اور شاید روڈ میپ ہی مل سکے۔'' ڈولنگر کے خیال میں میریویل خود کسی وجہ سے مشرق کی جانب گیا ہوگا جو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون سا نظریہ صحیح تھا۔ چاہے وہ میریویل ہو، اس کو بھگا لے جانے والا یا پھر قاتل۔ ان میں سے کسی ایک نے دوسرے علاقے میں جا کر زندگی کی بازی ہار دی۔ اوبرن نے شکاگو پولیس ڈپارٹمنٹ کے نام پیغام ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں ڈولنگر نے اس کار کے میک، ماڈل، سال اور رجسٹریشن نمبر کا پتا چلا لیا جو فلاڈیلفیا میں میریویل کے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے کرائے پر لی گئی تھی۔

''اگر وہ کل سہ پہر تک نہیں آیا۔'' اوبرن نے کہا۔ ''تو ہمیں اس بات کی تصدیق کرنا ہوگی کہ ہماری فہرست میں شامل افراد جمعے اور ہفتے کو کہاں تھے؟''

اگلے روز دوپہر سے پہلے ان لوگوں کے پس منظر کے بارے میں پہلی رپورٹ موصول ہو گئی۔ ان میں سے کوئی بھی نادہندہ نہیں تھا۔ نہ ہی کسی کے وارنٹ جاری ہوئے تھے اور نہ ہی کوئی مجرمانہ ریکارڈ تھا۔ ڈاکٹر ولیم نیوزی لینڈ اور گلیڈ جونز، جرمنی کا رہنا والا تھا۔ ان دونوں نے امریکی شہریت اختیار کر لی تھی۔ ان چاروں کی کریڈٹ ریٹنگ، تعلیم اور ملازمت کا ریکارڈ غیر اہم اور بور کر دینے والا تھا اور اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

فوری دلچسپی کی بات صرف یہ تھی کہ جیکی سیڈوک اور گلیڈ جونز کا رہائشی پتا ایک ہی تھا جو دراصل ڈیسمنڈ بش ہال کا پتا تھا۔ اوبرن نے وقت ضائع کیے بغیر ہوز ے کو فون کیا۔

''مجھے گلیڈ جونز کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''وہ انتہائی ضعیف، سانپ کی طرح زہریلا اور پانی کے مانند شراب پینے والا شخص ہے۔''

''لگتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔''

''اسے ریٹائر ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ یہ میرے یہاں آنے سے پہلے کی بات ہے لیکن لیبارٹریوں کے چکر لگاتا، پروفیسروں کو ہراساں، طلب علموں کو تنگ اور اس جگہ مدد کرتا ہے جہاں ضرورت نہیں ہوتی۔ سال میں دو مرتبہ ایسا ہوا جب اس نے نشے کی حالت میں وسط شہر کے ایک بار میں فرش پر پیشاب کر دیا اور سیکیورٹی کا عملہ اسے گھر چھوڑ کر گیا۔''

''وہ بھی ڈیسمنڈ بش ہال میں ہی رہتا ہے؟''

''ہاں، کل ہم جس اپارٹمنٹ میں گئے تھے۔ اس

کے برابر والا اسی کا ہے۔‘‘

’’کیا اس کی فیملی بھی ساتھ رہتی ہے؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ اس کی فیملی یورپ میں ہے۔‘‘

’’شکریہ ہوزے۔ میں تم سے جلدی ہی ملنے آؤں گا۔‘‘

ڈولنگر کو پولیس اکیڈمی میں تربیت کے دوران ٹرانسپورٹ سے وابستہ لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا اور وہ بس، ٹرک، ٹیکسی چلانے والے کئی ڈرائیوروں سے واقف تھا۔ اس نے ٹیلی فون پر طویل گفتگو ختم کرنے کے بعد اوبرن سے کہا۔ ’’میں نے ابھی اس ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی ہے کہ پروفیسر کے پاس صرف ایک سفری بیگ تھا۔ گوکہ اسے بتایا گیا تھا کہ پروفیسر کو ائرپورٹ جانا ہے لیکن راستے میں اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے کہا کہ اسے ائرپورٹ کے بجائے گرے ہاؤنڈ بس اسٹیشن پر اتار دیا جائے۔‘‘

فضائی کمپنی سے رابطہ کرنے پر اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ پروفیسر نے جرمنی جانے کے لیے اپنا ٹکٹ استعمال نہیں کیا۔ ویب پر تلاش کیا لیکن پروفیسر کا سیل نمبر نہیں ملا۔ اوبرن کا خیال تھا کہ ہوزے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا اسے زحمت دینے کے بجائے اس نے شعبے کے سربراہ اسٹیورٹ ڈیلری سے رابطہ کیا، اس نے بتایا کہ اونچا سننے کی وجہ سے پروفیسر اپنے پاس سیل فون نہیں رکھتا۔

’’گویا اب ہمیں دو لاپتا پروفیسرز کو تلاش کرنا ہے۔‘‘ ڈولنگر نے کہا۔ ’’ان دونوں نے گزشتہ جمعرات کی ملاقات کے بعد اپنا پروگرام تبدیل کیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ دونوں ایک ہی بس سے جمعے کو فلاڈیلفیا گئے ہوں گے؟‘‘

’’دونوں کیوں؟ ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ گلیڈ جونز کب اور کیسے یونیورسٹی کیمپس سے گیا لیکن ہمارے پاس میریویل کے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ گلیڈ جونز نے ہی اسے مار دیا ہو؟‘‘

’’اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟‘‘

’’ہوزے کے مطابق ان دونوں کا پرانا ساتھ تھا لیکن گلیڈ جونز تھوڑا سا خبطی تھا اور اسے پینے کی بھی عادت تھی......‘‘

’’جبکہ وہ اسی سال سے زیادہ کا ہو چکا تھا۔‘‘

’’لیکن میریویل بھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی اور اسی کشمکش میں وہ جان

عنوان

ننھی نے پوچھا: ’’ممی! کیا ساری کہانیاں اسی طرح شروع ہوتی ہیں کہ...... ایک دفعہ کا ذکر ہے؟‘‘

ماں: ’’نہیں میری جان۔ کچھ کہانیاں اس طرح بھی شروع ہوتی ہیں کہ...... ’’آج آفس میں کام اتنا زیادہ تھا کہ......‘‘

کراچی سے دائمہ کنول کا تعاون

سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ گلیڈ جونز پہلے ہی شہر سے باہر جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے میریویل کا بٹوا اور سفری بیگ اٹھایا اور فون کر کے ٹیکسی بلالی۔ اس نے کرایہ دینے کے لیے اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں مقامی ٹیکسی ڈرائیور اسے پہچان نہ لے۔‘‘

’’پھر وہ اپنے پروگرام کے مطابق جرمنی جانے والے جہاز میں سوار کیوں نہیں ہوا؟‘‘

’’تاکہ اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔ سب لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ یورپ جا رہا ہے۔ اگر میریویل کی لاش فوراً ہی مل جاتی تو اسے یورپ کے کسی بھی ائرپورٹ پر اترتے ہی تفتیش کے لیے حراست میں لے لیا جاتا۔‘‘

’’سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میریویل کی لاش کہاں ہے؟‘‘

دوپہر کے کھانے کے بعد اوبرن نے ایک بار پھر ہوزے سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ڈیسمنڈ بش ہال کے باہر کھڑا ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مسز سیڈوک کو بھی ان کے مشن کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ’’میں یہ چابی تمہیں واپس کر رہی ہوں۔‘‘ اس نے ہوزے سے کہا۔ ’’سیکیورٹی چیف کی حیثیت سے تم جو قدم بھی اٹھاؤ، وہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘

’’تمہارا مسئلہ یہ ہے مسز جیکی۔‘‘ ہوزے نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ’’کہ تم معمول کی نگرانی اور تلاشی یا گرفتاری میں کوئی فرق محسوس نہیں کر رہی ہو۔ پروفیسر شہر سے باہر گیا ہوا ہے اور ہم یہ دیکھنے آئے ہیں کہ اس کا کوارٹر محفوظ ہے یا نہیں۔‘‘

میریویل کے اپارٹمنٹ کے برعکس یہاں اس نے دو راتیں گزاری تھیں۔ گلیڈ جونز کا گھر مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں یادگاری اشیا، کتابیں، فریم شدہ تصویریں، مجسمے اور نوادرات شامل تھے۔ یہ چیزیں دیواروں،

الماریوں اور فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ آتش دان پر رکھی ہوئی تصویروں میں پروفیسر مختلف معروف شخصیات کے ساتھ یا اپنے طویل کیریئر کے دوران اعزازات وصول کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔

پورے اپارٹمنٹ کی تلاشی کے دوران میں انہیں وہاں کوئی لاش نظر نہیں آئی۔ بیڈ روم کے فرش پر دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے جن پر گلیڈ جونز کے نام کی چٹ لگی ہوئی تھی لیکن بیڈ پر پڑا ہوا کوٹ اور ہیٹ میریویل کا تھا۔

ڈولنگر نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا وہاں اسے بڑھی ہوئی گھاس نظر آئی۔ ''ایسا لگتا ہے کہ کبھی اس کی کٹائی نہیں ہوئی۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ صرف کھڑکی پر چڑھ کر ہی باہر جایا جاسکتا ہے۔''

''تہ خانے سے بھی ایک دروازہ اس طرف جاتا ہے۔'' ہوزے نے کہا۔

ڈولنگر نے ناشتے کی میز پر چڑھ کر کھڑکی کا پٹ اوپر اٹھایا اور باہر جھانکنے لگا۔ اس جگہ کا مختصر معائنہ کرنے کے بعد وہ نیچے اتر آیا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے پروفیسر میریویل کو تلاش کرلیا ہے۔''

اس کے بعد ہوزے کھڑکی پر چڑھا اور باہر جھانکنے کے بعد بولا۔ ''تم نے پروفیسر گلیڈ جونز کو تلاش کیا ہے اور اس کی لاش اسی جگہ پر ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔ اسے کسی نے برابر والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے دھکا دیا ہے جہاں میریویل ٹھہرا ہوا تھا۔''

یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کسی پی ایچ ڈی کی ضرورت نہیں تھی کہ اگر کارل گلیڈ جونز کی لاش سیڑھیوں کے نیچے پڑی ہوئی تھی تو مشرق کا سفر کرنے کے لیے میریویل کا کریڈٹ کارڈ استعمال کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ خود میریویل ہی تھا۔ ہوزے کے پاس تہ خانے کی چابیاں تھیں جہاں سے ان سیڑھیوں کو راستہ جاتا تھا۔ پروفیسر کی لاش چار روز پرانی ہوگئی تھی۔ جب ڈولنگر نے اس کی اطلاع کورونر آفس کو دی اور اس سے درخواست کی کہ ایک ٹیکنیشن کو بھیجا جائے جو جائے وقوعہ سے شواہد اکٹھا کرسکے۔ اس دوران اوبرن نے ایک مرتبہ گلیڈ جونز کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی۔

بیڈ روم میں رکھے ہوئے سوٹ کیسوں میں اس کے کپڑے اور ذاتی اشیا تھیں جو اس نے جرمنی کے سفر پر جانے کے لیے رکھی تھیں جبکہ کوٹ کی جیبوں میں چابیاں، دواؤں کی شیشیاں، ایک ڈائری اور ایسی ہی چند دوسری چیزیں تھیں جنہیں ایسٹ کوسٹ کی جانب جانے والا کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ ان چیزوں کی موجودگی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کیمپس چھوڑتے وقت میریویل نے اپنے ماضی سے قطعی طور پر تعلق ختم کرلیا تھا۔

اوبرن اس کی ڈائری پڑھنے میں مصروف تھا جب کورونر آفس سے ٹک اسٹیمی وہاں آیا۔ اس نے لاش دیکھنے کے بعد پہلا سوال کیا۔ ''تم لوگوں نے لاش کو اچھی طرح دیکھا تھا؟''

''نہیں البتہ ہوزے نے لاش دیکھی تھی۔ میں نے صرف ایک سرسری نگاہ ڈالی اور واپس یہاں آگیا۔ کیا تمہیں کوئی خاص بات نظر آئی؟''

''نہیں، اس نے بالکل نئے جوتے پہن رکھے ہیں اور اس کی جیبوں میں کوئی بٹوا یا چابی نہیں ہے۔''

''غالباً بٹوا میریویل ہی لے گیا ہوگا۔ ہماری نظر میں وہ مشتبہ افراد کی فہرست میں پہلے نمبر پر ہے۔ تمہارے خیال میں موت کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟''

''سر پر گہرے زخم کے علاوہ اس کے جسم پر کوئی اور نشان نہیں ہے جو پندرہ فٹ نیچے کنکریٹ کی سیڑھیوں پر گرنے کی وجہ سے آیا ہوگا۔ اگر وہاں خون گرا ہوگا تو غالباً بارش نے اسے صاف کردیا ہوگا۔''

شواہد اکٹھے کرنے والا ٹیکنیشن سارجنٹ کیرل ایک اپارٹمنٹ سے دوسرے اپارٹمنٹ میں چکر لگا رہا تھا جبکہ تحقیقاتی ٹیم کے دوسرے ارکان ادھر ادھر پھر کر غیر متعلقہ اشیا اکٹھا کررہے تھے۔ ڈیوڈ کیرل نے میریویل کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کی دہلیز پر لگے نشانات سے اندازہ لگا لیا کہ زندہ یا مردہ گلیڈ جونز کو اسی کھڑکی سے دھکا دیا گیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے اوبرن نے کیرل کو مطلع کرنا ضروری سمجھا کہ وہ میریویل کے کوٹ کی جیب سے برآمد ہونے والی کچھ چیزیں اپنے ساتھ لے جارہا ہے۔ وہ دونوں تین بجے کے قریب اپنے دفتر پہنچے جب ڈولنگر کیپٹن میننگ سے ملنے گیا تو اوبرن نے انٹرنیٹ سے کارل گلیڈ جونز کے پس منظر کے بارے میں کوائف اکٹھا کرنا شروع کردیے وہ ایک مفرور نازی جرمن تھا اور انیس سو چوالیس میں ہالینڈ اور انگلینڈ کے راستے امریکا پہنچا۔ انیس سو پچاس میں اس نے میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں پڑھانا شروع کیا۔ انیس سو ساٹھ میں وہ اٹامک انرجی کمیشن میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگیا۔ یہ واضح نہیں تھا کہ اس نے اپنے

کیریئر کے آخری بیس سال ایک چھوٹے درجے کی یونیورسٹی میں کیوں گزارے۔

یہ فرض کر لینے کے باوجود کہ میریویل کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے اس کا گرنا ایک حادثہ نہیں تھا۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ میریویل کو اس سے کیا دشمنی تھی۔ میریویل خود بھی شکاگو آنے سے پہلے میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں پڑھا چکا تھا لیکن اس سے کئی سال پہلے گلیڈ جونز وہاں سے جا چکا تھا۔

اوبرن نے میریویل کے بیٹے کو دوبارہ فون کیا۔ ڈیوڈ کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ اس کے باپ کو ایسٹ کوسٹ جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے لیکن اسے وہاں..... ملنے والی لاش کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور اوبرن نے بھی اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ڈیوڈ کا کہنا تھا کہ وہ کبھی کارل گلیڈ جونز سے نہیں ملا لیکن وہ اپنے باپ کے سابق ساتھی ہونے کی وجہ سے اس کے نام سے واقف ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میریویل کے یونیورسٹی آنے پر ان دونوں کے ملنے کا پروگرام ہے۔

اوبرن نے ان چیزوں کے بارے میں غور کرنا شروع کیا جو میریویل کی جیب سے برآمد ہوئی تھیں اور اس کی میز پر ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کی چین میں چار چابیاں جو اس کی کار، گھر، دفتر اور میز کی ہو سکتی تھیں، چھوٹی ٹارچ اور جیبی چاقو، چار دوائی کی شیشیاں اور ایک نوٹ بک شامل تھی۔ اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ میریویل نے فلاڈیلفیا میں کار کرایہ پر حاصل کرنے کے لیے اپنا کریڈٹ کارڈ حاصل کیا تھا اس کے لیے اسے اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھانا پڑا ہوگا۔ اس کی پروفیسر گلیڈ جونز کے ساتھ اتنی ہی مشابہت تھی جتنی لارل اور ہارڈی میں کیونکہ پروفیسر کا بٹوا غائب تھا۔ اس لیے گمان غالب تھا کہ اس کا کریڈٹ کارڈ بھی میریویل کے پاس ہی ہوگا۔

میننگ سے اجازت لینے کے بعد اوبرن نے فوری طور پر کارل گلیڈ جونز کے کسی بھی کریڈٹ کارڈ پر ہونے والی حالیہ سرگرمی کو چیک کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ اس کے بعد وہ ڈولنگر کا دماغ کھانے کے لیے بیٹھ گیا جو چھ سال کی عمر میں اپنے خاندان کے ہمراہ مغربی جرمنی سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ جب دیوارِ برلن موجود تھی اور اس نے جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ میریویل اور گلیڈ جونز کے تعلق کو سمجھنے کے لیے انہوں نے مختلف ویب سائٹس کا سہارا لیا۔ اوبرن نے اپنی توجہ میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی پر مرکوز رکھی اور ڈولنگر، میریویل کے ماضی سے متعلق غیر اہم باتیں تلاش کرنے لگا۔ وہ یہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ میریویل بھی دو سال کی عمر میں ہنگری سے امریکا آیا تھا تب اس کا نام اسٹیون مارووِیز تھا۔

اس کے بعد مزید گفتگو ہوئی اور بہت سی باتیں سامنے آئیں جس کے بعد انہوں نے نیشنل آرکائیو اینڈ ریکارڈ ایڈمنسٹریشن کے ڈیبورا گیئرز سے ٹیلی فون پر بات کی تو اس نے کہا۔ ”میرے اسٹاف کے لوگ اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ مسٹر میریویل کئی سالوں سے اپنے باپ جانوز مارووِیز کا مواد حاصل کرنے کے لیے ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“

”یہ کس قسم کی معلومات ہیں؟“ ڈولنگر نے پوچھا۔

”یہ زیادہ تر ایف بی آئی کے ریکارڈ پر مشتمل ہیں۔ اگر یہ واقعی اس کے لیے اہم ہوتیں تو میں ایک ہزار صفحات کی یہ دستاویزات اسے ای میل سے بھیج دیتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ بہرحال میں پوری فائل تمہیں بھیج رہا ہوں۔ براہِ کرم اسے اسمارٹ فون پر ڈاؤن لوڈ مت کرنا۔“

ابھی ڈولنگر اپنے انتظامات کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اوبرن نے دروازہ کھولا تو وہاں کیپٹن میننگ کھڑا تھا۔ اس نے مروجہ طریقۂ کار کے برعکس ذاتی طور پر آنے کا فیصلہ کیا۔ اسے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان کے مطابق کسی نے دو جگہ گیس اسٹیشن پر گلیڈ جونز کا کریڈٹ کارڈ استعمال کیا تھا۔ اسی شام غالباً وہی شخص ڈیڈھم میساچوسٹس کے ایک موٹیل پہنچا۔ راستے میں یہ کریڈٹ کارڈ ایک استعمال شدہ ریوالور اور گولیاں خریدنے کے لیے استعمال ہوا۔

موٹیل والوں نے فون پر تصدیق کر دی کہ کارل گلیڈ جونز اگلے روز صبح گیارہ بج کر چالیس منٹ پر موٹیل سے چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اوبرن اس علاقے کا روڈ میپ اپنے کمپیوٹر پر کھولتا، وہ تینوں سمجھ گئے تھے کہ آسٹن میریویل میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ ٹیکنالوجی جا رہا تھا۔ اوبرن نے فوراً ہی کیمبرج میں پولیس کو فون کر کے ان کی حدود میں ایک مشتبہ قاتل کی موجودگی کی اطلاع دی۔ اس نے انہیں اس کیس سے متعلق تمام معلومات فراہم کر دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ مسلح، غیر ذمے دار اور تند خو ہے۔ ڈولنگر

نے میریویل کی پوری فائل بمع اس کی تصویر ای میل کے ذریعے بھیج دی۔

اوبرن نے کورونر آفس فون کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں پوچھا۔ تو اسٹنٹ نے بتایا کہ گلیڈ جونز کی باقیات کے مکمل معائنے سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے جسم میں گولی کا کوئی زخم نہیں ہے اور نہ ہی اس پر تشدد کیا گیا ہے۔ البتہ کھوپڑی میں ایک زخم دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے جسم کے زہریلے مادوں کا مطالعہ ہو رہا ہے لیکن پوسٹ مارٹم اگلے روز صبح تک ممکن ہے۔

اسی دوران میں بیورو آف آرکائیوز سے مواد آنا شروع ہوگیا۔ اوبرن اور ڈولنگر ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتے رہے جن میں تحقیقاتی رپورٹیں اور انٹرویوز کے مسودے شامل تھے۔ ان سب کا تعلق جانوز مارووِیز سے تھا جو ہنگری سے ہجرت کر کے آیا اور میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں اسسٹنٹ پروفیسر آف فزکس کے طور پر پڑھاتا رہا۔ اس پر روسی جاسوس ہونے کا الزام تھا۔ اسی انسٹی ٹیوٹ میں کارگلیڈ جونز بھی ملازمت کر رہا تھا۔ بہت جلد اس نے ادارے میں کلیدی اہمیت اختیار کرلی۔ اسے جب جانوز مارووِیز کے بارے میں علم ہوا تو اس نے بھرپور خوداعتمادی اور سنگدلانہ عزم کے ساتھ اس کی ساکھ تباہ کردی اور مشرقی یورپ سے آئے ہوئے دوسرے لوگ بھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ وہ یہ تو ثابت نہیں کر سکا کہ یہ لوگ کمیونسٹوں کے لیے جاسوسی کررہے تھے ایسی صورت میں انہیں جیل یا ملک بدری کا سامنا کرنا پڑتا لیکن وہ انہیں سیکیورٹی رسک قرار دینے میں کامیاب ہوگیا جس کا مطلب تھا کہ وہ کسی سرکاری، نجی کمپنی یا تعلیمی ادارے میں ملازمت نہیں کرسکتے تھے لیکن گلیڈ جونز نے تنہا یہ کام انجام نہیں دیا بلکہ اس کی گواہی دینے والوں میں ہینز اوٹو بینڈلر بھی پیش پیش تھا ویب ریسرچ سے معلوم ہوا کہ بینڈلر میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں ڈائریکٹر ایمریٹس آف ریسرچ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

اس نام کو دیکھتے ہی اوبرن کو ایک جھٹکا لگا۔ اسے یاد آگیا کہ میریویل نے بینڈلر کا پتا اور فون نمبر اپنی نوٹ بک میں لکھا تھا۔ اس نے فوراً اس نوٹ بک پر نظر دوڑائی اور اسے ڈولنگر کو دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اس میں کوئی قابلِ غور بات ہے اور گلیڈ جونز کا نام بھی چیک کرو۔''

میریویل نے اے سے زیڈ تک تمام نام سیاہی سے لکھے تھے لیکن فون نمبر اور پتا پنسل سے لکھا گیا تھا تاکہ بوقت ضرورت انہیں تبدیل کیا جاسکے البتہ گلیڈ جونز اور بینڈلر کے نام اندراجات سیاہی سے لکھے ہوئے تھے جیسے اسے یقین ہو کہ ان میں آئندہ کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اوبرن نے ٹیلی فون اٹھاتے ہوئے ڈولنگر سے کہا۔ ''مجھے بینڈلر کا نمبر بتاؤ۔''

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم کون بول رہے ہو؟'' دوسری طرف سے ایک زنانہ آواز سنائی دی۔

اوبرن نے اپنی شناخت کروائی اور پلٹ کر وہی سوال اس سے کردیا۔ ''میں اس کی بیٹی ربیکا بول رہی ہوں، ڈیڈی سو رہے ہیں اور میں انہیں نہیں جگا سکتی کیونکہ رات کو وہ ٹھیک طرح سو نہیں سکے۔ میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

''کیا تم جانتی ہو کہ تمہارا باپ میریویل یا مارووز نامی شخص سے رابطے میں ہے؟''

''یہ نام میرے لیے اجنبی ہے کیونکہ میں یہاں نہیں رہتی۔ میں روزانہ اپنے کام سے فارغ ہو کر کچھ دیر کے لیے صفائی کرنے اور کھانا بنانے کے لیے یہاں آتی ہوں۔''

''کیا تمہارے ڈیڈی......؟''

''انہیں بھولنے کی بیماری نہیں ہے لیکن ان کی توجہ بٹ جاتی ہے۔ وہ گھر سے باہر نہیں جاتے اور نہ ہی کسی سے ملتے ہیں۔ البتہ آج ایک رپورٹر سے ان کی ملاقات کا وقت طے ہے۔''

''کیا تم اس رپورٹر کا نام جانتی ہو؟''

''تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس بات کا امکان ہے کہ میریویل نامی ایک شخص تمہارے باپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ اس مقصد کے لیے وہ رپورٹر کا روپ دھار سکتا ہے۔''

''کیسا نقصان؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''ٹیلی فون پر اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''میں تمہاری مقامی پولیس سے رابطہ کر رہا ہوں تاکہ وہ کسی کو تمہارے گھر بھیج دیں۔'' اس نے میریویل کی نوٹ بک میں لکھے ہوئے پتے کی تصدیق کرنے کے بعد کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ پولیس کے آنے تک تم اپنے باپ کے پاس ٹھہرو اور کسی کو اندر نہ آنے دو۔ کیا تم ایسا کرسکتی ہو؟''

''ہاں۔'' ربیکا نے اثبات میں جواب دیا لیکن میری

خواہش......“

اوبرن نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا اور کیمبرج میں پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملانے لگا۔ اب ان کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ انتظار کتنا طول پکڑ سکتا ہے چنانچہ انہوں نے کھانے کے لیے فرائڈ چکن منگوالیا۔ آٹھ بجے کیمبرج سے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے فون کر کے بتایا کہ اسٹن میریویل کو بینز بینڈلر کے گھر کے باہر پوچھ گچھ کے لیے روک لیا گیا ہے۔ مزید برآں آتشیں اسلحہ رکھنے کے جرم میں اس کی گرفتاری بھی عمل میں آئی ہے۔ پروفیسر بینڈلر محفوظ ہے اور بے خبر پڑا گہری نیند سو رہا ہے۔

میریویل کو خرابیِ صحت کی بنا پر میونسپل جیل کے شفاخانے میں رکھا گیا تھا۔ اوبرن نے اس کی تلاش میں ہونے والی تازہ ترین پیش رفت سے شکاگو پولیس کو آگاہ کر دیا تاکہ وہ اس کے بیٹے کو بھی اس بارے میں مطلع کر دیں۔

اگلے روز ایک بجے کے قریب اوبرن اور ڈولنگر لوگن انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اترے۔ پرواز بیس منٹ تاخیر سے پہنچی تھی لیکن پٹرول آفیسر کیون کارل جیل لے جانے کے لیے ان کا انتظار کر رہا تھا تاکہ وہ میریویل کا بیان ریکارڈ کر سکیں۔

میریویل نے ان سے مل کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ ہمیں اطمینان سے بات کرنی چاہیے۔ میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔“

اس نے سنجیدگی سے ڈولنگر کو ایک تین ٹانگوں والا اسٹینڈ کھولنے اور اس پر کیمرا نصب کرتے دیکھا جو تصویر اور آواز دونوں ریکارڈ کر سکتا تھا۔ جب اوبرن نے اس کے حقوق پڑھ کر سنائے تو اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”مجھے کسی وکیل کی نہیں بلکہ تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والے کی ضرورت ہے۔ مجھے لبلبے کا سرطان ہے اور میری کیموتھراپی ہو رہی ہے لیکن میں مزید بیمار ہوتا جا رہا ہوں۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ زیادہ سے زیادہ چھ سے بارہ ہفتوں تک زندہ رہ سکوں گا۔ کیا تمہارا ٹیپ چل رہا ہے؟“

اوبرن نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کسی تجربہ کار استاد کی طرح بولنا شروع کیا۔ ”میں ہنگری میں پیدا ہوا لیکن یہیں کیمبرج میں پلا بڑھا۔ میرے والد کو میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں ملازمت مل گئی اور پھر وہ یہیں رک گئے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہمیں

روم میٹ

کالج جانے کے بعد لڑکے نے اپنی ماں کو لکھا کہ وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے اور کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک روم میٹ کو رکھ لیا ہے جو لڑکی ہے اور اس سے کوئی قریبی تعلق نہیں ہے، صرف روم میٹ ہے۔

کچھ عرصے بعد لڑکے کی ماں پہلی بار اپنے بیٹے کے پاس آئی اور لڑکی کو دیکھنے اور رہنے کے طور طریقے دیکھنے کے بعد اندازہ لگایا کہ یہ دونوں صرف روم میٹ ہی نہیں ہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔

لڑکے نے اندازہ لگایا کہ اس کی ماں کو کچھ شک ہے اس پر۔ اس نے اپنی ماں کو کہا۔ ”آپ جو سمجھ رہی ہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے ہم دونوں صرف روم میٹ ہیں۔ ہم دونوں کے الگ الگ کمرے ہیں۔“

ایک ہفتے کے بعد اس کی روم میٹ لڑکی نے آکر کہا۔ ”تمہاری ماں ایک ہفتے پہلے کھانے پر آئی تھیں۔ تو میں نے اپنے چاندی کے برتن استعمال کیے تھے ان کو متاثر کرنے کے لیے۔ لیکن ان کے جانے کے بعد میری چاندی کی ایک پلیٹ غائب ہے۔ کیا تمہارے خیال میں ایسا تو نہیں کہ تمہاری ماں غلطی سے اپنے ساتھ لے گئی ہوں؟“

لڑکے نے کہا۔ ”میں ایسا نہیں سمجھتا مگر میں ای میل کر کے ماں سے پوچھتا ہوں۔“

اس نے ای میل میں لکھا۔ ”کہیں آپ غلطی سے میری روم میٹ کی چاندی کی پلیٹ تو نہیں لے گئیں جب سے آپ گئی ہیں پلیٹ غائب ہے۔ آپ کا بیٹا۔“

اس کے جواب میں ماں نے لکھا۔

”میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم اور تمہاری روم میٹ ایک ساتھ نہیں سوتے ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر تمہاری روم میٹ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر سوتی ہے تو اب تک اسے چاندی کی پلیٹ اس کے بستر کے تکیے کے نیچے مل چکی ہوتی۔“

امریکا سے جاوید کاظمی کی تجزیہ نگاری

اچھی خوراک، عمدہ کپڑے اور ڈھیروں کھلونے ملا کرتے تھے۔ ہم ایک شاندار اپارٹمنٹ میں رہا کرتے تھے جہاں ہمیشہ تعلیم یافتہ اور معزز مہمان آتے رہتے تھے پھر اچانک ہی ہم نیو جرسی میں واقع ایک ڈرگ اسٹور کے اوپر دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہوگئے۔ اب ہمارے یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ میری ماں کسی جگہ کھانا پکانے جاتی تھی اور باپ سارا دن گھر میں پڑا شراب سگریٹ پیتا اور مجھ پر چلاتا رہتا تھا کہ میں رونا بند کردوں لیکن میں اس لیے روتا تھا کہ مجھے بھوک لگتی تھی اور میرے پاس اچھے کپڑے نہیں تھے۔

''جنگ عظیم دوم کے دوران نازی جرمنی ساری دنیا بالخصوص یورپ کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا لیکن پچاس کی دہائی میں روسی ایک بڑا خطرہ بن گئے اور جرمنوں کے علاوہ مشرقی یورپ سے تعلق رکھنے والے ہر شخص پر ان کا جاسوس ہونے کا شبہ کیا جانے لگا۔ میرے باپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ اور میری ماں اس الزام سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکے اور جوانی میں ہی مفلسی کی حالت میں مرگئے۔ انہیں اس حال کو پہنچانے والے گلیڈ جونز اور بینڈلر تھے۔ مجھے بہت پہلے سے ان پر شبہ تھا کہ انہی دونوں نے میرے باپ پر روسی جاسوس ہونے کی مخبری کی ہے جس کے نتیجے میں اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے اور اس کا کیریئر تباہ ہوگیا۔ وہ ساری عمر کے لیے بلیک لسٹ ہو گیا۔ اسے کسی سرکاری یا نجی ادارے میں ملازمت نہیں مل سکتی تھی جب مجھے اس بارے میں واضح ثبوت مل گئے تو میں نے قسم کھائی کہ ان دونوں کو جان سے مار دوں گا۔ میں اس نقصان کا ازالہ تو نہیں کرسکتا تھا جو ان دونوں کی وجہ سے مجھے اور میرے خاندان کو اٹھانا پڑا لیکن انہیں ضرور تباہ و برباد کرسکتا تھا۔ مجھے کسی بہانے گلیڈ جونز کی یونیورسٹی جانے کے لیے کئی مہینے انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر وہ موقع مل ہی گیا اور میں نے اپنے ادارے کے لیے نایاب کتابوں کی خریداری کے لیے وہاں جانے کا پروگرام بنالیا۔

''اس نے مجھے بارہ تیرہ سال کا دیکھا تھا اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اسے اپنے باپ کے زوال کا ذمے دار سمجھتا ہوں۔ جب میں نے اسے لکھا کہ یونیورسٹی آرہا ہوں تو اس نے میرے قیام کے لیے اپنے برابر والے خالی اپارٹمنٹ کا انتظام کردیا اور جب میں وہاں پہنچا تو سارے کام آسان ہوتے چلے گئے۔ اسے جمعے کی شام یورپ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں اس وقت اس کے اپارٹمنٹ میں ہی تھا جب اس نے فون کرکے ٹیکسی والے کو دو گھنٹے بعد آنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے اپنے اپارٹمنٹ میں آنے کی دعوت دی تاکہ رخصت ہونے سے پہلے وہ میرے ساتھ ایک جام پی لے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کبھی بھی شراب کے لیے انکار نہیں کرسکتا۔ میں نے تیز فرانسیسی شراب میں ایک گولی ڈال دی جو آدھا سائنائڈ ہوتی ہے۔ اسے اتنی آسانی سے نہیں مرنا چاہیے تھا لیکن میرے پاس وقت کی کمی تھی۔''

''میں اسے کچن کے فرش پر نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ جلد از جلد اپنا کام ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ تم میری تلاش میں نکلتے۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا......''

''اسے کھڑکی سے باہر دھکا دینے میں مشکل پیش آئی ہوگی؟'' ڈولنگر نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ وہ کافی وزنی تھا؟''

''اور میں ایک نوّے پونڈ کا کمزور شخص ہوں۔'' اس کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''لیکن میرے پاس ایک سائنس داں کا دماغ ہے۔ میں نے نیوٹن کے قانون پر عمل کرتے ہوئے اسے کھڑکی تک پہنچایا اور باہر دھکیل دیا۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر اپنے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے بولا۔ ''بینڈلر کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ وہ اور میرے والدین بھی قریب نہیں رہے اور وہ مجھے نہیں جانتا ہوگا لہٰذا اس کے لیے سائنائڈ کے بجائے گولی کا انتخاب کیا اور اگر مقامی پولیس کے سپاہی اس کے پورچ کی سیڑھیوں پر مجھے نہ روکتے تو اسے مارنے کے بعد میں دوسری گولی سے اپنے آپ کو ہلاک کرلیتا۔''

اوبران اور ڈولنگر نے واپسی کا پروگرام بنالیا۔ وہ جانتے تھے کہ شاید ہی میریویل کا مقدمہ کسی عدالت میں شروع ہوسکے کیونکہ تحویل ملزمان کا عمل کئی ہفتوں پر مشتمل تھا اور اس کی زندگی کے شاید چند روز ہی باقی تھے، ان کی پرواز میں ابھی کافی وقت تھا۔ اس لیے پٹرول آفیسر انہیں قابلِ ذکر مقامات کے بارے میں بتانے لگا تاکہ ان کا وقت اچھا گزر جائے۔ ڈولنگر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''کیا قرب و جوار میں کوئی ڈونٹ شاپ نہیں ہے؟''

اکھاڑا

فرزانہ نگہت

ہزاروں برس سے انسان ستاروں اور سیاروں سے اپنی لگن کا اظہار کرتا آیا ہے... آسمان پر بنی شاہراہ پر سورج اور سیاروں کا روزمرہ کا سفر جاری و ساری ہے... کہیں جنگ و جدل ہے... تو کہیں دباؤ اور کہیں بھوک و افلاس کا پھیلاؤ... آسمان کی بلندیوں میں پنہاں سربستہ رازوں میں محوِ پرواز کہانی... زمینی خداؤں کا ایک نئی دنیا کی زندگی میں بڑھتا ہوا عمل دخل...

سیاروں کی چالوں سے کرۂ زمین پر اثر انداز ہونے والے تغیرات

کارمن نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو پشت کے بل ریت پر لیٹے اوپر نیلی دھند کو دیکھتے پایا۔

''میں پاگل ہو چکا ہوں۔'' اس نے سوچا۔ ''پاگل یا پھر مردہ......'' اس کے سامنے ریت چمکدار نیلی ریت تھی۔ ایسی ریت زمین یا کسی اور سیارے میں نہیں پائی جاتی تھی۔

اس نے کچھ ریت اٹھائی اور اسے اپنی انگلیوں کے درمیان لے کر اپنی ٹانگوں پر گرایا۔ اس کے جسم پر برائے نام ہی لباس تھا جو بمشکل اس کی ستر پوشی کر رہا تھا۔ اس کے

جسم کے ہر مسام سے پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ایسی شدید گرمی مریخ کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہی تمام سیاروں میں گرم ترین سیارہ تھا لیکن مریخ اس جگہ سے جہاں وہ اس وقت موجود تھا، چار بلین میل کی دوری پر تھا۔

پھر اسے یاد آگیا کہ یہ حادثہ پیش آنے سے پہلے وہ کیا کر رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک کھوجی خلائی جہاز میں زمین سے کروڑوں میل کی دوری پر باہر والوں کے خلاف صف آرا زمینی فوج کے ایک طرف پلوٹو کے مدار میں چکرا رہا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ باہر والے کون تھے۔ وہ کہکشاں کے کس دور دراز حصے سے آئے تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے زمینی آبادیوں پر وقفوں وقفوں سے حملے کرنے شروع کیے تھے جو زیادہ سنگین نوعیت کے نہیں تھے تاہم ان کی طرف سے کسی سنگین نوعیت کے ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے زمین والوں نے جنگی جہازوں کا ایک زبردست بیڑا تیار کر لیا تھا۔

زمین والوں کے کھوجی خلائی جہازوں نے زمین سے بیس بلین میل کی دوری پر باہر والوں کا ایک زبردست لشکر زمین کی طرف پیش قدمی کرتے دیکھ لیا تھا اور اب دس ہزار جنگی جہاز اور پانچ لاکھ خلائی لڑاکے ان کی راہ روکنے اور زمین کو بچانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

ہاں باں کارمن کو یہ سب کچھ یاد تھا لیکن اسے یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کس طرح اس جگہ پہنچا تھا جہاں وہ اس وقت اس گرم نیلی ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے خلائی جہاز کا کہیں بھی نام و نشان نہ تھا۔ اس کے اوپر جو گنبد نما شے تھی وہ ہرگز آسمان نہیں کہی جا سکتی تھی۔ یہ کسی چیز کا نیلے رنگ کا نصف کرہ تھا جس کا قطر ڈھائی سو گز تھا اور یہ نیلی ریت کے اوپر اوندھا کیا گیا معلوم ہوتا تھا۔

کارمن بمشکل تمام اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ تاحدِ نگاہ نیلی چمکیلی ریت اور سوکھی جھاڑیوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ ایک قریبی جھاڑی میں اسے ایک دس ٹانگوں والی چھوٹی سی چھپکلی دوڑتی دکھائی دی۔ وہ بھی نیلی تھی۔ اس جگہ کی ہر چیز نیلی تھی سوائے ایک چیز کے۔ یہ اس جگہ سے کچھ دوری پر ایک خم کھاتی ہوئی دیوار کے دوسری طرف ایک سرخ کرہ تھا جو ایک گز کے قطر کا تھا۔

پھر اس نے اپنے دماغ کے اندر ایک آواز ابھرتے سنی۔ ”اس زمان و مکان میں، میں نے ایک ایسی جنگ لڑنے کے لیے دو نفوس چنے ہیں جو ایک کو ختم کر دے گی اور دوسرے کو اس حد تک کمزور کر دے گی کہ وہ سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے عاری ایک ناکارہ سی شے بن کر رہ جائے گا۔“

”تم...... تم کون؟“ کارمن نے اپنے دماغ میں سوال ابھارا۔

”میں ایک نسل کے ارتقا کی انتہا ہوں۔“ اس آواز نے کہا۔ ”ایک نقطۂ عروج کا وجود ابدی۔ تمہاری قدیم نسل بھی ایسا وجود بن سکتی تھی اور وہ نسل بھی جسے تم باہر والے کہتے ہو۔ اسی لیے میں نے پیش آمدہ جنگ میں مداخلت ضروری سمجھی ہے۔ وہ جنگ جو تم انسانوں اور ان باہر والوں دونوں کی تباہی پر منتج ہوگی۔ میں اس جنگ کے دو فریقوں میں سے ایک فریق کو تباہ و برباد کر دوں گا۔ دوسرا فریق باقی رہے گا۔ ایک تہذیب کو تو باقی رہنا چاہیے۔“

”میں نے اس ممکنہ جنگ کے دونوں فریقوں میں سے ایک ایک فرد منتخب کر لیا ہے۔ تم یہاں ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہو۔ غیر مسلح اور برائے نام لباس میں ملبوس، ایسے حالات میں جو تم دونوں کے لیے یکساں طور پر غیر مانوس اور ناخوشگوار ہیں۔ اس جنگ میں جو فتح یاب ہوا وہ اپنی نسل کا نجات دہندہ اور عظیم محسن ہوگا۔ اس کی نسل قائم رہے گی۔“

”جب تک تم یہاں ہو گے اس کائنات کا وقت ایک جگہ رکا رہے گا۔ اگر تم یہاں مر گئے تو تمہاری ناکامی تمہاری نسل کے خاتمے کا اعلان ہوگی۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ آواز بند ہو گئی۔

کارمن نے جب نظر اٹھائی تو اس نے دیکھا کہ وہ سرخ رنگ کا کرہ اس کی طرف لڑھکتا ہوا چلا آرہا تھا۔ باہر والا! خوف و دہشت کی ایک مفلوج کر دینے والی لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ ساتھ ہی شدید نفرت کی تپش نے بھی اسے جھلسا دیا۔ وہ رولر بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز تھی۔ وہ اس سے دس گز کے فاصلے پر پہنچا پھر پانچ گز کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا اور اس غیر مرئی سی دکھائی دینے والی دیوار کے ساتھ ساتھ جو اس اوندھے کیے گئے نصف کرے کے ایک پہلو سے دوسرے پہلو تک دراز ہوتی چلی گئی تھی یوں گھسٹنے لگا گویا اس میں کوئی رخنہ یا راستہ تلاش کر رہا ہو۔

کارمن نے آگے بڑھ کر اس دیوار کو چھوا۔ وہ فولاد کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے پنجوں کے بل اونچا ہوتے ہوئے اس دیوار کی بلندی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ دیوار جانے کتنی اونچائی تک بلند ہوتی چلی گئی تھی۔ ”ہمارے لیے ایک دوسرے پر جھپٹ

پڑنے کے لیے کوئی راہ تو ضرور ہوگی۔ کارمن نے سوچا۔ ”ورنہ ہماری یہ مبارزت بے معنی ہی ہوگی۔“

وہ رولر اس دیوار کے دوسری طرف اس کے عین سامنے آکر رک گیا تھا۔ کارمن کو اس میں کسی قسم کے حیوانی اعضا دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن اس کی سطح پر درجن بھر جوف اور دراڑیں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک دم ہی دو جوفوں سے دو سونڈیں سی نکلتے ہوئے دیکھیں۔ ان کے سروں پر پنجہ نما دو دو انگلیاں تھیں۔ اسے خوف سے جھرجھری آگئی۔ وہ کہکشاں میں پائی جانے والی کسی بھی مخلوق سے بھیانک حد تک مختلف مخلوق تھی۔ جسمانی طور پر مختلف ہونے کے ساتھ ہی وہ ذہنی طور پر بھی مختلف ہو سکتی تھی۔ کارمن نے سوچا شاید یہ مخلوق اس کا ذہن پڑھ سکتی ہوگی۔ اس نے اس سے ذہنی طور پر رابطہ کرنے کی کوشش کی اور اس سے سوال کیا۔

”کیا ہمارے درمیان امن قائم نہیں ہو سکتا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے کوئی تعرض نہ کریں۔ تم لوگ اپنی کہکشاں میں امن و امان سے رہو اور ہم اپنے کرے میں۔“

جواباً اس نے جو پیغام وصول کیا، وہ ایسا نفرت بھرا اور غیظ و غضب کی انتہاؤں کو چھونے والا تھا کہ وہ بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اس کی پیش کش کو یکسر رد کرتے ہوئے تمام نسلِ انسانی کو تباہ و برباد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ کارمن کو اس شدید ذہنی دھچکے سے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔

”ٹھیک ہے۔“ بالآخر اس نے کہا۔ ”جنگ ہی سہی۔“

اسی وقت جھاڑی میں سے ایک چھپکلی نکلی۔ رولر کے سونڈ نما پنجے نے فوراً ہی اسے پکڑ لیا۔ اس کے دوسرے پنجے نے اس کی ٹانگیں اس کے جسم سے جدا کرنی شروع کر دیں۔ چھپکلی بری طرح سے تڑپنے مچلنے لگی اور منہ سے اذیت بھری آوازیں نکالنے لگی۔ پھر بالآخر بے جان سی ہو کر رولر کے پنجے میں جھول گئی۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں اسے کارمن کی طرف اچھال دیا۔ وہ اس دیوار میں سے گزر کر اس کے قدموں میں آپڑی۔

وہ دیوار یا روک اب کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ کارمن نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور تیزی سے آگے بڑھا لیکن اس دیوار یا روک سے ٹکرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ دیوار یا روک اپنی جگہ پر تھی۔ جب وہ اٹھا تو اس نے ایک پتھر اپنی طرف آتے دیکھا۔ دوسری ہی لمحے اسے اپنی بائیں ٹانگ کی پنڈلی میں تیز درد کا احساس ہوا۔ وہ پتھر اس کی پنڈلی میں آکر لگا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور رولر کا نشانہ لیتے ہوئے پوری قوت سے پتھر اس کی طرف پھینکا۔ یہ سیدھا اسے جا کر لگا۔ اس نے اسے شدید تکلیف پہنچائی لیکن اس سے قبل کہ کارمن دوسرا پتھر اسے مارتا وہ رینج سے باہر نکل گیا۔

کارمن اس دیوار یا روک کو جانچنے آگے بڑھا۔ اس نے ایک ہاتھ اس پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ریت اس پر اچھالی۔ ریت اس دیوار میں سے گزر گئی تھی لیکن اس کا ہاتھ گزر نہ پایا۔

نامیاتی بمقابلہ غیر نامیاتی؟ نہیں کیونکہ مردہ چھپکلی اس دیوار میں سے گزر گئی تھی اور ایک چھپکلی خواہ وہ زندہ ہوتی یا مردہ نامیاتی تھی۔ اگر ایک زندہ چھپکلی دیوار کے دوسری طرف پہنچانے کی کوشش کی جائے؟ کارمن نے اسے تلاش کیا اور دیوار کی طرف اچھالا۔ وہ دیوار سے ٹکرائی اور نیچے گر کر ایک طرف بھاگ اٹھی۔

وہ اسکرین زندہ اجسام کے لیے ایک روک تھی۔ صرف مردہ یا غیر نامیاتی اجسام ہی اس میں سے گزر سکتے

اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان گھر سے دور ایک دوسرے شہر میں تھا اور اس نے طویل عرصے سے اپنے والدین کو خط لکھا تھا نہ ان سے فون پر بات کی۔ ایک روز اسے اپنی غفلت کا احساس ہوا اور اس نے گھر فون کیا، لائن پر اس کا باپ تھا۔

اس نے اپنا نام بتائے بغیر کہا۔ ”آپ دس ہزار امریکی ڈالر لینا پسند کریں گے یا اپنے بیٹے سے فون پر بات کرنا؟“

ایک طویل وقفے کے بعد باپ نے جواب دیا۔ ”امید ہے کہ تم میرے بیٹے نہیں ہو۔“

کراچی سے دریشم یونس کا تعاون

ایک نوجوان نے کمپیوٹر میں اپنی خواہش فیڈ کی کہ وہ ایسی شریکِ حیات چاہتا ہے جو چھوٹی جسامت کی، سبک اور طرح دار ہو۔ اسے پانی کے کھیل پسند ہوں اور وہ جمگھٹے میں رہنے کی شوقین ہو۔ کمپیوٹر نے جواب دیا کہ وہ پنگوئن سے شادی کر لے۔

لاہور سے عروہ کا تعاون

تھے۔ اس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور اپنی ٹانگ کو دیکھا۔ پتھر کے ایک نکیلے سرے نے اس میں ایک گہرا کٹاؤ پیدا کر دیا تھا۔ اپنا زخم دھونے کے لیے اسے پانی چاہیے تھا۔ پانی...... اس خیال کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اس وقت پیاس سے بے تاب ہوا جا رہا تھا۔

اس نے لنگڑاتے ہوئے اپنے اس اکھاڑے میں ہر جگہ پانی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اسے کہیں بھی اس کا نام و نشان نہ دکھائی دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے دشمن کو مارتا پیاس اسے مار دیتی۔ اس سے پہلے اسے پیاس کی تسکین کا بندوبست کرنا تھا، بعجلت تمام!

اس نے ایک لمبے سے پتھر سے ایک بھدا سا چاقو بنایا۔ پھر ایک جھاڑی کے سوتی ریشوں سے رسی کی بیلٹ تیار کی اور اس میں چاقو کو اٹکا دیا۔ اس کے بعد اس نے پھینکنے کے لیے بہت سے پتھر جمع کیے۔

اسی وقت جھاڑی سے ایک چھپکلی نکلی۔ کارمن مسکرایا اور بولا۔ ”ہیلو...... کیسی ہو؟“

چھپکلی نے چند قدم اس کی طرف بڑھائے اور بولی۔ ”ہیلو...... تم کیسے ہو؟“

لمحہ بھر کے لیے کارمن ہک بک سا رہ گیا۔ پھر بے ساختہ قہقہے لگانے لگا۔ ایسا بھلا کیوں نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ذات کیا حسِ مزاح سے عاری ہو سکتی تھی۔

لیکن اس وقت اس کے لیے سوائے پانی کے کسی اور شے کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ اسے فوری طور پر کچھ کرنا تھا۔

رولر اس وقت جھاڑیوں کی لکڑی اور جڑوں کی مدد سے ایک مربع صورت کی کوئی چیز بنانے میں مصروف تھا۔ اس کی بلندی چار فٹ تک تھی اور یہ دیکھنے میں ایک منجنیق سی دکھائی دیتی تھی۔ کارمن کے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک بڑا سا پتھر اس منجنیق میں بنی ہوئی پیالہ نما چیز میں رکھا اور اس کے ایک لیور کو حرکت دی۔ پتھر اڑتا ہوا کارمن کی طرف آیا اور اس کے سر کے اوپر سے گزرتے ہوئے بہت دور پیچھے جا گرا۔ پھر دوسرا پتھر اس کے جمع کیے ہوئے پتھروں کے ڈھیر سے آ ٹکرایا۔ پتھروں میں سے چنگاریاں نکلیں۔

چنگاریاں، آگ، قدیم انسان انہی خشک جھاڑیوں اور پتھروں کو آپس میں رگڑ کر ان سے نکلنے والی چنگاریوں سے آگ پیدا کیا کرتے تھے۔

چند ہی منٹوں میں کارمن نے آگ کا ایک الاؤ تیار کر لیا۔ آگ کے بم بنانے آسان تھے۔ جلتی ہوئی ٹہنیوں کے گٹھے کو ایک پتھر کے ساتھ باندھ کر اسے خشک جھاڑیوں کے ریشے سے بنائی ہوئی رسی کی مدد سے گھما کر دور اچھالا جا سکتا تھا۔

کارمن نے اپنا پہلا آتشیں بم رولر کی طرف پھینکا۔ یہ اس کے ایک طرف سے نکل گیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی منجنیق بھی پیچھے گھسٹ آئی۔ کارمن نے ایک کے بعد ایک بم پھینکنے شروع کر دیے۔ ایک بم رولر کی منجنیق پر جا کر پڑا۔ وہ تیزی سے جلنے لگی۔

رولر نے دوسری منجنیق بنانے کے لیے جھاڑیاں اکھاڑنی شروع کیں۔ کارمن جانتا تھا کہ وہ خود کبھی ایک منجنیق بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں ایسا کام کرنے کے لیے کوئی ہمت اور حوصلہ نہیں تھا جس کی تکمیل میں کئی دن لگ سکتے تھے اور رولر کی بے شمار سونڈیں تھیں پنجے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے ہر چیز بنا سکتا تھا۔

تو وہ کیا چیز بنائے؟ ایک نیزہ؟ ہاں کارمن وہ بنا سکتا تھا۔ اسے جلد ہی نیزے کے سرے کی صورت کا ایک پتھر مل گیا۔ اس نے ایک چھوٹے پتھر کی مدد سے اسے مختلف پہلوؤں سے توڑتے ہوئے ایک نکیلے کانٹے کی شکل دی۔ پھر جھاڑیوں کی موٹی موٹی شاخیں توڑ کر انہیں پتلی شاخوں کے ریشے سے مضبوطی سے اکٹھے باندھتے ہوئے ایک ڈنڈے کی شکل دی پھر وہ نکیلا کانٹا اس کے سرے پر ریشوں کی مدد سے مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس کا نیزہ تیار ہو گیا۔ پھر اس نے جھاڑیوں کے ریشوں کی مدد سے بیس فٹ لمبی رسی تیار کی اور اسے اس نیزے کے ایک سرے سے باندھ دیا اور دوسرا سرا اپنی دائیں کلائی کے گرد باندھ لیا۔

کارمن کی ٹانگ کا زخم اب اسے بُری طرح سے تکلیف دینے لگا تھا اور اس کی ٹانگ بھی سوج رہی تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس زخم کا زہر پورے جسم میں پھیل جانے سے وہ مر بھی سکتا تھا۔ پھر زمین ان سرخ لڑھکتے ہوئے باہر والوں کے قبضے میں چلی جاتی تھی جو محض تفننِ طبع کی خاطر زندہ چھپکلیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے تھے۔ کارمن نے دیوار کی طرف رینگنا شروع کیا۔

”ہیلو۔“ ایک آواز بلند ہوئی۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ ایک چھپکلی تھی۔

”اسے مارو...... ختم کرو...... آؤ۔“ اس نے کہا۔

کارمن اس ننھی مخلوق کے پیچھے پیچھے دیوار کی سمت ہو لیا۔ اس وقت اس نے وہ چھپکلی دیکھی جس کی ٹانگیں رولر نے اس کے جسم سے نوچ لی تھیں۔ وہ ابھی تک زندہ تھی اور

تکلیف سے تڑپ اور مچل رہی تھی۔ کارمن نے اپنا چاقو پیٹی سے نکالا اور اسے اذیت سے نجات دے دی۔ اس کے ساتھ ہی اس پر ایک دم ہی ناامیدی کا ردِعمل حملہ آور ہوگیا۔ اسے اس مردہ چھپکلی پر رشک آنے لگا۔ وہ زندہ نہیں تھی اسی لیے ہر تکلیف اور اذیت سے آزاد تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے بازو بے حد لاغر اور ہڈی چمڑا ہو چکے تھے۔ وہ اس جگہ پر بہت عرصہ تک پڑا رہا تھا۔ کئی دنوں تک یا شاید کئی ہفتوں تک، اس لیے وہ اتنا لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ اس کا جسم آخر کتنی گرمی، پیاس اور تکلیف جھیل سکتا تھا۔

اس نے جو چھپکلی ماری تھی وہ اس دیوار میں سے گزر گئی تھی۔ وہ بدستور زندہ تھی۔ وہ مری نہیں تھی بلکہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ وہ دیوار زندہ جسم کے لیے نہیں بلکہ شعور و احساس کے لیے روک اور رکاوٹ تھی۔ یہ ذہنی منصوبہ بندی تھی، ذہنی جوا۔

کارمن نے ایک پتھر سنبھالا اور دیوار کے قریب ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنا چاقو اور ہارپون چیک کیے۔ پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر سے اپنے سر پر ضرب لگائی۔ اس نے یہ ضرب لگاتے ہوئے یہ خیال رکھا تھا کہ یہ اتنی شدید ہو کہ وہ بے ہوش ہوجائے تاکہ لڑھکتا ہوا اس دیوار کے دوسری طرف چلا جائے لیکن بے ہوشی کا دورانیہ طویل نہ ہو۔

رولر بدستور اپنی منجنیق بنانے میں مصروف تھا۔ کارمن نے پتھر سے اپنے سر پر ضرب لگائی پھر کولھے سے اٹھنے والی ایک اچانک قسم کی تیز و تند درد کی لہر اسے ہوش و حواس کی دنیا میں لے آئی۔ وہ اس دیوار یا رکاوٹ میں سے گزر چکا تھا۔ درد کی یہ لہر اس پتھر کی ضرب سے پیدا ہوئی تھی جو رولر نے یہ دیکھنے کے لیے اس کی طرف پھینکا تھا کہ آیا وہ زندہ تھا یا نہیں۔ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پڑا رہا لیکن اس نے اپنی آنکھوں میں جھری پیدا کر رکھی تھی۔

وہ اپنے ذہن کو حتی الامکان خالی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں رولر اپنی ٹیلی پیتھی کی قوت سے اس کے ہوش میں ہونے سے آگاہ نہ ہوجائے۔ اب بقا کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کن مرحلہ آن پہنچا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہی زندہ رہنا تھا اور اس پر ہی اس کی نسل کی بقا کا دارومدار تھا۔

رولر اس کے قریب آرہا تھا۔ قریب اور قریب۔

جب وہ چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو کارمن بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور پوری مجتمع شدہ قوت کے ساتھ ہارپون اس کی طرف پھینکا۔ وہ اس کے جسم میں گہرا اتر گیا۔

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ کارمن ہارپون کی رسی کو کھینچتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ رولر کی سونڈیں ہارپون کو جسم سے کھینچ نکالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ پھر وہ اپنی پنجہ نما سونڈیں آگے بڑھائے کارمن کی طرف بڑھنے لگا۔ کارمن نے اس پر چاقو سے حملہ کیا اور بار بار اسے چاقو گھونپنے لگا جبکہ اس کے خوفناک پنجے اس کا جسم ادھیڑنے لگے۔ کارمن رکے بغیر برابر اس پر چاقو کے وار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بے جان سا اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔

جب کارمن کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اپنے کھوجی خلائی جہاز کی سیٹ پر پٹیوں میں جکڑا ہوا پایا تھا۔ اس کے سامنے اسکرین پر اس کے کھوجی خلائی جہاز کے کپتان میگلن کا چہرہ نمودار ہوا۔

”چلو ہمارے ساتھ آن ملو۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”جنگ ختم ہوگئی ہے، ہم جیت چکے ہیں۔“

کارمن نے آٹومیٹک کنٹرولز سنبھالے اور جہاز کا رخ پیچھے ذخیرۂ آب کی طرف موڑ دیا۔ اسے اس وقت حد درجہ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا واقعی یہ سب کچھ رونما ہوا تھا؟ کیا واقعی ایسا ہی کچھ پیش آیا تھا؟“ اس نے اپنی ٹانگ پر سے پتلون اوپر اٹھائی۔ اس کی پنڈلی پر ایک لمبا سا ٹھیک ہوتے ہوئے زخم کا سفید سا نشان پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے اور پیٹ پر بھی ٹھیک ہوتے ہوئے زخموں کے نشانات پڑے ہوئے تھے۔ ہاں یہ حقیقت تھی۔ واقعی یہ سب کچھ اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔

جب وہ سب سے بڑے جہاز پر اُتر کر میگلن کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ اسے دیکھتے ہی چہکا۔ ”ہیلو کارمن! کمال ہی ہوگیا۔ ہماری پہلی ہی باڑھ نے دشمن کے جہازوں کو تتر بتر کر دیا۔ بہت سوں کے پرخچے اڑ گئے۔ جو بچے وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کا بیڑا تہ و بالا ہوگیا۔ کاش تم بھی یہ نظارہ دیکھنے کے لیے ہمارے ساتھ ہوتے۔“

کارمن نے بمشکل تمام اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کی۔ اس کی عقلِ سلیم نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے یہ بتایا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آیا تھا تو وہ پرلے درجے کا جھوٹا سمجھا جائے گا۔

”جی ہاں جناب! مجھے افسوس ہے کہ میں یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے موقع پر موجود نہ تھا۔“

وفادار

تمکین رضا

دوڑتی بھاگتی زندگی میں ہر روز واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں... مگر کوئی ایک حادثہ... سانحہ بُری طرح دل کو مجروح کر دیتا ہے... جفا پیشہ افراد کے درمیان رہتے رہتے انسان کا ہر ایک پر سے اعتماد و اعتبار کا رشتہ قائم نہیں رہتا... ہر کسی پر شک کی نظر اٹھتی ہے... دھندلاتے چہروں میں چھپے ایک ایسے ہی چہرے کی شناخت جو دنیا کی نظروں میں کھلنڈرا... بے وفا اور ہرجائی مشہور تھا...

وفاداری کے سودے میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والے پروانے کی دردناک کتھا

وہ چیخ اتنی لرزہ خیز تھی کہ میرے ہاتھ سے رسیدیں نکل کر فرش پر جا گریں۔ میں نے دفتر سے نکل کر باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ تمام گاہک سر اٹھا کر اس جانب دیکھ رہے تھے جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔ میں نے پُرسکون ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اپنی نشستوں پر تشریف رکھیں تاکہ کام دوبارہ شروع ہو سکے اور آپ وقت پر فارغ ہو جائیں۔“

میرا سیلون ہمہ وقت مصروف رہتا تھا۔ یہ میساچوسٹس ایونیو میں واحد بلیک ہیئر سیلون تھا۔ میں نے اپنے سیلون دی بیوٹی امپوریم کے لیے اعلیٰ تربیت یافتہ ہیئر ڈریسرز اور مساجرز کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں اور اپنے گاہکوں کی تواضع فرنچ پیسٹریوں اور شیمپین سے کرتی تھی۔ دھیمی آواز میں جاز کی دھنیں بجتی رہتی تھیں تاکہ میرے گاہکوں کو ایک پُرسکون ماحول میسر آ سکے۔ ان گاہکوں میں کمپنیوں کے منیجر، وکیل اور یہاں تک کہ ہمارے میئر کا پریس سیکریٹری بھی شامل تھا۔ اس سے پہلے ہمارے یہاں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ چیخ تو بہت دور کی بات تھی یقیناً اس کا تعلق فلپ سے تھا۔

میں شیمپو ایریا میں پہنچی جہاں سے چیخ کی آواز آئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مسز گیٹس ہسٹریائی انداز میں چلّا رہی تھی۔ ”دیکھو، تم نے یہ کیا کر دیا۔ میرے بال سبز ہو گئے۔“

میں اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دراصل اس کے پورے بال سبز نہیں ہوئے تھے۔ اوپر کا حصہ ہلکا سبز جبکہ اطراف اور پیچھے کے حصے کے بال گہرے سبز ہو گئے تھے۔ فلپ معصوم شکل بنائے کھڑا تھا۔

”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ کبھی اس برانڈ کا ہیئر کلر استعمال نہیں کیا لیکن تم نے اسی پر اصرار کیا۔“ فلپ نے کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تھیلما میری بات سن رہی تھی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔“

مسز گیٹس نے اپنی گردن کے گرد لپٹا ہوا تولیا اتار کر اس کے اوپر پھینکا اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”بے وقوف، ایک ہیئر ڈریسر ہو کر بہانہ بنا رہے ہو۔ میں تمہیں قتل بھی کر سکتی ہوں، تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہو گا۔“

”مسز گیٹس......“ میں نے کہنا شروع کیا۔

”مجھے منانے کی کوشش مت کرو۔ میں جا رہی ہوں۔ برائے کرم مجھے ایک اسکارف دے دو تاکہ اس نے میرے بالوں کا جو حشر کیا ہے، اسے چھپا سکوں۔“

میں تیزی سے چلتی ہوئی سپلائی روم میں گئی اور اسے ایک خوب صورت قیمتی ڈیزائنر اسکارف لا کر دیا اور ایک بار پھر اس سے معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں خود تمہارے بالوں کو ٹھیک کروں گی اور ہر ہفتے انہیں بہترین پروٹین کنڈیشنر سے صاف کروں گی۔ بہت جلد تمہارے بال دلکش نظر آنے لگیں گے۔“

مسز گیٹس نے غصے میں آ کر وہ اسکارف اپنے سر کے گرد لپیٹا۔ وہاں موجود دوسرے گاہک سر اٹھا اٹھا کر یہ تماشا

دیکھ رہے تھے۔ "آئندہ یہاں کوئی بھی شخص میرے بالوں کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔"

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی لیکن وہ زور سے دروازہ بند کر کے باہر جا چکی تھی۔ فلپ نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اب کہہ رہی ہے کہ یہاں کام کرنے والا کوئی بھی شخص اس کے بالوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اگر وہ اصرار نہ کرتی تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ وہ سمجھتی ہے کہ اسے چیزوں کے بارے میں ایک ہیئر ڈریسر سے زیادہ معلومات ہیں۔" وہ پیٹ اور تھیلما سے مخاطب تھا جو دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔

مجھے اس کی بات سن کر غصہ آیا اور بولی۔ "کسی گاہک کے بالوں کو سبز رنگ کے تین شیڈ دے دینا کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔"

فلپ بالکل بھی شرمندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "میرے کمرے میں آؤ۔"

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر ٹانگ ہلانے لگا۔ میں نے اسے گھورا تو وہ بولا۔ "ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے میڈم۔ میں اس عورت کو اس خضاب کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا لیکن اس نے میری بات نہیں سنی پھر اس کے ساتھ وہی ہوا جس کی وہ مستحق تھی۔ وینڈا کا کہنا ہے کہ وہ کبھی ٹپ نہیں دیتی۔"

"تم نے وینڈا کے چھٹیوں پر ہونے کی وجہ سے تمہیں یہ ذمے داری دی تھی لیکن تمہاری وجہ سے وہ ایک جوکر بن کر یہاں سے گئی ہے اور اب مجھ پر مقدمہ کر دے گی۔"

وہ اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ "اسے اپنا شوق پورا کرنے دو۔ میرے پاس گواہ موجود ہیں۔ سب لوگوں نے مجھے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہم اچھے سیلون میں اس برانڈ کا خضاب استعمال نہیں کرتے اور انہوں نے اسے اصرار کرتے ہوئے بھی سنا۔ اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں ہے۔"

"کتنی بار تمہیں یاد دلاؤں کہ اگر کچھ غلط ہو جائے تو اس کی ذمے داری مجھ پر آ جاتی ہے اور اگر اس نے مقدمہ دائر کر دیا تو مجھے ہرجانہ دینا پڑے گا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کا میری ساکھ پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کی وجہ سے میرے گاہکوں کی تعداد کم ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں فارغ کرنا پڑے گا۔"

میری بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور اپنی

انگلیوں سے سر کے بال سنوارتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے اسے بقیہ دن کی چھٹی دے دی ہو۔

''سچ تو یہ ہے کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے۔ پچھلے ہفتے بھی ایک گاہک شور مچا رہی تھی کیونکہ تم نے اس کے بال پکسی کٹ میں بنا دیے جبکہ وہ بوب کٹ چاہ رہی تھی۔''

''اس نے جو تصویر مجھے دکھائی، میں نے ویسے ہی بال بنا دیے۔ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو گاہک چاہتا ہے۔''

''ہونڈا بلیک نے بھی یہی شکایت کی تھی۔ تم نے اس کے بالوں کو گچھے کی شکل دے دی۔''

''اس نے خود ہی کہا تھا کہ وہ گھنگریالے بال بنوانا چاہتی ہے۔''

''نہیں فلپ، اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا اسیلون بہت کامیاب ہے اور مجھے ہمیشہ اس پر فخر رہا ہے کہ میں نے کبھی کسی گاہک کے بال خراب نہیں کیے۔ میں جب خود کام کرتی تھی تب بھی ہمیشہ محتاط رہی۔ میں نے کبھی گاہک کی مرضی کے خلاف کام نہیں کیا لیکن تم ان باتوں کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ میں آئندہ ایسا کچھ نہیں چاہتی۔ اب تم جاؤ، تمہارے گاہک انتظار کر رہے ہوں گے۔''

میری ڈانٹ ڈپٹ اور اس واقعے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں کسی کام سے استقبالیہ پر گئی تو وہ دو لڑکیوں سے ہنسی مذاق کر رہا تھا پھر دو نوجوان لڑکے وہاں آئے۔ فلپ انہیں دیکھتے ہی بولا۔

''یہ میرے دوست ہیں اور صرف آج رات کے پروگرام کے بارے میں پوچھنے آئے ہیں۔ ہمیں میچ دیکھنے جانا ہے۔''

میں نے بزر دبایا اور وہ دونوں اندر آ گئے۔ انہوں نے جینز اور باسکٹ بال کی جرسی پہن رکھی تھی۔

''ہیلو!'' طویل قامت لڑکے نے کہا۔ دوسرا بھاری بدن کا تھا۔ اس نے محض سر کو خم دینے پر اکتفا کیا۔ میں نے جواب میں ہیلو کہا اور کلائنٹ کا شیڈول دیکھنے لگی۔ فلپ گنگناتا ہوا دونوں کو عقبی حصے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جانے لگے تو لمبے لڑکے نے کہا۔ ''ہم تمہیں ساڑھے سات بجے لینے آئیں گے۔''

فلپ نے انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہیں ملوں گا۔''

ان کے جانے کے بعد مجھے ایک بار پھر دروازے کا بزر بجانا پڑا۔ اس مرتبہ سامان سپلائی کرنے والا ڈیرل تھا۔

''بہت خوشی ہوئی کہ تم شیڈول کے مطابق آئے ہو۔ ہمارا یہ ہفتہ کافی مصروف ہے۔ میں کسی چیز کی کمی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''تم جانتی ہو کہ میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کرتا مسز ایمس۔'' ڈیرل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈیرل سیٹی بجاتے ہوئے سامان کی ٹرالی سپلائی روم کی طرف لے گیا جو شیمپو ایریا کے برابر میں تھا۔ کام ختم کرنے کے بعد اس نے فلپ سے تھوڑی سی بات کی اور مجھ سے وعدہ کر کے چلا گیا کہ اگلے ہفتے وہ اسی وقت سامان لے کر آئے گا۔

باقی دن کافی مصروف گزرا اور کوئی مزید ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ چھ بجے میں نے اپنا کام ختم کیا اور گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ فلپ کے بارے میں سوچ کر میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ کسی کو بے روزگار کرے لیکن گاہکوں کی شکایات اور ان کی پروا نہ کرنے والا رویہ اور اس سے بھی بڑھ کر مسز گینس کی دھمکی مجھے اس بارے میں سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''وہ باصلاحیت ہے اور اچھا ہیئر ڈریسر بن سکتا ہے اگر سنجیدگی سے کام کرے اور بے پروائی نہ برتے۔'' میں نے رات کے کھانے پر اپنے شوہر کو بتایا۔

ہیمپٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری جان، وہی کرو جو تمہیں کرنا چاہیے۔'' ہماری شادی کو تیس سال ہو چکے تھے اور میں دو لڑکوں کی ماں تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے اسی طرح مخاطب ہوتا تھا۔

دوسرے روز میں اپنے معمول کے مطابق صبح سات بجے سیلون پہنچ گئی۔ گاہک نو بجے آنا شروع ہوتے تھے لیکن میں ہمیشہ وقت سے پہلے آتی تھی تاکہ یہ اطمینان کر سکوں کہ ہیئر ڈریسر اپنی جگہ صاف کر کے گئے تھے اور شیمپو ایریا میں کافی مقدار میں سامان موجود ہے۔ میں نے کافی کے لیے پانی گرم کیا، پیسٹریاں نکالیں جو میں بیکری سے لے کر آتی تھی اور شیمپین کا ایک گھونٹ لیا لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ استقبالیہ کاؤنٹر بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔ میں سامان چیک کرنے دوبارہ شیمپو ایریا میں چلی گئی۔ میں نے شیلف میں رکھے ہوئے مختلف شیمپو اور کنڈیشنر دیکھے۔ ان میں سے کچھ کا فارمولا میرا اپنا تھا۔ میں

نے چھ ماہ پہلے ویب پر اپنی بیوٹی پروڈکٹس اور خوشبوئیں بیچنا شروع کی تھیں۔ یہ آئیڈیا میرے بیٹے ناتھن کا تھا جو آئی ٹی کا ماہر ہے۔ مجھے کچھ کنڈیشنر پورے کرنے تھے۔ اس لیے میں سپلائی روم میں چلی گئی اور اس کا دروازہ کھولا دوسری بار ایک چیخ سیلون کی خاموشی کو چیرتی ہوئی فضا میں اُبھری۔ اس بار یہ میرے حلق سے نکلی تھی۔ کونے میں رکھے ڈبوں اور بوتلوں کے درمیان فلپ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

میری بھتیجی ایریل شکاگو پولیس میں سراغ رساں ہے۔ مجھے فوری طور پر اس کی مدد لینے کا خیال آیا۔ جب انڈیانا پولیس کی پولیس شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہو رہی تھی۔ میں نے اسے فون کیا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ مجبوراً میں نے وائس میل پر اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا۔

”کیا وہ ہم جنس پرست تھا؟“ سراغ رساں ویلس نے پوچھا۔

”میں ایسا نہیں سمجھتی لیکن اس کے قتل سے اس سوال کا کیا تعلق ہے؟“

”زیادہ تر مرد ہیئر ڈریسر اسی طرح کے ہوتے ہیں۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”یہ شخص تمہارے پاس کب سے کام کر رہا تھا؟“

”اسے یہاں کام کرتے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔“

”کیا وہ اچھا ملازم تھا یا کام کے دوران بہت زیادہ غلطیاں کرتا تھا۔“

مسز گیٹس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”گاہکوں کے ساتھ چند مرتبہ غلط فہمی ضرور ہوئی تھی۔“

”کیا کوئی چیز غائب ہے؟“

”مجھے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔“ میں نے کہا۔ ”اسے کس طرح قتل کیا گیا؟“

”یہ ہم اسی وقت بتا سکیں گے جب میڈیکل ایگزامنر کی جانب سے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔“

میں نے دیکھا کہ ایک ٹیکنیشن الماریوں کی تلاشی لے رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ”کیا اسے یہ کرنے کی ضرورت ہے؟“

ویلس نے ٹیکنیشن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، تمہیں کچھ دنوں کے لیے سیلون بند کرنا ہوگا۔“

میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ عرصے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت مجھ پر کام کا بہت بوجھ ہے اور وہ سب ہائی پروفائل کیس ہیں۔“

”مجھے اس کاروبار کو چلانا ہے اور جاننا چاہتی ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اسے تم غیر متوقع چھٹیاں سمجھ لو۔“

میں نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”شاید مجھے تمہارے باس سے بات کرنا پڑے۔ مجھ سے رابطے میں رہنا۔“

وہ میری بات کا جواب دیے بغیر چلا گیا۔

☆☆☆

فلپ کے قتل کو چار دن گزر چکے تھے اور میرا سیلون ابھی تک بند تھا۔ اس دوران سراغ رساں ویلس نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے پولیس اسٹیشن فون کیا تو بتایا گیا کہ وہ باہر نکلا ہوا ہے۔ میں گاڑی چلاتی ہوئی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گئی۔ استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے ایک پولیس آفیسر نے میری رہنمائی کی اور مجھے دوسری منزل پر واقع اس کا کمرا دکھا دیا جہاں وہ ایک دوسرے سراغ رساں کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا۔

میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے انتہائی اہم کام میں مداخلت کرنے پر معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے اپنا سیلون دوبارہ کھولنا ہے۔“

ویلس اور اس کے ساتھی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ویلس بولا۔ ”جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہمارے پاس دوسرے کیسز بھی ہیں جو......“

”میں جانتی ہوں۔ ہائی پروفائل۔ اسی لیے تم یہاں بیٹھے کافی پی رہے ہو۔ شاید مجھے فلپ کے قاتل کو خود ہی تلاش کرنا پڑے۔“

”تمہیں پولیس کے کام میں مداخلت کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

مجھے ایریل سے اپنی وہ گفتگو یاد آئی جب اس نے پولیس کے طریقۂ کار کے بارے میں بتایا تھا۔ میں جانتی تھی کہ مجھے جائے واردات سے ثبوت اکٹھے کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح ویلس کام کر رہا تھا، اس سے تو یہی لگ رہا تھا

کہ اس نے ابھی تک کوئی ثبوت حاصل نہیں کیا۔ میں نے کمرے میں بیٹھے دوسرے افسروں اور سراغ رسانوں کا جائزہ لیا اور میری نظریں ایک پرکشش عورت پر ٹھہر گئیں جو لیپ ٹاپ پر کام کر رہی تھی۔

''معافی چاہتی ہوں۔'' میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' اس کا نام آفیسر بلنکو تھا۔

''میرے سیلون میں ایک نوجوان شخص قتل ہو گیا ہے لیکن مجھے اس کی تحقیقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا رہا۔''

''ہم ان کیسز پر بات نہیں کرتے جن پر خود کام نہ کر رہے ہوں۔ تمہیں متعلقہ سراغ رساں سے بات کرنا چاہیے۔''

''میں کوشش کر چکی ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے میڈیا میں جانا اچھا نہیں لگتا لیکن سوچ رہی ہوں کہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔''

بلنکو نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سراغ رساں کا نام کیا ہے؟''

''سراغ رساں ویلس۔''

''اوہ، وہ......'' بلنکو معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مقتول کا نام؟''

''فلپ رچرڈ۔''

وہ کچھ دیر لیپ ٹاپ کے اسکرین کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''تمام رپورٹس یہی بتا رہی ہیں کہ اس کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔''

''گلا گھونٹا گیا ہے۔'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ وہ ایک توانا شخص تھا اور یہ کام اس سے بھی طاقت ور شخص ہی کر سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''اس رپورٹ میں اور کچھ لکھا ہے؟''

''ہاں، اس کی جیب سے ایک سیل فون، بیس ڈالر پینتالیس سینٹ اور پچاس باسکٹ بال گیم کے ٹکٹ ملے ہیں۔''

''ہاں، وہ اور اس کے دوست شام کو میچ دیکھنے جانے والے تھے۔''

بلنکو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں اس کا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس لیے اس کا شکریہ ادا کر کے چلی آئی۔

مجھے اجازت نہیں تھی لیکن میں اپنے سیلون چلی گئی۔ ایک منٹ میں اس کے بند دروازے کو دیکھتی رہی پھر پولیس کا لگایا ہوا فیتہ اوپر اٹھا کر اندر چلی گئی۔ مجھے وہاں کا خالی پن دیکھ کر افسوس ہونے لگا۔ پھر میں نے غور سے اس جگہ کا معائنہ شروع کر دیا۔ سراغ رساں ویلس نے پوچھا تھا کہ کوئی چیز غائب تو نہیں ہوئی، چنانچہ میں نے ایک پیڈ اٹھایا اور وہاں موجود تمام سامان کی فہرست بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس کا موازنہ کمپیوٹر کی فہرست سے کر سکوں۔

''کیا مجھے دستانے پہن لینا چاہئیں؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ہم نے ہمیشہ ٹیلی وژن پر سراغ رسانوں کو دستانے پہنے دیکھا تھا۔ چنانچہ میں نے دستانوں کی جوڑی اٹھائی جو خضاب لگاتے وقت استعمال کی جاتی تھی اور شیمپو ایریا سے اپنا کام شروع کیا۔ میں ایک ایک کیبنٹ کو دیکھ کر اس میں رکھی شیمپو، کنڈیشنر اور ہیئر فلر کی بوتلوں کی تعداد لکھ رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے کولون کی بوتلوں کو گننا شروع کیا۔ یہ فارمولا اپنا تھا جو میں نے ہیمپٹن کی مدد سے تیار کیا تھا۔ میں نے فلپ کے کام کرنے کی جگہ کو خصوصی توجہ دی۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہوگا۔

میں نے دفتر میں آ کر تھیلما کو فون کیا اور بولی۔ ''کاش میں تمہیں بتا سکتی کہ کب کام پر واپس آنا ہے لیکن ابھی تک پولیس نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ تم اور فلپ کافی قریب تھے۔ کیا وہ تنہا رہتا تھا یا گھر والوں کے ساتھ؟''

تھیلما اس سے عمر میں بڑی تھی، وہ تیس سے بھی زیادہ کی ہوگی لیکن اکثر اس کے ساتھ لنچ کے لیے جایا کرتی تھی۔

''اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ فلپ سے میری اتنی زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔''

''اس نے کبھی اپنے گھر والوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کیونکہ وہ تو بہت باتونی تھا۔''

تھیلما کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ اس کی ایک بیوی تھی۔''

''کیا کہا تم نے؟'' میں چونکتے ہوئے بولی۔ ''وہ شادی شدہ تھا؟''

''میں جانتی ہو کہ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ میرا مطلب ہے جس طرح سیلون میں لڑکیاں اس سے ملنے آتی تھیں۔ ایک ماہ قبل اس کی بیوی سے علیحدگی ہو گئی تھی۔''

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ جب میں تعزیت کے لیے اس کے والدین کے گھر گئی تو میں نے اس کی بیوی کو دیکھا ہو۔"

"فلپ کے گھر والے اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ شاید وہ اس کی تدفین پر بھی اسے مدعو نہ کریں۔"

"کیا ایک بیوی کو بھی شوہر کی آخری رسومات میں شرکت کرنے کے لیے دعوت دینے کی ضرورت ہے؟" میں نے پوچھا۔

تھیلما کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا فلپ سیلون میں اکیلا تھا جب تم شام میں وہاں سے روانہ ہوئیں؟"

"ہاں، وہ اپنے آخری گاہک کے بال کاٹ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ صفائی کرکے سیلون بند کردے گا۔"

میں نے تھیلما سے فلپ کی بیوی کے بارے میں کچھ اور معلومات لیں اور فون بند کردیا۔ میں نے سوچا کہ فہرست بعد میں بنالوں گی پہلے مجھے فلپ کی بیوہ سے ملنا چاہیے۔ وہ بالکل ویسی نہیں تھی جو میں توقع کررہی تھی۔ اس کا نام لیزا تھا اور اس میں فلپ جیسی کوئی بات نہیں تھی۔

"اس کے گھر والے نہیں چاہتے کہ میں تدفین میں شرکت کروں۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

"تم اور فلپ علیحدہ ہوگئے تھے؟"

وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولی۔ "لیکن ہم معاملات حل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ گھر واپس آنے والا تھا۔"

میری آنکھوں کے سامنے وہ لڑکیاں گھومنے لگیں جو سیلون میں فلپ سے ملنے آتی تھیں۔ وہ معاملات سلجھانے میں لیزا کی طرح سنجیدہ معلوم نہیں ہورہا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ فلپ کے گھر والوں کے ساتھ تمہارے کیا اختلافات ہیں؟" لیزا نے دونوں بازو سینے پر رکھے اور گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"وہ اس شادی کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ اس کی شادی کی عمر نہیں تھی اور اس کا الزام انہوں نے مجھے دیا کہ میری وجہ سے وہ کالج نہ جاسکا حالانکہ وہ خود ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک دن اپنا سیلون کھولے۔ وہ فلم اسٹارز کا ہیئر اسٹائلسٹ بننا چاہتا تھا۔"

میں یہ سن کر حیران رہ گئی۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ فلپ کی ایسی کوئی خواہش ہوگی۔

"لیزا، میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی لیکن کیا

موسیقی

حسین وجمیل سترہ سالہ مارگریٹ ایک ڈنر پارٹی میں شریک تھی۔ ایک نوجوان خوبرو موسیقار اس کی توجہ کا مرکز بن گیا، اور وہ موقع نکال کر اس کے پاس جا بیٹھی۔

"تمہارا دہانہ بے حد اچھا ہے۔" موسیقار نے کہا۔ "ایسا بہت کم لڑکیوں کا ہوتا ہے......"

مارگریٹ اپنی تعریف سن کر گلنار ہوگئی اور مخمور نگاہوں سے ساتھی کو دیکھنے لگی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ دہانہ کلارنٹ بجانے کے لیے نہایت موزوں ہے۔"

لاہور سے نگہت پروین کا تعاون

ناراضگی

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور خاتون نے ریسیور اٹھایا۔

"ممی! سوسن بول رہی ہوں۔ کار کا ٹائر پھٹ گیا ہے اور میں گیراج میں ہوں۔ مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔ ناراض نہ ہونا ممی۔ سچ مچ کار کا ٹائر پھٹ گیا ہے۔ میں کوئی بہانہ نہیں بنارہی ہوں۔"

"تم نے رانگ نمبر ڈائل کیا ہے۔ میری کسی لڑکی کا نام سوسن نہیں ہے۔" خاتون نے لڑکی کی غلطی کی نشاندہی کی۔

"افوہ! میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم اتنی سخت ناراض ہوجاؤ گی، ممی!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

کراچی سے تسنیم یونس کا تعاون

پرفیوم

پیرس میں ایک نوجوان لڑکی خوشبویات کے اسٹور میں گئی تو سیلز مین نے اسے ایک شیشی دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ ایک نئی پرفیوم ہے اور نہایت عمدہ ہے۔ اس کا نام 'سپردگی' ہے۔

لڑکی نے پوچھا۔ "کوئی ایسی پرفیوم نہیں ہے جس کا نام 'معاوضہ' ہو!"

کوئٹہ سے عارش کا تعاون

فلپ کوئی ایسا کام کر رہا تھا جو اسے نہیں کرنا چاہیے؟''

لیزا یہ سوال سُن کر ششدر رہ گئی اور بولی۔ ''تم نے ایسا کیوں سوچا؟''

''یہ کوئی اچانک حملہ نہیں تھا۔ کوئی شخص میرے سیلون میں آیا اور کسی وجہ سے اس نے اسے قتل کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ فلپ وہاں موجود ہوگا۔ انہوں نے سیکیورٹی سسٹم کے تار کاٹ دیے۔ اس کا گلا گھونٹا اور اس کی لاش کو سپلائی روم میں رکھ دیا۔''

لیزا نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہ رہی ہوں کہ کس نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا؟''

وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ سوائے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے۔''

مجھے وہ دونوں لڑکے یاد آ گئے جو اس سے ملنے سیلون میں آئے تھے۔ میں نے لیزا سے کہا۔ ''ان میں ایک لمبا اور دوسرا چھوٹے قد کا ہے؟''

لیزا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، کولن اور جارج۔''

''وہ اس روز شام میں فلپ کے ساتھ میچ دیکھنے جانے والے تھے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ میں ان سے کہاں مل سکتی ہوں؟''

''نہیں، لیکن شاید میرے پاس جارج کا نمبر ہے۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گئی اور میز پر سے اپنا موبائل فون اٹھا لیا۔

میں نے گھر جا کر جارج کو فون کیا تو اس نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''فلپ تمہارے ساتھ میچ دیکھنے جانے والا تھا پھر کیا ہوا؟''

''میں خود نہیں جانتا مسز ایمس۔ میں اور کولن اسے لینے کے لیے تمہارے سیلون پر آئے تھے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے دروازہ کھولا۔ ہم نے اسے فون کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ہم یہی سمجھے کہ وہ ایک بار پھر ہمیں چکما دے گیا۔''

''کیا اس نے پہلے بھی ایسا کیا تھا؟''

''ہاں، پچھلے کئی دنوں سے وہ یہ کر رہا تھا۔ اس کا بیشتر وقت فلورا کے ساتھ گزرتا تھا۔''

''یہ فلورا کون ہے؟''

''وہ باسکٹ بال میچ کے ٹکٹ بیچتی ہے۔''

مجھے وہ لمبی خوب صورت لڑکی یاد آ گئی جو ایک دفعہ سیلون پر آئی تھی۔ اس نے بڑے خوب صورت انداز میں پونی ٹیل باندھ رکھی تھی۔ میں ہیئر اسٹائل کبھی نہیں بھولتی۔

''وہ ڈیٹنگ کر رہے تھے۔ ہم یہی سمجھے کہ وہ فلورا کے ساتھ ہوگا اور ہم اس سے میچ کے دوران مل لیں گے لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ ہم نے میچ دیکھا اور ہوسٹل واپس آ گئے۔''

''کیا تم طالب علم ہو؟''

''جی میڈم، پری میڈیکل میں پڑھتا ہوں۔''

''فلپ کی جیب سے میچ کے پچاس ٹکٹ ملے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی اتنی آمدنی نہیں تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کے پاس یہ ٹکٹ کہاں سے آئے؟''

جارج نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ ''میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''زیادہ امکان یہی ہے کہ فلورا نے دیے ہوں۔''

فون رکھنے کے بعد میں باہر لان میں گئی۔ جہاں ہیمپٹن کام کرنے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھا سستا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''فلپ نے اپنی جیب میں پچاس ٹکٹ کیوں رکھے اور انہیں استعمال کیوں نہیں کیا؟''

''کھال اتارنے کے لیے۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے میں اس کا مطلب جانتی ہوں۔

''ڈارلنگ اس کی تھوڑی سی وضاحت کر دو۔''

''ٹکٹوں کی پوری گڈی خرید لو۔ پھر انہیں میچ والے دن مہنگے داموں بیچو۔''

''کیا یہ قانونی ہے؟''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا سیلون بند ہو جانے کے بعد اس طرح پیسے بنانے کا ارادہ ہے؟''

''تم مذاق کر رہے ہو۔ فلپ یہی کام کر رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے کسی نے اسے قتل کر دیا ہو۔''

ہیمپٹن مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اس سراغ رساں کو پسند نہیں کرتیں لیکن تم اسے اپنا کام کرنے دو۔ یہ معلوم کرنا اس کا کام ہے کہ فلپ کو کس نے قتل کیا، تمہارا نہیں۔''

''میں باسکٹ بال کورٹ جا رہی ہوں۔ جارج نے بتایا ہے کہ کلیٹ کے کھلاڑی وہاں پریکٹس کر رہے ہوں گے۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔''

مجھے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں پہلی بار وہاں

جارہی تھی۔ وہاں کئی ریستوران اور اسٹورز تھے اور لوگوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ میں نے انفارمیشن سے معلوم کیا کہ پریکٹس کہاں ہورہی ہے۔ ”تمہارے پاس وہاں جانے کا اجازت نامہ ہے؟“ استقبالیہ پر بیٹھی ایک نوجوان عورت نے پوچھا۔

”میری بیٹی نے پریکٹس دیکھنے کے لیے بلایا ہے۔“

میں نے جھوٹ بولا۔

میں دبے پاؤں چلتے ہوئے اس ہجوم میں شامل ہوگئی جو پریکٹس دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں تاکہ لمبی عورتوں میں فلورا کو تلاش کرسکوں۔ وہ مجھے اسٹینڈ کے آخری سرے پر نظر آگئی۔ میں نے اسے پونی ٹیل کی وجہ سے پہچان لیا۔ اس نے ایک تولیا اٹھایا اور کورٹ کی طرف چلنا شروع کردیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ یہاں مل جائے گی۔ وقفے کے دوران میں اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس جاکر بولی۔

”میرا نام ویرا ایمس ہے۔ تم فلپ سے ملنے میرے سیلون آئی تھیں۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دیکھی اور ساتھ ہی خوف کی پرچھائیاں بھی۔

”میں تم سے صرف ایک منٹ بات کرنا چاہوں گی۔“

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں ایک دفتر ہے۔ ہم اسے استعمال کرسکتے ہیں۔“

دفتر پہنچتے ہی میں پھٹ پڑی۔ ”کیا فلپ ٹکٹوں کی بلیک کیا کرتا تھا؟“

فلورا نے مجھے حیران ہوکر دیکھا پھر ایک غیر متوقع حرکت کی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ میں نے ہینڈ بیگ سے ٹشو پیپر نکال کر اسے دیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا، جب اس کا غبار ہلکا ہوگیا تو وہ بولی۔ ”یہ میری غلطی تھی۔“

”مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“

”فلپ دوست ہونے کے ناتے میری مدد کررہا تھا۔ وہ صرف اس لیے مہنگے داموں ٹکٹ بیچا کرتا کہ میں اپنی فیس ادا کرسکوں۔“

”لیکن تم اپنی ٹیم کی اسٹار کھلاڑی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں وظیفہ نہیں ملتا؟“

”اگلے سال سے ملنا شروع ہوگا۔ اس سیمسٹر میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔ میں نے ٹکٹ چوری کیے اور فلپ سے کہا کہ انہیں بیچ دے۔“

”تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ وہ اسی وجہ سے قتل کیا گیا؟“

”اس نے مجھے بتایا کہ گزشتہ میچ کے موقع پر وہ کورٹ کے باہر کھڑا ٹکٹ بیچ رہا تھا کہ کچھ لڑکے آئے اور کہا کہ وہ کس کی اجازت سے یہ کام کررہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ صرف وہی یہاں ٹکٹ بیچ سکتے ہیں اور اگر وہ دوبارہ یہاں دیکھا گیا تو وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔“

فلورا کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو آگئے اور وہ انہیں صاف کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“

”گزشتہ میچ کے بعد اس نے میرے لیے تیس ٹکٹ بیچے تھے اور وہ خوشی سے قہقہے لگا رہا تھا۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ وہ کیسا شخص تھا۔“

”کیا تم جانتی ہو کہ وہ لڑکے کون تھے اور کہاں مل سکتے ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کار میں واپس آتے ہوئے میں نے سوچا کہ سراغ رساں ویلس کو ان ٹکٹ بلیک کرنے والوں کے بارے میں بتا دوں لیکن پھر سوچا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ میرے سر پر تھپکی دے گا یا میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دے گا۔ اس کے علاوہ میرے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ وہ لڑکے اتنی معمولی بات پر فلپ کو قتل کرسکتے ہیں۔ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ میرے سیلون پر کام کرتا ہے اور اگر انہوں نے اسے کسی اور جگہ پکڑا تو میرے سیلون میں قتل کرنے کے لیے کیوں لائے۔ واقعی اگر میں نے سراغ رساں سے یہ بات کہی تو وہ میرا مذاق اڑائے گا۔

میں نے ہیمپٹن کو فون کرکے بتایا کہ سیلون جارہی ہوں تاکہ میں نے سامان کی فہرست بنانے کا جو کام شروع کیا تھا اسے پورا کرلوں۔ سپلائی روم کا دروازہ کھولتے ہوئے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے سوچا کہ مجھے ہیمپٹن کو بھی ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا پھر دل ہی دل میں اپنے آپ سے مخاطب ہوئی۔ ”ہمت سے کام لو۔ ابھی دن کی روشنی ہے اور کوئی اندر نہیں آئے گا۔ تم جتنی جلدی کام شروع کروگی۔ اتنی ہی جلدی اسے ختم کرلوگی۔“

میں نے جلدی جلدی بوتلیں گننا شروع کیں اور کمپیوٹر کھول کر اپنی لسٹ سے موازنہ کرنے لگی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دونوں کی تعداد میں بہت فرق تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمپیوٹر اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے فلپ کے مرنے سے ایک دن پہلے بڑی

تعداد میں سامان وصول کیا تھا اور اس میں سے ایک اونس بھی استعمال نہیں کیا پھر یہ بوتلیں کہاں چلی گئیں۔ میں نے ایک بار پھر کمپیوٹر کی فہرست چیک کی۔ اب بھی وہی نتیجہ سامنے آیا۔ پورے آرڈر کا سامان غائب تھا۔

یہ سب چیزیں خود چل کر تو باہر نہیں جاسکتیں۔ تھیلما اور پیٹ میرے پاس اس وقت سے کام کر رہے تھے جب میں نے پندرہ سال قبل یہ سیلون کھولا تھا۔ وہ بھی چوری نہیں کر سکتے۔ میرا شک فلپ پر گیا۔ اگر وہ تالوں کی بلیک کر سکتا ہے تو اسے میرا سامان چرانے میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنا سیلون کھولنے کے لیے یہ چیزیں کہیں ذخیرہ کر رہا ہو۔

میں نے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ ہیمپٹن نے دوسری گھنٹی پر فون اٹھالیا۔ ”تم کتنی دیر میں پہنچ رہی ہو؟“

”کسی نے میرا سامان چرالیا۔“ میں پھٹ پڑی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”ہاں، ایک پوری سپلائی غائب ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فلپ کی حرکت ہے۔“

”لیکن وہ تو مر چکا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے فلموں میں دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی پارٹنر بھی ہو۔“ میرا خیال ان لڑکوں کی طرف چلا گیا جو آخری بار سیلون میں آئے تھے۔ فلپ ان سے ہنسی مذاق کر رہا تھا۔

”اب تمہیں گھر آجانا چاہیے۔“ ہیمپٹن نے کہا۔

”جلدی پہنچ رہی ہوں۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ رکنا ہے۔“

میں فون بند کر کے سوچنے لگی کہ کیا مجھے سراغ رساں ویلس سے بات کرنا چاہیے۔ تاہم اس کے بجائے میں نے ڈیرل کا نمبر تلاش کیا۔ اس کے دفتر والوں نے بتایا کہ وہ سامان کی سپلائی کے لیے باہر نکلا ہوا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے فوری طور پر کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اب وہ سامان دینے سولھویں اسٹریٹ پر واقع کرل اینڈ کٹس، نامی سیلون کی طرف جا رہا ہے۔

میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گئی اور استقبالیہ پر بیٹھی نوجوان لڑکی سے کہا۔ ”میں ڈیرل کوپر کو تلاش کر رہی ہوں۔ مجھے فوری طور پر کچھ سامان چاہیے۔ اس کے دفتر والوں نے بتایا ہے کہ وہ یہاں مل جائے گا۔“

”وہ ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔“ اس لڑکی نے کہا۔

میری نظر ایک کونے میں رکھی ہوئی بوتلوں پر گئی جنہیں میں اچھی طرح پہچانتی تھی۔ ”تم نے یہ کولون کہاں سے خریدے؟“ میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔

”یہ ڈیرل نے متعارف کروائی ہے۔ بہت شاندار پروڈکٹ ہے۔ خاص کر اس کا جیسمین فلیور۔ تم انہیں لے جا سکتی ہو۔“

میں اسے بتانے والی تھی کہ یہ میری پروڈکٹ ہے جسے میں خود ہی تیار کرتی اور بیچتی ہوں اور بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ ڈیرل نے چوری کی ہیں لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور شکریہ ادا کر کے باہر آگئی۔

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ چور کون ہے۔ اس سے پہلے کہ میں ڈیرل کے اگلے اسٹاپ کے بارے میں سوچتی، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سفید وین ہیئر پیلس کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے چند فٹ کے فاصلے پر گاڑی کھڑی کی اور باہر نکل آئی۔ چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ ڈیرل کہیں نظر نہیں آیا۔ میں اس کی وین تک گئی اور عقبی شیشے سے اندر جھانکنے لگی۔ وہاں میری پروڈکٹ رکھی ہوئی تھی۔

”مسز ایمس؟“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ڈیرل تھا جو نہ جانے کہاں سے آگیا تھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے کہا۔

”یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے کہ جس سامان کی میں نے ادائیگی کردی تھی۔ وہ تمہاری وین میں کیوں رکھا ہے؟“

”معلوم نہیں تم کس کے بارے میں بات کر رہی ہو؟“

”میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ میرا سامان ہے۔ تم تو وہ خوشبو بھی لے آئے جو میں نے اپنے لیے تیار کی تھیں۔“

میں وین کے عقبی دروازے سے ٹیک لگائے ہوئے کھڑی تھی۔ ڈیرل نے میری طرف ایک قدم بڑھایا۔ میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی تھی کہ اس کے بازو کی مچھلیاں کتنی بڑی ہیں اور مضبوط ہاتھ پاؤں ہیں۔ وہ ہاتھ جو کسی آدمی کا گلا گھونٹ سکتے ہیں۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے، اسے بھول جاؤ۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔

”کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”یہی سمجھ لو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں پولیس کو فون کررہی ہوں۔“

”تم ایسا نہیں کروگی۔ اپنے کام سے کام رکھو ورنہ......“

”ورنہ میرا انجام بھی بے چارے فلپ جیسا ہوگا۔“

(اوہ میرے خدا، بعض اوقات میں اپنی زبان پر قابو کیوں نہیں رکھ پاتی)

ڈیرل نے مجھے غصے سے دیکھا اور سڑک پر نظریں دوڑانے لگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ سڑک پر کوئی ہے تو نہیں اور کیا وہ مجھے دن دہاڑے قتل کرسکتا ہے۔

میں بالکل خوف زدہ نہیں ہوئی اور بولی۔ ”فلپ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ تم نے اس بے چارے کو کیوں قتل کردیا؟“

”کیونکہ تمہاری طرح وہ بھی ضدی اور بے وقوف تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ میرے کام میں مداخلت نہ کرے۔“

”تمہیں اسے قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”ہاں، میں نے اسے قتل کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری بات مان جائے گا مگر وہ پولیس کو فون کرنے جارہا تھا لیکن میں نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔“

میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی۔ فلپ جسے میں ہمیشہ لیکچر دیا کرتی تھی، جس کے بارے میں یہ سوچا کہ شاید وہی میرا سامان چوری کررہا تھا لیکن وہ میرے سیلون کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا۔

”اب تم جان گئی ہو تو میں تم سے کہوں گا کہ شرافت سے میری وین میں بیٹھ جاؤ۔“

مجھ پر اپنی حفاظت کا جذبہ غالب آگیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی وین سے دور ہونے لگی اور پیچھے کی جانب ہٹنا شروع کردیا۔ ڈیرل نے میری طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آجاؤ مسز ایمس۔“

لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور مسلسل پیچھے کی جانب ہٹتی رہی۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح اپنی کار تک پہنچ جاؤں۔

”اگر مجھے یہیں گولی چلانا پڑی تو میں رکوں گا نہیں۔“

میں نے بے چین ہوکر سڑک پر نظر دوڑائی کہ کوئی میری جانب متوجہ ہے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ہاتھوں پر بے انگلیوں کے دستانے چڑھا لیے جو بیس بال کے کھلاڑی پہنتے ہیں اور میری طرف تیزی سے بڑھا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ تیزی سے گھوم کر اپنے بیگ سے اس پر حملہ کردیا جو سیدھا اس کی آنکھوں پر جا کر لگا۔

میں نے اس کے غرانے کی آواز سنی۔ اسی کشمکش میں میرے پیروں سے چپل نکل چکی تھی۔ میں نے ننگے پاؤں ہی ہیئر پیلس کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی چلاتے ہوئے کہا۔ ”دروازہ بند کرو اور پولیس کو فون کرو۔“

ایک عورت نے مجھے چائے پلائی تاکہ میرے اعصاب قابو میں آجائیں اور ہم پولیس کا انتظار کرنے لگے۔ ڈیرل یہ سوچ کر فرار ہوگیا کہ اگر وہ میرے تعاقب میں اندر آیا تو اس کے خلاف بہت سے لوگ گواہی دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد سراغ رساں ویلس بھی وہاں پہنچ گیا اور بولا۔ ”ہم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ اس کی وین شہر کے جنوبی حصے میں کھڑی ہوئی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ تمہیں اس کی گاڑی کا نمبر یاد تھا۔“

میں پُرسکون ہوکر کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ اس نے طنزاً کہا۔ ”اگلی بار پولیس کا کام ہمارے لیے چھوڑ دینا۔“

”اور تم بھی اپنے آپ کو اتنا مصروف ظاہر نہ کرنا کہ لوگ مایوس ہوکر خود ہی مجرم کی تلاش میں نکل پڑیں۔“

تھوڑی دیر بعد ہیمپٹن بھی وہاں آگیا۔ وہ میرے لیے جوتے لے کر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”وعدہ کرو کہ آئندہ تم ایسی حماقت نہیں کروگی۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کیا پتا مجھے دوبارہ پولیس کے حصے کا کام کرنا پڑ جائے۔“

دو دن بعد فلپ کی تدفین ہوگئی اور میرا سیلون دوبارہ کھل گیا۔ سب کچھ وہی تھا۔ لیکن مجھے فلپ کی کمی شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ میں اسے ایک کھلنڈرا اور بے پروا شخص سمجھتی رہی لیکن وہ تو بے حد فرض شناس اور وفادار نکلا جس نے میرے سامان کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے ایریل بول رہی تھی۔ ”معاف کرنا آنٹی۔ میں بہت مصروف تھی۔ تھوڑی دیر میں پہنچ رہی ہوں، تم بتاؤ کیا ہورہا ہے؟“

”کچھ نہیں، سوچ رہی ہوں کہ پرائیویٹ سراغ رساں کا لائسنس حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

آوارہ گرد

قسط:33

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گُل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گُل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک تو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناٹوٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی

نیں نے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک صبح کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لفنگا ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کا یا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹیکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہر بلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اگر میں فوری طور پر وہاں سے حرکت نہ کرتا تو حبسِ دم کا شکار ہو کر جان سے جا سکتا تھا۔

مجھے یہ کوئی اچانک حملہ لگتا تھا، جس کے متعلق پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ یہ محمود الحسن کے جاں فروش ساتھیوں کا کوئی ٹولا ہی ہو سکتا تھا اور یہ غالباً اس مجاہد ٹولے نے اپنے ساتھی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے کیا تھا یا پھر یہ حملہ ان کی کسی پرانی "پری پلاننگ" کا حصہ بھی ہو سکتا تھا۔

خطرہ مجھے بھی تھا، مجھے ان برمیوں کا ساتھی سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ ٹولا مرنے مارنے پر تلا بیٹھا تھا اور یقینی طور پر ان کا ٹارگٹ میجر کیم کھلا ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے لرزتے کیبن کے دروازے کی طرف دوڑ لگائی اور قریب پہنچا تو مجھے باہر وارف پر دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ دھوئیں اور بارود کے سلگتے بادلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

ہر طرف ایک افراتفری سی مچی ہوئی تھی، تاہم فائرنگ کے آہنگ سے محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ تبادلہ فائرنگ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یعنی جوابی حملے کے لیے یہ برمی بھی تیار ہو چکے تھے، تاہم یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انہیں کتنا نقصان ہوا تھا۔

سوئے اتفاق میں نہتا ہی تھا، حالانکہ ایک پستول میرے پاس تھا، مگر اس افراتفری میں جانے وہ کہاں رکھا تھا

یا کھو گیا تھا۔

اسی وقت ایک دھماکے سے کیبن کی چھت نیچے آرہی، اب میرا اندر محبوس رہنا محال ہی تھا، میں نے دروازے سے باہر جست بھری اور وارف پر انداز سے سے بیرونی راستے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

بارش ابھی تک ہو رہی تھی اور رن گھسان کا پڑا ہوا تھا...... مجھے چیخ و پکار اور شور کی بھی آوازیں آتی محسوس ہو رہی تھیں، ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے قریب ہی ایک سے زائد دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

تاریکی اور خنک آبی دھند میں مجھے وہ دو مسلح ہیولے ہی نظر آئے۔ جنہوں نے سروں پہ سیاہ رنگ کے صافے سے باندھے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا تھا ان کے بارے میں کہ یہ کون ہو سکتے تھے، ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں، ابھی وہ مجھ سے ذرا ہی فاصلے پر تھے کہ اچانک ان پر تین مسلح افراد ٹوٹ پڑے۔ وہ اچانک ہی اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر اُن پر پل پڑے تھے لیکن غافل وہ دونوں بھی نہیں تھے۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ انہوں نے بھی اپنے بچاؤ کے لیے بروقت حرکت کی تھی مگر بدقسمتی سے شاید ایک آدمی ان تینوں چھاپا ماروں کی گرفت میں آگیا تھا، کیونکہ اگلے ہی لمحے مجھے اس کی کرب انگیز چیخ سنائی دی تھی۔

میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور کیبنوں اور چوبی تختوں سے راستہ بناتا ہوا ایک طرف کو لپکا۔ اسی وقت مجھے لگا کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا تھا۔ حالانکہ بارش کا شور ہنوز جاری تھا، نیز جنگ کی صورت حال سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ متوقع جاں فروشوں کا حملہ ور گروپ کاری وار لگا چکا تھا اور اب...... اپنی اس کمانڈو مہم کو آخری نہج پر پہنچانے کے لیے کوشاں تھا۔ اس لیے اب دوبدو لڑائی کے علاوہ اکا دکا فائر یا کسی گرینیڈ کے دھماکے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

اپنے تعاقب کا شبہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب میں بیرونی راستے والے اس حصے کی طرف بڑھا تھا جدھر درمیانی سطح کی موٹر بوٹس موجود تھیں۔

میں اس سارے قصے پر لعنت بھیج کر نارتھ انڈیمان کی طرف اپنے ادھورے رہ جانے والے مہماتی سفر کی شروعات وہیں سے کرنا چاہتا تھا جہاں سے یہ منقطع ہوا تھا، شکر تھا کہ میں اپنی منزل سے زیادہ دور نہ تھا جبکہ یہاں پورٹ بلیئر کے شیارک آئی لینڈ میں کسی بھی انڈین پولیس یا کوسٹ گارڈ کی پیٹرولنگ ٹیمیں آسکتی تھیں۔ جس کے شبے کا اظہار اس طرح کے حالات میں ان دونوں باپ بیٹی کو بھی میں نے ایک دوسرے سے کرتے سنا تھا۔ اسی لیے میری یہی کوشش تھی کہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جاؤں۔

شارٹ موٹر بوٹ چلانا میرے لیے نسبتاً آسان ہوتا۔

اپنے تعاقب کا یقین کرنے کے لیے میں ایک ایسی جگہ آکر رکا جہاں گودی کے کنارے ایک بڑی لانچ کے ساتھ دو چھوٹی موٹر بوٹ مجھے دکھائی دی تھیں، یہاں لکڑی کی پیٹیاں اور بڑے بڑے بھاری بھرکم کینوسی بورے بھی رکھے نظر آرہے تھے۔ میں فوراً ان کے درمیان جا دبکا۔

بارش کا شور تھمنے لگا تھا، دور کیبنوں کی طرف سے کوئی چنگاری ایک شعلہ فشاں دھماکے سے بھڑکتی نظر آجاتی تھی۔ تاہم آگ بھی وہاں روشن تھی۔ کچھ کیبن شاید ہینڈ گرینیڈ پھٹنے سے آگ کی لپیٹ میں آگئے تھے، گودی پر پھیلا ہوا سامان بھی جل کر خاکستر ہونے لگا تھا۔ بحر ہند کے کنارے کا یہ حصہ اب ایک سلگتے علاقے کا منظر پیش کرتا نظر آتا تھا، مجھے انڈین نیوی پولیس کے کود پڑنے کا خدشہ زیادہ پریشان کر رہا تھا، اسی لیے میری کوشش تھی کہ یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے دور نکل جاؤں، لیکن اس نامعلوم متعاقب نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا، میں صرف چند ثانیے کے لیے یہاں دبکا بیٹھا رہا، جب عقب میں کوئی نظر نہ آیا تو اس گوشے سے نکلا اور ایک بار پھر بیرونی راستے کی طرف بڑھا، مگر ابھی چند ہی قدم بڑھائے تھے کہ اچانک مجھے اپنے بالکل قریب کوئی واضح آہٹ سنائی دی۔ چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے پلٹنے کی کوشش چاہی تھی کہ کوئی بھاری بھرکم وجود کے ساتھ مجھ پر پل پڑا۔

میں نے بیک وقت نہ صرف سنبھلنے بلکہ نامعلوم حملہ آور کے وار سے بچنے کی بھی کوشش کرتے ہوئے اس پر جوابی وار کیا اور نتیجے میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر پیٹیوں کے درمیان جا پڑے، مگر حملہ آور نے کچھ زیادہ ہی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور مجھ پر پل پڑا۔

اس نے میرے چہرے پر ایک گھونسا جڑ دیا، مجھے اس کی طاقت کا اندازہ ہوا، اس کا ہاتھ بھاری تھا۔ مجھے اپنا جبڑا ہلتا محسوس ہوا تو میرا دماغ بھی گھوم گیا۔ قہر و غضب کی لہر نے میرے اندر جنونی طاقت بھر دی، میں نے اس کے پیٹ پر اپنا گھٹنا رسید کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے تاریکی کے باعث یا پھر اندازے کی غلطی تھی کہ میرا گھٹنا اس کے پیٹ یا

سینے میں لگنے کے بجائے، کسی ٹھوس چوبی پٹی کے کونے سے ٹکرا گیا۔

یہ چوٹ شدید تھی، جس کے باعث میرے حلق سے بے اختیار چیخ سی خارج ہوگئی۔ جس نے حملہ آور کے حوصلے کو مہمیز کیا اور اس نے مجھ پر اسی وقت دوسرا بھرپور وار کیا۔

اس بار اس نے میری کنپٹی پر مُکّا رسید کیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، مجھے اپنے سر کو ایک دو بار ہی جھٹکے دینے کا موقع ملا تھا کہ اس نے میرے پیٹ پر لات بھی رسید کردی۔ میرے حلق سے تکلیف دہ کراہ خارج ہوگئی۔

وہ مردود تاریکی کے باوجود بڑے ٹھیک ٹھیک اندازوں سے مجھ پر کامیاب وار پہ وار کیے جارہا تھا، اور خود میرے حملوں سے بچ رہا تھا۔

تب ہی میں نے اس سے تھوڑی مار کھانے کے بعد اس کی ''پوزیشن'' کا اندازہ کیا اور بالآخر اس کے جسم کے نازک حصے پر لات چلادی۔

اس کا رزلٹ خاطر خواہ نکلا، مجھے اس کی ''اوغ'' سے مشابہ چیخ سنائی دی تھی۔ پھر میں نہیں رکا، اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اب میں بھی اس پر جنونی انداز میں پل پڑا۔

ہم دونوں اب لڑتے لڑتے نسبتاً کشادہ جگہ پر آگئے، جدھر دور قریب سے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تمازت اور روشنی پڑ رہی تھی اور تب ہی حملہ آور کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

وہ بدبخت ہوگرالی تھا۔ اسے پہچانتے ہی میں نے فوراً مصلحت سے کام لیا اور چلا کر بولا۔

''کیا تم مجھے نہیں پہچان رہے ہو ہوگرالی......؟ میں راج ہوں...... مجھ پر کیوں حملہ کیا ہے تم نے؟''

''میں تمہیں اچھی طرح پہچان گیا ہوں......'' اس نے غضب ناک لہجے میں کہا اور آخر میں ایک گندی گالی دی، جس نے میرا دماغ گھما دیا۔

''یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' کہتے ہوئے اس نے تیزی سے گردوپیش نگاہ دوڑائی، اس کے اس طرح دیکھنے پر مجھے یک بیک شبہ ہوا کہ اس کے دیگر ساتھی بھی پہنچنے والے تھے یا پہنچ چکے تھے۔

میں نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی تک میری طرف سے غلط فہمی کا شکار ہو...... یہ موقع میرے ساتھ لڑنے کا نہیں......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے عقب سے مجھے دو تین افراد دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔

میری پیشانی پر تفکر کی پرچھائیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ کیونکہ یہ مسلح تھے۔

''خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ میرے ساتھی تمہیں گولیوں سے بھون دیں گے۔'' اپنے ساتھیوں کی آمد پر وہ غیظ ناک انداز میں چیخا۔

میں ایک گہری سانس خارج کرکے وہیں کھڑا رہا۔ اس کے مسلح ساتھی تعداد میں تین تھے۔

ہوگرالی کی شاید مجھ پر نگاہ پڑ گئی تھی، اس نے مجھے فرار ہوتے دیکھ کر ہی میرا تعاقب کیا تھا اور جس حال میں بھی تھا میرے پیچھے دوڑ پڑا تھا، ساتھ ہی اپنے چند ساتھیوں کو بھی اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا تھا۔

''میں تمہاری تحویل میں ہوں...... کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کرکے کہا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو......'' ہوگرالی بھیڑیے کی سی خونخوار غراہٹ سے بولا۔ اس کا خار کھایا لہجہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ کافی دیر سے مجھ پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ ''چلو اس طرف......'' اس نے آخر میں مجھ سے تحکمانہ کہا۔

وہ خود میرے قریب آنے سے اب کترا رہا تھا، شاید وہ میرے لڑائی بھڑائی کے انداز سے سمجھ چکا تھا کہ میں کوئی عام شخص نہیں تھا۔

شاید یہی بات اس کے لیے ابتدا سے ہی مجھ پر شبہ کرنے کی وجہ بنی رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ برمی مسلم گروپ کے حملے کا جواب دینے کے بجائے یہاں کیا کررہا تھا؟ یا پھر وہ سب مارے گئے تھے، جبکہ ان کا بھی کم نقصان نہیں ہوا ہوگا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ اس کا رخ ان جلتے ہوئے کاٹیجز (کیبن) کے بجائے، اس جانب تھا جدھر دو تین موٹر بوٹس موجود تھیں۔ ان میں ہم سوار ہوگئے۔ مجھے بدستور گن پوائنٹ پر لیا ہوا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے بہت زیادہ ڈرے ہوئے اور محتاط دکھائی دے رہے تھے۔

ہوگرالی کا یہ کہنا کہ یہ سارا بکھیڑا میرا ہی پھیلایا ہوا تھا تو یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ میں نے جس طرح اپنی نادانستگی میں برمی مسلم گروپ کے محمود کو پکڑوایا تھا تو اس کی حقیقت جاننے کے بعد میں نے ہی اسے، اپنی جان پہ کھیل کر ان ظالم برمیوں کی قید سے چھڑوایا بھی تھا۔ تب سے ہی ہوگرالی

اور اس کے ''ہم نشیں'' جو شم کو مجھ پر شبہ تھا کہ میں ان کے دشمنوں کی جاسوسی کرنے کے لیے ان میں شامل ہوا ہوں، وغیرہ۔

بہرکیف اب میں دیکھنا یہ چاہ رہا تھا کہ اس تازہ حملے کے بعد کیا حالات تھے؟ کون زندہ بچا تھا اور کون مر چکا تھا؟ نیز اب یہ مجھے کہاں اور کس کے پاس لے جا رہے تھے؟

موٹر بوٹ میں ان کے ساتھ سواری کا مطلب یہ تھا کہ ان کا اب زمینی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اسی بات کی بو محسوس کر کے مجھے اپنے اندر رہ کر نامعلوم سنسنی خیزی کا احساس ہو رہا تھا۔

موٹر بوٹ مناسب رفتار سے ان کے گودی والے ٹھکانے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ سامنے ان کا ٹھکانا جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور کسی ویران مرگھٹ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں سے اب دھواں سا اُٹھنے لگا تھا۔

مگر ان کی منزل کسی اور جانب تھی، ٹھیک اسی وقت ایک بگل کی آواز ابھری، ہم سب ہی چونکے تھے، آواز کی جانب دیکھا تو میرے جسم میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگنے لگیں، وہ انڈین کوسٹ گارڈ کی لانچ تھی۔ وہاں سے فلش لائٹ پھینکی جا رہی تھی۔

''وہی بات ہوئی جس کا ڈر تھا، میں اسی وجہ سے بھاگ رہا تھا۔ اب کیا جواب دو گے انہیں مسٹر ہوگرالی؟''

میں نے چلا کر پریشانی سے کہا تو ہوگرالی نے مجھے خونخوار نظروں سے گھور کر کہا۔ ''تم اپنی چونچ بند رکھو...... میں نمٹ لوں گا ان سے، مگر یاد رکھنا، تم نے کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی یا بچاؤ کی صورت سمجھتے ہوئے خود کو ان کے حوالے کرنا چاہا تو میں تمہیں ہی مجرم ثابت کر دوں گا۔''

اس کی بات پر میں چونکا۔ میں بھلا کیسے خود اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارتا اور کیوں؟ میں تو خود ان سے بچنے کی کوشش میں تھا، تاہم ہوگرالی کو میں اپنی یہ کمزوری نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس کے عزائم کا اندازہ ہوتے ہی کہ یہ مجھے سردست اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا، مجھے یہ سن کر قدرے اطمینان ہوا تھا۔ گویا دشمن ہی دشمن کو بچا رہا تھا تو مجھے کیونکر اعتراض ہو سکتا تھا۔

ادھر ہوگرالی نے اپنے کسی ساتھی کو حکم دیا کہ جوابی اشارہ دے دیا جائے تاکہ کوسٹ گارڈ والے ان پر فائرنگ ہی نہ کھول ڈالیں۔ چنانچہ اس کے ایک ساتھی نے ٹارچ روشن کر کے جوابی اشارہ دے دیا اور لانچ روک دی گئی۔ ایسے میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے میں کتنا فائدہ اُٹھا سکتا تھا؟ یا یہ خود کو اور مجھے کس طرح اس انڈین کوسٹ گارڈ سے بچا سکتے تھے؟ کیونکہ میرے پھنسنے کے بھی امکانات بہرحال موجود تھے۔

ہوگرالی نے اپنے ساتھیوں کو اسلحہ ڈاؤن کرنے کا اشارہ کر دیا تھا اور خود ان سے مخاطب ہونے کے لیے اسی رنج پر عرشے پر آ کھڑا ہوا تھا جبکہ میں ان کے ساتھیوں کے بیچ گھل مل کر کھڑا ہو گیا تھا، جن کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں تھی۔

کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ ہمارے قریب آ کر ٹھہر گئی تھی اور اس کے عرشے پر مجھے دس بارہ مسلح افراد چوکس کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں روشنی تھی اور مستول پر ایک ریڈار گردش کر رہا تھا، جس پر ایک سرچ اور دوسری گردشی فوگ لائٹ نصب تھی۔

یہ سب سفید رنگ والی کوسٹ گارڈ کی مخصوص وردیوں میں تھے۔ انہی میں ایک اپنے شولڈر اور اس پر بنے مونوگرام سے ان کا آفیسر دکھائی دیتا تھا۔ یہ ایک دراز قامت شخص تھا اور اس کے ہمراہ ایک ساتھی ہاتھ میں میگافون لیے کھڑا تھا۔ لانچ کے قریب آتے ہی وہ بولنے لگا۔

''فرسٹ آرڈر...... اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے ایک قطار میں ریلنگ کے سامنے آ جاؤ...... ہری اپ۔''

ہوگرالی نے سب کو ان کا حکم ماننے کا اشارہ کیا اور پھر ہم سب اس کی تعمیل میں اسی طرح قطار بنائے ریلنگ کے سامنے کھڑے ہو گئے، ہوگرالی بھی ہمارے ساتھ تھا۔

ہم پر فلش لائٹ پھینکی گئی، جس کے باعث ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں تو ہم نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھوں کے چھجے بنا لیے۔

''سیکنڈ آرڈر...... تمہاری لانچ کے ساتھ سیڑھیاں لگائی جا رہی ہیں، تم سب اسی طرح قطار میں چلتے ہوئے ہماری لانچ تک آؤ گے۔''

تھوڑی دیر بعد ہم انڈین کوسٹ کی لانچ کے عرشے پر کھڑے تھے۔ ہماری جامع تلاشی لی گئی اور چند اہلکار ہماری موٹر بوٹ پر بھی تلاشی وغیرہ کے سلسلے کے لیے اُتر گئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اسی دراز قامت آفیسر نے ہوگرالی کو گھورتے ہوئے سوال کیا تو وہ رواں ہندی میں بولا۔

وقت

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرر بار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہر بار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

بہت جلد

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

”آفیسر! ہمارا تعلق فشری کمپنی سے ہے۔ ہم نے یہاں چند دنوں سے ڈیرا ڈالے رکھا تھا کہ کچھ بحری لٹیروں نے ہم پر حملہ کر دیا، اور ہمارا سارا ناپاب شکار اور سامان لوٹ کر لے گئے۔ ہماری مدد کو کوئی بھی نہیں آیا۔ ہمارا سب کچھ ان ظالموں نے ختم کر ڈالا۔“ یہ کہتے ہوئے ہوگرالی کی آواز بھرا گئی۔ میں اس کی اداکاری دیکھ کر خود بھی ایک لمحے کو حیران سارہ گیا۔

”تم کس علاقے سے تعلق رکھتے ہو؟“ آفیسر کے لہجے میں ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔

”آفیسر! ہم برما سے بے آف بنگال سی چینل پر چلے تھے اور نارتھ ٹو ساؤتھ شکار کرتے ہوئے یہاں پورٹ بلیئر میں آکر ٹھہرے تھے۔“

”پرمٹ دکھاؤ......“ انڈین آفیسر نے تحکمانہ کہا، اب اس کے لہجے کی تلخی کچھ کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

ہوگرالی نے جلدی سے اپنی جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک چرمی ڈائری نما کوئی شے نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ آفیسر نے اس سے یہ ڈائری نما شے لی اور کھول کر اس کے صفحات اُلٹ پلٹ کر دیکھنے اور پڑھنے لگا۔ اس کے بعد اپنے ساتھ چوکس کھڑے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ وہ اسے تھامے ہوئے اندر بڑے سے کیبن میں چلا گیا۔ اس دوران ہوگرالی اور اسی انڈین کوسٹ آفیسر کے درمیان ہی باتیں ہوتی رہیں۔

میں شکر ادا کر رہا تھا کہ ہم لوگوں سے چیدہ چیدہ پوچھ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ وہ اب تک ہوگرالی سے ہی مصروف گفتگو تھا اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اسی تک ہی محدود رہے، ہم سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کرے، ظاہر ہے پھر اس ”پوچھ گچھ“ کی لپیٹ میں، میں بھی آسکتا تھا، پھر میری ”اصلیت“ بھی آشکارا ہونے کا خطرہ ہوتا۔ اگرچہ ایسا خطرہ تو اب بھی محسوس کر رہا تھا، یعنی اپنے پہچان لیے جانے کا ڈر۔

تھوڑی دیر میں وہی ماتحت اہلکار ڈائری نما شے میں ملفوف وہ کاغذات لے آیا اور اپنے آفیسر کو تھمانے کے بعد اس کے کان میں جھک کر کچھ کہا۔

میری دھڑکتی ہوئی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ تب میں نے دیکھا کہ اس آفیسر نے وہ ڈائری نما کاغذات کی کتاب ہوگرالی کے حوالے کر دی۔ میں جیسے سرتاپا سماعت تھا۔ وہ اس سے بولا۔

”مسٹر ہوگرالی! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے برادر ملک کے ساتھیوں کو یہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ ہماری کوشش ہے کہ آپ کی مدد کریں، لہٰذا ہم بہت جلد ان مجرموں تک پہنچ کر آپ کے نقصان کا ازالہ کریں گے۔“

بظاہر خرانٹ نظر آنے والے اس انڈین آفیسر کی یہ بات میرے لیے حیران کن تھی، اس قدر جلد یہ معاملہ حل ہونے کی مجھے غیر یقینی سی مسرت ہونے لگی یا پھر شاید اس میں ہوگرالی کی ذہنی فراست اور مکاری کا کمال تھا، لیکن ایک بات بھی طے تھی کہ ہوگرالی والوں کا یا میجر کیم کھلا کا مقصد اس کاروبار کی آڑ میں کچھ بھی رہا ہو، بہرحال ایک معتبر جہازراں کمپنی کے (اڑیسہ کمپنی) توسط اور برمی ریٹائرڈ آرمی آفیسر کے تعارف اور کاغذات کی شناخت بھی اس آفیسر کے لیے ایک معتبر تعارف رہی ہو۔ پھر برما کے انڈیا کے ساتھ تعلقات اچھے اور ”برادرانہ“ بھی تھے۔

بہرکیف کچھ بھی سہی، ان کے ساتھ ساتھ میری بھی ”مکتی“ ہوگئی تھی کہ بات اِدھر ہی ختم ہوگئی تھی۔ ورنہ اگر معاملہ زیادہ آگے بڑھتا تو کم از کم میں ضرور لمبے چوڑے چکروں میں پھنس سکتا تھا۔

ہم سب کو واپس ہماری بوٹ میں اُتار دیا گیا۔ کوسٹ گارڈ والوں کی سرچ لائٹ آف ہو چکی تھی، تاہم ریڈار والی گردشی لائٹ جوں کی توں تھی۔

موٹر بوٹ میں آتے ہی ہوگرالی کے ساتھیوں نے فوراً مجھ پر گنیں تان لیں۔ میں بے پروا انداز میں اپنے سر کو جھٹکا دے کر مسکرا دیا اور ہوگرالی کی طرف دیکھ کر توصیفی لہجے میں بولا۔

”مان گئے تمہیں استاد! کیا غچا دیا ہے تم نے ان لوگوں کو...... ورنہ تو ہم سب ایک لمبی چوڑی تفتیش کے بہانے گئے تھے کام سے......“

”بکواس بند کرو اپنی......“ وہ میری طرف دیکھ کر نفرت انگیز انداز میں غرایا۔ ”میں نے ان سے وہی کہا جو سچ تھا۔“

”مگر اپنے پرانے دشمنوں کو بحری قزاقوں کا نام دے کر تم نے ان کے ساتھ کون سا سچ بولا ہے؟“

میں دانستہ گفتگو کی نہج کو اپنے مطلب پر لایا تا کہ ہوگرالی کے میرے سلسلے میں آئندہ کے عزائم واضح ہو سکیں۔ وہ بھناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”جھوٹ صرف اتنا ہی تھا کہ ہم پر قزاقوں نے نہیں، برما کے مہاجر مسلم لڑاکا گروپ نے حملہ کیا تھا، اس معاملے

سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی جبکہ میرے جھوٹ بولنے کا مقصد یہی تھا کہ ہم اپنے معاملات خود ہی حل کرنا جانتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ تم نے شاید کسی لمبے چوڑے چکر سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولا ہوگا، مگر تمہیں سچ بولنا چاہیے تھا، تاکہ یہ لوگ اس سلسلے میں تمہاری مدد کرتے، ان کے پاس پوری فورس ہے۔ اس مسلم لڑاکا گروپ نے نجانے تم لوگوں کا کتنا جانی و مالی نقصان کر ڈالا ہوگا۔ لیکن خدا کے لیے یہ تو بتا دو کہ میجر صاحب اور ان کی بیٹی سونگ کھلا خیریت سے تو ہیں ناں......؟'' میں نے اپنے لہجے میں تفکر سموتے ہوئے کہا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

''یہ مٹھی بھر لڑاکا مسلم گروپ اپنی اس غلطی کی سزا عنقریب بھگتنے والا ہے۔ ہمارے چند آدمیوں کو مارنے کے سوا یہ گروپ کچھ نہیں کر پایا ہے۔ ہاں! ہمارا مالی نقصان بہت کیا ہے، ہمارا سب کچھ تباہ کر دیا ہے، اب دیکھنا ہم برما جا کر ان کی اس غلطی کی سزا پوری مسلم کمیونٹی سے لیں گے۔ جس کا پلان میجر صاحب بنا چکے ہیں، وہ اور ان کی بیٹی اس حملے سے بال بال بچے ہیں اور اب تم نہیں بچو گے، کیونکہ تمہاری ہی وجہ سے یہ سب ہوا ہے، نہ تم محمود کو میری قید سے چھڑاتے، نہ وہ اپنے لڑاکا ساتھیوں کے ساتھ یہاں کا رخ کرتا۔''

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ مجھے سونگ کھلا کے بچنے یا نہ بچنے سے کوئی سروکار نہ تھا، مگر میجر کیم کھلا کے اس حملے سے بھی زندہ بچ جانے پر افسوس ہوا تھا۔ اس ظالم اور بدبخت کی عمر خدا نے ابھی شاید دراز کر رکھی تھی یا پھر یہ ''نیک کام'' میرے ہی ہاتھوں انجام پانے والا تھا اور اب میری اس ہٹ لسٹ میں یہ مردود ہوگرالی بھی شامل ہو چکا تھا۔ تاہم میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''تمہارا ابھی تک میری طرف سے دل صاف نہیں ہوا ہے۔ میرا بھلا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ میں خود ایک انڈین ہندو ہوں......''

میری بات پر اس نے بڑی تیز اور خرانٹ نظروں سے میرے چہرے کو گھورا اور پھر زہر میں بجھی مکروہ مسکراہٹ تلے بولا۔ ''ابھی پتا چل جاتا ہے تمہاری حقیقت کا......''

اس کے لہجے کی سنسنی خیز کاٹ پر ایک لمحے کو میں خود بھی اندر سے دہل گیا اور پہلا خدشہ یہی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں اس مردود کو کسی ٹھوس حوالے سے میری اصلیت کا تو نہیں پتا چل گیا؟ یا پھر یہ ایسے ہی ابھی تک میرے بارے میں ایک تشکیک بھرا اندازہ قائم کیے ہوئے ہے؟ جبکہ میجر کیم کھلا کی مجھے پوری حمایت حاصل تھی۔

گودی سے تقریباً آٹھ دس ناٹیکل میل کے سفر کے بعد سمندر کی پُرسکون لہروں پر ایک بڑی سی لانچ کھڑی نظر آئی، جس پر روشنی ہو رہی تھی۔ تاریک پانیوں میں یہ لانچ کسی قندیل کی طرح رکھی نظر آتی تھی۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس حملے کے بعد ''میجر کمانڈ'' کو فوری طور پر گودی سے دور کر دیا گیا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ یہ لوگ پہلے ہی سے اسی لانچ پر رہائش پذیر ہوں۔ خطرے کی صورت میں یہ فوراً دور دور چلے گئے تھے۔

ہوگرالی کی بات پر میں بظاہر بے پروا انداز میں اپنے کاندھے اُچکا کر رہ گیا اور ساتھ میں اپنا سر بھی اس انداز میں جھٹکا جیسے مجھے ہوگرالی کے خیال سے بالکل اتفاق نہ ہو۔ یہ محض اس کا لغو خیال تھا۔

بوٹ لانچ کے قریب آ کر روک دی گئی۔ پھر اس کے ساتھ سیڑھیاں لگا دی گئیں اور ہم سب سیڑھیوں کے ذریعے لانچ میں جا سوار ہوئے۔

عرشے پر ہی مجھے اِکا دُکا مسلح افراد دکھائی دیے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ برمی مسلم گروپ نے ان کی افرادی قوت کو زبردست دھچکا پہنچایا تھا۔ ان کے جو مزدور مارے بھی گئے تھے وہ بھی لڑاکا افراد ہی ہو سکتے تھے۔

مجھے وہاں جوشم بھی کھڑا نظر آیا۔ وہ اپنے مخصوص چوغے نما لباس میں تھا اور میری طرف بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے چھاپ لیا اسے......'' ہوگرالی نے جوشم سے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

''یہ جھوٹ ہے، میں فرار نہیں ہو رہا تھا۔'' میں نے فوراً کہا۔

''منہ بند رکھو اپنا، اس کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے کہ تم دوست ہو ہمارے یا دشمن۔'' جوشم نے اپنے مخصوص اور کڑکڑاتے لہجے میں میری طرف گھور کر کہا۔

ہوگرالی کے ساتھ اب جوشم بھی شامل ہو گیا۔ صرف دو افراد اس کے ہمراہ تھے۔ باقی باہر ہی رک گئے تھے۔ ہوگرالی نے کسی آدمی سے اپنی زبان میں کچھ کہا تھا جو ظاہر ہے میرے پلے نہیں پڑ سکا تھا، البتہ اس کے بعد اس آدمی نے فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔

مجھے یہ لوگ لے کر ایک ایسے کیبن میں آ گئے جہاں میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ موجود تھی، ایک خدمت گار ٹائپ آدمی بھی وہاں موجود تھا۔

میں نے اپنے چہرے پر خوف، اُلجھن اور پریشانی طاری کر لی تھی۔ میجر کیم کچھ اُلجھا ہوا مگر طیش میں نظر آ رہا تھا جبکہ سونگ کے چہرے پہ کچھ زہریلے سے تاثرات تھے۔ میجر کیم نے ہوگرالی اور جوشم کے سوا باقیوں کو کیبن سے نکل جانے کا اشارہ کیا تھا۔

''یہ فرار ہو رہا تھا، میں نے اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دبوچ لیا۔'' ہوگرالی نے بڑے فخر سے بتایا تو میں خار کھائے لہجے میں بولا۔

''تم نے کیا مجھے اپنے کسی دشمن کے ساتھ فرار ہوتے پکڑا تھا؟ میں تو اس صورتِ حال سے خود گھبرایا ہوا، خوف زدہ اور پریشان تھا کہ کہاں جاؤں؟ کہ میں بھی نہ مارا جاؤں......''

میری دلیل مضبوط تھی، یہی وجہ تھی کہ میجر کیم نے جب یہی بات تصدیق طلب لہجے میں ہوگرالی سے پوچھی تو میرا خیال تھا کہ اس کے پاس اثبات میں جواب کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ سچ بھی یہی تھا۔ لیکن اس وقت جیسے میرے پیروں تلے زمین نکل گئی جب اس بدذات نے صاف انکار کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ لڑاکا مسلم گروپ کے اُن چند مسلح افراد کے ساتھ تھا، جنہیں ہم نے فرار ہوتے وقت ہلاک کر ڈالا، لہٰذا اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں ہے سر! کہ یہ ان کا ہی جاسوس ہے...... اور اس نے یہ بھی ہم سے جھوٹ بولا ہے کہ یہ انڈین ہندو ہے، بلکہ یہ ایک مسلمان ہے، اس کی تصدیق کرنے کی اجازت مجھے دی جائے تو میں ابھی اس کا پول کھول کر رکھ دوں گا......''

ہوگرالی نے کہا تو میجر کیم کھلا کا چہرہ سیاہ پڑ گیا جبکہ میں نے دیکھا سونگ کھلا کے چہرے کا زہریلا پن اور گہرا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ بھی عود کر آئی تھی، صاف لگا تھا کہ وہ بھی ہوگرالی اور جوشم کے ساتھ مجھے پھنسانے کی سازش میں ان کی شریک کار بن چکی تھی۔

ہوگرالی کا جھوٹ اپنی جگہ، مگر مجھے اس بات نے پریشان کر دیا تھا کہ میرے سلسلے میں ہندو، مسلم کی جو ''تصدیق'' کروانے کی بات اس نے جس اعتماد سے کی تھی اس پر مجھے واقعی گہری تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ ''تصدیق'' کھڑے کھڑے اور سیکنڈوں کی بات تھی۔ پھر یہ آشکارا ہونے کے بعد کہ میں ہندو نہیں بلکہ ایک مسلم تھا تو اس ''سچ'' سے ہوگرالی کا جھوٹ سچ ہو جاتا۔ ان کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح مجھے میجر کیم کھلا کے سامنے مجرم اور برمی مسلم لڑاکا گروپ کا جاسوس ٹھہرا کر دم لیں۔

میں نے پل کے پل حالات کا تجزیہ کیا۔ ''تصدیق'' والی بات کے بعد میرا میجر کیم کے سامنے اپنی صفائی کا جواز پیش کرنا فضول ہی ہوتا۔ اس سے ہوگرالی کا جھوٹ ازخود سچ ثابت ہو جاتا۔ بات کچھ بھی رہی ہو، گھوم پھر کر ادھر ہی آ جاتی تھی کہ میں بہرحال ان کا دشمن تھا۔

تب ہی میرے اندر کا کمانڈو ایکا ایکی ایک انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا اور تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں اپنی موجودہ پوزیشن کو دیکھتے ہوئے میں نے بات سنبھالنے کی غرض سے میجر کیم کھلا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ ہوگرالی اور جوشم کو ابتدا سے ہی مجھ پر کیوں شبہ ہوتا رہا ہے؟ اور اس کے پیچھے ان کا آخر مقصد کیا ہے؟ آج نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ہوگرالی نے میرے منہ پر سفید جھوٹ بھی بڑے دھڑلے سے بول دیا کہ اس نے مجھے مسلم لڑاکا گروپ کے ساتھ فرار ہوتے ہوئے پکڑا ہے، جبکہ میجر صاحب......! سچ وہی تھا جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ حیرت ہے، آپ اس سے یہ سوال کیوں نہیں کر رہے کہ اگر اس نے مجھے ان لوگوں کے ساتھ فرار ہوتے ہوئے پکڑا بھی تھا تو پھر ان لوگوں کے ساتھ مجھے بھی ہلاک کر دیا ہوتا، مجھے کیوں زندہ چھوڑ دیا؟''

''اس لیے کہ ہمیں یقین ہے تم ان لڑاکا مسلم گروپ کے جاسوس ہو......'' ہوگرالی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''جب سے تم ہمارے ساتھ ملے ہو، تب سے ہی مسلم لڑاکا گروپ نے ہم پر حملے شروع کر رکھے تھے۔ ورنہ انہیں کیا معلوم تھا کہ ہم رنگون سے میلوں دور یہاں انڈیمان کے کنارے ٹھکانا کیے ہوئے ہیں؟''

اس کی دلیل بے پرکی ہونے کے باوجود مضبوط نظر آتی تھی۔ کیونکہ یہ سب تب سے ہی ہونا شروع ہوا تھا جب سے میں ان کے ساتھ ملا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

''بقول مس سونگ کھلا کے...... اور میری یہاں پر حاصل کردہ اپنی معلومات کے مطابق میجر صاحب کو خصوصی طور پر برمی بدھ بھکشوؤں نے برمی مسلم کمیونٹی آبادی اور مہاجروں کو برما سے بے دخل کرنے کا اسپیشل ٹاسک دے

رکھا ہے اور وہ کافی عرصے سے اس پر بڑی کامیابی سے (میں نے دل ہی دل میں اس کی کامیابی پر لعنت بھی بھیجی) عمل بھی کرتے چلے آرہے ہیں، تو یہ بات یقینی نہیں کہ میجر صاحب بھی مسلم لڑاکا گروپ کا ٹارگٹ بن چکے ہوں۔ میں اگر جاسوس ہوتا تو اس روز میجر صاحب کو کیوں ایک مسلم لڑاکا گوریلے کے قاتلانہ حملے سے اپنی جان پر کھیل کر بچاتا؟''

''ہم پر اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے...... کیونکہ بعد میں تم نے ہی محمود نامی اس گوریلے کو میری قید سے چھڑایا تھا مجھ پر دھوکے سے وار کر کے......'' ہوگرالی نے فوراً توجیہہ پیش کی۔

اسی وقت لانچ حرکت میں آگئی تھی۔ ہمیں ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں آتے ہی ہوگرالی نے اپنے جس ساتھی سے کچھ کہا تھا وہ شاید لانچ کی روانگی کا ہی حکم تھا۔

بہرکیف میرے اور ہوگرالی کے درمیان گرما گرم جرح جاری تھی کہ اچانک سونگ کھلا نے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے ہمیں اشارے سے خاموش کرا دیا اور خود اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تمہارے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے...... کہ تم واقعی راج کمار ہو یا اور کوئی......'' یہ کہنے کے بعد وہ اپنے باپ کی طرف بڑھی اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور پھر خود میری طرف معنی خیز مگر زہریلی مسکراہٹ سے تکتی ہوئی کیبن سے باہر نکلتی چلی گئی۔ کیبن کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

میں ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پایا تھا مگر دل میں بے چینی سی ضرور محسوس کرنے لگا تھا کہ ہوگرالی نے اپنے سچ نما جھوٹ کو چھپانے کے لیے جو ''شوشہ'' چھوڑا تھا، وہ کوئی گل نہ کھلا دے اور وہی ہوا۔

سونگ کھلا کے کمرے سے نکلتے ہی میجر کیم کھلا نے مجھ سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اپنی پینٹ اُتارو......''

میں دھک سے رہ گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک غیر روایتی مگر ''آک ورڈ'' طریقے سے میرے سچ اور جھوٹ کو اس بے ہودہ کسوٹی پر پرکھا جائے گا مجھے اس کی توقع تو تھی، کیونکہ ہوگرالی نے شوشہ ہی یہ ایسا چھوڑا تھا۔

میں ایک دم پُرسکون ہو گیا اور میجر کیم کھلا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میجر صاحب! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا...... میں ہندو نہیں ایک مسلمان ہی ہوں...... لیکن......''

''دبوچ لو اسے......'' میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ میجر کیم کھلا نے کرخت لہجے میں ہوگرالی کو حکم دیا اور اس نے میرے دونوں بازو پکڑ کر پیچھے کی طرف موڑ کر بظاہر مجھے بے بس کر دیا۔

میں نے میجر کیم کھلا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میجر صاحب! مسلمان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں آپ کے دشمنوں کا ساتھی ہوں؟ میں واقعی ایک انڈین ہی ہوں۔ لیکن مسلمان ہوں۔''

''تم نے پھر ہم سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟''

''اس کی ایک وجہ تھی۔''

''کیا وجہ تھی؟''

''جب مجھے آپ کی بیٹی مس سونگ نے اپنے دشمنوں کے بارے میں بتایا تھا تو میں ڈر گیا تھا کہ کہیں آپ لوگ بھی مجھے اپنا دشمن نہ سمجھ بیٹھیں...... حالانکہ میرا برما سے تعلق نہیں......''

مجھے مجبوراً محتاط رہتے ہوئے یہ کہنا پڑ گیا تھا، تاکہ میری گلوخلاصی کی کچھ صورت نکل سکے۔ کیونکہ متعصب برمیوں کو صرف برما کے مہاجر مسلمانوں سے نفرت تھی، وہ انہیں بے دخل کرنا چاہتے تھے جبکہ میں نے اپنا تعلق بھارت سے جوڑا تھا۔

''بات تب بھی ایک ہی ہے۔'' اس بار ہوگرالی زہرخند لہجے میں بولا۔ ''جب تمہیں یہ پتا چلا کہ محمود ایک مسلمان ہے تو تمہیں سخت پچھتاوا ہوا کہ تم نے نادانستگی میں اپنے ہی ایک مسلمان بھائی کو پکڑوا دیا اور پھر بعد میں تم نے ہی اسے نقاب پہن کر میری گرفت سے آزاد بھی کروا دیا......'' یہ کہتے ہوئے وہ میجر کیم کھلا سے بولا۔

''سر! میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، اُس روز اسی نے ہی اپنے چہرے پر نقاب چڑھا کر قیدی محمود الحسن کو آزاد کروایا تھا کیونکہ مسلم لڑاکا گروپ کبھی بھی اپنے چہرے پر نقاب نہیں لگاتے۔ کیونکہ وہ ظاہر ہوتے ہیں، وہ اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہمیں آج یہ اتنا بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ کیونکہ محمود کو اس کی مدد سے آزادی ملتے ہی اُسے اپنے لڑاکا گروپ کو حملے کے لیے تیاری کا موقع ملا...... اگر اب بھی میری بات پر شبہ ہے تو میں ایک آخری ثبوت پیش کرنے کو تیار ہوں......''

ہوگرالی کی اس آخری بات پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بدبخت مردود مجھے ہر قیمت پر آشکارا کرنے اور میجر

کیم کھلا کی نظروں میں ایک سنگین مجرم ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اس نے بہ آواز بلند کسی کو بلایا۔ ایک ساتھی فوراً اندر آ گیا۔ ذرا دیر میں سونگ بھی اندر آ گئی۔ اس وقت اس کا حسین چہرہ مجھے ایک زہریلی ناگن کی صورت نظر آ رہا تھا، وہ کہیں دور نہیں گئی تھی، شاید دروازے کے قریب ہی کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھی۔

میرے اور سونگ کھلا کے تعلقات میں اسی روز سے ہی گرہ پڑ گئی تھی جب میں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اسے اس کے باپ کا مکروہ چہرہ دکھایا تھا۔ اگر اس کا دل بھی بے گناہ انسانوں کے حوالے سے ہی سہی، میری بات کی حمایت کرتا تو میرے لیے بھی یہ سوشیلا اور رینا کی طرح قابلِ احترام ٹھہرتی، مگر اس کے برعکس اسے اپنے باپ کی بربریت پر کوئی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی اور اُلٹا وہ مجھ سے خائف اور بددل ہونے لگی تھی۔ پھر مجھے بھی اس کی پروا نہیں رہی تھی۔ نہ ہی مجھے اس کی کسی مدد کی ضرورت رہی تھی۔ وجہ یہی تھی یہاں رہتے ہوئے مجھے اب تک بہت سی باتوں کا اندازہ ہو چکا تھا کہ میری منزل کتنی قریب تھی، یہ شکر ہی تھا کہ ابھی میں انڈیمان میں ہی تھا۔

تاہم میں بے چین ہو گیا تھا کہ نجانے اب ہوگرالی تابوت میں کون سی آخری کیل ٹھونکنے والا تھا؟

ہوگرالی نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک رسن بستہ شخص کو دبوچے وہاں آن پہنچا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک درمیانے قدوقامت اور سانولے رنگ کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر کہیں سے بھی خوف اور ڈر کا شائبہ تک نہیں تھا، اس کے برعکس اس کی آنکھوں میں مجھے ایک عزم اور سرکشی کا طوفان سا کروٹیں لیتا محسوس ہوا۔

''سر! دشمن کا ایک آدمی ہماری گرفت میں آ چکا تھا۔ یہ ان کے لیڈر محمود الحسن کا ایک قریبی ساتھی ہے۔ عزیز نام ہے اس کا۔ میں نے اسے پوچھ گچھ کے لیے ابھی تک زندہ چھوڑ رکھا تھا، مگر یہ بھی ان کی طرح پتھر ہے، کچھ نہیں بتا رہا، یہ اب یہاں کام آ جائے گا...... اور اس بات کا بھی پتا چل جائے گا کہ اس کا (میرا) دل اپنے اس مسلمان بھائی کے لیے کتنا دھڑکتا ہے۔ آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہیں......''

ہوگرالی نے میجر کیم سے کہا اور آخر میں اس کے لہجے سے بڑی سفاکیت آمیز معنی خیزی جھلکنے لگی تھی۔ مجھے بھی وقوع پذیر ہونے والی ایک سنگدلانہ حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا... اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ برمی مسلم قیدی اب میری جانب اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ یہ سارا کھیل ابھی شاید پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میجر کیم کھلا کے مکروہ چہرے پر بڑی بے رحمانہ مسکراہٹ اُبھری جیسے اس نے ہوگرالی کی بات پر پورا پورا صاد کیا ہو۔ وہ اُٹھا اور ایک قریبی میز کی دراز سے سیاہ رنگ کا پستول نکال لیا۔ اس کے بعد چند قدموں کے فاصلے پر ٹھہر کر اس نے پستول کی نال کا رخ اس بدنصیب قیدی کے سینے کی طرف کر دیا۔ قیدی نے اپنی یقینی موت کو سامنے دیکھ کر بھی میجر کیم کھلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھی تھیں۔

''ٹھہر جاؤ میجر صاحب!'' میں نے یکدم چلّا کر کہا۔

ہوگرالی کے چہرے پر ایکا ایکی فاتحانہ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ جوشم بھی کب کا اندر آ چکا تھا۔ اس کے مکروہ ہونٹوں پہ بھی شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی جبکہ میجر کیم کھلا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ قیدی کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ میجر کیم کھلا کی اُنگلی پستول کے ٹریگر پر تھر تھرانے لگی تھی۔

''میں کبھی ایسے حالات سے نہیں گزرا ہوں میجر صاحب! اس لیے کوئی بھی انسان ہو خواہ کسی مذہب سے بھی تعلق رکھتا ہو، میری طرح ایک عام انسان یہ اندوہناک منظر دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔''

''ٹز...... ٹز......''

میری بات پوری ہوئی تھی کہ کیبن کی دم بہ خود فضا میں دو فائر ہوئے اور اس بدنصیب برمی قیدی کے سینے میں دو سرخ روشندان بن گئے۔ جہاں سے خون اُبل پڑا تھا، وہ کھڑے کھڑے تیورا کر کیبن کے فرش پر گر کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

یکلخت میرے اندر سناٹے اُترتے چلے گئے، ایسے سناٹے، جن کی دھڑکتی خاموشی کے پیچھے نجانے کتنے طوفان چھپے ہوتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی ننگی بربریت مجھے ہمیشہ ہتھے سے اُکھاڑنے کا باعث بنتی تھی اور پھر یہ تو معاملہ ایک مسلمان کا متعصب برمی کے ہاتھوں بیدردی سے ہلاک ہونے کا تھا۔ یہ مجھے جانتے نہیں تھے کہ میں اصل میں کون تھا اور کیا تھا۔ کتنی قیامتیں ہر وقت میرے اندر کروٹیں بدلتی رہتی تھیں۔ کتنے طوفانوں سے میں اب تک گزرتا رہا تھا اور خود کو سورما سمجھنے والے نجانے کتنوں کو میں فنا کے گھاٹ کے اُتار چکا تھا۔

پل کے پل میں نے پیشِ نظر ماحول کا جائزہ لیا۔

وہاں میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی کے علاوہ ہوگرالی اور جوشم بھی موجود تھے، ایک ان کا ساتھی اور بھی تھا۔

تب پھر ایکا ایکی جیسے میرے وجود میں پارا دوڑ گیا، انداز برق کی طرح میں متحرک ہوا تھا اور ہوگرالی کے پیٹ پر میری زوردار لات پڑی۔ یہ حملہ اس کے لیے اچانک اور کاری ثابت ہوا، وہ اپنے حلق سے ایک بھیانک چیخ خارج کرتا ہوا کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میجر کیم کے ہاتھ میں پستول تھا، اس کا رخ اس نے میری جانب موڑنا چاہا تھا کہ میں ماہیِ بے آب کی طرح مچلا اور اپنے وجود کو اس طرح سوئپ کیا کہ میں اس کے پستول سے کیے جانے والے متوقع فائر سے بھی بچ سکوں اور اسے رگید تا بھی چلا جاؤں۔

گولی چلی اور کیبن کی دیوار میں پیوست ہوگئی۔ دوسرا فائر داغنے کے لیے اس نے پوزیشن بدلنا چاہی تھی کہ میری قینچی کی طرح چلتی ہوئی ٹانگیں، اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرائیں، نتیجتاً وہ کیبن کے فرش سے چند انچ اُچھلا اور جب دھڑام سے نیچے آرہا تو اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔

جوشم نے حلق سے ''مُشتری ہوشیار باش'' جیسی کوئی آواز خارج کی تھی کہ وہاں موجود اس کے ساتھی نے بہ سرعت حرکت کی اور وہ میری جانب لپکا۔ میں تب تک میجر کیم کھلا کے ہاتھ سے گرا ہوا پستول اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔

پہلی گولی میں نے اسی پر چلائی تھی اور وہ اپنے سرخ پڑتے سینے پر ہاتھ رکھتا ہوا کربہ انگیز چیخ کے ساتھ نیچے آرہا تو میرا دوسرا نشانہ میجر کیم کھلا تھا۔

میجر کیم کھلا کو ہلاک کرنے کا مشن صرف میرا ہی نہیں، محمود اور برما کے ان تمام خانماں برباد مظلوم مسلمانوں کا بھی تھا، جس پر اس خبیث نے زمین تنگ کر رکھی تھی۔ جس کے بدلے میں وہ وہاں کے متعصب بدھ بھکشوؤں سے مال و مراعات حاصل کرتا رہا تھا۔

میرے دوسرے فائر نے میجر کیم کھلا کی پیشانی میں سرخ روشندان بنا دیا۔ وہ بے رحم خبیث بغیر کوئی آواز نکالے وہیں ڈھیر ہوگیا۔

سونگ کھلا جو اَب تک تیزی سے بدلتی اس صورت حال پر ہک دک کھڑی تھی، اپنے باپ کو واصلِ جہنم ہوتے دیکھا تو اس کا جیسے سکتہ ٹوٹا اور اس نے اپنے حلق سے ایک تیز تھرّاتی ہوئی چیخ خارج کی۔

ہوگرالی تو میری ایک ہی لات کھا کر دیوار سے ٹکرانے کے بعد ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ میں سب سے پہلے کسی شکاری باز کی طرح سونگ کھلا پر جھپٹا اور اسے کسی کمزور چڑیا کی طرح دبوچ لیا۔ اس کی حسین و دلکش آنکھوں میں خوف کی پھریریاں سی لہرانے لگی تھیں، اس کے لیے میرا یہ جارحانہ اور جنگجوانہ روپ نیا تھا۔

میرا یہ مرحلہ وار گوریلا ایکشن جیسے ہی اپنے منطقی انجام کو پہنچا، میری توقع کے عین مطابق کیبن کے دروازے سے دو تین مسلح بری دھڑدھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔

''خبردار......! کسی نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو یہ جان سے جائے گی۔'' میں بھیانک لہجے میں غرا کر بولا۔

میں نے تب تک سونگ کھلا کو دبوچ کر اس کی کنپٹی سے پستول کی نال لگا دی تھی۔ وہ سب میرا یہ خونیں روپ دیکھ چکے تھے۔ اب جو سونگ کھلا کو اس حال میں دیکھا تو اپنی جگہ جہاں کے تہاں ٹھہر گئے۔

جوشم تو جیسے دم بہ خود ہی ہو کر رہ گیا تھا جبکہ ہوگرالی قدرے سنبھلنے کے بعد دیوار کے ساتھ ہی پشت ٹکائے کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک پیٹ پر تھا۔ چہرے سے غیظ ناکی کے علاوہ تکلیف کے آثار بھی تھے۔

''اِسے چھوڑ دو...... تم یہاں سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔'' وہ مجھے خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا۔ میں نے اس کی طرف باز جیسی تیکھی نظروں سے دیکھا اور میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔

''ہوگرالی......! ہمارا اور تمہارا قصہ اِدھر ہی ختم ہوسکتا ہے، اگر مجھے یہاں سے مزید کوئی خون خرابا کیے بغیر نکل جانے دیا جائے......'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہ صورت دیگر اس جنگ کو بڑھانا چاہتے ہو تو اپنا شوق پورا کرلو...... اپنے بچاؤ کے لیے میں یہاں، مس سونگ کھلا سمیت لاشیں گرانے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاؤں گا......''

میرے لہجے کی سفاکی اور جوشِ جنوں خیزی نے ان پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور سونگ کھلا ہی کے منہ سے لرزیدہ سی آواز برآمد ہوئی۔ وہ خوف اور تحکمانہ انداز کے ملے جلے لب و لہجے میں بولی۔

''اِسے نکل جانے دیا جائے...... تم سب اپنے ہتھیار ڈال دو...... جلدی۔''

ہوگرالی نے اب اپنے مضروب پیٹ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ میری جانب گھور کر دیکھتے ہوئے وہاں موجود اپنے مسلح ساتھیوں سے تحکمانہ بولا۔ ''ہتھیار پھینک دو...... اور اِسے جانے دیا جائے۔''

ساتھیوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل چاہتے ہوئے جب

اپنے ہتھیار جھک کر فرش پر ڈالنے چاہے تو قریب کھڑے ادھیڑ عمر جوشم نے چلا کر کہا۔ ’’کوئی بھی اپنے ہتھیار نہیں پھینکے گا......‘‘

ہتھیار زمین پر ڈالنے والے اس کی آواز پر رک گئے۔ ہوگرالی اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف تکنے لگا جبکہ سونگ کھلا کے چہرے پر برہمی کے تاثرات ابھرے تھے۔

’’یہ یہاں سے ہرگز نہیں جائے گا......‘‘ وہ آگے بولا.... ’’یہ ان مسلم لڑاکا گروپ کا خطرناک جاسوس ہے اور اس نے ہمیں اور ہمارے مشن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ مس سونگ کھلا کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا اور اسے بھی مار کر بھاگ جائے گا۔ ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔‘‘

میں اس کی بات پر اندر سے ذرا پریشان سا ہوا تھا۔

’’یہ تم کیا کہہ رہے ہو، جوشم! ہوش میں تو ہو......؟‘‘ ہوگرالی نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے حیرت سے کہا۔

’’تمہارا مطلب ہے یہ مس سونگ کھلا کو ہلاک کر ڈالے؟‘‘

’’ہم نے میجر صاحب کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا ہے تو مس سونگ کھلا کا صدمہ بھی ہمیں برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ یہاں سے نہیں جائے گا۔‘‘

میں نے دیکھا اس کی بات پر ہوگرالی کے مکروہ چہرے پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

’’یہ کیا بکواس کررہے ہو تم؟‘‘ معاً ہی سونگ کھلا لرزتی ہوئی آواز میں غصے سے بولی۔

’’جوشم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، مس سونگ!‘‘ ہوگرالی نے اچانک بدلے ہوئے اور مکروہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’یہ تمہاری ہی غلطی تھی کہ تم نے اس اجنبی پر بھروسا کیا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود اس کے ساتھ تم نے راہ و رسم اور محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش بھی کی...... یہ سارا تمہارا ہی کیا دھرا ہے، مگر ہم دشمنوں کے اس خطرناک جاسوس کو زندہ یہاں سے ہرگز نہیں جانے دیں گے، تم اب اپنی اس غلطی کی سزا بھی خود ہی بھگتو......‘‘

میرے اندر لحظہ بھر کو ہول سا اُٹھا تھا۔ شاید میجر کیم کھلا کی موت کے بعد ان کی نظروں میں سونگ کھلا کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

جوشم جو مجھے خالصتاً متعصب بدھ بھکشوؤں کے روپ میں ہی نظر آرہا تھا، اس نے بڑی چالاکی سے اس نازک صورتِ حال میں سونگ کھلا کی حیثیت کو ’’مائنس‘‘ کردیا تھا۔

سونگ کھلا کا غصہ اور برہمی سب فرو ہونے لگا تھا اور اب اس کے حسین چہرے پر موت کی زردی پھیلنے لگی تھی۔

میں خود اس کا یا پلٹتی صورتِ حال پر اس قدر تشویش آمیز پریشانی کا شکار ہوگیا تھا کہ اپنی اس کیفیات کو چھپا نہ سکا تھا جو شکنوں کی صورت میں میری فراخ پیشانی پر نمودار ہونے لگی تھیں۔ کچھ بھی سہی، میں نے سونگ کھلا کو ایسا کوئی جرم کرتے نہیں دیکھا تھا جس کی وجہ سے میں اسے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتا اور پھر یہ میری اپنی فطرت کے خلاف بھی تھا کہ میں ایک عورت ذات کو یوں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار ڈالتا۔

یہ حالات اور ہی نہج پر آنے لگے تھے جبکہ وہ اب میری جانب رحم طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ ان خوبصورت اور کشادہ آنکھوں میں ایک گلہ بھی تھا، جس کے اظہار پر اس کی تصویر یوں بنتی تھی کہ وہ مجھ سے جیسے کہہ رہی ہو......

’’راج......! میں نے تمہیں ان سب لوگوں میں اس وقت پسند کیا تھا جب یہ سب تمہیں ناپسند کرتے تھے اور تمہیں اپنا دشمن سمجھتے تھے، مگر میں نے انہیں تمہارے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھانے دیا تھا جس سے تمہاری ذات کو نقصان پہنچتا، درمیان کی غلط فہمی اور بات تھی، مگر اب...... میری زندگی تمہارے ہاتھ میں اور داؤ پر لگی ہوئی ہے تو کیا میں یہ سمجھوں کہ میں نے تمہیں، کالے زہریلے بچھوؤں سے بچا کر اپنی موت کے پروانے پر دستک دی تھی......؟

دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں اور خیال بھی کلک ہوا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ مکار جوشم کی کوئی چال ہو۔ یہ دیکھنے کی غرض سے میں نے بدستور اسی سفاکی سے جوشم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کچھ بھی کہو، مگر میں اسے نہیں چھوڑوں گا...... مجھے راستہ دو......‘‘

اسی وقت جوشم نے قریب کھڑے اپنے آدمی کی گن پر جھپٹا مارا اور اس کا رخ ہماری طرف کردیا۔

سونگ کھلا کو میں نے ڈھال بنا رکھا تھا اور وہ جوشم کی گن کے نشانے پر تھی۔ اس کا نرم و گداز سا نازک بدن میری باز جیسی گرفت میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا کہ اچانک جوشم نے گن لے کر ہماری طرف برسٹ فائر کردیا۔

☆☆☆

جوشم کا نشانہ سونگ کھلا سمیت میں ہی تھا جبکہ میں نے

پوری یکسوئی اپنی باز جیسی آنکھوں میں سمیٹ لی تھی جو اس کی ایک ذرا جنبش پر مرتکز تھی۔ جیسے ہی میں نے ٹریگر پر اس کی اُنگلی کو حرکت کرتے دیکھا، سونگ کھلا سمیت میں نے خود کو ایک طرف گرا دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ کیبن کی دیواروں تک کو چھید گئی۔ گرتے ہی میں نے سونگ کھلا کو سنبھالا اور اپنے پستول پر گرفت کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے جوشم کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

میں فقط اس مردود جنگجو کی چیخ ہی سن سکا تھا کیونکہ میں دروازے کی چوکھٹ کے قریب ہی گرا تھا اور جوشم پر فائر کرتے ہی میں نے سونگ کھلا سمیت لڑھکنی لگا دی تھی۔

یہاں سونگ نے ایک عجیب حرکت کی اور میرے چہرے پر ایک لات رسید کر کے خود کو میری گرفت سے چھڑا کر ایک طرف کو بھاگی، اور پھر نجانے کیا سوچ کر میں بھی اسی کے پیچھے دوڑ پڑا۔

عقب میں چیخنے چلّانے کا شور سا ابھرا۔ مگر ہم آگے پیچھے دوڑتے ہی رہے اور تب ہی میں نے سونگ کھلا کو عرشے کی ریلنگ سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ میں دوڑتا ہوا قریب پہنچا اور ریلنگ سے لگ کر نیچے جھانکا۔ وہاں دنبالے کے ساتھ ایک چھوٹی موٹر بوٹ بندھی تھی۔ غالباً یہ وہی موٹر بوٹ تھی جس پر ہوگرالی وغیرہ مجھے سوار کرا کر گودی سے اس لانچ تک یرغمال بنا کر لائے تھے۔

میں نے دیکھا، سونگ کھلا اب اس کے بونٹ پر گری ہوئی تھی مگر اس نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک لیور کھینچ کر بوٹ کو دنبالے سے الگ کر دیا۔

پل کے پل میں اس کا مقصد سمجھ گیا اور اسی وقت عقب میں برسٹ چلنے کی آواز ابھری، میں نیچے جھک گیا اور دوسری جانب سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

سمندری رات جوبن پر تھی۔ آسمان پر ہنوز کالے بادلوں کا بسیرا محسوس ہوتا تھا کیونکہ ستارے کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی دور کہیں جھکے چاند کی روشنی بھی محسوس ہوتی تھی۔ میں شور زدہ اور بپھرے ہوئے سمندر میں تیرتا ہوا موٹر بوٹ کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ سونگ کھلا نے اس کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو رہی تھی۔ اب شاید اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں بچا تھا اس کے سوا...... مگر مجھے اپنے بیچ منجدھار میں پھنسنے کی فکر ہوئی جو میرے لیے کسی لحاظ سے بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔

موٹر بوٹ نے ایک گردشی موڑ کاٹا اور وہ میرے قریب سے طوفانی رفتار کی طرح گزری تو اس کے پیچھے جانے کس طرح کھلی رہ جانے والی موٹی رسی میرے ہاتھوں میں آ گئی جسے میں نے فوراً مضبوطی سے پکڑ لیا۔

بوٹ لمحہ بہ لمحہ لانچ سے دور ہوتی چلی گئی مگر میں پانیوں میں غوطے کھانے لگا۔ میں صرف رسی کو تھامے ہی رکھ سکتا تھا، آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ بوٹ تک پہنچ کر اس میں سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ موٹر بوٹ کی رفتار اور دوسرے پانی کے دباؤ سے مجھے اپنا وجود ہی سنبھالے رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

تاہم میں نے رسی کو بدستور تھامے رکھا تھا۔ بوٹ سے اس کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ لیکن مجھے اس خطرے کا بھی احساس تھا کہ اگر میں نے جلد ہی کوئی ایسی کوشش نہ کی تو میں زیادہ دیر جم نہ پاؤں گا اور رسی میرے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گی، تب میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنی سی کوشش کرتے ہوئے رسی سے بوٹ تک کا اپنا فاصلہ کم کرنے لگا، رفتار کم سہی مگر بڑھوتری کی جانب تو مائل تھی۔

اس کوشش میں میرے بازو شل ہو گئے تھے، سانسیں پھولنے کی وجہ سے غوطے بھی لگ رہے تھے، بڑا مشقت طلب کام تھا یہ، مگر میں نے بھی ہمت نہیں ہاری، میں نے اپنے ذہن کو آمادہ کر لیا تھا کہ میں بوٹ تک اسی طرح پہنچ کر رہوں گا کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا، رسی چھوٹ جاتی تو گہرے پانیوں کا یہ ہلکورے لیتا ہولناک ویرانہ میرا مقدر ہوتا۔

بالآخر ہمت اور حوصلے کے ساتھ میں بوٹ کے دنبالے تک پہنچ ہی گیا مگر تب تک میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔ کوئی پل جاتا تھا کہ رسی میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی کہ میں نے اپنے شل زدہ وجود کی آخری کوشش کرتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ دنبالے کی عقبی دیوار پر ابھرے ہوئے ایک آہنی کنڈے سے ٹکرا دیا اور اسے دبوچ لیا۔ کچھ دیر ستایا اور اس کے بعد میں دنبالے پر چڑھ کر اندر جا گرا۔

میرے اعصاب شل ہو چکے تھے، پورے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں، میں تھوڑی دیر تک اسی طرح نڈھال اور بے سدھ سا پڑا رہا۔ تاآنکہ میرے اعصاب پُرسکون اور بے ترتیب سانسیں بحال نہ ہو گئیں۔

اس کے بعد میں ڈرائیونگ کیبن کی طرف بڑھا اور

وہاں میں نے شیشے کی ونڈ اسکرین کے پیچھے سونگ کھلا کو وہیل سنبھالے ہوئے پایا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، غالباً اسے میرے اس طرح بوٹ میں سوار ہونے کی بالکل اُمید نہ رہی تھی۔

میں اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے اس اوپن ڈرائیونگ کیبن میں آیا تو سونگ کھلا وہیل چھوڑ کر مجھ پر کسی جنگلی بلی کی طرح جھپٹی۔

"تم......تم......خونی! ظالم! بے رحم! تم نے میرے پاپا کو بے رحمی سے مار ڈالا...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے چلّانے لگی اور اس نے اپنے نکیلے ناخنوں سے میرے چہرے پر کھرونچے ڈالنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو قابو کیا اور غصے سے دانت پیس کر بولا۔

"اپنے پاپا کے لیے تم کیا کہو گی؟ جس نے اتنے سارے بے گناہ اور مظلوم مسلم خاندانوں کو بے گھر کیا اور اُن کا خون بہایا۔ اُس بدنصیب قیدی کے بارے میں کیا کہو گی تم، جسے تمہارے پاپا نے ہم سب کے سامنے چشم زدن میں گولی مار کے ہلاک کر ڈالا......"

"وہ مجرم تھے۔" وہ نفرت سے اپنے دونوں ہاتھ جھٹک کر میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

"کیا جرم کیا تھا اُنہوں نے؟" میں نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اُنہوں نے ہم پر کئی بار قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ایک بار رنگون میں ہماری رہائش گاہ پر بم پھینکا تھا اور آج ہمیں تباہ و برباد کر ڈالا اُنہوں نے...... اور اس بار وہ صرف تمہاری وجہ سے کامیاب ہوئے۔" وہ نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

"اچھا!" میں نے طنزیہ کہا۔ "تم بھولی ہو یا مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو؟ کبھی تالی ایک ہاتھ سے بجی ہے؟ مجھے ایک سوال کا جواب دو صرف...... وہ لوگ تمہارے دشمن کیوں بنے؟ مجھے پہلے اس سوال کا جواب دو؟"

وہ میری بات پر لاجواب سی ہوگئی اور منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے زہرخند لہجے میں اس سے کہا۔

"مس سونگ کھلا! دنیا کا کوئی بھی مذہب کسی بے گناہ پر ظلم کرنے کا درس نہیں دیتا ہے مگر تم لوگ شاید یہ درس فراموش کر بیٹھے ہو۔ کیا بگاڑا تھا تم لوگوں کا اُن معصوم اور بے گناہ برمی مسلمانوں نے؟ تم لوگوں نے جن کا آرام و سکون غارت کر دیا اور اُنہیں نہ صرف اپنی سرزمین سے بے دخل کر دیا بلکہ ان کی املاک اور جائدادوں کو آگ لگا دی، بے رحمی اور بے دردی سے ان کا قتلِ عام کیا۔ وہ اس داغ کو بھولیں گے کبھی؟ ہرگز نہیں۔ لیکن کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ تمہارے پاپا کے مرتے ہی تمہارے اپنے لوگ، جن کی حیثیت تمہارے ملازموں کی سی تھی، تمہارے ہی جان کے دشمن بن گئے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ تمہیں اب بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور پھر وہ وہیل کے سامنے والی ایک چھوٹی سی دیوار گیر بینچ پر بیٹھ گئی اور گومگو سے لہجے میں بولی۔ "کچھ بھی سہی، تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میں تمہیں پسند کرتی تھی۔ مگر تم ان کے جاسوس نکلے۔"

"میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا، مس سونگ کھلا!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ "رہا سوال تمہاری پسند ناپسند کا وہ تمہارا اپنا ذاتی فعل تھا، میں ایسا کچھ نہیں سمجھتا تھا، نہ ہی اب سمجھتا ہوں مگر میں تمہارے اس الزام کو رد کرتا ہوں کہ میں تمہارے دشمنوں کا جاسوس تھا۔"

"تو پھر تم کون ہو؟ اور نارتھ انڈیمان کے اس کالے بچھوؤں والے صحرا میں کیا کر رہے تھے؟"

"میں اپنے ساتھیوں کو ایک وحشی قبیلے کی قید سے چھڑانے کے لیے نکلا تھا۔" میں نے جواب دیا اور پھر اس سے گفتگو کا سلسلہ موقوف کرنے کی غرض سے کمپاس کی طرف آیا۔

بوٹ کا رخ رنگون کی طرف تھا۔ میں نے اس کا رخ نارتھ انڈیمان کی طرف موڑنا چاہا تو سونگ کھلا ایک بار پھر جنگلی بلی کی طرح غرا کر میری طرف لپکی۔

"تم نے بوٹ کا رخ کیوں بدل ڈالا؟ میں اپنے شہر رنگون لوٹ رہی تھی۔"

"تم چاہے جہنم میں جاؤ، مگر پہلے مجھے میری منزل پر اُتارو گی۔" میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"اس میں اتنا فیول نہیں ہے کہ تمہیں نارتھ انڈیمان کے ساحل پر اُتارنے کے بعد میں رنگون کا رخ کر سکوں۔" وہ غصے سے بولی۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

وہ شکست خوردہ ہی نہیں زخمی بھی محسوس ہوا مجھے۔ اس کی حالت بڑی دیدنی ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے اسی وقت بوٹ سے نیچے دھکا دے ڈالے۔

”میں چیک کرتا ہوں فیول، مگر تم بوٹ کا رخ نہیں بدلو گی۔“ میں نے اس کی طرف سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔

سونگ کا جھوٹ کھل گیا۔ فیول کافی تھا۔ میں ابھی ڈائلز پر ہی جھکا ہوا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کی آہٹ کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے پلٹا ہی تھا کہ میں نے کسی کو ایک آہنی سریے سے خود پر وار کرتے پایا۔ بس، وہ ایک جھلک ہی تھی، میں اپنا سر ہی بچا سکا تھا ورنہ اس موٹے سریے کی ایک ضرب میرا مغز کھول دینے کے لیے شاید کافی تھی، سریا میرے دائیں کاندھے پر لگا اور مجھے اپنے شولڈر کی ہڈی چٹختی ہوئی محسوس ہوئی۔ شدتِ تکلیف سے میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی تھی۔

مجھ پر اس طرح حملہ کرنے والی سونگ کھلا ہی تھی۔

ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ اس نے دوبارہ ہسٹریائی چیخ خارج کرتے ہوئے مجھ پر سریا چلانے کی کوشش چاہی تو تب تک میرا اپنا دماغ گھوم چکا تھا، میں نے ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ کسی بلبلائی ہوئی لومڑی کی طرح چیخ کر اُچھلی اور اوپن ہڈ والے ڈرائیونگ کیبن کے مختصر قدمچوں پر آڑی ترچھی ہو کر جا پڑی اور بے حس و حرکت ہو گئی۔ میں نے اسے اسی طرح ہی پڑے رہنے دیا اور دوبارہ ڈیش بورڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

سونگ کھلا مجھے پسند کرنے کا دعویٰ رکھتی تھی۔ پسند میں محبت کا دخل بھی رہتا ہے۔ یہ سب محض اس کی ڈھکوسلے بازی ہی تھی۔ اس کے اندر کی کالی نیت کا مجھے تو اسی وقت ہی اندازہ ہو گیا تھا جب وہ مجھ سے نرم خوئی سے گفتگو کر رہی تھی اور میں نے موقع محل جان کر اس سے ان کے دشمنوں کے بارے میں پوچھا تھا اور جب اس نے مجھے ان کی ”حقیقت“ بتائی تھی تو مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اصل دشمن بری مسلم لڑاکا گروپ نہیں بلکہ یہ لوگ تھے۔ اس پر جب میں نے ذرا کھل کر سونگ کھلا سے بات کی تو اس کا رویہ ایک دم چینج ہو گیا تھا جو پھر ”ریورس“ نہ ہو سکا تھا اور مسلسل میرے ساتھ زہریلا ہی رہا تھا۔

مجھے تو یوں بھی اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی، فقط اس حد تک کہ اس نے میری جان بچائی تھی اور اب میں نے بھی اس کے اپنے ہی لوگوں سے جان بچا کر حساب بے باق کر دیا تھا، تو میں نے اس سے تعلق ختم کر دیا تھا۔ اپنی منزل پر پہنچ کر میں اسے رنگون کی طرف بہ سلامت روانہ کر دینے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔

میری منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ کپاس کا جائزہ لینے کے علاوہ بھی ابتدائی ملاقات میں سونگ کھلا نے مجھے انڈیمان کا محلِ وقوع سمجھا دیا تھا۔ کوئی اسی رفتار سے روانگی پر اب یہاں سے بہ مشکل پندرہ بیس ناٹیکل میل کا فاصلہ پچیس سے تیس منٹ میں طے ہو سکتا تھا۔

میں نے وھیل کو ایک جگہ پر ایڈجسٹ کیا اور مختصر سے عرشے پر آ گیا۔ یہ سمندری رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ مطلع ابھی تک ابر آلود تھا۔ جس کے باعث چہار اطراف گھور تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آسمان بھی سیاہ اور تاریک تھا۔ جسے دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس پر کالے بادلوں کا راج تھا۔ کہیں کہیں دور تاریک اُفق کے ہولناک ویران سناٹوں میں بجلی چمکتی ہوئی عجیب سا منظر پیش کرتی تھی۔ ہوا چل رہی تھی، اس میں خنکی کے ساتھ اب سردی کی کاٹ بھی شامل ہونے لگی تھی۔

مجھے بھوک کا احساس ہوا، مگر بوٹ میں کھانے پینے کا سامان ناپید ہی تھا۔ ایک چھوٹا پانی کا مشکیزہ ضرور پڑا نظر آیا، مگر اس میں بھی آدھا ہی پانی تھا۔ میں نے اس میں سے چند گھونٹ بھرے۔ اس کے علاوہ مجھے غوطہ خوری کا مختصر سا سامان بھی نظر آیا تھا، جو میرے لیے شاید بیکار ہی تھا۔

خیالات کی رو میں مجھے اچانک ہی یاد آیا کہ میں نے آنسہ خالدہ سے بات کرنا چاہی تھی مگر اس کے سیل فون پر مجھے کسی اور خاتون کی آواز سنائی دی تھی جو میرے لیے اجنبی تھی اور میں اس بات پر بری طرح چونکا تھا۔

حالات ہی اس طرح تواتر کے ساتھ پیش آتے چلے گئے تھے کہ میں اس پر توجہ نہیں دے سکا تھا اور نہ ہی اس بارے میں زیادہ سوچ پایا تھا کہ آخر آنسہ خالدہ کے سیل پر اس کے بجائے کسی اور اجنبی عورت کی آواز کیوں ابھری تھی؟

اچانک فضا میں عجیب سی آواز ابھری......

”قیں......کلغ......قیں......“

کوئی سی ایگل پھڑپھڑاتا ہوا قریب سے گزرا تھا۔ پتا نہیں یہ منہ اندھیرے کس شکار کی تلاش میں نکلا تھا، بہرحال اس نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑا تو مجھے سونگ کھلا کی طرف متوجہ ہونا پڑا، جو میرا ایک ہی گھونسا کھا کر ابھی تک بے سدھ سی پڑی تھی۔

میرے دائیں شانے میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ میں نے دونوں بازوؤں کو دائیں بائیں اور اُوپر نیچے کرتے ہوئے وارم اپ کیا اور سونگ کھلا کی طرف بڑھا تو چونک

پڑا۔

اس کے چہرے سے خون بہہ بہہ کر کیبن کے قدمچوں پر پھیل سا گیا تھا۔ خون اس کی ناک سے بہہ رہا تھا۔ میری پیشانی پر تشویش آمیز پریشانی کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔

میں نے اسے فوراً سنبھالا اور اس کا چہرہ صاف کیا۔ خون بہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ سپید ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ ہوش میں آگئی اور کھانسنے لگی، جس کے ساتھ اس کے منہ سے بھی خون نکلا، میں نے پانی کا مشکیزہ اس کے منہ سے لگایا، اس نے کلی کی اور سارا پانی غٹا غٹ پی گئی۔

میں نے اسے وہیں قدمچے پر ہی ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور قریب پڑا وہ آہنی سریا اُٹھا کر سمندر میں اچھال دیا۔

بوٹ مناسب رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ سونگ کھلا نے اپنا خون دیکھا تو اس پر ایک بار پھر ہسٹریائی سا دورہ پڑھا۔ مگر اس بار اس نے کوئی جارحانہ حرکت نہ کی اور مجھے، وحشی، جانگلی، بولنے لگی۔

میں اس کی بڑبڑاہٹ کا کوئی نوٹس لیے بغیر کپاس کا جائزہ لیتا رہا۔ میری منزل لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ مگر شاید تاریکی کی وجہ سے ساحل کی پٹی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً موٹر بوٹ کی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ اس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے گردن موڑ کر سونگ کھلا سے بولا۔

''میری منزل قریب آچکی ہے۔ میں ساحل پر اُتر جاؤں گا اور تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا......''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے بھی اس کی کوئی پروا نہ کی اور اس طرف اپنی نظریں جما دیں جدھر میری منزل کا ساحل تھا۔ اچانک میں بری طرح ٹھٹکا اور میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے بوٹ کی لالٹینیں بجھا دیں۔

مجھے مذکورہ سمت روشنی سی نظر آئی تھی۔ کلی منجارو کے اس گوشۂ ویران ساحل پر جہاں بیابان اور خوفناک صحرا تھا، وہاں کسی روشنی کا مطلب تھا کہ کوئی گروپ وہاں پہلے سے ہی فروکش تھا۔

کلی منجارو کی سرزمین پر میرے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے، اس لیے مجھے ہر لحہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

ذرا دیر بعد میں نے بوٹ کا انجن بھی آف کر دیا۔ بوٹ میں چپو موجود تھے۔ کچھ سوچ کر میں نے بوٹ کو چپوؤں کی مدد سے کھینا شروع کر دیا۔ سونگ کھلا مجھ سے اُکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ تمہاری منزل آگئی ہے تو دفع ہو جاؤ، میں نے لوٹنا ہے جلدی۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنا کام کرتا رہا۔ جواب نہ پا کر غصے سے وہ اپنی جگہ سے اُٹھی، تو شاید کمزوری کی وجہ سے اسے چکر آ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہی۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ میں نے اسے سنبھالنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنی نظریں قریب آتے تاریک ساحل پر مرکوز کر دیں۔

تب ہی اچانک میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا اور میں نے سب سے پہلے چپو چلانا بند کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر پہلے بوٹ میں غوطہ خوری کا جو مختصر سا سامان دیکھا تھا، میں نے اُسے اپنے لیے بیکار سمجھا تھا مگر اب وہی میرے کام آنے والا تھا۔ میں اُسے اُٹھا لایا اور تیزی سے اسے پہننے لگا۔

فلیپر چڑھانے، پشت پر آکسیجن سلنڈر لگانے اور لباس پہننے تک میں نے تھوڑی ہی دیر لگائی تھی، اس کے بعد سونگ کھلا کی طرف متوجہ ہوا جو حیرت اور عجیب سی نگاہوں سے میری طرف تکے جا رہی تھی، جبکہ مجھ سے برہمی کا تاثر بھی ہنوز اپنی جگہ موجود تھا۔

''میری بات اب غور سے سنو......! میں سمندر میں غوطہ لگا کر ساحل کی طرف جا رہا ہوں اور تم ایک لحہ بھی ضائع کیے بغیر یہاں سے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جانا۔ رنگوں کی بندرگاہ یہاں سے سو، ڈیڑھ سو ناٹیکل میل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تم دن چڑھے تک پہنچ جاؤ گی۔ سمجھ گئیں؟''

سونگ کھلا نے منہ بنا کر کہا۔ ''مجھے راستہ سمجھانے کی ضرورت نہیں، میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بھی اسی طرف دیکھا جہاں تاریک ساحل کی طرف سے دکھائی دیتی ہوئی وہ روشنی خاصی قریب آچکی تھی اور اس نے بھی دیکھ لی تھی۔ مگر اس کے بارے میں اس نے کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور بدستور نفرت خیز لہجے میں بولی۔

''تم جلد از جلد میری بوٹ سے دفع ہو جاؤ...... چاہے جہنم میں جاؤ، بس!''

میرے جی میں تو آئی اس کے ایک اور گھونسا رسید کر دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکا تاہم غصے سے دانت پیس کر

بولا۔ ”اپنی بکواس بند کرو اور زبان کو بھی لگام دو...... میرے پانی میں کودتے ہی تم پلٹ کر تھوڑے فاصلے تک چپوؤں کی مدد سے بوٹ لے جاؤ گی اور تھوڑی دور تک جانے کے بعد ہی موٹر بوٹ کا انجن اسٹارٹ کرو گی۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ وہاں ساحل پر مجھے شبہ ہوا کہ میرا دشمن گروپ موجود ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اس طرح ساحل سے ایک دم پلٹتی ہوئی تمہاری بوٹ کو دیکھ کر تعاقب میں لگ جائیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ناگواری سے اپنا سر جھٹکتے ہوئے مختصراً کہا اور مجھے اس کی ہٹ دھرمی اور اکڑ پر ایک بار پھر غصہ آنے لگا، حالانکہ میں نے یہ اس کے فائدے کی ہی بات کی تھی۔

بہر طور میں نے پھر بھی اس کے لیے کلمۂ خیر ادا کیا اور ماسک درست کرنے کے بعد اللہ کا نام لے کر پانی میں کود گیا اور بوٹ سے ذرا پرے ہٹ گیا۔ ابھی میں دانستہ پانی کی سطح پر ہی تھا۔

میں نے دیکھا کہ سوئنگ کھلا نے غصے اور اپنی عداوت میں وہی حرکت کر ڈالی جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس نے میری احتیاطی ہدایت کے برخلاف عمل کرتے ہوئے بوٹ کو چپوؤں کی مدد سے کھینے کے بجائے، اس کا انجن اسٹارٹ کر ڈالا، اس بے وقوف نے عداوت اور ضد میں آکر بوٹ کو اسٹارٹ کر کے چند منٹوں تک اسی طرح ہی وہاں موجود رکھا، جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ میرا ”معاملہ“ بگاڑنا چاہ رہی تھی۔

اس نے بوٹ کی تمام بتیاں بھی جلا ڈالی دی تھیں۔ اس کی اس قبیح حرکت پر میرا دماغ غصے کی آگ سے بھر گیا۔ اس کے بعد ہی، بلکہ میرے متوقع دشمنوں کو باخبر کرنے کے بعد اس نے بوٹ آگے بڑھائی تھی، گویا اپنے تئیں، میری اچھی طرح ”بگاڑنے“ کے بعد وہ روانہ ہوئی تھی۔

میں نے پانی کی سطح سے تاریکی میں ڈوبے ساحل کی طرف دیکھا جہاں مجھے ابھی تک روشنی سی نظر آ رہی تھی۔ اچانک مجھے ان روشنیوں میں حرکت سی محسوس ہوئی اور اسی وقت ایک اور روشنی چمکی، اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اسی طرف آنے لگی۔ مجھے اپنی سماعتوں میں کسی انجن کے غرانے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ساحل کی طرف سے ایک اور بوٹ طوفانی رفتار سے اسی طرف بڑھنے لگی جس طرف میں تھا...... مگر مجھے اپنی زیادہ فکر نہ تھی، یہ میں نے سوئنگ کھلا کے بھلے کے لیے بھی کیا تھا، مگر وہ عناد کے مارے اندھی ہو گئی تھی۔ دشمن بوٹ کا رخ اسی کی بوٹ کے تعاقب میں تھا۔

میں نے تو فوراً ہی پانی کے اندر غوطہ لگا لیا تھا اور اندر ہی اندر تیرتا ہوا ساحل کی طرف اس سمت بڑھنا شروع کر دیا تھا جس طرف میرے ایک محتاط اندازے کے مطابق دشمن پناہ گاہ کی حدود دور پڑتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں ساحل کے قریب ابھرا اور تیزی سے ریت میں آ کر دم لیا۔ سب سے پہلے میں نے غوطہ خوری کے لباس سے پیچھا چھڑایا اور وہیں دبک کر پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔

میرے عقب میں تاریکی میں ہلکورے لیتا ہوا سمندر تھا اور سامنے اندھیرے میں ڈوبا ہوا چھدرا جنگل، سیدھے ہاتھ کی جانب روشنی تھی، جہاں مجھے ایک بڑا سا سیلانی خیمہ نصب دکھائی دیا تھا۔ وہاں مجھے ایک پرانے ماڈل کی لمبی سی بند جیپ بھی کھڑی دکھائی دی۔

گویا ان کے پاس بوٹ کے علاوہ جیپ بھی تھی، جس کا ”میل“ میری سمجھ میں نہ آ سکا تھا کہ یہ لوگ کس طرح بیک وقت خشکی اور پانی کا سفر کر کے یہاں تک پہنچے تھے، نیز یہ تھے کون؟ آیا میرے دشمن یا پھر کوئی اور عام سیلانی گروپ۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ایک ہی گروپ ہو اور دو مختلف راستوں سے سفر کرتا ہوا یہاں ایک دوسرے سے آن ملا ہو؟ لیکن جس طرح ان لوگوں نے فوری طور پر سوئنگ کھلا کی بوٹ کا پیچھا کیا تھا، اس سے ایک بات کا تو پتا چلتا تھا کہ یہ

لعنت

ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ کر ایک صاحب نے پوچھا۔ ”آپ کا ہوٹل کیسا ہے؟“

”بہترین جناب!“ استقبالیہ کلرک نے فخر سے کہا۔ ”آپ یہاں قیام کریں گے تو بالکل یہی محسوس کریں گے جیسے اپنے گھر میں ہیں۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے ہوٹل پر...“ مہمان نے کہا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر رخصت ہو گیا۔

انتخاب، تجمل حسین حیدری، محلہ مسجد کھجور، پنڈ دادن خان

کوئی عام سیلانی گروپ نہیں ہوسکتا تھا، ورنہ انہیں کیوں خطرہ محسوس ہوتا۔ دال میں کالا ضرور تھا اور مجھے یہ قریب جائے اور جانے بغیر نہیں پتا چل سکتا تھا۔

میں نے راستہ بدلا اور جس طرف چھدری چھدری جھاڑیوں کا سلسلہ تھا اُس طرف سے ہوکر آگے بڑھنا شروع کردیا۔ ذرا ہی دیر بعد میں ان کے قریب تھا۔ وہاں الاؤ روشن تھا اور کچھ لوگ بھی وہاں بیٹھے نظر آئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور تعداد میں بھی پانچ، چھ کے قریب تھے، اگر بوٹ میں تعاقب پر دو تین ہی افراد گئے ہوں تو کل ملا کر ان کی تعداد سات آٹھ ہی بنتی تھی۔

ان کی باتوں کا آہنگ سنائی دیتا تھا مگر جملے ابھی واضح نہیں ہورہے تھے، میں تاریکی کا حصہ بنا تھوڑا اور آگے بڑھا اور تھوڑا مزید قریب پہنچ کر ٹھہر گیا اور وہیں دبک گیا۔

مجھے اب کچھ کچھ الفاظ سمجھ میں آرہے تھے، یہ لوگ ہندی اردو میں باتیں کررہے تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے الاؤ کی روشنی میں بہ غور ان کے بشروں کا جائزہ لیا۔ مجھے سرِدست ان میں سے ایک بھی چہرہ شناسا محسوس نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ لوگ مجھے ایک ٹولے کی شکل میں ہی نظر آئے تھے اور انہیں لیڈ کرنے والا بھی ان کے درمیان موجود تھا جو اپنی وضع قطع سے ان کا سرغنہ ہی نظر آتا تھا کیونکہ باقی لوگ اسے ''باس'' کہہ کر اور مودبانہ انداز میں ہی مخاطب تھے، وہ ایک دبنگ قسم کا آدمی لگتا تھا۔ قد کا گھٹا ہوا اور کسی بھارتی سُور کی طرح مضبوط اور جسیم تھا۔ اس نے چست پتلون اور شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ کرخت اور گول سی بدہیئت آنکھوں میں وحشیانہ چمک محسوس ہوئی تھی۔ مگر اس کا لہجہ اس کی دبنگ شخصیت سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

ان کے پاس مجھے جدید گنیں دکھائی دی تھیں۔ یہ لوگ باتیں کرنے کے دوران سمندر کی طرف اسی سمت گاہے بہ گاہے دیکھتے بھی جاتے تھے جدھر ان کے ساتھی ایک تیز رفتار بوٹ پر سونگ کھلا کے تعاقب میں گئے تھے۔

''باس! ہم اپنی منزل کے قریب ہیں۔ آگے کا سفر ہمیں خشکی پر ہی کرنا ہوگا۔ کیونکہ کلی منجارو قبیلے کا ٹھکانا خشکی کے راستے پر یہاں سے بہت قریب ہے۔''

ایک ساتھی کو میں نے اسی دبنگ شخص سے جب یہ کہتے سنا تو ایکا ایکی میرا ماتھا ٹھنکا۔ کلی منجارو کی مہم میرے بہت سے دشمنوں کی مشترکہ مہم کی صورت اختیار کرگئی تھی اور بھی جانے کتنے لوگ آگے چل کر ظہور پذیر ہونے والے تھے۔ کیونکہ نانا شکور کی جاسوسہ ڈولی جو بھولا ناتھ کے کلب میں مخبر کی حیثیت سے چھوڑی ہوئی تھی، میرا یہ اندازہ اسی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے اور قیافات قائم کرنے میں مصروف تھا کہ ان کی قلعی بھی کھل گئی۔

''صبح ہونے والی ہے اور ہم روشنی پھیلتے ہی یہاں سے جیپ میں روانہ ہوجائیں گے جبکہ ہمارا ایک ساتھی ادھر ہی بوٹ کے قریب رہے گا اور مسلسل ہمارے رابطے میں رہے گا۔ بوقتِ ضرورت یہ بوٹ بھی ہمارے کام آسکتی ہے۔ مجھے اپنے ساتھی شاکا کی زیادہ چنتا کھائے جارہی ہے، نجانے اس کے ساتھ کیا ہوچکا ہے؟ وہ رابطے میں بھی نہیں ہے، وہ زندہ ہے یا مرچکا۔''

''باس'' کی زبانی یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اول تو مجھے ذرا قریب آکر سننے پر ''باس'' کا لب ولہجہ بھی کچھ شناسا سا لگا تھا اور اب شاکا کے ذکر پر میرے اندر ایک ہی نام ابھرا تھا۔

''بھولا ناتھ۔''

شاکا...... بھولا ناتھ کا ہی خاص آدمی تھا، جسے کلی منجارو کی مہم میں پہلے روانہ کیا گیا تھا اور اسے اس وحشی قبیلے کی زبان آتی تھی۔ وہ ان سے اُن تینوں قیدیوں (میرے ساتھیوں) کی حوالگی کے سلسلے میں مذاکرات کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے بھولا ناتھ کا لہجہ بھی یاد آنے لگا تھا۔

یہ آواز میں نے پہلی بار اس وقت کارڈلیس کے وائیڈ اسپیکر پر سنی تھی، جب بھجوانی سے میں نے اس کی بات کرائی تھی۔ فون پر اصل آواز کچھ دبی دبی سی آتی محسوس ہوتی ہے اور اتنی جلدی نہیں پہچانی جاتی تاہم ذرا غور کرنے اور شاکا کے ذکر پر یہ پہچاننا مشکل بھی نہ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگیا تھا، کیونکہ میں اس وقت خونخوار بھیڑیوں کی کچھار کے قریب ہی تھا۔

اس کے ایک ساتھی کو میں نے کہتے سنا۔ ''باس! میرا تو خیال تھا کہ شاکا کو اس وحشی قبیلے سے مذاکرات کرنے کے بجائے خاموشی سے وہاں پہنچ کر اپنے دشمن شہزاد احمد کے ان تینوں ساتھیوں کو وہیں ٹھکانے لگا کر اپنے تینوں ساتھیوں کا بدلہ لے لینا چاہیے تھا۔ اب تو بھجوانی صاحب بھی دیہانت (مرگئے) کرگئے۔ رہا شہزی تو اسے بھی ہم یہاں تلاش کرکے ختم کرڈالیں گے۔''

''میں اب یہی سوچ رہا ہوں......'' بھولا ناتھ بولا۔

''شا کا لگتا ہے ناکام ہوگیا ہے، اب ہم شہزی اور اس کے تینوں ساتھیوں کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ بھولا ناتھ اپنے دشمنوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں ہے۔'' اس کے لہجے کے آخر میں سفاکی اتر آئی تھی اور اس کے نئے خطرناک عزائم جان کر کہ وہ اب اپنے تئیں اول خیر وغیرہ کے ''ڈیتھ وارنٹ'' جاری کر چکا تھا، مجھے ایک نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

''لیکن باس! ہمارا اصل مشن دشمن سے انتقام لینے سے زیادہ اہم ہے......'' ایک نے کہا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''اصل مشن۔'' میرے ذہن میں یہ لفظ تیزی سے گردش کرنے لگا۔ ان کا اصل مشن کیا تھا؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

''ہاں! اصل مشن کو ہی میں زیادہ اہمیت دوں گا۔ اسی لیے تو میں بھی اس وقت تم لوگوں کے ساتھ ہوں...... ورنہ شا کا کے بعد میں تم لوگوں کو بھی بھیج سکتا تھا۔'' میں بھولا ناتھ کو یہ کہتے ہوئے پورے دھیان سے سن رہا تھا۔

''شا کا سے آخری گفتگو پر ہی میں چونکا تھا۔ میں بگ باس کے علم میں بھی یہ اہم راز لا چکا ہوں اور ان کی بھی مجھے یہی ہدایت تھی کہ میں بلا تاخیر اس مشن پر از خود روانہ ہو جاؤں۔''

میں ان کی اس گفتگو پر چونکا تھا تو گویا بھولا ناتھ کا بھی یہاں آنے کا کوئی اہم مشن تھا، اور وہ کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن مجھے ایک اچنبھا ضرور ہوا تھا کہ کوہارا بھی یہاں موجود تھا اور اب بھولا ناتھ بھی...... تو یہ سوال لامحالہ ہی میرے ذہن ابھرا تھا کہ کیا ان دونوں کے اس اہم مشن کی نوعیت ایک ہی تھی؟ یہ میرے دشمن گروپس کا کوئی مشترکہ مشن تھا جسے وہ الگ الگ اپنے ٹولے کی صورت میں سرانجام دینے کے لیے کوشاں تھے؟

صورتِ حال واقعی کافی گمبھیر ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں کلی منجارو کی بستی میں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور اب یہ وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

''وہ آرہے ہیں باس......!'' معاً ایک نے جیسے اعلان کیا اور وہ سب بیک وقت سمندر کی طرف دیکھنے لگے۔ مطلع صاف ہونے لگا تھا اور آسمان پر اب صبحِ کاذب کی سپیدی نظر آنے لگی تھی، کچھ تاریکی نما روشنی کا بھی ظہور ہونے لگا تھا۔

میری بھی غیر ارادی طور پر نظریں اسی طرف کو اٹھ گئیں جو بوٹ سونگ کھلا کے تعاقب میں گئی تھی وہ اب اسی تیزی کے ساتھ واپس لوٹ رہی تھی اور میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں یہ خدشات سر اٹھانے لگے کہ اگر بدقسمتی سے سونگ کھلا ان بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے تو میری بھی یہاں موجودگی کا راز آشکارا ہو سکتا تھا اور پھر آناً فاناً میری یہاں ڈھنڈیا پڑ سکتی تھی۔ اگرچہ سونگ کو میں نے اپنا اصل نام نہیں بتایا تھا تاہم اس سے میرا ناک نقشہ معلوم کیا جا سکتا تھا یوں تو بھولا ناتھ نے بھی مجھے نہیں دیکھ رکھا تھا، مگر کیا خبر اس نے میری کوئی تصویر دیکھ رکھی ہو جو پہلے ہی مخصوص اداروں میں پھیلائی جا چکی تھی۔ جیسے میں ابھی بعض ٹھوس حوالوں سے بھولا ناتھ کو پہچان رہا تھا۔

''لگتا ہے باس! واپس لوٹتا ہوا شکار ہمارے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔'' ایک نے اپنے گلے میں جھولتی دوربین کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ واقعی کوئی شکار ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ اس بوٹ کا قریب آکر اچانک پلٹ جانا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ساحل پر موجود ہمارا عارضی ٹھکانا دیکھ لیا تھا۔'' پھر دوسرے نے تبصرہ کیا تو بھولا ناتھ گھاگ لہجے میں بولا۔

''مجھے تو ایک اور بات کا بھی شبہ ہوتا ہے، کہیں ایسا تو نہیں یہ بوٹ کسی خاص مقصد کے لیے اس ساحل کے قریب آئی ہو اور وہ پورا کر کے واپس لوٹ رہی ہو۔''

''ہاں! میرے دل میں بھی یہی خدشہ آتا ہے۔'' تیسرے ساتھی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا، گویا ان خبیثوں کا بھی قیافہ غضب کا تھا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' بھولا ناتھ نے کہتے ہوئے ایک موٹا سگار سلگا لیا۔

بوٹ کے انجن کی گڈ...... گڈ کرتی آواز قریب آگئی اور اس میں سے دو افراد اسی طرف کو تیزی سے لپکے۔ میں گویا سانس روکے اس طرف دیکھنے لگا اور پھر جیسے میرا پورا وجود سن ہو کر رہ گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔

سونگ کھلا نے اپنی منتقمانہ روش میں آکر جو بے وقوفی کر ڈالی تھی وہ اب نہ صرف اس کے بلکہ میرے گلے بھی پڑنے والی تھی۔ تاہم مجھے اپنی نہیں اس کی زیادہ فکر ہونے لگی تھی۔ کچھ بھی سہی، وہ بہرحال میری محسنہ تھی اگرچہ میں نے بھی اس کی جان بچا کر اس کا حساب بے باق کر دیا تھا

لیکن باوصف اس کے میرا دل کبھی نہ چاہ سکتا تھا کہ میں اس نازک سی سونگ کھلا کو ان بھیڑیے صفت درندوں کی خوراک بنتے دیکھوں۔

سونگ کھلا ان کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ اُس کا چہرہ خوف و دہشت سے پیلا پڑا جارہا تھا اور وہ بھولا ناتھ کے دونوں ساتھیوں کے شکنجے میں بری طرح مچل رہی تھی۔ اس پر شاید تشدد بھی کیا گیا تھا، کیونکہ اس کے چہرے پر سرخی اور گالوں پر خراشوں کے نشان تھے۔

''مم...... مجھے چھوڑ دو پلیز......! مم...... میرا اُس آدمی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو خود اس کی دشمن تھی۔''

جب اسے بھولا ناتھ کے رُوبرو کیا گیا تو وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی تھی جبکہ بھولا ناتھ اسے خوف ناک نظروں سے گھورے جارہا تھا۔ وہ جیسے اپنے ان دونوں ساتھیوں کے کچھ بولنے کا منتظر تھا، جسے سمجھتے ہوئے ان میں ایک نے قدرے صراحت سے بتایا۔

''باس! اس نے راج نامی جس آدمی کی کہانی ہمیں سنائی ہے اس کا ناک نقشہ اس نے جو بتایا ہے وہ ہمارے دشمن شہزی پر ٹھیک ٹھیک اُترتا ہے۔ اُسے ساحل پر ہماری موجودگی کا شبہ ہوا تو وہ احتیاط کے پیشِ نظر غوطہ خوری کا لباس پہنے پانی میں اُتر گیا اور اگر یہ سچ کہہ رہی ہے تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ شہزی اس وقت ہمارے آس پاس ہی موجود ہے......'' اس نے جیسے وہاں دھماکا کردیا۔

''مگر ہماری معلومات کے مطابق تو اس کے ہمراہ نانا شکور اور ایک سوشیلا نام کی ساتھی بھی تھی، وہ کہاں ہے؟''

بھولا ناتھ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ دونوں اس سوال کا جواب نہ دے سکے، یہی وہ وقت تھا جب بھولا ناتھ کو اپنے اس فضول سوال پر وقت ضائع جانے کا احساس ہوا اور وہ بھیڑیے جیسی غراہٹ سے تحکمانہ انداز میں چیخا۔

''یہ صحیح کہہ رہی ہے، فوراً فلش لائٹیں آن کردو اور چاروں طرف پھیل جاؤ......''

بھولا ناتھ نے جیسے پل کے پل اپنی ذہنی فراست کے بل بوتے پر اس ''سچویشن'' کا بالکل ٹھیک اندازہ قائم کیا تھا اور پورے اعتماد سے میری ''ڈھنڈیا'' ڈالنے کا حکم دے ڈالا تھا۔

میرے لیے اب وہاں ٹکے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا، میں نے یہ ''اعلان'' سنتے ہی فوراً سے پیشتر اپنی جگہ سے حرکت کی اور زمین پر لیٹے لیٹے تیزی کے ساتھ رینگتا ہوا جتنی دور سرک سکتا تھا سرک لیا...... مگر تب تک اس خبیث بھولا ناتھ کے ساتھیوں نے نہ صرف طاقت ور چارجر لائٹیں آن کردیں بلکہ اپنی جدید ساختہ گنیں سنبھالے چاروں طرف پھیلتے چلے گئے۔

میرے لیے اب زیادہ دیر سرکتے رہنا محال تھا۔ میں نے اُٹھ کر دوڑ لگا دی۔ اسی وقت مجھے دو فائر کی آواز سنائی دی۔ میں دہل گیا، میں یہی سمجھا تھا کہ یہ دونوں گولیاں مجھ پر فائر کی گئی تھیں۔ مگر ایسا نہ تھا۔ کیونکہ فائر کی آواز کے ساتھ ہی سونگ کھلا کی لرزہ خیز چیخ ابھری تھی۔ اس نے یا تو موقع جان کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی یا پھر اس بے رحم انسان بھولا ناتھ نے اسے اب ''بیکار'' شے سمجھتے ہوئے گولی ماری تھی۔ میں سونگ کھلا کی موت پر افسوس ہی کرسکتا تھا کہ وہ مفت میں ماری گئی تھی۔

ابھی تو مجھے اپنی پڑی ہوئی تھی۔ میں کب تک بچتا، جلد ہی ان بھیڑیوں کی نظروں میں آگیا۔ کیونکہ چند لمحوں بعد ہی عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری تھی، میں نے فوراً خود کو زمین پر گرادیا۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا...... سونگ کھلا نے اپنے ساتھ میرے مرنے مارنے کا بھی سامان کردیا تھا۔ بھولا ناتھ کے خطرناک عزائم جاننے کے بعد اب یہ بات شک وشبے سے بالاتر تھی کہ وہ مجھے بہرصورت مردہ دیکھنے کا خواہشمند تھا اور اس پر مستزاد کہ میں اس کے نرغے میں بھی تھا۔

بھولا ناتھ کی قسمت پر نازاں ہوئے بغیر میں نے خود کو زمین پر گراتے ہی لڑھکنیاں کھائیں اور ان ٹیلوں ٹبوں کی آڑ میں چلا گیا جہاں جابجا چھدری اور کہیں نصف قدِ آدم جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف وہی بنجر صحرا تھا جہاں کالے بچھوؤں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔

میں اس وقت بالکل نہتا تھا۔ مگر میرے کوہ شکن حوصلوں کے بادبان بلند تھے۔ اندازہ تھا مجھے کہ یوں بھاگتے رہنا میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا نیز مجھے پیش آمدہ صورتِ حال کو فیس کرنا تھا۔

دشمن کو زعم تھا کہ ان کا ''شکار'' تنہا اور وہ خود تعداد میں زیادہ تھے اور جدید ہتھیاروں سے لیس بھی، یہی زعم میں ان کا ''ویک پوائنٹ'' بنانے کی سوچنے لگا اور وہیں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

اسی وقت میرے ذہنِ طباع نے دشمن کی حرکات و سکنات کی ''کیلکولیشن'' کی اور سرتاپا سماعت بن گیا۔ جلد ہی مجھے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دے گئی۔ وہ اپنی جھونک میں درانہ وار دوڑے چلے آرہے تھے۔ یہ بات

یقینی تھی کہ انہیں اب تک میرے ''خالی ہاتھ'' ہونے کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو چکا تھا اور وہ مجھے تر نوالہ سمجھے ہوئے تھے۔

دوڑتے قدموں کی دھپ...... دھپ مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر سنائی دی تھی اور ٹھیک اسی وقت میں نے ایک کو پھلانگ کر اپنے بالکل قریب سے گزرتے پایا۔ اسے میں نے دانستہ ''جانے دیا۔'' جب دوسرا گزرنے لگا تو میں کسی چیتے کی طرح چابک دستی کے ساتھ اس پر جھپٹا۔ یہ حملہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا۔ چنانچہ گرتے ہی اس نے کمال پھرتی کے ساتھ اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کی تھی مگر میں اب کہاں اسے کوئی موقع دینے والا تھا۔ جانتا تھا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ میرے لیے کتنا قیمتی اور ہر لمحہ موت کی جانب دستک دیتا ہوا محسوس بھی ہوتا تھا۔

اس نے میرے شکنجے سے خود کو بچانے کی کوشش کی تھی اور میں نے اس کی ایسی کوئی تیاری پکڑنے سے پہلے ہی اس کی ٹھوڑی پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا، جو میری توقع کے عین مطابق خاصا زوردار ثابت ہوا۔

میرا گھونسا لگتے ہی اس کے دانتوں تلے شاید اس کی زبان آگئی تھی۔ وہ بری طرح بلبلا کر چیخا تھا، ایک مقصد اس کے چیخنے کا اپنے آگے نکل جانے والے ساتھی کو اس طرف متوجہ کرنا بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اب اس کے لیے کافی دیر ہو چکی تھی۔

میں نے اسے ذرا ڈھتے پا کر، اس کی گن پر جھپٹا مارا اور وہ گرفت میں آتے ہی اس کا ٹھوس کندا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ اسی وقت بے حس و حرکت ہو گیا۔

آگے نکل جانے والے ساتھی کو اس کا تب اندازہ ہو سکا تھا جب میں دشمن کی گن پر قبضہ جماتے ہی اپنے اندر طوفانی جذبات اُمڈتے ہوئے محسوس کرنے لگا تھا اور بہ سرعت اپنی جگہ چھوڑ کر شست باندھ کر اس طرف کو ہو گیا جدھر میری توقع کے مطابق اس کا دوسرا ساتھی پلٹتے ہی مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے ارادے سے نمودار ہوا تو میں نے اس پر برسٹ چلا دیا۔ وہ کریہہ انگیز چیخ مارتا ہوا رقصِ اجل کرتا گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

یہ لوگ کسی طور پر بھی رحم کے مستحق نہ تھے۔ وجہ یہی تھی کہ بھولا ناتھ میرے اور اول خیر وغیرہ کے ڈیتھ وارنٹ جاری کر چکا تھا۔ وہ ہمیں زندہ یا مردہ دیکھنے کا بے قراری سے متمنی تھا۔

اس مختصر سی فائرنگ سے اِدھر اُدھر میری تلاش میں پھیلے ہوئے باقی دشمن ساتھی اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے اس لیے میں نے فوراً سے پیشتر اپنی جگہ بدلی اور ایک نسبتاً جھکے جھکے مگر قدرے وسیع قطعہ اراضی پر محیط بڑے سے ٹیلے کی ڈھلان پر جا چڑھا، جہاں نصف قدِ آدم جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں ان کے بیچ جا کر چیتے کی طرح گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

یہاں سے میں متوقع طور پر ایک سے زائد دشمنوں کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ جلد ہی مجھے ملگجی سی روشنی میں تین سے چار مسلح ہیولے دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ وہ سب محتاط تھے اور ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اپنے دونوں ساتھیوں کے انجام کا کافی حد تک ادراک ہو چکا تھا۔ وہ اسی جانب آ کر تین اطراف میں پھیل گئے اور میں ان کو نشانہ بنانے کا سوچتا ہی رہ گیا۔

کسی بھی قسم کی جلد بازی میرے لیے نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔ افرادی قوت میں بہرحال وہ زیادہ تھے اور محض ایک گن میرے ہاتھ میں آجانے سے میں ان پر اس طرح اندھا دھند نہیں پل پڑ سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے بھی چابک دستی اور چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے انہیں ایک ایک کر کے نشانہ بنانے کی سوچنے لگا۔ یہی سبب تھا کہ اس آٹومیٹک گن سے میں نے سنگل شاٹ کھیلنے کا فیصلہ کیا، تاکہ برسٹ کی صورت میں فالتو گولیاں ضائع نہ ہوں۔

ابھی یہ سوچ کر میں اپنی جگہ سے حرکت کرنے ہی والا تھا کہ اچانک میں ان میں سے کسی ایک کی نگاہ میں آ گیا۔ اُس نے وہیں سے ہی مجھ پر برسٹ چلایا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی یا پھر ملگجی سی روشنی کے سبب دشمن کا نشانہ خطا چلا گیا۔ گولیوں کی پوری طوفانی بوچھاڑ میرے سامنے محض چند فٹ کے فاصلے پر پڑی اور گرد و غبار کا وہاں طوفان سا بپا ہوا۔ میں بری طرح بدکا اور حواسوں کو قابو رکھتے ہوئے میں نے بھی پھر مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اُسی طرف تلے اُوپر دو فائر کر ڈالے، جس کا نتیجہ ایک لرزتی ہوئی کریہہ ناک چیخ کی صورت برآمد ہوا۔

''اندھا دھند فائرنگ مت کرو...... ہم لوگ اس وقت ڈینجر زون میں ہیں......'' ایک چلّاتی ہوئی آواز ابھری، اس میں آواز میں پریشانی اور جھلاہٹ آمیز طیش کا عنصر شامل تھا۔

یہ آواز بھولا ناتھ کی تھی۔ میں بھی اس کی ہدایت پر ٹھٹک کر رہ گیا تھا، کیونکہ اس کی بات غلط نہیں تھی۔ اس کی ''ڈینجر

زون‘‘ سے مراد یہی تھی کہ ہم اس وقت ایک وحشی قبیلے کی حدود میں نہیں تو اس کے اریب قریب ضرور موجود تھے، فائرنگ کی آواز پر وہ سب اس طرف متوجہ ہوسکتے تھے۔

’’اسے ترنت گھیرنے کی کوشش کرو...... وہ اکیلا ہے۔‘‘ بھولا ناتھ پھر چلایا۔

میں نے فوراً حرکت کی اور ایک طرف کو رینگ گیا۔ صبح کی روشنی چار دانگ پھیلنے لگی تھی۔ سورج نمودار ہوتے ہی باقی ماندہ اندھیرا بھی کائی کی طرح چھٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب ہر سُو روشنی پھیل گئی تھی۔

دشمن نے اسٹریٹجی بدل دی تھی۔ وہ اب حملہ کرنے کے بجائے مجھے گھیرنے کی کوشش میں تھے، یہ بات میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھی۔ کیونکہ ہم دشمن کے لحاظ سے ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ فائرنگ کرنے سے میں بھی کترا رہا تھا۔

اب اس کا حل یہی تھا کہ میں بھی ان کی طرح اپنی حکمتِ عملی کو بدلوں اور ان سے مزید بھڑے بغیر یہاں سے اپنی منزل کی طرف خاموشی سے نکل جاؤں جو زیادہ دور نہیں رہی تھی۔

میں نے یہی کیا اور ایک محتاط انداز ے سے رخ بدلا اور جزیرے کی اندرونی سمت نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ ابھی مجھے ایک دم گھیرنے کی پوزیشن میں نہیں آئے تھے، یہی سبب تھا کہ میں ان کی حکمتِ عملی جانتے ہی ٹیلوں ٹبوں اور ان کی ڈھلوان پر اُگی ہوئی خودرو جھاڑیوں کی اُوٹ لیتا ہوا مقررہ سمت کی طرف کھسکنے لگا، لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ اچانک ایک تیز چلاتی ہوئی آواز ابھری۔ یہ بھولا ناتھ کی آواز نہیں تھی اس کے کسی ساتھی کی تھی۔ وہ خبردار کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

’’وحشیوں کا ٹولا اسی طرف آرہا ہے، واپس گاڑی کی طرف پلٹو...... ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔‘‘

یہ سنتے ہی میرے اپنے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔ وحشیوں کے ٹولے سے مراد اگر کلی منجارو قبیلے کے لوگ تھے تو یہ کم تشویش ناک بات نہیں تھی۔

میرے دشمنوں کو اپنی پڑ گئی تھی اور وہ میری گھات چھوڑ کے جیپ کی طرف دوڑے۔ میں چاہتا تو اس موقعے سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا اور اس بھاگا دوڑی میں انہیں نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اس میں میرا بھی نقصان ہوتا۔ ان وحشی جانگلیوں کے خونی نرغے میں خود میں بھی آسکتا تھا جبکہ خود مجھے بھی اپنا بچاؤ کرنا تھا۔

بھولا ناتھ کو میرے انتقام نے اندھا کردیا تھا۔ جس کے لیے وہ خود بھی یہاں کی خاک چھانتا ہوا آنکلا تھا۔ اگرچہ وہ اس مقصد کے لیے اپنے ساتھیوں کو بھی نا سک سونپ سکتا تھا جیسا کہ وہ شاکا کو بھیج کر یہ کرچکا تھا۔ لیکن باوجود اس کے مجھے نہیں لگتا تھا کہ بھولا ناتھ کا یہاں صرف یہی ایک مقصد تھا۔

بقول نانا شکور مرحوم کی جاسوسہ ڈولی کے...... شاکا نے وہاں پہنچ کر بھولا ناتھ کو کچھ ایسی باتیں بھی بتائی تھیں، جس کے بعد بھولا ناتھ کو اس نے یہ کہتے سنا تھا کہ اگر ایسی بات ہے تو میں بھی پہنچ رہا ہوں اور وہ ’’بات‘‘ کیا تھی؟ اس سے آگے ڈولی نہیں سن سکی تھی۔

پھر اس کے بعد بھولا ناتھ کا اچانک ان سے رابطہ منقطع ہوگیا تھا جو بعد میں بھی بحال نہ ہوسکا تھا۔ یہی نہیں مجھے ان کی آپس کی باتوں سے بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ کسی اور مشن پر آئے تھے۔ میرا معاملہ تو ان کے لیے جیسے ’’لگے ہاتھوں‘‘ نمٹانے کا جیسا لگتا تھا۔

ایک دل دہلا دینے والی چیخ نے میرے خیالات کو یکدم منتشر کرکے رکھ دیا۔ یہ بھولا ناتھ کے ہی کسی ساتھی کی آخری چیخ سے مُشابہ آواز تھی۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو اس جانب دس، بارہ سنان بردار وحشی نظر آئے۔ ایک نے بھولا ناتھ کے ساتھی کو اپنی سنان میں پروئے رکھا تھا۔ لیکن میں ان وحشیوں کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ کیونکہ ان میں صرف کلی منجارین ہی نہیں تھے بلکہ چست پینٹ شرٹ میں ملبوس چار، پانچ کی تعداد میں وہ افراد بھی شامل تھے جن کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ گویا یہ لوگ جو ’’تہذیب یافتہ‘‘ کہلائے جاتے تھے، ان کا ان کلی منجارین وحشیوں کے ساتھ ہونا یہی ثابت کرتا تھا کہ یہ لوگ آپس میں ساتھی تھے۔

ان کے لباس شہری سہی، مگر ان کا رنگ ایک ہی تھا، یعنی ڈارک براؤن اور ہلکا نیلا، سر پہ ایک ہی طرح کی چھجے دار ٹوپیاں تھیں۔ یہ سب چاق و چوبند اور چوکس نظر آرہے تھے۔

میری پیشانی یکلخت شکن آلود ہوگئی۔ اب میرا یہاں سے یوں چپ چپاتے نکل جانے کا ارادہ یکسر بدل گیا تھا۔ ورنہ سوچا میں نے یہی تھا کہ انہیں آپس میں اُلجھتا چھوڑ کر آگے اپنی منزل کی طرف نکل جاؤں۔

قدیم و جدید ساتھیوں کے اس ملاپ کا راز ڈولی کی بتائی ہوئی معلومات (جو درحقیقت شاکا کی ہی تھیں) جس سے اس نے بھولا ناتھ کو کسی لاسلکی رابطے کے ذریعے آگاہ کیا

تھا اور نانا شکور کی جاسوسہ ڈولی نے بھی وہ رازداری سے سن لی تھیں) کو سچ ثابت کر رہا تھا جس کے مطابق اس وحشی قبیلے پر ایک دوسرے گروپ نے اپنا تسلط جما رکھا تھا یا اپنا ساتھی بنایا ہوا تھا۔ مجھے اس کا کھوج لگانا ازبس ضروری محسوس ہوا۔ میں اب اپنی جگہ پر دبک کر ان کی حرکات و سکنات کا بہ غور جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔

میرا ان سے فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ ان کی گفتگو کو میں سردست سننے سے قاصر تھا۔ تاہم میں نے دیکھا تھا کہ یہ سوٹ پوش ٹولا، جانوروں کی کھالوں کے مختصر لباس میں ملفوف ان ننگ دھڑنگ وحشیوں پر حاکمانہ اثر رکھے ہوئے تھا۔ وہ ان پر حکم چلا رہا تھا۔ انہی کے حکم اور اشارے پر یہ لوگ اسی جانب کو دوڑ پڑے تھے جدھر بھولا ناتھ اور اس کے ساتھی بھاگے تھے۔ وہاں ان کی جیپ موجود تھی اور یہ سب اس میں سوار ہو کر ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتے تھے۔

تب ہی اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی طرح کا ایک ”سوٹ پوش“ ٹولا اس ہیلی کاپٹر میں بھی سوار تھا، جنہوں نے سے جی کو ہارا اور کوریلا پر بھی حملہ کیا تھا، جسے بعد میں کو ہارا مار گرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تو گویا یہ انہی ہیلی کاپٹر والوں کے ہی ساتھی تھے۔

انہیں آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے بھی کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ دوڑے جا رہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ میں بھی ان کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ ان کی بھولا ناتھ اور اس کے ٹولے پر نگاہ پڑ چکی تھی، بلکہ یہ ان کے ایک آدمی کو بھی شکار کر چکے تھے، جبکہ میں دو کو جہنم واصل کر چکا تھا۔

جلد ہی یہ لوگ وہاں جا پہنچے تھے جہاں یہ سب خیمہ زن تھے۔ وہاں اب بھی خیمہ نصب تھا، باقی سامان بکھرا بکھرا سا نظر آ رہا تھا۔ وہیں مجھے مڑی ہوئی زرد چونچوں والے تین چار مردار خور گدھ ساحل کی ریت پر پڑی ایک لاش کے قریب پھدکتے ہوئے نظر آئے۔ لاش ابھی پوری طرح نچی ہوئی نہیں تھی، مگر دور سے ہی میں نے اس لاش کو پہچان لیا تھا، یہ بدنصیب سونگ کھلا کی لاش تھی جسے رات آخری پہر میں بھولا ناتھ نے بڑی سنگ دلی کے ساتھ گولی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔

سونگ کھلا جیسی حسین اور نرم و نازک حسینہ کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ وہ جیسی بھی تھی، اس کے ساتھ میں نے بہر حال انڈیمان کے صدر مقام پورٹ بلیئر کے کنارے اچھا وقت گزارا تھا، یہ الگ بات تھی کہ بعد میں حالات تلخ ہوتے چلے گئے تھے اور پھر نہ سنبھل سکے یہاں تک کہ وہ بالآخر تباہی و بربادی اور سونگ کھلا کی موت پر منتج ہوئے۔

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جس بدنصیب عورت کی لاش اس وقت نارتھ انڈیمان کے اس دور افتادہ ساحل پر مردار خور گدھوں کی خوراک بن رہی تھی وہ صرف چند روز پہلے کس قدر شاہانہ زندگی گزارتی رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ جیپ اپنی جگہ موجود تھی، جبکہ بھولا ناتھ اور اس کے ساتھی اپنے دشمنوں کو تعاقب میں آتے دیکھ کر ایک دم پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ شاید ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے پاس ابھی جیپ میں سوار ہونے کا وقت نہ تھا۔ اُدھر ان کے تعاقب میں آنے والوں نے ان پر اپنے ہتھیاروں سے حملہ کر دیا۔

دونوں گروپوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑ گیا اور میں ایک طرف دبکا یہ جنگ کا منظر دیکھتا رہا۔ ابھی میں ان کے بیچ نہیں کودا تھا، مگر ہونٹ بھینچے سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حالانکہ میں چاہتا تو اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اپنی منزل کی جانب بڑھ سکتا تھا لیکن ان وحشیوں کے ساتھ سوٹ پوش مسلح افراد کو دیکھ کر میرا کچھ اور کرنے کا ارادہ ہو گیا تھا۔

میں نے ایک فیصلہ کیا اور گھات لگانے کے انداز میں اسی طرف بڑھنے لگا جہاں نووارد گروپ بھولا ناتھ کو چھاپنے کے چکروں میں تھا۔

دونوں طرف سے خوب ٹھنی ہوئی تھی اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا کہ میں ان کے بیچ میں کود پڑتا، تاہم یہ الگ بات تھی کہ میں اوکھلی میں سر دینے جا رہا تھا اور یہ داؤ پر بھی لگ سکتا تھا۔ لیکن میرا اوکھلی میں سر دینے کا جو مقصد تھا وہ اہم ہی نہیں میری بہت سی بے چینیوں کو رفع کرنے کے علاوہ کافی سے زیادہ آگہی دینے کا سبب بن سکتا تھا۔

میرا شکار کوئی وحشی نہیں، ان کے ساتھی گروپ کا کوئی فرد تھا جو اُن پر حکمرانی حاصل کر چکا تھا یا قریبی دوست بن چکا تھا۔

جہاں یہ لوگ سست باندھے بھولا ناتھ وغیرہ سے نبرد آزما تھے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی، اصل بات یہ تھی کہ مجھے رازداری سے ان کے قریب پہنچنے کی گھات میسر تھی۔ اس طرف جھنڈ دار درخت اور گھنی جھاڑیاں تھیں، میں انہی کی اُوٹ لیتا ہوا محتاط روی کے ساتھ ان کی طرف بڑھنے لگا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ جاری تھی اور مجھے ان کی فائرنگ سے بچ کر ہی آگے بڑھنا تھا بہ صورت دیگر میں کسی بھولی بھٹکی گولی یا برسٹ کے زد میں آسکتا تھا۔

میں زمین پر جھکا جھکا ہوا آگے سرکتا رہا۔ اسی وقت ان میں سے کافی سے زیادہ افراد آگے کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یا تو بھولا ناتھ وغیرہ پسپا ہو رہے تھے یا پھر انجام کو پہنچ رہے تھے۔

میں ذرا رکا اور پھر آگے بڑھا، اسی وقت ایک برسٹ چلا۔ میں غیر ارادی طور پر جھکا اور زمین کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ اُدھر گھات میں رہ جانے والے ان کے وہ چند ساتھی جو تین چار کی تعداد میں تھے دو چیخ مار کر گرے...... تو باقی دو جوابی فائرنگ سے بچنے کے لیے پیچھے کی طرف کو سرکے، یہی وہ وقت تھا جب ان میں سے ایک کی خدا جانے کس طرح مجھ پر نگاہ پڑ گئی، پہلے تو اس کی آنکھوں میں حیرت سی اُمڈی، مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کیا تھا کہ میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا، میری گن نے آتشیں قہقہہ اُگلا اور وہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ آخری جو بچا اُسے پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ برسٹ کہاں سے اور کس نے چلایا، جب اس نے عقب میں مڑ کر دیکھا تو میں تب تک اس کے سر پر پہنچ چکا تھا، اب اس کے پاس اپنی گن کا رخ میری طرف پھیرنے کا موقع نہ رہا تھا۔ میں اس پر جھپٹا اور اس کی گن چھین لی۔ یہ کلی منجارو گروپ کے ”مہذب“...... ساتھیوں میں سے ایک تھا۔

وہاں ساحل کی طرف ابھی جنگ جاری تھی۔ ادھر میں نے اپنے شکار کو دبوچ رکھا تھا، گن چھینتے ہی میں نے اسے نیچے گرا لیا اور اس کی کنپٹی پر گن کا ٹھوس آہنی کندا رسید کر دیا۔ وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

میرا کام ہو گیا تھا۔ میں .... باقیوں کو آپس میں ”مصروف“ چھوڑ کر اپنے بے ہوش شکار کو کاندھوں پہ ڈالے اُلٹے پاؤں دوڑا اور ٹیلوں ٹبوں کی آڑ میں آ گیا۔ یہاں پہنچا تو اچانک میری نگاہ سامنے پڑی اور میں ٹھٹک گیا۔

سامنے ہی ایک ٹیلے کی ڈھلان کے قریب ایک بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا ہوا، یہ جیپ بلاشبہ انہی لوگوں کی تھی۔ میں نے پل کے پل اپنا یہاں ٹھہرنے کا ارادہ بدلا اور اپنے شکار کو کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے تقریباً دوڑتا ہوا جیپ کے قریب آیا تو حسبِ توقع اس کے اگنیشن سوئچ پر چابی لگی دیکھ کر میری آنکھوں میں ایک چمک سی اُبھری، جیپ میں اور بھی تھوڑا بہت سامان رکھا تھا۔

میں نے اپنے شکار کے بے سدھ وجود کو سیٹ پر ڈالا اور خود اس کے برابر والی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ چابی گھمائی تو ایک تیز غراہٹ کے اس کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ میں نے گیئر ڈالا اور ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ بدلا اور منزل کی جانب موڑ کر ایکسیلریٹر دباتا چلا گیا۔

میں جیپ کو ناہموار اور اُونچے نیچے راستوں پر دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جہاں دو مخالف گروپ آپس میں لڑ مرنے میں مصروف تھے، میں وہاں سے کافی دور نکل جاؤں۔

کلی منجارو کی سرزمین میں جہاں میرے بہت سے دشمن تھے وہیں میری ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ اپنے اپنے مفادات نے انہیں بھی ایک دوسرے کی جان کا دشمن بنا رکھا تھا۔ سے جی کوہارا اور کوریلا کی مثال میرے سامنے تھی، لیکن میرے لیے اب یہ بات بے چینی پیدا کرتی تھی کہ میں اس بات کا جلد سے جلد کھوج لگاؤں کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو ان وحشیوں پر اپنا غلبہ قائم کر چکے ہیں اور انہیں اپنا بے دام غلام اور دوست بھی بنا چکے ہیں۔ یہ راز اب مجھے میرا یہ شکار اُگلنے والا تھا۔

ایک محفوظ مقام پر میں نے جیپ روک دی۔ میرے شکار کو ہوش آنے لگا تھا۔ میں نے اس کی ٹوپی اُتار کر خود پہن لی تھی۔ اس سے دھوپ آنکھوں میں نہیں پڑتی تھی۔ یہ تقریباً میرے ہی قد و قامت کا آدمی تھا، رنگت بھی سرخ و سپید تھی، مگر اس پر کسی یورپین کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ وہ انڈین ہی لگتا تھا۔

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر رسی سے باندھ دیے تھے۔ روانگی سے پہلے جیپ کی مختصر تلاشی کے دوران مجھے بس یہی ایک کام کی شے نظر آئی تھی۔ ہوش میں آتے ہی وہ تڑپنے لگا۔

”بس! حرکت نہیں...... تم پوری طرح میرے قابو میں ہو......“

میں نے اس کی طرف گن کا رخ کرتے ہوئے کھردرے سے لہجے میں کہا۔ وہ ٹھہرا اور پہلے گرد و پیش کا ایک طائرانہ سا جائزہ لیا، شاید وہ اپنے ساتھیوں کی موجودگی کا احساس کرنا چاہتا تھا۔

”یہاں اس بنجر ویرانے میں صرف میں اور تم ہیں......“ میں نے اس کی متلاشی اور گردشی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے اس سے تحکمانہ کہا۔ ”میری تم سے کوئی دشمنی

نہیں ہے۔ مجھے صرف سوالوں کے جواب چاہئیں۔''
''تم انہی کے ساتھی ہو جو ساحل کے قریب......'' اس نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔
''نہیں......'' میں نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''وہ میرے دشمن تھے اور اُنہوں نے میری ایک ساتھی کو ہلاک کر ڈالا تھا، تم نے شاید اس کی لاش وہاں ریت میں پڑی دیکھ لی ہوگی۔''
اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بہ غور اپنی آنکھیں سکیڑے میری طرف دیکھتا رہا۔
''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میرے سوالوں کے جواب دو گے یا پھر میں تمہیں گولی مار کر آگے بڑھ جاؤں......؟''
میں نے آخر میں سفاکی سے کہا تو وہ مجھے اسی طرح گھور گھور کر شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے گومگو سے لہجے میں بولا۔ ''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''
''تم لوگ کون ہو اور کس گروپ سے تعلق رکھتے ہو؟ ان کلی منجارین وحشیوں پر تم لوگوں نے کس طرح اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے؟ اور کیوں؟''
اس نے میرے جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر تھوک پھینکا۔
مجھے اس کے انداز میں تضحیک اور حقارت کا عنصر محسوس ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اسی لہجے میں استہزائیہ ہنسی سے بولا۔
''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے سوالوں کے جوابات دے دوں گا؟''
اس کے اندازِ بے پروائی نے میرا دماغ گھما دیا اور میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا ٹھوس آہنی کندا اس کی ٹھوڑی پر ''وجا'' دیا۔ اس کے حلق سے تیز کراہ خارج ہو گئی۔ اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا تھا، جسے اس نے خون آلود لعاب تھوک کی صورت، نیچے بھربھری مٹی میں اُچھال دیا۔
میں نے ایک ہاتھ سے اس کا گریبان دبوچا اور جیپ کی سیٹ سے نیچے گھسیٹ کر گرم تپتی ریت پر پھینک دیا۔ پھر اس کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا اور گن کی نال اس کے منہ کے اندر گھسیڑ ڈالی اور غرا کر بولا۔ ''میرے تین ساتھی ان وحشیوں کے قبضے میں ہیں...... جنہیں آزاد کرانے کی خاطر میں نے یہاں تک کا دشوار گزار سفر کیا ہے...... سمجھے تم؟ مجھے بتاؤ گے تم کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہیں؟ ورنہ گولی مار کر تمہارا حلق پھاڑ دوں گا......''
میں نے کہنے کے بعد گن کی نال اس کے منہ سے باہر کھینچ لی۔ اسے کھانسی کا ایک زبردست ٹھسکا لگا، میں نے شاید جوشِ غیظ تلے گن کی نال اس کے حلق تک اُتار دی تھی۔ میں نے اُسے ذرا سنبھلنے کا موقع دیا۔ وہ تھوڑا کھانستے رہنے کے بعد میری طرف اپنی آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا پھر ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔
''م...... مجھے تمہارے ان تینوں ساتھیوں کا کچھ بھی نہیں پتا......''
''کیسے نہیں پتا تمہیں؟'' میں غضب ناک لہجے میں غرا کر بولا۔ ''تم ان کے ساتھی ہو اور میرے تینوں ساتھی انہی کی قید میں ہیں۔''
''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہوتی تو میں تم سے کیوں چھپاتا؟ ہمارا یوں بھی تمہارے ساتھیوں سے بھلا کیا لینا دینا۔''
مجھے اس کے لہجے سے مکاری کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے پھر، اگر تم نے واقعی مجھ سے سچ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں...... ہاں! البتہ اپنے ساتھیوں کی آزادی کے سلسلے میں جو کر سکتا ہوں وہ تو میں ضرور ہی کروں گا...... یوں بھی میں منزل کے قریب ہوں اور میرے پاس تم سے سچ اُگلوانے کا وقت بھی نہیں......''
بڑے ڈرامائی انداز اور لہجے کو دانستہ سنسنی خیز بناتے ہوئے میں نے گن جیپ کے ساتھ ٹکائی اور اس کی طرف بڑھا، اس کی پسینے سے تر پیشانی پر اُلجھن آمیز پریشانی کی شکنیں سی ابھریں۔ پھر وہ لکنت زدہ لہجے میں مجھے اپنی طرف جھکتا دیکھ کر بولا۔
''ت...... تم کیا کرنا چاہتے ہو......؟''
''خاموش......! ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' میں نے سرد سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد اس کی قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔
''ی ی...... ی...... یہ کیا کر رہے ہو تم؟''
میں نے ایک تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا اور پھر اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر وہ اُتار لی۔ اس کے لیے مجھے اس کم بخت کے دونوں رسن بستہ ہاتھ کھولنا پڑے، اور یہ کام میں نے نہایت محتاط طریقے سے پہلے اس کے دونوں پیروں میں رسی باندھ کر کیا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ اس کے ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے تھے پھر اسی طرح اس کی پتلون بھی اُتار لی۔

اب وہ صرف ایک جانگیا میں تھا اور باقی سارا اس کا جسم برہنہ تھا۔

''تم اس طریقے سے بھی کامیاب نہیں ہوسکو گے......''

وہ اب کہیں جاکر میری اس حرکت کا مطلب سمجھا تھا۔

''یہ میرا درد سر ہے...... تمہارا نہیں۔'' میں نے بے پروا انداز میں کہا۔''تم اپنی فکر کرو کہ یہاں بنجر اور تپتے صحرائی ویرانے میں ننگے بدن تپتی دھوپ کے نیچے کسی کی مدد کے انتظار میں جانے کب تک بیٹھے رہو گے؟''

میں نے خوفناک نقشہ کھینچ کر اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا چاہا اور اپنا کام کرتا رہا۔ یعنی اب اس کا لباس اور ٹوپی میں نے پہن لی تھی۔ لباس کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے کچھ شناختی کاغذات برآمد ہوئے جس کے مطابق اس کا نام دیال داس تھا۔ شہریت اس کی بھارتی تھی اور رہنے والا یہ ممبئی کا تھا۔ میری پیشانی پر سوچ آمیز شکنیں نمودار ہوگئیں۔

نام دیال داس، شہریت بھارتی اور رہائش ممبئی...... یہ کون سا گروپ ہوسکتا تھا اور یہاں ایک دور افتادہ جزیرے کے ایک وحشی قبیلے کو کس طرح اپنا تابع بنا چکا تھا اور کیوں......؟ نیز یہاں ان کے فروکش ہونے کا مقصد کیا تھا؟

یہ ایک بڑا سوالیہ نشان تھا میرے لیے۔ دیال داس مجھے یہ ساری حقیقت بتا سکتا تھا۔

''پپ...... پلیز! مجھے اپنا لباس تو پہنا دو...... میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں علم نہیں ہے۔''

''چلو، مانے لیتا ہوں، تمہیں میرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں پتا...... مگر یہ تو بتا سکتے ہو کہ تم لوگ ہو کون؟ اور یہاں ایک وحشی قبیلے کو تم لوگوں نے کس طرح اپنا تابع بنا رکھا ہے؟''

میں نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہم ایک غیر ملکی این جی او...... ''سروائیول انٹرنیشنل'' کے ملازم ہیں۔ وہ یہاں پر بسے ہوئے قبائلیوں کی بقا اور ان کی ناپید نسل کو بچانے اور ان کے حقوق کی آواز کو بھارتی حکومت اور عالمی برادری تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ یہ ہمارے تابع ہیں، بلکہ یہ ہمارے دوست ہیں۔ ہمارا مقصد جاننے کے بعد یہ ہمارا ہر طرح سے ساتھ دینے کو تیار ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ کہا۔

''یہ کیسی این جی او ہے جو ایک طرف تو ان قبائلیوں کی بقا و بہبود کے لیے کام کر رہی ہے اور دوسری طرف اُن لوگوں کا بیدردی سے خاتمہ کر رہی ہے جو باہر سے آکر ان کی عمل داری میں دخل انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں یہاں ان لوگوں کی بربریت کے مظاہرے دیکھ چکا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ جیسے بات بناتے ہوئے بولا۔ ''ہماری جنگ ہر اُس شخص سے ہے جو مجرمانہ مقاصد کے ساتھ یہاں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''مثلاً...... ان کے مجرمانہ مقاصد کیا ہو سکتے ہیں؟ اس کی ذرا تشریح کرنا پسند کرو گے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر بدستور استہزائیہ لہجے میں کہا۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھ رہا تھا، سمجھ رہا تھا میں اس کی باتوں میں آجاؤں گا۔

''وہ...... وہ...... مقاصد کسی بھی قسم کے ہوسکتے ہیں۔''

''چلتا ہوں میں...... خود ہی مجھے حقیقت کا پتا چل جائے گا۔'' میں نے کاندھے جھٹکے اور پھر اس کے منہ میں اسی کا رومال ٹھونس دیا۔ وہ بے چین ہوکر اِدھر اُدھر اپنا سر مارنے لگا۔ میں اسے چھوڑ کر جیپ لیے آگے بڑھ گیا۔

دال میں کچھ کالا تھا۔ کلی منجارو کی سرزمین میں یہ گروپ کیا کر رہا تھا، اس کا مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی قابلِ تحسین فعل نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ کچھ بھی کرتا رہے مجھے اس کی پروا نہ تھی، میں تو اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے بعد اُلٹے پیروں اس منحوس جزیرے سے فرار چاہتا تھا۔

دیال داس کا میں بھیس بھر چکا تھا۔ ساتھ ہی اپنی ''پری پلاننگ'' کے مطابق میں اس سے باتیں کرنے کے دوران اس کے لب و لہجے اور آواز پر بھی غور کرتا رہا تھا۔ اس کا لہجہ دبا دبا اور آواز بھاری مگر گھٹی گھٹی سی تھی۔ رہا شکل و صورت کی مماثلت کا مسئلہ تو وہ اپنی جگہ تھا، مگر دیکھنا تھا کہ اتنی گنجائش کے دوران میں کب تک ان کے درمیان ان کا ساتھی بن کر رہ سکتا تھا اور کیا کرسکتا تھا تاہم میری کامیابی کا دورانیہ مختصر ترین بھی ثابت ہوتا تو یہ میرے لیے بہت ہوتا۔ یہی سوچ کر میں نے یہ سارا روپ دھارا تھا۔ تاہم متوقع کامیابی کے اس قلیل ترین عرصہ کو کچھ طول دینے کی غرض سے میں نے اپنی ''پری پلاننگ'' کے مطابق اپنے چہرے پر کچھ اس طرح کی مصنوعی خراشیں ڈال لی تھیں جس سے میرا چہرہ پوری طرح نہیں پہچانا جاتا تھا۔

میں نے ایک لائحہ عمل کے تحت اپنی منزل کا راستہ عارضی طور پر بدل لیا تھا اور اب اسی سمت کو واپس لوٹ رہا تھا جہاں میرے شکار کے ساتھی بھولا ناتھ گروپ سے برسرِ

بیکار تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے جیپ روک دی اور صورتِ حالات کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے وہاں لاشیں بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ان میں وحشیوں کی بھی لاشیں تھیں، میں نے ان کا جائزہ لیا تو اکا دُکا مجھے ہوش میں مگر زخمی حالت میں نظر آئے۔ باقی غائب تھے۔ جیپ بھی نہیں نظر آرہی تھی۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔ میں نے ان کا ساتھی بن کر دو کلی منجاریوں کو اُٹھایا اور جیپ میں اس طرح ڈال دیا کہ وہ دور سے ہی جیپ میں لدے ہوئے نظر آتے رہیں۔

میں ابھی پلٹ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک فائر ہوا، میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ میں نے گردن موڑ کر عقب میں دیکھا تو وہاں مجھے چار افراد کھڑے دکھائی دیے۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا، وہ انہی کے ساتھی تھے۔ تین کلی منجارین اور ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس۔ اس نے اپنی گن کا رخ فضا میں کر رکھا تھا، اس بات کا فوری ادراک ہوتے ہی کہ اپنی جیپ پہچان کر اور غالباً مجھے اپنے مخصوص لباس میں دیکھ کر مجھے متوجہ کرنے کے لیے اس نے ہوائی فائر داغا تھا۔

اب آر تھا یا پار میں نے فوراً جیپ کا اسٹیئرنگ گھمایا اور ان کی طرف موڑ کر قریب جا پہنچا۔

اپنے کلی منجارین ساتھیوں کو جیپ میں پڑا دیکھ کر وہ تینوں وحشی ان کی طرف بڑھے۔ جبکہ شرٹ پینٹ والا غصے سے اپنے دانت بھینچتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر کے پُرطیش لہجے میں بولا۔

''تم کدھر دفان ہو گئے تھے دیال!''

اس کے تحکمانہ لہجے نے فوراً ہی مجھے باور کرا دیا کہ یہ اس گروپ کو لیڈ کر رہا تھا۔ تھپڑ کھانے سے میرے سر کی ٹوپی نیچے گر پڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں چونکنے پن کی علامات ابھری تھیں۔ میں جلدی سے جیپ سے اُتر کر ٹوپی اُٹھانے کے لیے جھکا اور پھر اسے دوبارہ سر پہ جمانے کے بعد لرزتے لہجے میں بولا۔

''سر! میں جیپ لینے کے لیے بھاگا تھا، تاکہ دشمنوں کا تعاقب کیا جا سکے۔ مگر وہاں پہنچا تو دشمنوں کے دو ساتھی مجھ سے بھڑ گئے، میرے ہمراہ یہ دونوں بھی تھے۔'' میں نے جیپ میں بے سدھ پڑے دو کلی منجارین کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دونوں زخمی ہو گئے، میرا بھی یہی حال ہوا مگر میں نے ان دونوں سے جم کر مقابلہ کیا اور ایک کو ہلاک کر ڈالا اور دوسرے پر تشدد کر کے یہ حقیقت اُگلوانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ تھے کون؟''

اس سے بات کرنے کے دوران میں نے اپنی ٹوپی کا چھجا ذرا نیچے جھکا لیا تھا۔ وہ میرے چہرے کی خراشوں سے مجھے پہچاننے کے معاملے میں تھوڑی دیر تذبذب کا شکار رہا تھا مگر میری بات اور انکشاف نے اسے اس اُلجھن سے فرد کر دیا۔ بولا۔ ''کون تھے وہ؟''

''بھولا ناتھ اور اس کے ساتھی تھے وہ......'' میں نے دیال سنگھ جیسے گھٹے گھٹے اور ہمراے ہوئے لہجے میں بتایا تو وہ بری طرح ٹھٹکا۔ جس سے مجھے صاف اندازہ ہوا کہ وہ اس سے غائبانہ واقف تھا۔

''کیا تم صحیح کہہ رہے ہو؟''

''جی ہاں، جناب! بالکل صحیح کہہ رہا ہوں...... آہ......'' آخر میں دانستہ میں کراہا...... اور اپنے خراش زدہ چہرے پر یونہی ہاتھ پھیرا۔ اسی اثنا میں اس کے دو ساتھی اور وہاں آ گئے اور ایک نے مجھے دیکھ کر اپنا غصہ نکالتے ہوئے برہمی سے کہا۔

''تم کہاں مر گئے تھے؟ ہمیں گاڑی کی ضرورت تھی۔''

مجھے یہاں دیال داس کی حیثیت کا اندازہ بھی ہونے لگا تھا کہ وہ ان کا ساتھی ضرور تھا مگر اس کی وقعت ان کی نظروں میں ایک ادنیٰ ملازم سے زیادہ نہیں تھی اور وہ کچھ زیادہ معروف بھی نہ تھا یا شاید ان کے درمیان نیا تھا۔ یہ بات میرے مفاد میں جاتی تھی، یوں یہ مجھ پر زیادہ توجہ نہیں رکھ سکتے تھے۔

''اس نے بڑا کام کیا ہے۔'' تحکمانہ انداز میں مجھ سے بات کرنے والے نے ان سے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر جب اس نے انہیں یہ ''حقیقت'' بتائی تو وہ چونک پڑے۔

''اوہ...... سر! اس کا مطلب ہے جنرل صاحب کا خدشہ درست ثابت ہوا......'' دوسرے نے قدرے تفکر سے کہا تو میرے اندر ''جنرل'' کے ذکر پر ایک دھماکا سا ہوا۔

جنرل کے لاحقے نے میرے اندر ''جنرل کے ایل ایڈوانی'' کا تصور ابھارا تھا مگر یہ ابھی قبل از وقت تھا کہ بھلا اس کا یہاں کیا کام اور کیا مقصد؟ تاہم میں اندر سے کھٹک ضرور گیا تھا۔

''مگو بار انڈیمان کے ڈان کو بھلا کس طرح اس کی بھنک پڑی ہو گی......؟ یہ اڑچن سمجھ میں نہیں آتی۔'' تحکمانہ انداز میں بات کرنے والے نے خود کلامیہ بڑبڑاہٹ سے کہا۔

''صاف سی بات ہے سر! اسی طرح خبر ہوئی ہو گی جیسے اوروں کو ہوئی......'' اس کے پہلے والے ساتھی نے کہا۔

میں بہ غور گویا ٹکٹکی باندھے ان کی گفتگو سنے جا رہا تھا۔ باقی وہ تینوں قلی منجارین جیپ میں پڑے اپنے دونوں ساتھیوں کو سنبھالنے کی کوشش میں معروف تھے۔

''یہ سارا کچھ جنرل صاحب کی لاڈلی پوتی اور اس کے پاکستانی یار کا کیا دھرا ہے، جس کی یہاں آمد کے شواہد بھی ہمیں ملے ہیں......'' وہ دانت پیس کر بولا اور میرے اندر جیسے پے در پے دھماکے ہونے لگے۔

''جنرل صاحب......''، ''لاڈلی پوتی'' ...... ''اس کا پاکستانی یار'' ...... بات کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔

''تب پھر ہمیں بلراج صاحب سے کہنا پڑے گا کہ جتنی جلد ہو سکے وہ جنرل صاحب کو اس بات پر قائل کریں کہ وہ یہاں سے اپنا بوریا بستر گول کریں...... اُس منحوس ہیرے کی وجہ سے ایک بڑی عالمی تنظیم کا گروپ بھی ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔''

ہیرے اور بلراج کے ذکر نے میرا رہا سہا شبہ بھی دور کر دیا کہ یہ لوگ کس کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر ابھی تک میں یہ سمجھنے سے قاصر ہی تھا کہ بھلا جنرل ایڈوانی کو یہ کیا سوجھی تھی کہ وہ شہر چھوڑ کر یہاں ان وحشی قبائیلیوں کی پناہ میں آیا ہوا تھا اور یہ اہم سوال اپنی جگہ پر تھا کہ اس نے ان وحشی قبائیلیوں کو کس طرح رام کر رکھا تھا؟

میری ''پری پلاننگ'' کی ابتدا میں ہی بہت سی سنسنی خیز باتوں کا انکشاف ہوا تھا اور کئی چونکا دینے والے حقائق سے پردہ ہٹا تھا اور آگے بھی جانے کیا کچھ سامنے آنے والا تھا۔

''بلراج سنگھ، جنرل صاحب کا چہیتا ہے جو جنرل صاحب کی مرضی ہوتی ہے وہی بلراج صاحب کی، ہم کچھ نہیں کر سکتے، زیادہ اعتراض اُٹھائیں گے تو ہمیں خاموشی سے موت کی نیند سلا دیا جائے گا، بلراج سنگھ جیسے درندہ صفت اور کمینے انسان سے میں اچھی طرح واقف ہوں......''

تحکمانہ انداز میں کہنے والے کی اس بات سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہوا تھا کہ یہ لوگ بھی خائف تھے۔

''چلو اب واپس چلیں......'' اس نے کہا اور مجھے جیپ اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ جیپ میں سوار ہو گئے اور میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا لی۔

میرا دل اپنی اس کامیابی سے بے طرح دھڑک رہا تھا مگر بقول شاعر۔ ابھی آگے امتحاں اور بھی تھے...... کے مصداق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میری اس کامیابی کی عمر کتنی ہو سکتی تھی؟

جیپ دوڑاتے ہوئے میرے ذہن میں ان لوگوں کی

باتوں سے کئی طرح کے منصوبے آنے لگے، میں ان پر غور بھی کرتا جاتا اور ساتھ ہی سامنے نظریں اور ان کی آپس کی باتوں پر توجہ بھی رکھے ہوئے تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں دیال؟ اس طرف سے چلو...... کیا راستہ بھول گئے ہو؟"

اچانک میرے برابر میں بیٹھے ہوئے گروپ لیڈر نے مجھے درشت لہجے میں ٹوکا تو میں نے فوراً بات بنائی۔ "سر! میں تو احتیاط کے پیشِ نظر دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا...... چلیں جیسے آپ کی مرضی......" یہ کہتے ہوئے میں نے جیپ کو اسی کے اشارے پر ڈال دیا۔

ظاہر ہے مجھے پوری طرح ان کے ٹھکانے کے راستوں کا اندازہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں صرف نانا شکور کے بتائے ہوئے راستوں کا ادراک تھا جو غلط تو نہیں تھے، مگر بہرحال ان لوگوں کے حساب سے مجھے نسبتاً شارٹ کٹ راستہ ہی اپنانا چاہیے تھا، جس سے میں ناواقف تھا۔

"پتا نہیں کیوں جرنل صاحب نے نئے لوگوں کو بھی بھرتی کرلیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا، وہ اتنے لوگوں کا ہجوم بنا کر کس کے لیے فوج بنانا چاہتے ہیں؟"

عقبی سیٹ پر بیٹھے اس کے ایک ساتھی نے بیزار کن تبصرہ کیا تو مجھے یہ خوش کن اندازہ ہوا کہ میں نے جس دیال داس نامی آدمی کا "حادثاتی" بہروپ بھرا تھا وہ ان میں کوئی نو وارد ہی تھا۔

میں نے موقع پاتے ہی اپنے لہجے میں بے چارگی اور لجاجت سموتے ہوئے کہا۔ "کیوں صاحب جی! کیوں مجھ غریب کی روزی پر لات مارنا چاہتے ہیں؟"

"تم اپنے کام سے کام رکھو دیال!" میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے مجھے گھرکا۔

میرے بہروپ میں خاطر خواہ "رنگ" بھرنے لگا تھا اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میری باقی کی "گیم" بھی اب بغیر کسی خون خرابے اور مارا ماری کے خیر خیریت سے گزرے گی۔ تقدیر میرا ساتھ دے رہی تھی، اگرچہ اس کی تدبیر میں ہی کر رہا تھا۔

جلد ہی ہم ایسی بستی میں داخل ہو گئے جہاں بے ترتیب سی قطاروں کی صورت میں کھپریل کی مخروطی چھتوں والی جھونپڑیاں تاحدِ نظر پھیلی ہوئی تھیں اور ننگ دھڑنگ جانگلی مرد وعورتیں اور بچے اِدھر اُدھر چکراتے پھر رہے تھے۔

میرے لیے اب ایک مشکل پیش آگئی تھی کہ مجھے ان کی منزل کا پتا نہیں تھا کہ انہوں نے کہاں اور کس طرف جانا تھا۔ میری یہاں ذرا سی بھی غلطی مجھے پھنسا سکتی تھی۔ اچانک میں نے جیپ روک دی اور اسٹیئرنگ سے ہاتھ ہٹا کر اپنے خراش زدہ چہرے پر رکھ کر کراہنے لگا۔

"آہ...... بڑی جلن ہو رہی ہے میرے زخموں پر...... شاید یہ دھوپ کی وجہ سے ہے...... اُف۔"

میری اس چالاکی کا خاطر خواہ اثر نکلا، لیڈ کرنے والے نے اپنے ایک ساتھی کو پکارا۔ "اوئے...... بھگت! چل تُو سنبھال اسٹیئرنگ کو اور دیال! پیچھے جا تو......"

میں اُف...... اور ہائے وائے کرتا ہوا جیپ سے اُترا اور پھر پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ جیپ آگے بڑھ گئی اور میں نے اندر ہی اندر اطمینان کی سانس خارج کی۔

میں نے اپنے انداز و اطوار سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں پہلی بار اس بستی میں داخل ہوا تھا۔ تاہم میں دُزدیدہ نظروں سے اطراف کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔

اس پسماندہ سی بستی میں ایک جیتی جاگتی زندگی آباد تھی۔ تہذیب وتمدن سے کوسوں دور یہ باشندے دنیا والوں کے سامنے وحشی کہلاتے تھے، مگر حقیقت میں ان کی زندگی بڑی قابلِ رحم تھی۔ تپتی دھوپ اور بلا کی گرمی میں یہ لوگ ننگے پنڈوں کے ساتھ روزمرہ کے کاموں میں مشغول تھے۔ یہاں مال مویشی بھی نظر آ رہے تھے جن میں گائے بھینسوں اور بکریوں کے علاوہ کتے اور سؤر بھی شامل تھے۔

مجھے ایک بات پر حیرت ہوئی تھی۔ یہ لوگ کہیں سے بھی جنگجو نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے برعکس ان کے جسم نحیف ونزار اور مدقوق تھے۔ کئی ایک کو تو میں نے چلتے چلتے گرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، چند ایسے بھی تھے جنہیں میں نے کسی معذوری کے باعث چوپایوں کے مانند بھی چلتے ہوئے دیکھا۔ عورتوں کی حالت مجھے زیادہ قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھی۔

ان کے اُوپری جسم بالکل برہنہ تھے۔ نیچے تک کھلا لاچا سا باندھے رکھا تھا۔ جسم سوکھے اور نچڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ چہرے گول اور کانوں میں پیتل کے بالے تھے۔ مردوں کا بھی یہی حال تھا۔ ان کی پسلیاں تک باہر کو آ رہی تھیں۔ یہ سارے مجھے ان لوگوں سے بالکل مختلف نظر آ رہے تھے جن وحشیوں سے میرا ٹاکرا ہو چکا تھا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اگر میں اُن وحشیوں کا موازنہ اِن سے کرتا ہوں تو یہ لوگ مجھے ان سے قطعی مختلف نظر آ رہے تھے۔ اِن کے چہروں سے تو بے بسی، اُداسی اور مایوسی کے ساتھ بے چارگی بھی ٹپک رہی تھی۔ یہ تو خود قابلِ رحم نظر آ رہے

تھے جُھے، بھلا کسی اور کے لیے کیا خطرہ بن سکتے تھے۔ یوں میں اُن وحشیوں کی طرف دیکھتا ہوں جن سے میرا مقابلہ ہوتا رہا تھا تو وہ ان کے مقابلے میں توانا، صحت مند اور جنگجو نظر آتے تھے، یہ الگ بات تھی کہ ان کی ''ہیئت'' ایک ہی تھی۔ یعنی وہ بھی قبائلی تھے تو یہ بھی انہی جیسے ہی نظر آتے تھے۔ ان کے چہروں سے مفلوک الحالی ٹپکتی تھی تو کلی منجارین کے چہروں سے بے رحمی اور سفاکی مترشح ہوتی تھی۔

یہ کیا چکر تھا؟ ابھی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا مگر لگتا ایسا ہی تھا کہ کوئی بڑا اور گہرا چکر تھا اور اس کا تعلق اس خبیث جنرل کے ایل ایڈوانی سے جڑتا تھا۔

میں بظاہر جیپ کی عقبی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا اور میرے برابر میں اُن کا ساتھی۔ بالکل پچھلے حصے میں کلی منجارین تھے۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا میرا (دیال کا) ساتھی اُن ننگ دھڑنگ قبائلی جوان عورتوں کو شیطانی نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے ہلکا ٹہوکا مار کر سرگوشی میں بولا۔

''اوئے دیالے! وہ دیکھ...... ہماری بلیک کوئین...... ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے...... لگ رہا ہے اسے کل رات مزہ آیا تھا۔''

''ہیں...... آں...... ہاں، کہاں ہے وہ؟ مجھے تو نظر نہیں آ رہی ہے؟'' میں نے جیسے خیالات سے چونک کر کہا۔

''وہ دیکھ، اُس طرف، جہاں دو جھونپڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔''

اس نے کہا اور میں نے اس طرف نظریں پھینکیں۔

وہاں دیگر قبائلی ادھیڑ اور جوان عورتیں بھی کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی تھیں، مگر ان کے چہروں سے کہیں بھی خوشی یا خیر مقدمی کی مسکراہٹ چھلکتی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اس کی جگہ خوف، نفرت اور سراسیمگی کا عنصر غالب نظر آتا تھا۔

صرف ان میں ایک وہ واحد عورت تھی، جو قدرے صحت مند اور متناسب جسم کی مالک تھی اور اس کے چہرے کے نقوش بھی خاصے کشش انگیز تھے، باقی رنگ اس کا بھی اپنی ہم قبیلہ عورتوں جیسا ہی کالا سیاہ تھا۔ یہ سب اُوپری دھڑ سے برہنہ تھیں اور ان کا شباب غربت، مصائب اور سخت کوش زندگی کی دھوپ میں ڈھلتا ہوا ہی لگ رہا تھا۔ مگر وہ ''بلیک کوئین'' ذرا صحت مند دکھائی دیتی تھی۔

وہ اپنی ساتھی خواتین سے ذرا پیچھے کھڑی ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بھی ہلا دیا تھا، تب ہی اچانک ایک عورت کی اس پر نگاہ پڑ گئی اور پھر دونوں میں لڑائی ہوگئی۔

جیپ آگے جا چکی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ سارا چکر کیا تھا۔ تاہم اس ''بلیک کوئن'' (پتا نہیں یہ اس عورت کا نام تھا یا پھر میرے ساتھی نے خود سے رکھ چھوڑا تھا) کون تھی؟ اور اس نے اور دیال نے کل رات اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ کچھ شرمناک سا اندازہ تو ہوا، پھر اس سے آگے میں کچھ سوچ نہ سکا۔

جیپ ان جھونپڑیوں سے راستہ بناتی ہوئی بہت کم رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی اور یہ قبائلی جانگلی ایک طرف کھڑے ہو کر ہماری طرف گھورنے میں محو تھے، ان کی آنکھوں میں اب بھی ہمارے لیے ناپسندیدگی اور سراسیمگی کے جذبات موجود تھے۔

معاً ہی میری نگاہ ایک عجیب سے شخص پر پڑی۔ عجیب تو خیر اسے نہیں کہہ سکتے تھے، بلکہ اسے قابلِ رحم کہنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ اگرچہ یہاں مجھے ایسے کچھ اور بھی جانگلی دکھائی دیے تھے، یہ بھی انہی میں سے ایک تھا، کچھ زیادہ معذور تو نہیں تھا یہ جیسا دیگر کچھ معذور ایسے تھے جنہیں میں نے چوپایوں کی طرح چلتے دیکھا تھا۔ اس کی صرف ایک ٹانگ میں ''لنگ'' تھا۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اچھے ڈیل ڈول کا مالک تھا مگر اس کے ننگ دھڑنگ جسم پر کوڑھ کے داغ نظر آتے تھے۔ چہرہ بھی کوڑھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ لنگڑا لنگڑا کر ہماری جیپ کے ذرا قریب آ کر ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر پُرغور نظر ڈالی تو یکا یک مجھے ایک جھٹکا لگا۔

اس لنگڑے کوڑھی کا چہرہ مجھے شناسا محسوس ہوا، پھر ایکا ایکی میرے ذہن میں اس کے تصوراتی خدوخال اور شبیہ واضح ہونے لگی تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب میں بھی اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر اور ''پہچان'' کر میں نے اپنے سر سے ٹوپی بھی اتار دی تھی تاکہ یہ بھی مجھے اچھی طرح ''پہچان'' لے۔ یہ کبیل دادا تھا۔

☆☆☆

کبیل دادا یہاں دانستہ ایک کوڑھی کے بھیس میں تھا یا اسے واقعی کوڑھ ہو چکا تھا۔ ابھی اس کا اندازہ کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ میرے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ پتا نہیں اس نے بھی مجھے پہچانا تھا یا نہیں۔ وہ تب تک دور ہو گیا تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اسی طرح بدستور لنگڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ کچھ دور جانگلی بھی چلے آ رہے تھے۔ بیشتر اپنی اپنی بولیوں میں ان سے بے چارگی کے عالم میں کچھ کہہ رہے

تھے۔ انداز ان کا داد و فریاد کرنے جیسا ہی تھا۔ کبیل دادا بھی ان میں ایسا ہی لگتا تھا۔

میرے اندر شدید قسم کی دھکڑ پکڑ سی مچ گئی تھی، میں سوچ رہا تھا باقی میرے ساتھی کہاں تھے؟ اول خیر اور شکیلہ کہاں تھے؟ اور کس حال میں تھے؟ اور پھر سوشیلا...... وہ بے چاری کہاں اور کس حال میں تھی، کیا وہ ابھی ان کے ہتھے نہیں چڑھی تھی یا پھر چھائی کے جنگلوں میں کسی موذی حیوان یا خونخوار درندے کا شکار ہوگئی تھی۔

میں چاہ رہا تھا جیپ کی رفتار مزید آہستہ ہو جائے تاکہ کبیل دادا جیپ کے کچھ اور نزدیک ہو جائے اور وہ مجھے پہچان بھی لے۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی بہت بڑا اور گہرا چکر چل رہا تھا جبکہ کبیل دادا کی ذہنی فراست کا میں بھی معترف تھا۔ وہ یہاں قیدی ہو کر بھی قیدی نہیں تھا اور شاید اپنی ہی کسی مہم بازی میں مصروف...... ان لوگوں کی آنکھوں میں کوڑھی معذور بن کر دھول جھونک رہا تھا۔

اچانک ایک پکی عمر کی عورت روتی ہوئی جیپ کے سامنے آگئی۔ اس نے ایک تین چار سال کا بچہ اپنی گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ عورت کا رنگ انہی کی طرح سیاہ تھا۔ ڈرائیور نے بریک لگادیے، جیپ کی رفتار پہلے ہی آہستہ تھی۔ وہ رک گئی۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہمیں لیڈ کرنے والا سرغنہ اس عورت سے ایسی زبان میں چیخ چیخ کر باتیں کر رہا تھا جو میرے لیے سر بہ سر اجنبی تھی۔ وہ انہی کی بولی بول رہا تھا شاید۔ اس کے بولنے کے انداز میں درشتی اور دھمکی تھی۔ لہجہ حاکمانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنی گن بھی اس پر تانے ہوئے اسے جیپ کا راستہ چھوڑنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مگر وہ عورت اپنے معصوم بچے کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے اس کے سامنے بلند کر کے روئے جاتی تھی اور ساتھ ہی نجانے کیا بولے بھی جا رہی تھی، مگر چونکہ جذبات و احساسات کی ایک ہی زبان ہوتی ہے اسی لیے صاف لگتا تھا کہ وہ فریاد کر رہی تھی اور اس کا بچہ بھی بیمار نظر آتا تھا۔ وہ ان سے مدد مانگ رہی تھی شاید۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ اسی اثنا میں اسی کے قبیل کے دیگر مرد و عورتوں نے اسے تھام لیا اور راستے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگے۔

اسی وقت ایک فائر ہوا۔ وہ بدنصیب عورت تیورا کر گری۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی، جس سے اس کا بھیجا اُڑ گیا تھا۔ لوتھڑے فضا میں بلند ہوئے تھے، وہ بچہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا...... باقی قبائلی خوف سے چیخیں مار کر کائی کی طرح چھٹتے چلے گئے۔ وہ بیمار بچہ، دھوپ سے تپتی ننگی اور بھربھری مٹی والی زمین پر گر پڑا۔ اس کے اندر ہلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

یہ دل دہلا دینے والا منظر مجھے سرتاپا لرزا گیا تھا، کسی خوف سے نہیں بلکہ ایک معصوم، لاچار اور مصیبتوں کی ماری ایک بے گناہ دُکھیاری عورت کی اس طرح سفاکانہ ہلاکت پر...... مگر میں چونکا بھی تھا کہ یہ گولی کس نے چلائی تھی؟ کیونکہ یہ گولی ہمارے (دیال داس کے) گروپ سرغنہ نے نہیں بلکہ کسی اور نے چلائی تھی۔

اس اثنا میں دیگر قبائلی جانگلیوں کے ساتھ کبیل دادا بھی لنگڑاتا ہوا ہماری جیپ کے ذرا قریب آگیا...... وہاں تھوڑا شور اور چیخ و پکار سی مچ گئی تھی، میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کبیل دادا کو اشارہ کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ٹوپی کو جھاڑنے اور جھٹکنے کے انداز میں ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مجھے دیکھ کر ایک شناسائی کی چمک ابھر آئی تھی۔ میں نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا اور ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ کر اس کے چھجے میں اپنا نصف حد تک چہرہ چھپا لیا۔

جلد ہی وہ بے رحم اور سفاک انسان ہمیں نظر آگیا۔ وہ دائیں جانب کے ایک کچے اور بل کھاتے ہوئے راستے پر، بے ترتیب پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کے درمیان سے نمودار ہوا تھا اور اس کے ہمراہ اسی جیسے (ہمارے جیسے) دو مسلح افراد اور تین عدد کلی منجارین بھی تھے، جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں سنان اور بھالے پکڑ رکھے تھے۔ وہ بے رحم شخص خاصا نزدیک آچکا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پستول تھا، جس کی نال سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔ گولی اسی نے چلائی تھی۔ وہ ہمارے سرغنہ کے قریب آگیا۔ اس نے ترچھی ٹوپی پہن رکھی تھی جسے اس نے اُونچی کر رکھی تھی۔ میں اسے یک ٹک تکے جا رہا تھا اور میرے اندر سیاہ طوفانوں کے بگولے اُٹھ رہے تھے۔

''نمستے چھوٹے سرکار جی!'' ہمارے سرغنہ نے اسے سلام کیا، انداز خوش آمدانہ تھا۔

وہ بے رحم چھوٹا سرکار ہمارے سرغنہ سے خرانٹ لہجے میں بولا۔ ''تم کیوں اس مریل کتیا پر اتنا وقت ضائع کر رہے تھے؟ لگتا ہے ایک گولی تجھ پر بھی خرچ کرنا پڑے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پستول کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ سرغنہ اپنی جگہ گم صم سا رہ گیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''چ.... چھچھ......چھوٹے سرکار! غلطی ہوگئی، آئندہ ان کیڑے مکوڑوں کو روندتا ہوا گزر جاؤں گا۔''

''ہاں! یہ ٹھیک ہے، یہ لوگ اسی قابل ہیں۔ انہیں غلام ہی رہنے دو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ انہیں بالکل بھی بولنے نہ دو......'' ترچھی ٹوپی والا بولا، اور پھر ایک نظر ہم سب پر ڈالی۔ دیگر نے فوراً ہاتھ ہلا کر اسے سلام کیا، جبکہ گلی منجاریں نے اپنے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر سر کو خم کیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ہاتھ ہلا دیا تھا حالانکہ میں اس ترچھی ٹوپی والے المعروف ''چھوٹے سرکار'' کو دیکھ کر سکتے ہیں آ چکا تھا۔

یہ جنرل کے ایل ایڈوانی کا مقربِ خاص کار پرداز......بلراج سنگھ تھا،

☆☆☆

قبائلی اُس بدنصیب عورت کی لاش کو اُٹھا کر لے گئے تھے اور اس کے بیمار بچے کو بھی۔ مجمع اب چھٹ چکا تھا۔

میرے اندر سرسراہٹیں ہو رہی تھیں اور پورے وجود پر جیسے لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ میرا ذہن یہ سوچنے سے یکسر قاصر تھا کہ آخر یہاں اس ذلیل ایڈوانی اور اس کے دستِ راست بلراج سنگھ نے کون سا پُراسرار چکر چلا رکھا تھا؟ یہ ابھی تک واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔

''رتن لال! آج کیا پالا مار کے آ رہے ہو؟ کیا کوئی نیا شکار؟''

اچانک چھوٹے سرکار...... بلراج سنگھ نے ہمارے سرغنہ کو مخاطب کر کے کہا تو وہ فوراً جیپ سے اُتر آیا اور ساتھ ہی ہمیں بھی اُترنا پڑا۔ میں نے دانستہ خود کو ان کے پیچھے رکھا تھا۔ اگر اس ظالم کو پتا چل جاتا تو یہ مجھے اِدھر ہی کھڑے کھڑے گولیوں سے چھلنی کر ڈالتا۔

''چھوٹے سرکار! باہر کی صورتِ حال بڑی کھراب ہے۔'' وہ خالص ہندی لہجے میں بولا۔ ''ایک نہیں، دو نہیں، بلکہ بہت سے گروپ یہاں آن وارد ہوئے ہیں۔ بلکہ اب تو ایک بھولا ناتھ نامی بڑا ڈان بھی یہاں قدم رکھ چکا ہے۔ ہمارا ان سے بڑا جبردست ٹاکرا بھی ہوا تھا، ہمارے ساتھی بھی کچھ مارے گئے، مگر ان کا کوئی بھی نہیں بچا تھا۔''

''اور وہ خود...... بھولا ناتھ؟'' بلراج سنگھ نے ٹوپی اُتار کر اور اپنی آنکھیں اُچکا کر اس سے پوچھا۔

''وہ سالا بچ نکلا...... پرنتو اب کیا کرے گا، اس کے اکھا آڑی (ساتھی) مارے گئے ہیں...... وہ اب باؤلے کتوں کی طرح اس جنگل کی خاک ہی چھانتا رہے گا۔''

رتن لال نے جواب دیا اور اسی وقت بلراج سنگھ کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس کے بھاری ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ رتن لال کے چہرے پر پڑا تھا۔

''بھولا ناتھ کا نام شاید تم نے نہیں سن رکھا ہے یا پھر اُس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو......وہ اکیلا بھی کسی سے کم نہیں ہے اور یہاں رہتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کی پوری فوج بلا سکتا ہے، جانتے نہیں ہو تم کہ وہ نارتھ انڈیمان کے ساؤتھ ایریا کا بادشاہ کہلاتا ہے، سب کو چھوڑ کر تمہیں اُسے نشانہ بنانا چاہیے تھا۔ وہ ضرور اپنے ساتھی شاکا کی تلاش میں یہاں آیا ہوگا۔''

رتن لال تھپڑ کھا کر اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔

''چھوٹے سرکار! آپ چنتا نہ کریں...... ہم اُسے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور......''

''تم اب تک شہزی اور اس بری گروپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تو بھولا ناتھ کا کیا کر لوگے۔'' بلراج سنگھ غضب ناک لہجے میں بولا۔

غالباً بری گروپ سے اس کی مراد کوہارا کا گروپ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا۔

اسی وقت ہلکے سے شور کی آوازیں ابھریں۔ ہماری نظریں اس طرف کو اُٹھیں جدھر بلراج سنگھ اور اس کے ساتھی کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے کچا دھول اُڑاتا ہوا راستہ تھا۔ وہاں سے اب ایک قافلے کی شکل میں لوگوں کا ایک ہجوم سا گزرتا ہوا نظر آنے لگا، وہ دوسری طرف نکلنے والے راستے کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یہ بھی انہی کی طرح کمزور اور مدقوق قبائلی تھے، اور ان کے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے اور ان پر ڈنڈا بیڑیاں لگی ہوئی تھیں جبکہ انہیں جانوروں کی طرح ہانکنے والے، گلی منجاریں تھے اور ان کی ''سپرویژن'' بلراج سنگھ جیسے چند مسلح آدمی کر رہے تھے۔ ان سارے مصیبت کے مارے قبائلیوں کی حیثیت غلاموں کی سی ہی نظر آتی تھی۔ یہ سب قیدی جوان اور پکی عمروں کے تھے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں۔

مجھے یہ سارا الجھن چکر کوئی بڑا ہی گمبھیر معاملہ نظر آ رہا تھا جبکہ ابھی تک مجھے اپنے عزیز ساتھیوں کی کوئی جھلک بھی نہیں نظر آ رہی تھی۔

پھر پتا نہیں یہ کون سا وقت تھا کہ میری یہ دعائیہ خواہش اسی وقت پوری ہوگئی۔

ان لوگوں نے تو ان پر ایک ہلکی سی نگاہ ڈالی تھی مگر میری نظریں غلاموں کے اس قافلے پر جم سی گئی تھیں۔ تب

ہی مجھے اُن دو افراد کی جھلک نظر آگئی جو ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے چہرے بھی دیگر غلام قیدیوں کی طرح سُتے ہوئے نظر آرہے تھے اور ڈنڈا بیڑیوں سے یہ بھی ''لدے'' ہوئے تھے۔

ان دونوں کو پہچانتے ہی میں فرطِ جذبات سے اس قدر بے اختیار اور دیوانہ ہونے لگا تھا کہ میرا دل انہیں پکارنے کو چاہا تھا، مگر شکر ہوا کہ میں نے اپنی اس بے اختیاری خواہش کو بڑی مشکلوں سے دبائے رکھا تھا۔

سب سے پہلے مجھے نظر آنے والا میرا یار، دوست، بھائی اور مربی...... اول خیر اور پھر شکیلہ تھی۔ شکیلہ کی حالت تو مجھے سب سے زیادہ پتلی نظر آرہی تھی۔

میری بے چین اور منتظر آنکھوں کو سوشیلا کی بھی تلاش تھی۔ مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دی تھی، اس کی ایک ٹانگ شدید زخمی تھی، ممکن ہے کہ وہ کسی اور جگہ قید ہو، مگر پھر ایک بات کا تصور کرتے ہی میں اندر سے لرز سا گیا۔ اگر وہ بدقسمتی سے بلراج سنگھ کے ہتھے چڑھ چکی ہوتی تو یہ درندہ صفت انسان سوشیلا کو تو دیکھتے ہی جان سے مار ڈالتا...... وہ یہاں کب زندہ رہ سکتی تھی۔ نجانے وہ غریب اس حالت میں، جبکہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو چکی تھی۔ جانے کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوگی۔ پتا نہیں زندہ بھی تھی وہ بے چاری کہ نہیں...... مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔

تھوڑی دیر میں یہ قافلہ ایک طرف مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انہیں شاید کسی بیگار پر لے جایا جارہا تھا۔ میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا تھا، دل تھا جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

اپنے تینوں جری ساتھیوں کو زندہ پا کر مجھے جو خوشی ہوئی تھی وہ میرے لیے ناقابلِ بیان تھی۔ یہ میرے وہ وفادار اور جاں نثار ساتھی تھے جو میری تلاش (مدد) کے لیے پاکستان سے انڈیا آئے تھے مگر نجانے کیسے دھوکے سے اس رذیل بھجوانی کے ہتھے چڑھ گئے اور یہاں پہنچا دیے گئے۔ انہیں اب اس حالت میں دیکھ کر مجھے یوں ہی لگا تھا جیسے ماضی کے ''کالے پانی'' کی خوں رنگ داستان دہرائی جارہی ہو۔

میرے اندر ڈھتے حوصلے اب توانا ہونے لگے تھے، اُمید واثق کی اِک ذرا جھلک نے میرے اندر کوہ شکن عزم و حوصلے کی ایسی جوت جگا دی تھی کہ میں اب کسی بھی وقت کسی بھی بڑے طوفان سے درانہ وار ٹکرا جانے کے لیے تیار تھا۔

''تم ایک دم بیکار اور کام کے چور آدمی نکلے ہو...... اب مجھے خود اس ''آپریشن کلین اَپ'' کے لیے نکلنا پڑے گا اور تم میرے ساتھ ہوگے۔'' بلراج سنگھ نے رتن لال کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا اور پھر ایک تیز سی نگاہ ہم سب پر ڈالی۔ میں اندر سے خائف بھی تھا کہ کہیں کم بخت مجھ سے کوئی بات نہ چھیڑ دے۔ کیونکہ میرا اس سے کئی بار ٹکراؤ ہو چکا تھا اور بہت دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ دوبدو نبرد آزما بھی ہو چکے تھے۔

اگر وہ مجھ سے مخاطب ہوتا تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ میری کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی جھلک تاڑ کر فوراً کھٹک جاتا، کیونکہ میں نے اسے ہر بار اور ہر محاذ پر شکست دی تھی۔ وہ مجھ پر بری طرح اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ اب یہاں میرے لیے توجہ طلب امر یہ تھا کہ آیا اس رذیل بلراج سنگھ کو یہ معلوم تھا کہ میرے تینوں ساتھی درحقیقت میرے ہی ساتھی تھے؟ شاید نہیں...... پتا ہوتا تو یہ جلاد صفت انہیں بھلا کب زندہ رہنے دیتا؟ یہ تو شکر تھا کہ اول خیر وغیرہ یہاں عام بیگار قیدیوں کی حیثیت سے تھے۔ تاہم یہ بات واضح ہو چکی تھی یہاں پر جنرل کے ایل ایڈوانی کا تسلط قائم تھا، کیوں، کیسے اور کس مقصد کے تحت؟ یہ ابھی پردۂ راز میں تھا۔

''جو نئے آدمی بھرتی ہوئے ہیں، ان کی فوراً ابھی اور اسی وقت ایک ٹیم بناؤ...... کم از کم پانچ افراد ہونے چاہئیں۔'' معاً بلراج سنگھ کی پاٹ دار آواز گونجی۔ وہ ہنوز رتن لال سے مخاطب تھا۔

''یس سر!'' وہ فوراً مؤدبانہ بولا۔

''ان نئے بھرتی ہونے والوں کی فہرست بنا کر مجھے دو اور ان میں سے پانچ افراد چن کر ٹیم میں شمولیت کے لیے نکال لو، باقی پانچ پرانے آدمی ہوں گے اور ہاں، ان نئے بھرتی ہونے والوں پر بھی کڑی نگاہ رکھو...... ان پر ابھی اتنی جلدی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تمہاری اس وقت ٹیم میں کون کون شامل تھا؟''

بلراج نے آخر میں پوچھا اور پھر تب ہی اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ ''اے......! یہ تم نے اپنے چہرے پر اتنی نیچی ٹوپی کیوں کر رکھی ہے، اُوپر کروا سے......''

اس نے رتن لال کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی نجانے کس طرح اچانک مجھے تاڑ کر کہا اور میرے پورے جسم میں لاتعداد چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ایکو

سلیم انور

یادیں انتہائی پُراسرار انداز میں انسانی زندگی کی خالی جگہوں کو پُر کرتی ہیں... لاتعلقی کی بے رحم آندھیوں کے جھکڑ حساس دلوں کو نہایت بے دردی سے تار تار کر دیتے ہیں... ایک ایسے ہی تشنہ کام اور ٹوٹے ہوئے شخص کا ماجرا... جو برسوں سے یادوں کا خزانہ دل سے لگائے بیٹھا تھا... ایک ایک پل کی یاد نے اس کے دامن کو سنسان راہوں... بے قرار انتظار اور جنونی اطوار سے بھر دیا تھا... وقت کی کڑی طنابوں پر چلتے چلتے اس کے قدم ڈگمگا ہی گئے...

ایک مشہور ناول نگار کے پُرسکون شب و روز جو اچانک ہی وقت کی گرفت میں آ گئے

الیگزینڈر اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی انگلیاں کی بورڈ پر تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ کئی دنوں کی کوشش کے بعد بالآخر وہ اپنے ناول کے اس مخصوص باب کا خاکہ اپنے ذہن میں تیار کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا کہ وہ کس طرح اس کا اختتام چاہتا ہے۔

دی ٹوائے لائٹ زون، نامی یہ ناول اپنے آخری مراحل میں تھا اور الیگزینڈر اس کے انجام کو پُراثر بنانے کے لیے پوری تندہی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں

خیالات کا ایک تسلسل جاری تھا جسے وہ کمپیوٹر پر منتقل کر رہا تھا۔

اچانک بجنے والی فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔ یہ گھنٹی کی آواز اس کے بائیں جانب سے آرہی تھی۔

وہ چونک گیا۔ ”لعنت ہو!“ وہ غصے سے بڑبڑایا۔ اپنے سیل فون کی تلاش میں اس نے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ پھر لپک کر فون اٹھایا اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”فرینکلن!“

”مسٹر الیگزینڈر فرینکلن؟“ دوسری جانب سے ایک بھاری مردانہ آواز نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ الیگزینڈر نے جواب دیا۔ ساتھ ہی اس کی انگلی سیل فون کے آف بٹن پر چلی گئی۔

یہ کوئی ٹیلی مارکیٹر ہی ہوسکتا ہے، الیگزینڈر نے سوچا۔ کیونکہ صرف ٹیلی فونی فروخت کار ہی اس کا پورا نام استعمال کرتے تھے۔ جب سے اس کی تحریر کردہ ڈیٹکٹیو سیریز نے نیویارک ٹائمز کی بیسٹ سیلر لسٹ میں جگہ بنائی تھی تو دنیا اسے اے ایم فرینکلن کے نام سے پہچاننے لگی تھی۔ صرف وہ لوگ جن کی اس کی کریڈٹ رپورٹ تک رسائی تھی، اسے الیگزینڈر کہہ کر پکارتے تھے۔

”میں سینٹ کلیئرس ول پولیس ڈپارٹمنٹ کا سراغ رساں رچرڈ ڈنکن بول رہا ہوں۔“

الیگزینڈر کی انگلی سیل فون کے آف بٹن سے صرف چند ملی میٹر کے فاصلے پر ساکت ہوگئی۔ ”میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں ڈیٹکٹیو؟“ اس نے پوچھا۔

”سر، ہمیں ایک قتل کی ہوئی لاش کی شناخت کے سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے۔“

”قتل کی ہوئی لاش؟“

الیگزینڈر کو سینٹ کلیئرس ول کا قصبہ چھوڑے ہوئے لگ بھگ پانچ سال ہو چکے تھے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے آج تک اس علاقے کے کسی بھی فرد سے بات نہیں کی تھی۔ اسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ آیا اس کے شناساؤں میں سے کوئی اب وہاں موجود بھی ہے یا نہیں۔ وہ ایک کالج ٹاؤن تھا اور اس کی آبادی عارضی اور کم سے کم رہتی تھی۔

”سر، ہم افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دے رہے ہیں کہ ہمیں ایک عورت کی لاش ملی ہے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کی بیوی ہے۔“ ڈیٹکٹیو رچرڈ ڈنکن نے بتایا۔

الیگزینڈر کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس کے اعصاب تن گئے اور ذہن سراغ رساں کے آخری جملے کا مطلب سمجھنے کے لیے قلابازیاں کھانے لگا۔ ”ڈیٹکٹیو رچرڈ، میری کوئی بیوی نہیں ہے۔“

یہ سن کر پولیس سراغ رساں نے قدرے توقف کیا۔ الیگزینڈر کو پس منظر میں کاغذات کو پلٹنے اور پھر کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر سراغ رساں گویا ہوا۔ ”کیا آپ الیگزینڈر فرینکلن اور 2525 ماؤنٹ پلیز نیٹ پلیس کے سابقہ رہائشی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ الیگزینڈر نے تصدیق کی۔

”تاریخ پیدائش پندرہ جنوری انیس سو بچاسی؟“

”جی ہاں۔“

”تو پھر مجھے یقین نہیں آرہا کہ بے ربطی کہاں ہے۔ ہمیں جس عورت کی لاش ملی ہے، اس کا نام مارجوری میری پوسا فرینکلن ہے...... یہ وہی عورت ہے جس کی گمشدگی کی رپورٹ آپ نے پانچ جولائی 2007ء کو درج کرائی تھی۔“

الیگزینڈر کے سر میں ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ اس نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک پین نکالا اور اسے میز کی سطح پر بجانے لگا۔ اس کا ذہن اس معلومات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو ہزار سات کے اوائل میں اس نے خود کو سینٹ کلیئرس ول کے ایک دڑبے نما اپارٹمنٹ میں قید کیا ہوا تھا۔ ادبی شہرت کی تلاش میں کالج سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے مسودے پر پوری تندہی سے کام کرنے کی دھن میں مگن رہا تھا۔ اس دوران میں اسے حلیے کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ اس کے سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ اور داڑھی بے ترتیب اور وحشیوں کی طرح بڑھ چکی تھی۔ شادی کرنا تو دور کی بات تھی، عورتیں اسے ڈیٹ دینے کی روادار بھی نہیں تھیں۔

جولائی تک اس کا ناول مکمل ہوگیا تھا اور اپارٹمنٹ کے کرائے نامے کی مدت بھی پوری ہو چکی تھی۔ اس نے وہ قصبہ چھوڑ دیا تھا۔

اس کے لیے سینٹ کلیئرس ول اب ماضی کا قصہ بن چکا تھا۔

”ڈیٹکٹیو رچرڈ، مجھے حقیقت میں کوئی آئیڈیا نہیں کہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟“

”شاید یہ اس قسم کا معاملہ ہے کہ جس کے لیے ہمیں دوبدو بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔“ سراغ رساں

رچرڈ ڈنکن نے کہا۔ ”کل صبح ٹھیک آٹھ بجے مجھ سے ملنے کے لیے سینٹ کلیئرس ول پولیس اسٹیشن آجائیں۔“

”یہ نہیں ہوسکتا۔“ الیگزینڈر نے اپنی ڈائری اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کل صبح میری ایک میٹنگ ہے اور سہ پہر کو مجھے ایک کانفرنس میں شرکت کرنی ہے۔ البتہ ہم آئندہ ہفتے کا کوئی وقت مقرر کرسکتے ہیں۔“

بظاہر کسی غلط فہمی کے سلسلے میں چھ گھنٹے کی ڈرائیو اسے ایک مضحکہ خیز سی بات لگ رہی تھی۔ اگر وہ اس ملاقات کو آئندہ ہفتے تک کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا تو بلاشبہ اس دوران میں یہ غلط فہمی خود بہ خود دور بھی ہوسکتی تھی یا پھر وہ کوئی اور بہانہ بنا کر اپنے وہاں جانے کی مدت میں مزید اضافہ کر سکتا ہے۔

اس کی آئندہ آنے والی کتاب کی مقررہ تاریخ پہلے ہی گزر چکی تھی اور وہ اپنے وقت میں کسی قسم کے خلل کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

”خدا کے بندے!“ سراغ رساں نے غصے سے کہا۔ ”ایک عورت مرچکی ہے۔ یہ وہی عورت ہے جس کی گمشدگی کی رپورٹ آپ نے درج کرائی تھی۔ اگر آپ کل صبح آٹھ بجے یہاں موجود نہ ہوئے تو میں آپ کی حراست کا وارنٹ جاری کررہا ہوں۔“ یہ کہہ کر سراغ رساں نے فون بند کردیا۔

الیگزینڈر ریسیور ہاتھ میں تھامے رہ گیا۔

☆☆☆

اپنے ایڈیٹر سے گرما گرم بحث کے بعد الیگزینڈر نے اپنی میٹنگ ری شیڈول کی اور شہر میں واقع اپنے پلش اپارٹمنٹ سے سینٹ کلیئرس ول کی بل کھاتی پہاڑیوں کی جانب روانہ ہوگیا۔

چھ گھنٹے کی ڈرائیو اور راستے میں لگ بھگ ایک گیلن کافی کی مقدار معدے میں انڈیلنے کے بعد وہ آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر سینٹ کلیئرس ول پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔

”ڈیٹکٹیو رچرڈ ڈنکن؟“ اس نے ڈیسک کلرک سے پوچھا۔

ڈیسک کلرک اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اور ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا جو ایک خستہ سی دھاتی میز کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کی لکڑی کے تختوں کی دیواریں ستّر کی دہائی کی بنی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ زنگ آلودہ نشان زدہ دھاتی میز کمرے کے ماحول سے قطعی مطابقت رکھتی تھی۔

دفتر کی حالت بے حد خستہ اور مرمت طلب تھی۔

الیگزینڈر کو دفتر دیکھ کے انتہائی مایوسی ہوئی تھی۔

اس دفتر کا جائزہ لینے کے بعد الیگزینڈر کے ذہن میں ایک ہی لفظ ابھرا تھا...... مایوس کن!

الیگزینڈر انتظار کرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وقت ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہا ہو۔ بالآخر ایک طویل وقت انتظار کے بعد ایک بھاری بھرکم، گنجے، ادھیڑ عمر شخص نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کا لباس بھی اس کمرے کے مانند فرسودہ تھا۔

”مسٹر فرینکلن؟“ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلایا اور جواباً ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”سراغ رساں رچرڈ ڈنکن؟“

سراغ رساں نے گردن ہلادی اور اس خستہ حال میز کے سامنے رکھی ہوئی غیر آرام دہ کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”پلیز، بیٹھ جائیں۔“

الیگزینڈر نے کرسی پر بیٹھتے ہی براہِ راست مطلب کی بات شروع کردی۔ ”جیسا کہ میں نے کل کہا تھا نہ میں شادی شدہ ہوں اور نہ ہی میری کبھی شادی ہوئی تھی۔“

سراغ رساں نے یہ سن کر ایک کاغذ الیگزینڈر کی جانب بڑھا دیا اور اپنی ٹھوڑی اپنے ہاتھوں پر رکھ کر اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ ”جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں یہ وہ بیان ہے جو پانچ برس پہلے آپ نے دیا تھا جس میں آپ کی بیوی کی گمشدگی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔“

الیگزینڈر نے اس تحریر کا جائزہ لینا شروع کیا تاکہ صحیح صورتِ حال کو سمجھ سکے۔ تفصیل آسانی سے سمجھ میں آرہی تھی۔ رپورٹ کے مطابق الیگزینڈر نے چھ جولائی دو ہزار سات کو اپنے اپارٹمنٹ سے مارجوری میری پوسا فرینکلن کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ وہ آخری بار ایک پارٹی کے بعد الیگزینڈر کے کاؤچ پر بے ہوش پڑی دیکھی گئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ رپورٹ میں بھی اس عورت کو الیگزینڈر کی رفیقِ حیات ظاہر کیا گیا تھا۔

”کچھ یاد آرہا ہے؟“ سراغ رساں نے پوچھا۔

الیگزینڈر نے پوری رپورٹ دوبارہ پڑھ ڈالی۔ ”نہیں، آئی ایم سوری۔ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔“

سراغ رساں کے ہونٹوں سے ایک آہ بلند ہوئی اور اس کے کان کی لویں سرخ ہوگئیں۔ اس کی بھویں تن گئیں۔ اس نے الیگزینڈر کو شعلہ فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے

اپنی کرسی پر پہلو بدلا اور بولا۔

’’تو مجھے یہ بتا رہے ہو کہ آپ نے اس عورت کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ...... یہ عورت جو رپورٹ کے مطابق آپ کی بیوی ہے۔ اس بیان پر اپنے دستخط کیے اور چلتے بنے...... اس کے بارے میں پھر کبھی دوبارہ خیال ذہن میں نہ لانے کا فیصلہ کر کے؟‘‘

’’نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میری کبھی کوئی بیوی نہیں رہی ہے۔ اس لیے میں نے کبھی اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائی۔ بھلا یہ بات سمجھنے میں کیا دشواری پیش آ رہی ہے؟ آپ نے غلط آدمی سے رابطہ کیا ہے۔‘‘ الیگزینڈر نے وہ کاغذ واپس سراغ رساں رچرڈ ڈنکن کی جانب دھکیل دیا اور اس پر موجود دستخط کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’حتیٰ کہ یہ دستخط بھی میرے نہیں ہیں۔‘‘

سراغ رساں نے دستخط کا جائزہ لیا اور بولا۔

’’واقعی؟‘‘

الیگزینڈر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ’’یہ دستخط جس کسی نے بھی کیے ہیں وہ کھبا ہے۔ میں بائیں ہاتھ سے نہیں لکھتا۔‘‘

سراغ رساں ایک بار پھر پوری توجہ سے دستخط کا جائزہ لینے لگا۔ ’’گو یہ ایک دلچسپ بات ہے لیکن اسے بمشکل حتمی ثبوت قرار دیا جا سکتا ہے، مسٹر فرینکلن۔‘‘

’’حتمی ہو یا نہ ہو، یہ میری تحریر نہیں ہے۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ میرے نام کے دستخط کس نے کیے ہیں اور کیوں؟‘‘ یہ کہہ کر وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔

وہ دونوں اپنے اپنے انداز میں سوچ میں غرق تھے۔ اب ان کے درمیان مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

اس تمام تر صورتِ حال نے الیگزینڈر کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بھلا کسی نے اس کے نام سے پولیس رپورٹ کیوں درج کرائی تھی اور اس شادی کی داستان کیوں گھڑی تھی جو اس نے کبھی کی ہی نہیں تھی؟ اور یہ مارجوری کون تھی جس سے خیال تھا کہ اس کی شادی ہوئی تھی؟

’’کیا آپ کے پاس اس عورت کی کوئی تصویر ہے؟‘‘ الیگزینڈر نے سراغ رساں سے پوچھا۔ یہ نام سن کر الیگزینڈر کو یقینی طور پر کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس عورت کی تصویر دیکھ کر وہ اسے پہچان لے۔

سراغ رساں رچرڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ’’میں اس سے زیادہ بہتر کر سکتا ہوں۔‘‘

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور الیگزینڈر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا رخ تہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب تھا جہاں مردہ خانہ بنا ہوا تھا۔

مردہ خانے پہنچ کر سراغ رساں نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی چادر پلٹ دی۔

’’یہ ممی ہے؟‘‘ الیگزینڈر نے لاش کو تکتے ہوئے حیرت سے کہا۔

’’ہاں۔‘‘

’’واؤ۔‘‘ الیگزینڈر اپنی حیرانی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ’’کیا آپ کو اس کی موت کا سبب معلوم ہے؟‘‘

سراغ رساں نے اپنی قمیص کی جیب میں سے ایک پین نکالا۔ ’’ہم قریب ترین سبب بتا سکتے ہیں۔‘‘ اس نے پین کی نوک سے ممی کی گردن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’ظاہر یہ ہو رہا ہے کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہے لیکن ہم اس وقت تک یقین سے نہیں کہہ سکتے جب تک لاش کا تفصیلی معائنہ نہیں ہو جاتا۔ البتہ لاش کی گردن پر دھاریوں کے نشان یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ کسی پتلی رسی یا ڈوری سے اس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ اس بات کا یقین ہونے میں چند دن لگیں گے۔‘‘

الیگزینڈر لاش کی گردن پر نشان کا جائزہ لینے کے لیے اس پر جھک گیا۔ وہ اس سے پہلے بھی کسی ممی پر تو کجا کسی لاش کے بھی اتنا نزدیک نہیں ہوا تھا۔ جس طرح یہ صورتِ حال عجیب اور غیر متوقع تھی، اسے اس معاملے میں کچھ کچھ شناسائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

’’یہ لاش آپ کو کہاں سے ملی ہے؟‘‘ اس نے سراغ رساں سے پوچھا۔

’’پیدل لمبی سیر کرنے والوں نے اسے دریا کے پاس مٹی میں دبا پایا تھا۔ ہمارے یہاں حال ہی میں ہلکا سا سیلاب آیا تھا جس کے سبب زمین کی سطح اس حد تک گھس گئی کہ لاش کا بازو زمین سے باہر نکل آیا اور وہ پیدل سیر و تفریح کرنے والے اس سے الجھ کر گر پڑے۔ اس کی قبر یقیناً خاصی اتھلی بنائی گئی تھی۔‘‘

’’دلچسپ۔‘‘ الیگزینڈر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ’’کیا آپ کے پاس اس کی اس وقت کی کوئی تصویر ہے جب وہ زندہ تھی؟‘‘

سراغ رساں نے منیلا فولڈر کھولا اور ڈرائیورز لائسنس کی تصویر سے بنائی گئی ایک بڑی سی تصویر باہر

سال نو کا تحفہ..... خوشیاں بکھیرتا جنوری 2017ء پاکیزہ کا خوب صورت شمارہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
شیریں حیدر کے نئے سلسلے وار ناول امرت کی پہلی تعارفی قسط
سحر ساجد کی دل گداز تحریر..... من جانبازم
سیما رضا ردا کے منی ناول ہم کو عبث بدنام کیا کا اگلا باب
رفعت سراج اور انجم انصار
کے ناول تیزی سے تکمیل کے مراحل طے
کرتے ہوئے
نئے سال کا بھرپور تحفہ..... نگہت سیما، بنت سحر اور رضوانہ پرنس کی
خوشگوار تحریریں..... دلچسپ اور معلومات افزا..... منفرد مضامین آپ کی خوش ذوقی کا سامان
اس کے علاوہ
نامور رائٹرز کی تحریریں جن میں بشریٰ سیال، سفینہ یاسمین،
نفیسہ سعید، ام ایمان، ہاجرہ ریحان و دیگر شامل ہیں۔
دل فریب تحریروں سے سجا خوب صورت پاکیزہ آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر.....

نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ متوفی مارجوری میری پوسا ہے۔ اس کا لائسنس تبدیل نہیں ہوا تھا اس لیے اس پر اس کی شادی کے بعد کے نام کی عکاسی نہیں ہے۔ جس افسر نے گمشدہ فرد کی رپورٹ کا اندراج کیا تھا، اس کے مطابق آپ...... میرا مطلب ہے رپورٹ درج کرانے والے نے کہا تھا کہ وہ دونوں نوبیاہتا جوڑا ہیں۔''

یہ کہہ کر سراغ رساں نے وہ تصویر الیگزینڈر کی جانب بڑھا دی۔

تصویر کو دیکھتے ہی الیگزینڈر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''ایکو؟'' اس نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

تصویر میں موجود لڑکی کے لمبے براؤن بال بے باکی سے اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کی توانا مسکراہٹ اسٹریچر پر رکھی ہوئی سوکھی لاش کی مضحکہ اُڑانے والی ہنسی سے متضاد تھی۔

''آئی ایم سوری؟'' سراغ رساں نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں اسے ایکو کے نام سے جانتا ہوں۔''

''کیا ایکو کا کوئی پورا نام تھا؟''

''ہوسکتا ہے، ہو۔ لیکن مجھے نہیں معلوم۔ وہ اداکاری کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ایکو اس کے اسٹیج کا نام تھا۔'' الیگزینڈر نے بتایا۔

سراغ رساں نے فائل فولڈر اپنے پیچھے میز پر رکھ دیا اور اپنی جیب میں سے ایک نوٹ پیڈ نکالتے ہوئے بولا۔

''اور آپ ایکو کو کس طرح جانتے تھے؟''

''وہ اس شخص سے بڑی پابندی سے ملاقاتیں کیا کرتی تھی جو ہال میں میرے سامنے رہتا تھا۔''

''اور آپ کے اس پڑوسی کا نام؟''

''ڈیون۔ ڈیون کوپر۔''

سراغ رساں نے اپنے نوٹ پیڈ پر کچھ نوٹ قلمبند کیے اور نوٹ بک واپس اپنے جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔ اس نے ایکو کا چہرہ دوبارہ چادر سے ڈھانپ دیا اور اپنی فائل اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کافی پینا پسند کریں گے؟''

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ دونوں مردہ خانے سے نکل کر سیڑھی کے راستے واپس اوپری منزل پر چلے آئے۔

☆☆☆

دفتر میں داخل ہونے کے بعد ان دونوں نے اپنی اپنی پہلی والی نشستیں سنبھال لیں۔

الیگزینڈر میز پر اپنے بازو ٹکاتے ہوئے آگے کی جانب جھک گیا اور اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔

''ہم نے اسے ایک پینٹ برش کے ساتھ دفن پایا تھا۔'' سراغ رساں رچرڈ ڈنکن نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

الیگزینڈر نے ایک آہ بھری اور اپنا سر لٹکاتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ ابھی جائے واردات کی تلاش میں ہیں؟''

''بالکل ہیں۔ کیا آپ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بھی بتا سکتے ہیں؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''میں پرانے مل کو چیک کروں گا بلکہ حقیقت میں بوائلر روم کو دیکھنا ہوگا۔ میرے خیال میں آپ کو کم از کم یہ معلوم ہو جائے گا کہ لاش کو حنوط وہیں پر کیا گیا تھا۔''

یہ سن کر سراغ رساں میز پر آگے کی جانب جھک گیا اور بولا۔ ''کیا آپ قتل کا اعتراف کر رہے ہو، بیٹا؟''

الیگزینڈر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں، لیکن میں نے یہ اسی طرح لکھا تھا۔''

''ایکسکیوزمی؟''

''یہ منظر میں نے اپنے پہلے ناول 'کو یو ٹو ڈیتھ' میں بالکل اسی طریقے سے تحریر کیا تھا۔ ناول میں مرکزی کردار کا رسی سے گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، پھر ایک عمارت میں اس کی حنوط کاری کی جاتی ہے پھر اسے دریا کے کنارے اتھلی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ قاتل ایک آرٹسٹ تھا۔''

''میرے خیال میں یہ پورا منظر نامہ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔ آپ اے ایم فرینکلن ہیں۔ میں نے آپ کی وہ کتاب پڑھی ہے۔''

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں جب یہاں رہتا تھا تو حقیقت میں وہی کتاب لکھ رہا تھا۔''

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟''

''وہ ایک طرح سے میری...... میرے خیال سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ میری مربیہ دیوی تھی۔''

سراغ رساں رچرڈ ڈنکن نے یہ سن کر اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور بولا۔ ''ایک منٹ رک جاؤ۔ آپ نے کہا کہ وہ آپ کے پڑوسی کی گرل فرینڈ تھی لیکن وہ آپ کی مربیہ دیوی تھی؟ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟''

الیگزینڈر نے ایک گہرا سانس لیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ذہن چلتے پھرتے ہوئے زیادہ بہتر کام کیا کرتا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی کے پاس چلا گیا اور بلائنڈ کی پٹی

کھسکا کر باہر کی طرف نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”یہ قدرے پیچیدہ...... معاملہ ہے۔“

تب سراغ رساں نے اپنی میز کی ایک چھوٹی دراز کھولی اور اس میں سے ایک ٹیپ ریکارڈر باہر نکالتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر آپ سب کچھ وضاحت سے بیان کر دیں۔“

ساتھ ہی اس نے ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔

الیگزینڈر نے کھڑکی کے بلائنڈ کی پٹی اپنی جگہ پر واپس کر دی اور کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ”ایکو، ڈیون کوپر کی محبوبہ تھی لیکن ہم تینوں آپس میں دوست بھی تھے۔ میں انگریزی کے مضمون کا طالب علم تھا۔ ڈیون کوپر ماڈرن آرٹ کا طالب علم تھا اور ایکو تھیٹر کی طالبہ تھی۔ آرٹسٹ ایک طرح کے سنکی ہوتے ہیں اور ڈیون کوپر یقینی طور پر مجسم سنکی تھا۔ وہ انتہائی مغلوب الجذبات تھا...... خاص طور پر ایکو کے معاملے میں۔ وہ ایکو سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا...... اس پر دیوانگی کی یہ کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی...... کبھی کم تو کبھی زیادہ...... اس کی اس دیوانگی نے ایکو کی زندگی اجیرن کرنا شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں ہر وقت لڑتے رہتے تھے۔“

”سو وہ اُسے چھوڑ کر آپ کے پاس چلی آئی؟“

”جی نہیں۔“ الیگزینڈر نے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے بدستور ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک رات ان کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا۔ میں ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن رہا تھا جو ہال کے پار ان کے کمرے سے بلند ہو رہی تھیں۔ جب وہ ان کے کمرے سے نکلی تو بری طرح بکھری ہوئی تھی۔ وہ سیدھی میرے اپارٹمنٹ میں آ گئی۔ اسے وقتی طور پر سہارے کی ضرورت تھی اور میں اسے دلاسا دے رہا تھا۔ یوں ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے چلے گئے اور پھر...... ہم اکٹھا ہی سو گئے۔“

اس رات کی یادیں الیگزینڈر کے ذہن میں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ اسے یاد آگیا کہ ایکو اس شب اس بری طرح اَپ سیٹ تھی کہ الیگزینڈر کے چھوتے ہی اس کا انگ انگ تڑپنے لگا جیسے نہ جانے کتنے عرصے کی پیاسی ہو۔ پھر وہ جذبات کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ ایکو کے لیونڈر کی خوشبو آج بھی اس کے ذہن میں بسی ہوئی تھی اور اس کی نرم جلد اسے یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے ان کا یہ ملاپ کل ہی کی بات ہو۔

اتنے میں سراغ ساں کی کھنکھار نے الیگزینڈر کو عالمِ

خیال سے بیدار کر دیا۔

''یہ سلسلہ کب تک جاری رہا تھا؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''وہ بس ایک بار کا ملاپ تھا۔ وہ ڈیون کوپر سے حقیقت میں محبت کرتی تھی اور اسے اپنی غلطی کا اس بری طرح احساس ہو رہا تھا کہ اس کے بعد وہ مجھ سے نظریں ملانے سے کترا رہی تھی۔ یہ ہماری ایک غلطی تھی۔ اس دوران میں نے اپنا ناول شروع کر دیا تھا۔ میرے ناول کا مرکزی کردار ایلس، ایکو پر مبنی تھا۔''

سراغ رساں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنی کنپٹیاں سہلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا ڈیون کوپر کو بھی اس بات کا پتا چلا؟''

الیگزینڈر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میرے خیال سے تو پتا نہیں چلا تھا۔ اس وقت ہم دونوں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ ڈیون کوپر کو اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتائیں گے۔ وہ قدرے...... ناپسند گفتنی تھا...... اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ جاننے کے بعد اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس کے چند ماہ بعد میں یہاں سے شہر منتقل ہو گیا۔''

سراغ رساں نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا اور سوچ میں غرق ہو گیا۔

قدرے خاموشی کے بعد وہ گویا ہوا۔ ''میرا مسئلہ تو ابھی تک جوں کا توں ہے۔ آپ کی کتاب کب شائع ہوئی تھی؟''

''2008ء کے موسم بہار میں۔''

''ایکو کی گمشدگی اور قتل کا واقعہ 2007ء میں رونما ہوا تھا لیکن ان واقعات میں کتاب کی وہی تفصیلات استعمال کی گئی تھیں جو اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا کہ میں کدھر جا رہا ہوں؟''

''میں بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' الیگزینڈر دوبارہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر اپنے بازو ٹکاتے ہوئے آگے کی جانب جھک کر بولا۔ ''لیکن قتل میں نے نہیں کیا۔''

سراغ رساں رچرڈ ڈکنن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں بھی نہیں سمجھتا کہ یہ قتل آپ نے کیا ہے لیکن یہاں مجھے اس کی متبادل مفروضہ صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔''

کمرے میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں اس مضحکہ خیز صورتِ حال پر سوچ بچار میں ڈوبے ہوئے تھے۔

پھر سراغ رساں اچانک اپنی کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے آپ کا ناول پڑھے ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس میں لاش کے ساتھ کسی پینٹ برش کا کوئی تذکرہ تھا۔''

''جناب اس کا تذکرہ صرف میرے ناول کے ابتدائی مسودے میں شامل تھا لیکن بعد میں اسے تخفیف کر دیا تھا کیونکہ ایڈیٹرز نے محسوس کیا تھا کہ اس طرح قاتل بہت زیادہ نمایاں ہو رہا ہے۔''

سراغ رساں کے ہونٹوں پر ایک محتاط سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''اب ہم کسی سمت جا رہے ہیں۔ آپ کے ناول کے ابتدائی مسودوں تک کس کس کی رسائی تھی؟''

الیگزینڈر نے اپنی یادداشت پر زور دیا تو اس کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔ ''اس وقت کسی نے حقیقت میں میرے ناول کا مسودہ نہیں پڑھا تھا۔''

''پروفیسرز نے؟ ساتھی طالب علموں نے؟''

''نہیں، میں نے گریجویشن کرنے کے بعد ہی ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ میرے خیال سے صرف میری ممی کو اس کا علم تھا۔ انہوں نے مسودہ پڑھا تھا...... یا پھر ڈیون نے۔''

الیگزینڈر کے ہونٹوں سے ڈیون کا نام نکلتے ہی ان دونوں کو باقی سب کچھ کلک کر گیا۔

''ڈیون!'' الیگزینڈر نے سرگوشی کے سے انداز میں دہرایا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''واؤ!''

اسے معلوم تھا کہ ڈیون کوپر کسی حد تک پاگل ضرور تھا لیکن قاتل؟

''اب بس ہمیں یہ کرنا ہے کہ اس نوجوان کو ڈھونڈ نکالیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہم اس معاملے کو منطقی انجام تک پہنچا سکتے ہیں؟'' سراغ رساں رچرڈ ڈکنن نے کہا۔ پھر کمپیوٹر کی جانب اپنا رخ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ڈیون کوپر! یہی نام ہے نا اس کا؟''

سراغ رساں نے مختلف ڈیٹا بیس سرچ کرنا شروع کر دیے۔ البتہ کسی سبب سے اگست 2007ء کے اوائل میں ڈیون کوپر کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ مر گیا تھا۔ بس اس کا مزید کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا اور کسی ڈیٹا میں اس کا نام نہیں آ رہا تھا۔

سراغ رساں چند گھنٹوں تک سرچ کرتا رہا پھر کمپیوٹر بند کر دیا۔ ''مسٹر فرینکلن، میرے خیال سے ہم سے آج جتنا ہو سکتا تھا، وہ ہم نے کر لیا۔ میں اپنے طور پر اس سلسلے میں اپنا کام جاری رکھوں گا لیکن آپ اگر جانا چاہتے ہیں تو

جاسکتے ہیں۔"

"کیا میں اب واپس اپنے شہر جاسکتا ہوں؟"

یہ سن کر سراغ رساں مسکرا دیا۔ "میں صرف اس وقت کی بات کر رہا ہوں۔ آپ یہ ٹاؤن چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ مجھے آپ کی ضرورت پڑسکتی ہے اور جب تک مجھے مزید معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں آپ اس وقت تک میرے لیے ایک مفید فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

الیگزینڈر کو یہ سن کر غصہ آ گیا۔ "اگر میں پیش نہ ہوتا تو میں کسی قسم کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوسکتا تھا۔ اور میں اپنے تمام کام پسِ پشت ڈال کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے اپنے ایڈیٹر کے ساتھ معاملات ری شیڈول کرنے ہیں اور وہ اس سلسلے میں مزید تاخیر برداشت نہیں کرے گا۔"

"میرے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ میں کل آپ سے پھر رابطہ کروں گا۔" سراغ رساں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

الیگزینڈر وہاں سے نکل کر اپنے قیام کی جگہ کی تلاش میں کیمپس کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسے اپنے قابلِ قیاس مستقبل کا اندازہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

الیگزینڈر اپنی پرانی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر کھڑا پرانی یادوں کو تازہ کر رہا تھا۔

چونکہ دن بھر کی فضول مصروفیت سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا اس لیے اس کا ذہن اب اپنی پرانی قیام گاہ کے بارے میں تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ "یہاں تو قطعی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے سڑک کے دونوں طرف کا جائزہ لیا جہاں مختلف دکانیں اور ریسٹورنٹس بنے ہوئے تھے۔ یہ سڑک اب ماؤنٹ پلیزنیٹ پلیس ہوم کہلاتی تھی۔ تمام دکانوں پر مختلف نام ہونے کے باوجود سڑک بالکل ویسی ہی دکھائی دے رہی تھی جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں اتنا مصروف ہو چکا تھا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ اس جگہ سے کتنا پیار کرتا تھا۔ آرٹسٹک ماحول نے اطراف کی ہر شے پر اپنا اثر ڈالا تھا۔ الیگزینڈر کے اندر کا فنکار اب بیدار ہو گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک طویل سفر کے بعد گھر لوٹ آیا ہے۔

اس نے اپارٹمنٹ کے مکینوں کی فہرست کی جانب قدم بڑھا دیے اور محض تجسس کی خاطر اس پر درج ناموں کا جائزہ لینے لگا پھر ایک نام پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔

وصیّت

دو سیلز مین مضافات میں اشیا فروخت کرنے کے لیے گھوم رہے تھے کہ کار خراب ہو گئی۔ رات کا وقت تھا۔ انہوں نے قریب ترین مکان پر دستک دی تو ایک ادھیڑ عمر بیوہ نے دروازہ کھولا۔ ان کی رُوداد سنی اور انہیں رات گزارنے کے لیے اپنے ہاں ایک کمرا دے دیا۔ صبح کو انہوں نے کار ٹھیک کروائی اور میزبان خاتون کا شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔

چند ماہ بعد ایک سیلز مین کو ڈاک سے ایک لفافہ ملا۔ اس نے کھولا تو قانونی دستاویزات تھیں۔ انہیں پڑھ کر اس نے دوسرے سیلز مین کو فون کیا۔

"چند ماہ پہلے جس رات کو ہم شہر سے باہر جس بیوہ کے ہاں ٹھہرے تھے تو تم چپکے سے اٹھ کر اس کے بیڈروم میں چلے گئے تھے؟"

"ہی ہی ہی۔ ہاں یہی ہوا تھا۔"

"اور تم نے اسے اپنے نام کے بجائے میرا نام بتایا تھا؟"

"اوہ......ہاں۔"

"وہ مر گئی ہے اور وصیت نامے میں اپنی ساری جائداد میرے نام کر گئی ہے۔"

کراچی سے عروسہ فاطمہ کا تعاون

"ڈی میری پوسا!" اس نے سرگوشی کے انداز میں وہ نام پڑھا۔ وہ تجسس میں پڑ گیا۔ میری پوسا کوئی عام سا نام نہیں تھا۔ یہ ظاہر ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ ڈیون نے گزشتہ عشرے سے اپنا نام تبدیل کر لیا تھا اور شاید اب اپنا نام ڈیون میری پوسا رکھ لیا تھا؟ اس اتفاق نے اس کے تجسس کو اور بڑھا دیا۔

ڈیون میری پوسا!

الیگزینڈر، ڈیون کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک ناقابلِ فہم مزاج کا جنونی آرٹسٹ تھا اور شاید اس کے فون کرنے پر اسے اندر آنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لہٰذا الیگزینڈر دروازے کے پاس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور کسی بھی فرد کے عمارت میں داخل ہونے یا نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

چونکہ یہ ایک بڑی عمارت تھی اس لیے الیگزینڈر کو چند

منٹ سے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک بار عمارت کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد وہ چوتھی منزل کی جانب چل پڑا۔

چوتھے فلور پر پہنچ کر وہ آہستہ قدموں سے ڈی میری بوسا کے اپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ ابھی تک اس بارے میں پُریقین نہیں تھا کہ ڈی میری بوسا کے دروازے پر پہنچ کر اسے کیا کرنا ہے۔ کیا اسے دستک دینی چاہیے؟ یا وہ باہر یونہی کھڑا رہے اور جائزہ لیتا رہے؟ یا وہ دوڑتا ہوا پولیس اسٹیشن پہنچ جائے اور سراغ رساں رچرڈ ڈنکن کو ہوشیار کر دے؟

پھر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ایک بار اسے کچھ آگاہی ہو جائے تو تب ہی اسے اس سلسلے میں مزید کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔

الیگزینڈر اپنے پرانے اپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ دروازے سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس کا ذہن ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن یہ لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا جسم کوئی فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کے بازو کے عضلات خود بخود تن گئے اور اس کے ہاتھ نے دروازے پر دستک دے دی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دہلیز کی دوسری جانب کون منتظر ہوگا!

اتنے میں اندر کی جانب سے قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ ایک لمحے کے وقفے کے بعد دروازہ چوں چوں کی آواز کے ساتھ تھوڑا سا کھل گیا۔

”ایل فرینکلن!“ دروازہ کھولنے والے شخص نے بغیر کسی جوش و خروش سے کہا اور پورا دروازہ کھول دیا۔

”ڈیون؟“ الیگزینڈر نے دروازے میں کھڑے ہوئے شخص کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا کیونکہ یہ شخص اس ڈیون کوپر کے مقابلے میں جسے وہ جانتا تھا، کہیں زیادہ عمر رسیدہ، وحشت زدہ اور دبلا دکھائی دے رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ زندگی اس پر مہربان نہیں رہی تھی۔ اس کی سیاہ وحشت زدہ آنکھیں اس کے چہرے میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے سر پر گہرے سیاہ بال خاص انداز سے تراشیدہ تھے جو ماتھے سے گدی تک ایک پٹی کی شکل میں تھے اور باقی سر منڈا ہوا تھا۔ اس کے اوپری جسم پر قمیص موجود نہیں تھی اور اس نے نیلے رنگ کی ٹائٹ فٹنگ کی جینز پہنی ہوئی تھی جس سے اس کے بدن کی ہڈیاں نمایاں اور ابھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

”میں محو حیرت تھا کہ تم دوبارہ کب آؤ گے۔“ ڈیون نے کہا۔ ”تمہیں یہاں سے گئے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ایسا ہی ہے۔ سو اب تم نے اپنا نام ڈیون کوپر سے ڈیون میری بوسا رکھ لیا ہے؟“

ڈیون کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”تم اسے میرا قلمی نام کہہ سکتے ہو۔“

وہ دونوں دہلیز پر کھڑے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

”تو اب نیا کیا ہے؟“ الیگزینڈر نے پوچھا۔

”تم اندر کیوں نہیں آ جاتے تاکہ ہم کھل کر اطمینان سے گپ شپ کر سکیں؟“ ڈیون نے اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کی عجیب سی مسکراہٹ نے الیگزینڈر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ الیگزینڈر کو اپنی دہلیز پر دیکھ کر ڈیون کوپر کچھ زیادہ ہی مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس نے کوئی اتنی زیادہ حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا جیسے کہ اسے الیگزینڈر کی آمد کی توقع تھی۔

اس چھوٹے سے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی الیگزینڈر کو بے چینی اور بے کلی سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے لگا۔ ہر دیوار پر ہر سائز اور ہر شیپ کی پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ پینٹنگز کے درمیان اتنی کم خلا تھی کہ دیوار کا سیاہ رنگ جھریوں کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ پینٹنگز کے مختلف رنگوں اور طول و عرض میں تفریق کے باوجود تمام تصاویر کا موضوع ایک ہی تھا...... حنوط کردہ چہرے!

بلکہ حقیقت میں وہ سب کے سب ایک ہی چہرہ کھائی دے رہے تھے۔

ڈیون نے اس بات پر کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا کہ الیگزینڈر اس کے کام کو سمجھ رہا ہے۔ ”میں جو کام کرتا رہا ہوں وہ تمہیں پسند آیا؟“

”میرے خیال سے تم اس پر گزشتہ پانچ سال سے کام کرتے چلے آ رہے ہو۔“ الیگزینڈر نے جواب دیا۔ البتہ اس کی آنکھیں بدستور ان پینٹنگز پر جمی ہوئی تھیں جو اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

”تم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تمہارے انسٹرکٹر نے

تمہیں بتایا ہے کہ تم وہ لکھو جو کچھ تم جانتے ہو۔ سو میرا خیال ہے کہ یہی کچھ پینٹنگ کے سلسلے میں بھی اپلائی ہوتا ہے اور یہ بات کہتے ہوئے میں شرط لگا سکتا ہوں کہ مارجوری یہ دیکھ کر بے انتہا خوش ہوتی کہ وہ تمہاری کتاب میں مرکزی کردار کی اہل ثابت ہوئی۔''

''ایکیوزمی؟''

''جی، ایک روز جب ہم دونوں بحث کے ذریعے یہ قصہ حل کرنے کی کوشش کررہے تھے تو مارجوری نے تم دونوں کے بارے میں مجھے سب کچھ بتادیا تھا۔ کیا یہ دلچسپ بات نہیں کہ اس کا انجام ہم دونوں کی مربیہ دیوی کے طور پر ہوا؟'' ڈیون نے اپنے آرٹ کے نمونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

الیگزینڈر یہ سن کر تیزی سے ڈیون کی جانب گھوم گیا۔

''سو اس کا یہ انجام تم ہی نے کیا ہے۔'' اس نے ڈیون پر الزام عائد کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس بے رحم شخص کے خلاف اپنی نفرت کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ مارجوری ایک پُرجوش اور پُرکشش عورت تھی اور ڈیون نے اسے برباد اور ضائع کردیا تھا۔

الیگزینڈر نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ اس بات کا انتظار کررہا تھا کہ ڈیون کا ذہن اسے اس بات پر آمادہ کرلے کہ وہ خود مارجوری کے قتل کا اعتراف اپنی زبان سے کردے۔

''تمہیں اس بات کی پروا کیوں ہے؟ وہ تمہارے لحاظ سے اتنی اچھی نہیں تھی کہ تمہارے ساتھ چپکی رہ جاتی۔ جب ہی تم نے اپنے فن کی خاطر اپنی کتاب میں اسے مار ڈالا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے اپنے آرٹ کی خاطر اسے قتل کردیا تھا!''

''تم کتیا کے بچے!'' الیگزینڈر غصے سے پھٹ پڑا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بدستور اپنے پہلو میں بھینچی ہوئی تھیں۔

''مجھے اسی کی فکر لاحق رہتی تھی۔ میری کتاب میں اس کی موت کا سبب میرا وہ خوف تھا کہ اگر وہ تمہارے ساتھ رہ گئی تو اس کا کیا انجام ہوگا۔'' الیگزینڈر نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم اسے اپنی زندگی سے نکل جانے کی اجازت بھی تو دے سکتے تھے؟''

اس بات پر ڈیون نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''کیا؟ تم میرا استدلال سمجھنا چاہتے ہو؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ سن کر تم بہتر

شکرگزاری

ہم دن میں کئی مرتبہ اپنے ملنے والوں سے رسماً پوچھتے ہیں۔ ''کیا حال ہے؟'' اور وہ رسماً جواب دیتے ہیں۔ ''اللہ کا شکر ہے۔'' نہ حال پوچھنے والے کو اس شخص کے حال سے کوئی خاص دلچسپی ہوتی ہے اور نہ عموماً حال بتانے والے کا حال اتنا اچھا ہوتا ہے جتنا اس کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے۔ بس ایک رسم دنیا ہے، جو چلی آرہی ہے!

مگر کچھ سادہ لوح ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن سے آپ حال پوچھ بیٹھیں تو وہ اپنی صحت کے حوالے سے پورا بلیٹن جاری فرمادیتے ہیں۔ ''کھڑے کھڑے چکر آتے ہیں، بلڈ پریشر نارمل نہیں ہورہا، کل میں سودا سلف لینے بازار گیا تو دکان پر ہی گر پڑا اور ایک ہمسایہ اٹھا کر گھر لایا۔''

آپ اس کے جواب میں تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور یہ تلقین بھی کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور پھر جانے کے لیے ان سے اجازت طلب کرتے ہیں مگر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اب وہ آپ کو جانے دیں، آپ حال جو پوچھ بیٹھے ہیں چنانچہ وہ باقی ماندہ حال بھی سنانا شروع کردیتے ہیں۔ ''چھوٹے بچے کو خسرہ نکلا ہوا ہے، بڑا بیٹا کل موٹر سائیکل کھمبے میں مار بیٹھا، ابھی موٹر سائیکل کی قسطیں بھی رہتی تھیں، چلو اللہ کا شکر ہے جان تو بچ گئی!''

رسماً تو دل میں ہم لوگ کئی دفعہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے یہ شکر صرف اس وقت ادا ہوتا ہے جب ہم کسی بڑے حادثے میں ہڈی پسلی تڑوا بیٹھتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ''خالو جان کار کے حادثے میں فوت ہوگئے مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آنکھیں بچ گئیں۔'' انسان بھی اللہ کی عجیب مخلوق ہے، خوشی کے موقع پر رسمی اور غمی کے موقع پر اللہ کا دلی شکر یہ ادا کرتا ہے۔ لگتا ہے اسے حسنِ سلوک کچھ زیادہ راس نہیں آتا!

ولید بلال کی جستجو: عطاالحق قاسمی کی کتاب ''ہنسنا رونا منع ہے'' سے اقتباس

محسوس کرو گے؟ یہ بات تمہیں اس کی موت کی ذمے داری سے بری کردے گی؟ میں تمہارے لیے ایسا ہرگز نہیں کروں گا، الیگزینڈر۔ میں تمہاری ذمے داری کے احساس کو تم سے جدا نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے کہ یہ تمام تر غلطی تمہاری تھی۔''

الیگزینڈر نے یہ سن کر اپنا سیل فون نکالا اور نائن ڈبل ون ڈائل کرتے ہوئے بولا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس خود ہی اس مسئلے کو حل کرلے گی۔''

ڈیون لپک کر الیگزینڈر کے پاس پہنچا اور اس کے

ہاتھوں سے سیل فون جھپٹ لیا۔ ”ہاں، میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔“

الیگزینڈر، ڈیون کو گھورنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ڈیون کی وحشیانہ آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس سے بھڑنے پر تُلا ہوا ہے۔

”تمہیں تفصیلات کی یہ توضیح کیسی لگ رہی ہے، ڈیون اس بات کو رہنے دو کہ میں اس معاملے کو کس نگاہ سے دیکھ رہا ہوں، لیکن اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوا۔“

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن میں برسوں سے اس موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر انہیں قبر مل گئی۔ ہے نا؟“

الیگزینڈر نے محتاط ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک بیسٹ سیلنگ مسٹری ناول نگار ہونے کے باوجود اس سے یہ اندوہناک غلطی کیونکر سرزد ہو گئی؟ اسے یہاں تنہا آنے کے معاملے میں زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔ اس کی نظریں راہِ فرار اختیار کرنے کے لیے کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔

”سوال یہ ہے کہ اب میں کیا کروں؟ کیا میں غائب ہو جاؤں اور قتل کا تمام تر الزام تمہارے سر منڈھا جائے جیسا کہ میرا ہمیشہ سے ارادہ تھا؟ یا میں تمہارا انجام بھی اس طرح تحریر کر دوں جیسا کہ تم نے مارجوری کا تحریر کیا تھا؟“ یہ کہہ کر وہ آہستہ قدموں سے الیگزینڈر کی جانب بڑھنے لگا۔

الیگزینڈر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس ڈیون کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے جذبات اس کے چہرے سے عیاں نہ ہونے پائیں۔ اگر وہ پُرسکون، خاموش رہے اور اپنے حواس مجتمع رکھے تو شاید متوقع تباہی سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

ادھر ڈیون جذباتی اور جنونی ہونے کے باعث اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ جب الیگزینڈر نے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تو ڈیون نے اپنے دل کے غبار کو اگلنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

”میں قصبہ چھوڑ کر چلا جاؤں اور اپنا نام تبدیل کر لوں...... تمہارے خیال میں ڈیون الیگزینڈر نام کیسا رہے گا؟ اور پھر سے ایک نئی زندگی کا آغاز کر لوں۔ یہ بہت آسان رہے گا یا پھر میں بھی تمہیں اسی آزار سے نبرد آزما ہونے کا موقع دوں جس میں وہ مبتلا رہی تھی؟ فیصلہ کرو...... فیصلہ......!“ یہ کہہ کر ڈیون دروازے کی جانب چلا گیا اور اس نے دروازے کا تالا لگا دیا۔ پھر لمبی کھڑکیوں کی جانب بڑھا اور ان کے شیڈ گرا دیے۔

کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی الیگزینڈر کو یوں لگا جیسے دیواروں پر آویزاں پینٹنگز کے دہشت زدہ چہرے اندھیرے کے کرب سے چلا رہے ہوں۔ الیگزینڈر کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

الیگزینڈر اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا جبکہ ڈیون بدستور کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ جب وہ کچن کے پاس پہنچا تو اس نے کچن کی ایک دراز کھولی اور اس میں سے ایک بڑا سا گوشت کاٹنے والا چاقو باہر نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا پھر خوفناک انداز میں الیگزینڈر کی جانب بڑھنے لگا۔

الیگزینڈر غیر شعوری طور پر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کی نبض کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور خون کی گردش کی رفتار بڑھنے سے اس کے کانوں کی لویں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔ ”تم نے اسے قتل کر دیا! اس نے تمہارا انتخاب کیا تھا اور تم نے اسے مار ڈالا!“

ڈیون چاقو کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں اچھال رہا تھا۔ ”اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی چاہتے، ہے نا؟ جیسے کہ یہ تمام تر غلطی میری تھی؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غلطی میری نہیں تھی، الیگزینڈر! تم نے اسے میرے خلاف ورغلا دیا تھا پھر تم اس سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ سمجھ گئے؟ یہ غلطی میری نہیں تھی!“

الیگزینڈر، ڈیون سے بدستور پیچھے ہو رہا تھا، وہ بولا۔ ”تو پھر تم میرے پیچھے کیوں نہیں آئے اگر میں نے اسے تمہیں چھوڑ کر آنے کے لیے ورغلایا تھا تو پھر تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا، اسے کیوں قتل کیا؟“

الیگزینڈر کو پیچھے کھسکتے ہوئے رکنا پڑ گیا کیونکہ اس کی پشت میز سے جا ٹکرائی تھی۔ اس نے بائیں جانب قدم اٹھانے کی کوشش کی لیکن ڈیون اس پر نظریں جمائے اس کی حرکت سے ہم آہنگ خود بھی حرکت کر رہا تھا۔ ایسا اس وقت بھی ہوا جب الیگزینڈر نے دائیں جانب حرکت کرنا چاہی۔

الیگزینڈر کو اب مشکل صورت کا سامنا تھا۔ اس کے ہاتھ اپنے عقب میں کوئی شے ٹٹولنے لگے جو اس کے لیے بطور ہتھیار ثابت ہو لیکن اس کی گرفت میں ایسی کوئی تیز دھار یا کند شے نہیں آئی جو ہتھیار کے طور پر کام آسکتی۔ صرف خطوط یا اخبارات تھے جو اس کے پیچھے میز پر رکھے ہوئے تھے۔

ڈیون نے شانے اچکا دیے۔ وہ چاقو کو بدستور اپنے دونوں ہاتھوں میں نچا رہا تھا۔ ''اگر میں اسے آزاد کر دیتا تو وہ کسی اور کے ساتھ شتھی ہو جاتی اور مجھ سے یہ کبھی برداشت نہ ہوتا۔ لیکن میں بھی اس کی جگہ کسی اور کو گوارا نہیں کر سکتا تھا جس پر مجھے اعتبار نہ ہوتا۔ سو اس کا بس یہی ایک حل تھا جو کوئی معنی رکھتا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک قدم اور آگے بڑھا لیا۔

میز اب بھی الیگزینڈر کے عقب میں تھی۔ وہ میز کی درازوں کو ٹٹولنے لگا۔ وہاں پیپر کلپس، ٹپس، اسٹیپس، چپکواں نوٹس اور ٹشو وغیرہ موجود تھے لیکن کام کی کوئی شے نہیں تھی۔

ڈیون نے گردن گھماتے ہوئے الیگزینڈر کے عقب میں اس کی میز کی درازوں کو ٹٹولتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا تو تمسخر اڑانے والے انداز میں بولا۔ ''کیا تم مجھے مارنے کے لیے کچھ تلاش کر رہے ہو؟'' اس کی ہنسی زہرخند تھی۔ ''کم آن! تم ایک رائٹر ہو۔ اپنا تخیل استعمال کرو!''

الیگزینڈر نے اپنا ہاتھ بائیں دراز میں گھسیڑ دیا لیکن وہاں بھی کوئی کند تیز دھار شے موجود نہیں تھی۔ البتہ اس کی انگلیاں جس شے سے ٹکرائیں وہ ڈوری محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس ڈور کو بطور ہتھیار استعمال کر سکتا تھا اور جیسا کہ دکھائی دے رہا تھا، اس کا استعمال کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ ڈیون کو گھومنے پر کس طرح آمادہ کیا جا سکتا تھا؟

اگر الیگزینڈر یہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیون کے ہاتھ میں پکڑا ہوا لمبا چاقو اس کے سینے میں دھنس جائے تو اس سے بچاؤ کا بس ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ عقب سے ڈیون کی گردن میں ڈوری ڈال کر اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرے۔

چونکہ ڈیون کی نظریں بے اعتباری اور شبہ کے انداز میں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں تو ڈیون کی اس اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہی اچانک ہی ایک خیال الیگزینڈر کے ذہن میں سوجھ گیا۔

ڈیون کا ذہن یا تو کسی نشے کے زیرِ اثر تھا یا اس کی ذہنی بے اعتدالی تھی جو اسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے روکے ہوئے تھی۔ الیگزینڈر کے لیے اس خطرناک صورتِ حال سے بچ نکلنے کا یہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ ڈیون کی اس کمزور ذہنی کیفیت سے فائدہ اٹھا لے۔

ہوش

مسٹر زیلکن کی بیوی فوت ہو گئی تو اس کا ایک قریبی دوست تعزیت کے لیے اگلے روز اس کے گھر گیا۔ دیکھا کہ زیلکن ایک عورت کو لیے بیٹھا ہے۔

''تمہیں شرم نہیں آئی! قبر میں تمہاری بیوی کا گوشت بھی ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا ہوگا اور تم رنگ رلیاں منا رہے ہو؟'' دوست نے غصے سے کہا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس جانکاہ صدمے سے مجھے اتنا ہوش ہے کہ کیا کر رہا ہوں؟'' زیلکن نے درد بھری آواز میں کہا۔

اسلام آباد سے حبا خالد کا تعاون

''ڈیون، تمہارے ساتھ ایک پرابلم ہے، مین!'' الیگزینڈر نے ڈیون کے شانے کے پیچھے نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ حقیقت میں تمہارے لیے کسی طور پر بہتر ثابت نہیں ہوگا۔''

الیگزینڈر کی نظریں وقفے وقفے سے ڈیون کے چہرے سے اس کے عقب میں دیوار کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ ڈیون کو جھنجلاہٹ کا شکار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' ڈیون نے پوچھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پلٹ کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن اپنی اس خواہش کو کچلنے کے لیے خود سے نبرد آزما تھا۔

الیگزینڈر نے شانے اچکا دیے۔ وہ ایک طویل لمحے تک ڈیون کے چہرے پر نظریں جمائے رہا لیکن پھر دوبارہ وقفے وقفے سے اس کے شانے پر سے اس کی عقبی دیوار کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ''میرے خیال سے تم خود کو حوالے کر دو۔'' الیگزینڈر نے اس کے عقب میں دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح تمہیں وہ مدد مل جائے گی جس کی تمہیں ضرورت ہے۔''

الیگزینڈر نے دروازے کی جانب اشارہ کیا اور پھر افسردگی کے انداز میں سر ہلانے لگا۔

ڈیون اپنا تجسس چھپانے میں ناکام رہا اور اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ الیگزینڈر کس کے ساتھ خاموش گفتگو کر رہا

ہے، اپنا اوپری دھڑ دروازے کی سمت گھما دیا۔

الیگزینڈر برق رفتاری سے ڈیون پر جھپٹ پڑا۔

اس نے ڈوری سے ڈیون کی گردن میں حلقہ ڈالتے ہوئے اسے مضبوطی سے کس دیا اور اسے پوری قوت سے دبائے رہا۔

ڈیون بوکھلا کر الل ٹپ ہاتھ پیر مارنے لگا اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ الیگزینڈر کا مقصد ڈیون کو ہلاک کرنا نہیں بلکہ بے ہوش کرنا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ ڈیون اپنے ہاتھ پیر مارنا چھوڑ دے تاکہ وہ ڈوری کے پھندے کی گرہ ڈھیلی کر دے۔ لیکن ڈیون مسلسل ہاتھ پیر مارے جا رہا تھا۔

اور پھر اچانک ڈیون نے اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کا جسم پُرسکون...... اور چہرہ ارغوانی رنگ کا ہو گیا تھا۔

الیگزینڈر پیچھے ہٹ گیا اور ڈیون کا بے جان جسم فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ کرسی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ ڈیون کو دیکھتا رہا کہ شاید اس کے جسم کا کوئی حصہ حرکت کرنے لگے۔ اسے یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہونے والا محسوس ہو رہا تھا۔

لیکن ڈیون کے جسم نے کوئی حرکت نہیں کی۔

الیگزینڈر نے ایک قدم آگے بڑھایا اور فرش پر گرے ہوئے چاقو کو ٹھوکر مار کر پرے پھینک دیا۔ پھر گھٹنوں کے بل ڈیون پر جھک گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پر نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔ وہاں کوئی حرکت نہیں تھی۔

پھر اس کا ہاتھ ڈیون کی کلائی پر چلا گیا۔ وہاں پر بھی کچھ نہیں تھا۔ الیگزینڈر کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ وہ دھم سے ڈیون کے بے جان جسم کے پاس فرش پر بیٹھ گیا اور اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

یہ کیا ہو گیا؟ ایک دن...... صرف ایک دن میں اس کی زندگی مکمل طور پر تہ و بالا ہو گئی تھی۔

پھر پُرسکون ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں اس شخص پر مرکوز ہو گئیں جسے اس نے ابھی ابھی قتل کیا تھا۔

لاش کو دیکھنے کے دوران اس کی توجہ اس ڈوری پر پڑی جس کو استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنے پرانے دوست کا گلا گھونٹا تھا۔ ''لعنت ہو مجھ پر۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ پھر اس نے جھک کر وہ ڈوری ہاتھ میں اٹھالی۔ وہ غور سے اس ڈوری کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس کے سائز، ڈیزائن اور مضبوطی کو جانچ رہا تھا۔

پھر اس کا ذہن فوراً ہی اس مردہ خانے کی طرف چلا گیا جہاں مارجوری کی حنوط شدہ لاش سلیب پر بے جان پڑی ہوئی تھی۔ مارجوری کی گردن پر حلقے کے نشانات ہو بہو اس ڈوری کی خصوصیات سے مشابہ تھے۔

''تمہیں یہ کیسا لگا؟'' الیگزینڈر نے اپنے آلۂ قتل کا معائنہ کرتے ہوئے ڈیون کی لاش سے مخاطب ہو کر کہا۔

تب عین اسی لمحے کمرے کا دروازہ... ایک دھماکے سے کھل گیا۔ الیگزینڈر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسے چار باوردی پولیس آفیسر دکھائی دیے جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں سیمی آٹومیٹک ہتھیار تھے اور ان کا رخ الیگزینڈر کی جانب تھا۔

''ڈیون کوپر تم زیرِ حراست......'' سراغ رساں رچرڈ ڈنکن نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ ان باوردی پولیس افسران کی اوٹ سے نکل کر سامنے آچکا تھا لیکن الیگزینڈر پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ اس کی نظریں الیگزینڈر پر سے ہوتی ہوئی ڈیون کی لاش کی جانب چلی گئیں۔ پھر دوبارہ الیگزینڈر پر واپس آگئیں۔

''یہاں یہ سب کیا ہوا ہے؟''

''میں نے ڈیون کوپر کو تلاش کر لیا تھا۔'' الیگزینڈر نے جواب دیا۔ ڈوری بدستور اس کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔

''یہ تو نظر آرہا ہے۔ لیکن کیا تم یہ وضاحت کرنا پسند کرو گے کہ تم نے اسے کس طرح تلاش کیا؟ اور اس کا قتل بالکل اسی انداز سے کیوں کر ہوا ہے جیسے کہ تمہاری کبھی جانے والی بیوی کا ہوا تھا؟'' سراغ رساں رچرڈ ڈنکن نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

الیگزینڈر اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی ڈوری کو گھورتا رہا۔ پھر اس کی نظریں فرش پر موجود ڈیون کوپر کی لاش پر جم گئیں۔ وہ ایک طویل خاموشی کے بعد شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''میرے خیال سے مجھے اپنے وکیل کی ضرورت ہے۔ اس کی موجودگی کے بغیر میں کسی قسم کی وضاحت بیان نہیں کر سکتا۔''

سراغ رساں نے اپنے ساتھیوں کو الیگزینڈر کو حراست میں لینے کا اشارہ کیا۔ الیگزینڈر نے چپ چاپ خاموشی سے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

کالی زندگی

محسن صدیقی

محبت، عورت اور مرد کے باہمی تعلق سے جڑی مختصر کتھا... دونوں کی محبت دلوں میں سانس لیتی اور رگوں میں دوڑتے خون کی طرح محسوس ہوتی تھی... مگر وارداتِ قلبی کی کاری ضرب نے ایک ہی وار میں سب کچھ تباہ و برباد کر دیا...

فراق میں مبتلا عاشق کی بے خودی جسے اپنی محبوبہ کا شدت سے انتظار تھا......

رات بہت کالی تھی اور وہ اپنی خواب گاہ کے کالے بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ اچانک ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر جما ہوا تھا۔ وہ دہشت سے چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آواز مضبوط ہتھیلی کے سائے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

''خبردار...... چیخنے چلّانے کا خیال دل سے نکال دو۔ ورنہ یہ ہاتھ تمہارا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں۔''

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ وہ گہری تاریکی میں نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس نے بولنے والے کی آواز پہچان لی تھی۔ خوف کی یہ لہر آتشی سیال کی طرح اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر منہ پر سے ہاتھ ہٹتے ہی وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''تت...... تم......؟''

''ہاں میں۔ تم نے قبر کی جس تاریکی میں مجھے پہنچانا چاہا تھا، میں اسی تاریکی میں سے نکل کر آیا ہوں۔ کیا اس وقت تم اپنے چاروں طرف قبر کی تاریکی کو نہیں دیکھ رہی ہو؟''

''آں...... ہاں، اس اندھیرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ خدا کے لیے روشنی کرو۔''

''روشنی کا سفر بہت مختصر ہوتا ہے۔ جب تک زندگی چلتی ہے، روشنی چلتی ہے اس کے بعد صرف قبر کا اندھیرا ہی ساتھ دیتا ہے۔''

''تت...... تمہارے ہاتھ بہت سرد ہیں۔''

''موت کے ہاتھ ہمیشہ سرد ہوتے ہیں۔''

''تمہاری باتوں سے میرا دم اُلجھ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ اتنے عرصے بعد کیوں آئے ہو؟''

''تمہاری محبت کھینچ لائی ہے۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی تھیں یا کرتی ہو؟''

''کک...... کک...... کک...... کرتی ہوں۔ جب سے تم گئے ہو تمہارے لیے تڑپ رہی ہوں۔''

''اسی لیے تو آ گیا ہوں۔ اب تمہاری ساری تڑپ اور

بے چینی ختم ہو جائے گی۔ زندگی کیا ہے؟ ایک اندھے کا سفر ہے۔ میں اندھا ہو چکا ہوں۔"

اس حسینہ کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ چشم زدن میں سمجھ گئی کہ اس کا محبوب اسی کے ہاتھوں اندھا ہوا ہے۔ اس کی آواز کانوں میں تیزاب کی طرح ٹپک رہی تھی۔

"میں اب اندھا ہوں۔ جب آنکھیں تھیں اس وقت بھی آنکھ والوں کی طرح اندھا تھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی خواہش انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ ہماری ہر خواہش زندگی کے راستوں پر اندھیرا پھیلاتے پھیلاتے ہماری زندگی کو نہایت بدصورت اور سیاہ فام بنا کر رکھ دیتی ہے۔ میری جان میں اس کالی زندگی کا سفر طے کرتا ہوا پھر ایک بار تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ تمہارے حسن و شباب کی چکا چوند ایسی ہے کہ پچھلی بار تمہیں دیکھتے ہی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ماں باپ نے نصیحتیں کیں مگر وہ میرے پلّے نہیں پڑیں۔ دوستوں نے سمجھایا کہ تم وفا کے نام سے واقف نہیں ہو لیکن ان کی باتوں سے بھی میرے کان بہرے ہو گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے جیسی حسین عورت اپنے پچھلے عاشقوں کو "اونہہ" کہہ کر ٹھکرا دے اور کسی دوسرے مرد پر مہربان ہو جائے تو اس مرد کو فتح کا غرور حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ احمق یہ نہیں سوچتا کہ اس کے جیسے دوسرے مرد ٹھکرائے جا چکے ہیں۔ ایک دن اس کی باری بھی آئے گی۔ میں بھی ایسا ہی ایک احمق تھا۔ میری باری بھی آ گئی۔

تم مجھ سے بہت زیادہ خائف رہتی تھیں اس لیے کھلم کھلا مجھے ٹھکرا نہ سکیں۔ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے اپنے نئے عاشق کا سہارا لیا۔ شاید تم نے میرا یہ دردناک انجام اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اب دیکھ لو میں تم سے دور نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اس کے نازک سے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ دیکھنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر اندھیرا دیکھنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اس کھردرے ہاتھ نے اس نازک سے ہاتھ کو اپنے سر پر لا کر رکھ دیا۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ کھوپڑی ایسی چکنی تھی جیسے مردہ ڈھانچے کا سر ہوتا ہے، وہ اسے چھوتے ہی تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کی انگلیاں پھسلتی ہوئی چہرے پر آئیں تو چہرے پر چھوٹی چھوٹی گوشت کی بوٹیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔

"مم...... مجھے چھوڑ دو۔ مجھے سوئچ بورڈ کی طرف جانے دو۔ میں روشنی کروں گی۔ ورنہ تم اندھیرے میں مجھے مار ڈالو گے۔"

اندھیرے میں دبا دبا سا قہقہہ ابھرنے لگا۔ ہلکے ہلکے قہقہوں کے جھٹکے ایسے تھے کہ منہ سے تمباکو کے بھبکے آ رہے تھے۔

"نہیں، نہیں، میں تمہاری طرح بے وفا نہیں ہوں کہ تمہیں جان سے مار ڈالوں۔ محبت کو آج تک کس نے مارا ہے؟ تم نے دل سے مار دیا مگر اس دنیا سے مجھے نہ مار سکیں۔ میری جان محبت کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ آپس میں جو عہد و پیمان ہوتے ہیں، انہیں نبھانا پڑتا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ مروں گا تمہارے ساتھ، جیوں گا تو تمہارے ساتھ۔ میری دولت تمہاری دولت ہوگی۔ میری زندگی کی روشنی تمہاری زندگی کی روشنی ہوگی۔ ہماری خواب گاہ میں اندھیرا ہوگا تو ہم دونوں اس اندھیرے کے شریک ہوں گے۔ اب میری زندگی کی خواب گاہ میں اندھیرا ہو چکا ہے تو تمہیں بھی اس اندھیرے کی شریک بننا پڑے گا۔ تم سوئچ بورڈ کی طرف نہیں جاؤ گی، جو وعدہ کیا ہے نبھانا پڑے گا۔ محبت کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی وہ اس پر جھک گیا۔ چیخنے کے لیے نازک سے لب کھل گئے لیکن پتھر جیسے ہونٹوں نے چیخنے کا راستہ مسدود کر دیا۔ جب اس کی سانسیں بری طرح الجھنے لگیں اور وہ چیخنے کے قابل نہ رہی تب اس نے کہا۔

"تم نے میری سالگرہ پر مجھے کالی زندگی کا تحفہ دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ آج میں بھی تمہیں کالی زندگی کا تحفہ دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک بوتل نکالی۔ دانتوں سے اس کے ڈھکن کو کھولا پھر بوتل کے تیزاب کو اس کے سر پر اور اس کے چہرے پر انڈیل دیا۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپنے لگی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے دبوچے رہا۔ پھر الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ زندگی اندھیرے میں گزرنے والی کہانی کا عنوان ہے۔ اس اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف آواز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے حسین چہرے اور حسین آنکھوں کا ماتم کر رہی ہے۔ پھر وہ تڑپتی ہوئی بستر پر سے گر کر فرش پر آ گئی۔ وہ اندھیرے میں آگے بڑھا۔ اس کے جسم سے ٹھوکر کھا کر فوراً سنبھل گیا پھر آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ کے پاس پہنچا۔ ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ سوئچ آن ہو گیا۔ خواب گاہ روشن ہو گئی۔ دنیا روشن ہو گئی۔ مگر اب ان دونوں کو روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے پیار کا وعدہ نبھانے کے لیے اسے اپنی کالی زندگی کا ہمسفر بنا لیا تھا۔

عمدگی سے جھوٹ کو نبھانا بھی ایک فن ہے... خصوصاً وہ لوگ جن کے دامن پر چھینٹ ہو... اس کے گھر میں ایک واردات ہو چکی تھی... اور بچاؤ کا ایک ہی راستہ تھا جو بالآخر اس نے سوچ سمجھ اور پرکھ لیا تھا... مگر حسرت ان غنچوں پر جو بن کِھلے مرجھا گئے... سائنس کی ترقی و کھوج نے اس کی عمدہ کوشش کو ایک ہی جھٹکے میں ناکام بنا دیا...

ماہر سراغ رساں کی باریک بینی سے کی گئی نظر ثانی

پیغام

عکسِ فاطمہ

سراغ رساں ونسٹن داخلی دروازے سے مکان میں داخل ہوا تو اس نے سراغ رساں شارپر کو ایک ادھیڑ عمر شخص کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے پایا۔ ونسٹن کی آمد کی آہٹ پر شارپر نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ شخص فوراً ہی مر گیا تھا۔“

سراغ رساں ونسٹن نے ادھیڑ عمر راجر کلارک کی لاش پر نگاہ ڈالی جو ایک آرام کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سر کے داہنی حصے میں گولی کا سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے داہنے بے جان ہاتھ میں ایک ریوالور لٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے داہنی حصے اور گردن پر خشک خون لگا ہوا تھا۔ آرام کرسی کے کپڑے پر بھی خشک خون نظر آرہا تھا۔

”کوئی اور زخم کا نشان؟“ ونسٹن نے پوچھا۔

سراغ رساں شارپر نے نفی میں سر ہلا دیا اور کافی ٹیبل کی جانب انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”بیئر کی ان خالی بوتلوں کے علاوہ یہ جگہ بالکل صاف ستھری ہے۔

نہ کسی قسم کی جدوجہد کے آثار ہیں اور نہ ہی زبردستی گھر میں در آنے کا کوئی نشان ہے...... اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ خودکشی کا ایک پیچیدہ سیٹ اپ ہے۔"

"اس کی لاش اس کی بیوی نے دریافت کی ہے؟"

"ہاں۔" شارپر نے لاش کی چند تصویریں اتارتے ہوئے کہا۔ "وہ پانچ بجے کے کچھ دیر بعد یہاں آئی تھی اور جب گھر میں داخل ہوئی تو اسے اسی حالت میں پایا۔"

سراغ رساں ونسٹن نے پورے منظر کا بغور جائزہ لیا۔ پھر پوچھا۔ "کیا تم نے گھر کا بقیہ حصہ چھان لیا ہے؟"

"میں تمہاری آمد کا انتظار کر رہا تھا۔"

ان دونوں نے مل کر پورے گھر کی تلاشی لے ڈالی۔ انہیں ایک چھوٹے سے دفتر نما کمرے میں ایک کمپیوٹر کے پاس ایک ٹائپ شدہ پیغام مل گیا۔ ونسٹن نے دستانوں میں بند ہاتھوں سے وہ کاغذ اٹھایا تو اسے کاغذ کے ایک کونے میں خون کا ایک چھوٹا سا دھبا دکھائی دیا۔ ونسٹن نے کاغذ پر تحریر پیغام بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔

"لیزا، میں یہ سب کچھ اب برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اسے ختم کر رہا ہوں۔ پیار کے ساتھ، راجر!"

"میں حیران ہوں کہ اب مزید برداشت نہ کرنے سے اس کی کیا مراد تھی؟" ونسٹن نے بلند آواز سے کہا۔

"لگتا ہے کہ لیزا اپنے طور پر اس ازدواجی رشتے کو ختم کر رہی تھی۔"

سراغ رساں شارپر نے اپنی نوٹ بک پر نگاہ دوڑاتے ہوئے ونسٹن کو بتایا۔ "مجھے یہ معلومات پڑوس سے حاصل ہوئی ہیں۔"

سراغ رساں ونسٹن نے ایک پٹرول ڈپٹی کو جائے واردات کی نگرانی کے لیے مامور کیا اور سراغ رساں شارپر کے ہمراہ لیزا کلارک سے ملنے کے لیے پڑوسی کے مکان کی جانب چل دیا۔

"میں جب مکان میں داخل ہوئی تو اسے وہاں اسی حالت میں پایا۔" لیزا کلارک نے بتایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "اس نے کہا تھا کہ اگر میں گھر واپس نہیں آئی تو وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لے گا۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ حقیقت میں ایسا کر لے گا۔"

"سو تم یہاں ٹھہری ہوئی نہیں تھیں؟" ونسٹن نے پوچھا۔

لیزا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں گزشتہ ہفتے سے اپنی ممی کے گھر سو رہی تھی۔"

"تم یہاں اس گھر میں کیا کر رہی تھیں؟"

"میں یہاں اپنے مزید کپڑے لینے کے لیے آئی تھی۔"

"کیا گھر کا دروازہ لاک تھا؟"

لیزا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر تم اندر کیسے داخل ہوئیں؟"

"دروازے کے تالے کی چابی اب بھی میرے پاس موجود ہے۔"

"جب تم گھر میں داخل ہوئیں تو تمہاری نگاہ اس پر فوراً ہی پڑ گئی تھی؟"

"ہاں، گھر میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے میں نے یہی دیکھا۔"

"پھر تم نے کیا، کیا؟"

"میں دوڑتے ہوئے اپنے پڑوس میں پہنچی اور نائن ون نائن پر فون کر دیا۔"

سراغ رساں ونسٹن نے اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے لیزا کلارک کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ "گھر کے دروازے کے تالے کی چابی اور کس کے پاس ہے؟"

"وہ کسی کے پاس نہیں ہے، کیوں؟"

"کیا تم نے حال ہی میں کوئی گن فائر کی ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا تم نے حال ہی میں کوئی گن چلائی ہے؟"

"ہوں، نہیں۔"

شارپر کی پیشانی کی لکیریں اس وقت گہری ہو گئیں جب ونسٹن نے اسے اپنی کار میں سے گن شاٹ کے ذرات کا نتیجہ اخذ کرنے والی کٹ لانے کو کہا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور کٹ لینے کے لیے باہر چلا گیا۔

جب شارپر لیزا کے ہاتھوں پر روئی کی پھریری پھیر رہا تھا تو ونسٹن نے لیزا سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہر قسم کی شوٹنگ کی جانچ کا ایک اسٹینڈرڈ طریقۂ کار ہے۔ اس سے ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ کیا کسی فرد نے حال ہی میں کوئی گن فائر کی ہے یا نہیں۔"

"لیکن میں بتا چکی ہوں کہ میں نے کوئی گن فائر نہیں کی۔"

دعائیں

ایک خاتون نے باتیں کرنے والا طوطا خریدا۔ لیکن انکشاف ہوا کہ وہ مغلظات بکتا تھا۔ خاتون بہت پریشان ہوئی اور اسے پادری کے پاس لے جا کر بپتا سنائی۔ پادری نے کہا کہ وہ فکرمند نہ ہو۔ اس کے پاس ایک مادہ طوطی ہے جو بیشتر وقت آنکھیں بند کیے دعائیں مانگتی ہے۔ خاتون اپنے طوطے کو اس کے پاس چھوڑ جائے۔ وہ سدھر جائے گا۔ خاتون نے اپنے طوطے کا پنجرہ طوطی کے پنجرے کے قریب رکھ دیا۔

''کیا خیال ہے، کچھ...... ہو جائے؟'' طوطے نے طوطی سے کہا۔

''یہی تو میں دن رات دعائیں مانگ رہی ہوں۔'' طوطی نے جواب دیا۔

کراچی سے نور احمد کا تعاون

ونسٹن اس بات پر مسکرا دیا اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

شارپر کا منہ لٹک گیا جب گن شاٹ ریزی ڈیو ٹیسٹ کا نتیجہ مثبت ظاہر ہوا۔ لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

ونسٹن نے دروازے کی جانب انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے شارپر سے کہا۔ ''جائے واردات پر واپس جاؤ اور راجر کے ہاتھوں پر بھی یہ ٹیسٹ سرانجام دو۔ پھر جو بھی نتیجہ سامنے آئے اس سے مجھے آگاہ کرو۔''

شارپر نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا۔

لیزا کچھ الجھن میں دکھائی دے رہی تھی۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے قدرے پریشان لہجے میں پوچھا۔

ونسٹن نے دلاسا دینے کے انداز میں لیزا کا شانہ تھپتھپایا اور بولا۔ ''یہ ہمارے طریقۂ کار کا حصہ ہے۔''

شارپر کی واپسی پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے آتے ہی ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ ''اس کا نتیجہ منفی نکلا ہے۔''

لیزا نے پہلے شارپر اور پھر ونسٹن کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اس کا کیا مطلب ہے؟''

ونسٹن نے اپنے بیلٹ کے پاؤچ میں سے ہتھکڑیوں کا ایک سیٹ نکالا اور لیزا کا بازو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔''

☆☆☆

سراغ رساں شارپر اس میز کی جانب بڑھا جہاں سراغ رساں ونسٹن، لیزا کے اعتراف کے بعد اس کی حراست کی رپورٹ ٹائپ کر رہا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ لیزا نے کلارک کو اس وقت قتل کیا جب وہ اپنی آرام کرسی پر سو رہا تھا۔'' شارپر نے کہا۔

''وہ اسے نیند کی حالت میں ہی قتل کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ یہ خودکشی کی واردات نہیں لگتی۔''

شارپر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تم نے کیسے پتا چلایا کہ یہ قتل لیزا ہی نے کیا ہے؟''

''آسانی سے۔ گن فائر کرنے کے ذرات لیزا کے ہاتھوں پر پائے گئے جبکہ کلارک کے ہاتھوں پر یہ ذرات موجود نہیں تھے۔''

''نہیں، میں اس ٹیسٹ سے پہلے کی بات کر رہا ہوں...... تمہیں اس پر شبہ کیونکر ہوا تھا؟'' شارپر نے جاننا چاہا۔

''خودکشی کے پیغام سے!''

شارپر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''پیغام سے؟ لیکن کس طرح؟''

''خودکشی کے پیغام پر خون کا جو دھبا لگا ہوا تھا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ پیغام راجر کلارک کو گولی مارنے کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ چونکہ اس کا زخم کاری ثابت ہوا تھا اور اس کی موت فوری طور پر واقع ہو گئی تھی اس لیے وہ خودکشی کا اعتراف نامہ خود تحریر نہیں کر سکتا تھا۔ گھر میں کسی کے زبردستی در آنے کا بھی کوئی ثبوت نہیں تھا، اس کا مطلب تھا کہ قاتل کے پاس لازمی طور پر گھر کی چابی موجود تھی۔ لیزا نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ گھر کی چابی کسی اور کے پاس نہیں تھی۔ اس لیے گھر کا تالا کھول کر اندر آنے والی شخصیت اسی کی ہو سکتی تھی۔ گن شاٹ ریزی ڈیو کی لیزا کے ہاتھوں پر موجودگی اور راجر کلارک کے ہاتھوں پر گن شاٹ ریزی ڈیو کی عدم موجودگی نے لیزا کے جرم پر مہر ثبت کر دی۔''

تاوان

زویا اعجاز

انسانی شخصیت کی تشکیل اس کے ابتدائی چند برسوں میں ہی ہو جاتی ہے... اس زندگی میں استاد کا درجہ ایک مینارۂ نور کا سا ہوتا ہے... جو نہ صرف علم کی روشنی تک پہنچاتا ہے بلکہ اس کی اپنی شخصیت طالب علموں کے لیے قابلِ قدر نمونہ ہوتی ہے... استاد کی فوری ستائش پر احساسِ مسرت، انسان میں مثبت سوچ کو بڑھاوا دیتی ہے... شخصیت پرستی اور مثبت سوچوں کے حامل افراد کے لیے گویا وہ ایسے چراغ ہوتے ہیں جن سے دوسرے بہت سے چراغ روشن ہوں... دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی ایک شاندار تحریر... وہ علم کی پیاس بجھانے کے شوقین اور معاشرے کے لیے فعال کردار ادا کرنے کا عزم رکھتے تھے... دونوں ایک دوجے کی آنکھوں میں اتر کر خواب چنتے تھے... وفا کے تانے بانے ریشمی باتوں سے بنتے تھے... مگر اچانک ہی رت کے بدلتے ہی دونوں کے قدم مختلف سمتوں میں بہک اٹھے۔ نم آنکھیں... شکستہ دل، انتقام کی دہکتی چنگاریاں اور کچھ یادیں... ان کے سفر کا ساماں بن چکے تھے...

عزم...... محبت اور مضبوط ارادوں کو ریت کے گھروندے کے مانند مسمار کردینے والی تخریب کاری کا سنسنی خیز ماجرا......

وہ سڑک پر کسی روبوٹ کے مانند چل رہا تھا۔ ذہن پر ایک بھیانک سناٹا طاری تھا۔ اسے اپنے آس پاس موجود ہر شے سرخ رنگ میں رنگی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... گہرا سرخ...... لہو رنگ۔ دماغ پر دھند سوار تھی۔

بصارت میں قید وہ خونی منظر اس کے اعصاب میں شدید کھنچاؤ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ حسیات بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ اس کی انگلیوں کی پوروں نے موت کی ٹھنڈک کو محسوس کیا تھا۔ وہ ٹھنڈک اب پوروں سے اس

کے ہاتھوں میں اتر رہی تھی۔ تشنج کی ایک لہر سی اس کے روم روم میں سرایت کرنے لگی۔

اسے گمان ہونے لگا ابھی کوئی پل ایسا آئے گا کہ اس کا برف ہوتا وجود پاش پاش ہوکر ان ہواؤں میں بکھر جائے گا۔ معدہ کسی تیز نکیلی شے سے کھرچتا محسوس ہونے لگا۔ درد کی ایک شدید لہر اس کے پیٹ میں اٹھی اور وہ سڑک کنارے دہرا ہو کر گر گیا۔ منہ میں کسی سیال مادے کی کڑواہٹ سی اس کے جی کو متلانے لگی اور سیاہ کولتار کی سڑک پر وہ کتنی ہی دیر ابکائیاں کرتا رہا۔ وہ بے طرح ”نروس ڈائیریا“ کا شکار ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے لرزتی ٹانگوں سے سامنے موجود مسجد میں جا کر اپنا چہرہ دھویا۔ اس کے پردۂ تصور پر اب بھی ایک جیتے جاگتے، زندگی کی حرارت سے بھرپور، ہزاروں تمناؤں سے گندھے وجود کی ایک شبیہ لہرا رہی تھی جواب صرف ایک مقتول تھا۔

یقین اب بھی بہت دشوار تھا۔

☆☆☆

زندگی ایک پل میں کیسے بدل جاتی ہے؟

یہ سوال اگر کوئی معیز بیگ سے پوچھتا تو وہ بلا جھجک اوائل دسمبر کی اس گلابی سی شام کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی تبدیلی قرار دے دیتا۔

اس روز وہ میٹرو اسٹیشن پر اپنے ایک دوست کے انتظار میں کھڑا تھا جب اس کی نظر دور دُور یہ سڑک کے دوسری جانب روشنیوں سے جگمگاتے ایک بک اسٹال پر پڑی تھی۔

یہ بک اسٹال علاقے میں کافی مقبول تھا۔ دکان کے مالک نے نوجوانوں کی دلچسپی کے پیشِ نظر عقبی جانب ایک 'ریڈنگ روم' بھی مختص کر رکھا تھا جہاں وہ انٹرنیٹ کے استعمال کے علاوہ کتابوں سے بھی خوب دل بہلاتے تھے۔ صاف ستھرے ماحول اور اچھی سروس کی وجہ سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں وہاں آزادانہ آتے جاتے تھے۔ معیز خود بھی کئی بار انٹرنیٹ کے استعمال کے لیے وہاں جا چکا تھا لیکن اس لڑکی کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لباس اور اطوار سے وہ کافی متمول محسوس ہو رہی تھی۔ معیز نے ایک کوفت بھری نظر موبائل پر ڈال کر وقت کا اندازہ کیا اور کچھ سوچ کر سڑک کے پار اس بک اسٹال کی طرف چل دیا۔

”آئیے معیز بھائی! بڑے عرصہ بعد آنا ہوا۔ لگتا ہے انٹرنیٹ کی ضرورت کھینچ لائی ہے آج آپ کو یہاں۔“ کاؤنٹر پر بیٹھے بائیس، تیئیس سالہ لڑکے حارث نے شرارت نما سنجیدگی سے کہا۔ وہ معیز ہی کے علاقے کا رہائشی تھا اور پڑھائی کے اخراجات میں والدین کا ہاتھ بٹانے کے لیے شام چھ بجے کے بعد وہاں جز وقتی ملازمت کرتا تھا۔

”نہیں! ایسا کچھ نہیں۔ بس کچھ کتابیں خریدنے کا دل چاہ رہا تھا۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔

”تو یہ سامنے ریک میں دیکھیے۔ کافی نئی کلیکشن موجود ہے یہاں۔“ حارث نے اس کی دائیں جانب اشارہ کیا تو وہ بھی وہیں متوجہ ہو گیا۔ شومئی قسمت وہ بھی اسی ریک کے پاس کھڑی کتابوں میں منہمک تھی۔ معیز بے پروا سے انداز میں کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا تاہم ذہن کا تمام تر ارتکاز اسی کی جانب مرکوز تھا۔ گلابی مائل سفید رنگت، تیکھے اور جاذبِ نظر نقوش، گہری سنجیدہ آنکھیں اور غرور سے اٹھی تیکھی ناک۔ وہ قدرت کی صناعی کا ایک شاہکار تھی۔ اس کی منتخب کردہ کتابوں میں فکشن اور جاسوسی ادب دیکھ کر وہ کافی حیران ہوا تھا۔ عام لڑکیوں کے برعکس ایسا انتخاب اس کے جذبۂ شوق میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ وہ معیز کی موجودگی سے یکسر بے نیاز تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے کاؤنٹر پر بل بنوایا اور سبک خرامی سے چلتی ہوئی رخصت ہو گئی مگر معیز اس کی ذات کے اسرار میں الجھا کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔

☆☆☆

صوبائی دارالحکومت کے نواحی علاقے کی اس متوسط طبقے والی آبادی میں دن کا آغاز حسبِ معمول روایتی سرگرمیوں سے ہی ہوا تھا۔ دکانوں پر مخصوص چہل پہل، سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام، بھاری بستے کندھوں پر کسی بوجھ کی طرح لادے ہر عمر اور سائز کے بچے بے دلی سے گھسٹتے قدموں کے ساتھ اسکولوں کی طرف گامزن تھے۔ دکانوں اور ریڑھیوں پر خوانچہ فروش ان بچوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اپنا بچپن پھر سے پالینے کی تمنا میں ٹھنڈی آہیں بھر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتے اور دوسری جانب اسکول کو ایک قید خانہ سمجھنے والے وہ بچے اپنی زندگی کے آنے والے چند سال ایک ہی جست میں پھلانگ کر عہدِ شباب میں قدم رکھنے کے لیے بیتاب دکھائی دیتے تھے۔

مرکزی سڑک سے دائیں جانب مڑنے والی ایک گلی کے انتہائی بائیں کونے میں واقع دو کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل اس گھر میں آج کچھ خلافِ معمول سرگرمیاں نظر آ رہی تھیں۔ معیز بیگ کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا اور اس کے اہلِ خانہ کافی پُرجوش تھے جبکہ ان کے برعکس پچھلے کچھ ماہ کی فراغت کے باعث وہ کسلمندی کا شکار تھا۔ رات

کے کسی پہر ہونے والی بارش کے بعد ہوا میں نمی اور ٹھنڈک کا تناسب بڑھ گیا تھا اور ایسے حالات میں بستر سے نکلنا اس کے لیے قدرے دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

وہ کچھ دیر یونہی تساہل سے کروٹیں بدلتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بالآخر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ سورج کی آگ برساتی کرنوں میں بھی آج ایک انوکھی سی فرحت بخش لذت تھی۔ جیسے وہ اپنی تپش سے بے حال کرنے کے بعد صلح جو یانہ موڈ میں آ چکی ہوں۔

حوائج ضروری سے فارغ ہو کر اس نے برآمدے کے کونے میں بنے چھوٹے سے باورچی خانہ کا رخ کر لیا۔ گرما گرم پراٹھوں اور چائے کی خوشبو نے بھوک خوب چمکا دی تھی۔ کم قیمت کرسیاں اور چھوٹی سی میز ان کے لیے ڈائننگ روم کا درجہ رکھتی تھیں۔ ایک کرسی پر مرزا صادق بیگ سر نہوڑائے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے؟ آج تو پپا خاموش کیوں ہیں؟''

معیز نے ان کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اٹھ گئے تم؟ دیر نہیں لگا دی کچھ آج؟'' وہ بیٹے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آج میں خود تمہیں چھوڑنے جاؤں گا یونیورسٹی۔''

''جی! وہ تو سب بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ تو بتایئے کہ آپ اتنے پژمردہ کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟'' وہ ان کی طبیعت و مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھا اس لیے تشویش سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں! یہ اتار چڑھاو تو زندگی میں آتے جاتے رہتے ہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولے۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ...... لیکن اب کیا ہوا ہے؟ بتائیں مجھے۔''

''دکان ہی کا مسئلہ ہے تھوڑا...... نئے ترقیاتی منصوبے کی وجہ سے سڑکوں کی توسیع کا فیصلہ ہوا ہے اور کئی دکانوں کے مسمار ہونے کے نوٹس جاری ہوئے ہیں۔'' وہ اس بار اپنی پریشانی چھپا نہ سکے۔

مرزا صادق بیگ اگلے وقتوں کے ایک شریف النفس اور وضع دار انسان تھے۔ چار بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے 'سینئر' عہدے پر فائز تھے لہٰذا ساری زندگی اسی کے خراج کی ادائیگی میں گزری تھی۔ وہ پچاس کے پیٹے میں تھے مشقت طلب زندگی نے صحت پر بھی خاطر خواہ اثرات ڈالے تھے۔ والدین سے ترکے میں ملنے والے اس گھر کا ہر ایک کونا کئی عشروں سے اپنی مرمت طلبی کی دوہائیاں دیتے ہلکان ہو رہا تھا لیکن صادق بیگ ان دوہائیوں پر کان دھرنے کے متحمل نہیں تھے۔ گھر میں آخری دفعہ رنگ و روغن ان کی سب سے چھوٹی بہن کی شادی کے موقع پر کروایا گیا تھا جو بے رحم برساتوں اور جھلستی دھوپ میں اپنا حسن ایک مدت ہوئی کھو چکا تھا اور اب در و دیوار اپنی ستر پوشی میں بالکل ناکام نظر آتے تھے۔

مین روڈ پر ان کے والد کا قائم کردہ ایک جنرل اسٹور تھا جہاں روز مرہ کی چھوٹی موٹی اشیا کی دستیابی کے علاوہ پچھلے سال آن لائن رقم کی درآمد و برآمد کا نیا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ مقابلے کے اس سخت ترین دور میں وہ سرپٹ بھاگتے وقت کے ساتھ اپنے قدم ملانے میں ہنوز ناکام ہی رہے تھے اور یہ ناکامی کسی نہ کسی تلخی کی صورت میں ان کی زبان پر مچل جاتی تھی۔

ان کی ساری زندگی چادر اور پاؤں کا درمیانی فاصلہ کم سے کم کرنے میں بیت گئی تھی۔ سوئے اتفاق حرام کمائی کے قائل نہ تھے اس لیے زندگی ایک مخصوص مدار سے باہر نکل ہی نہ سکی۔ صادق بیگ کے آباؤ اجداد بھلے وقتوں کے لوگ تھے جنہوں نے ایک ہی نکتے کو مرکز حیات بنائے رکھا...... اکل حلال۔ ان کے بہن بھائی سب اپنی زندگیوں میں مگن ہو چکے تھے اور اب امیدوں کا تمام تر محور معیز بیگ اور انعم تھے۔ اکلوتے بیٹے کو اپنی اس پریشانی میں شامل نہ کرنے کے ارادے کے باوجود وہ اپنی حالت اس سے مخفی نہ رکھ سکے مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا اور معیز بھی صورتِ حال کی سنگینی سے ذہنی طور پر دباؤ میں آ گیا تھا۔

''یہ نوٹس محلے کے اور لوگوں کو بھی ملا ہے یا صرف آپ کو موصول ہوا ہے؟''

''اس طرف کی سبھی دکانیں اس منصوبے میں ضم ہوں گی...... اور ظاہر ہے میری طرح سبھی پریشان ہیں...... ہم میں سے کوئی بھی جدی پشتی نواب نہیں ہے...... سبھی کی دال روٹی انہی دکانوں سے چلتی ہے۔''

معیز خاموشی سے ناشتے کے چھوٹے چھوٹے لقمے لیتا رہا۔ وہ دراز قد، گندمی رنگت اور خوبرو نقوش کا حامل تھا۔ سادہ مزاجی کی وجہ سے اکثر دوستوں کی باتوں میں پھنس کر اپنا نقصان بھی کر بیٹھتا تھا۔ فطرتاً وہ ایک ہمدرد اور غمگسار انسان تھا جسے کسی کی بھی مدد میں کبھی کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ والدین کے محدود وسائل نے اسے بچپن ہی سے بہت ذمے دار اور حساس بنا دیا تھا۔ اس کی زندگی میں پڑھائی اور گھر کے سوا کوئی اور ترجیح نہیں تھی۔ حلقۂ احباب بھی محدود تھا۔

اسے یوں بے دلی سے ناشتا کرتے دیکھ کر اس کی والدہ نے ماحول کے تناؤ کو دور کرنے کی سعی کرتے ہوئے شوہر سے کہا۔

''اللہ نے جو لکھا ہے وہ ہر صورت مل کر رہے گا۔ پریشان ہونے سے کیا ہوگا بھلا؟''

رقیہ کا یہ سیدھا سادہ فلسفہ صادق بیگ کو مزید تپا گیا اور وہ درشتی سے بولے۔

''ہمارے بیٹے کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے ابھی کم از کم دو سال کا عرصہ درکار ہے اور بیٹی کی پڑھائی و شادی سمیت ایک پہاڑ سر پر کھڑا ہے۔ اس سب کے لیے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہ سکتا۔''

رقیہ نے بدقت تمام شوہر کی یہ سرزنش برداشت کی اور غیر اختیاری طور پر اپنا غبار بیٹے کی طرف منتقل کر دیا۔

''اپنے یہ اختتامی تعلیمی سال بہت سنبھل کر گزارنا۔ غلط صحبت اختیار کرنے سے پہلے اپنی جوان بہن اور والدین کا خیال کرلینا ایک بار۔ ہمارا مستقبل تم ہی سے وابستہ ہے۔''

''پہلے بھی ایسا موقع دیا ہے میں نے کیا؟'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ میری طرف سے فکرمند نہ ہوا کریں...... مجھے اپنی ذمے داریوں کا مکمل احساس ہے۔''

وہ متوسط طبقے کے ان نوجوانوں میں سے تھا جو اپنے والدین کے خوابوں کا تاوان ادا کرتے ہوئے ایک تلی بندھی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اردگرد بسنے والے خاندانوں میں ان کی ذاتی قربانیاں تحسین وحسد کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں اور ان کے ہم عمر لڑکے دل میں ایک خار اور بغض پالے ذہنی طور پر ان سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذات کے قلعے میں محصور کسی قیدی کے مانند ان کی زندگیاں اپنی شناخت بنانے میں ہی گزر جاتی تھیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ چالاکی اور موقع پرستی جیسی ''صفات'' سے بے بہرہ رہتے تھے۔

اور یہی حال معیز بیگ کا بھی تھا...... وہ ذہین تھا لیکن چالاک نہیں تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کا ماحول اس کی سوچ سے بڑھ کر خوشگوار اور رنگین ثابت ہوا تھا۔ شہر کے معروف علاقے میں واقع یہ نجی یونیورسٹی اپنے اعلیٰ تعلیمی نظام، سخت سکیورٹی انتظامات اور نظم و ضبط کی وجہ سے خاصی مقبول تھی۔ یہاں داخلہ لینا کسی بھی عام شہری کے بس میں بالکل بھی نہ تھا لیکن شومئی قسمت معیز کی ذہانت اور اعلیٰ گریڈز اس کے بھرپور کام آئے۔ نوے فیصد سے زائد نمبروں کی بدولت وہ لاکھوں کی رقوم میں فیسیں بھرنے والوں کے ساتھ آبیٹھا تھا۔

کامرس کی اس کلاس میں چوبیس لڑکے اور سولہ لڑکیاں تھیں۔ مختلف خاندانوں اور پس منظر سے تعلق رکھنے والے ان طلبہ میں صرف دو چیزیں مشترک تھیں...... بے تحاشا دولت...... اور اس دولت کو خرچ کرنے کا جنون۔ جدید لباس میں ملبوس لڑکیاں کسی فیشن شو میں آئی ہوئی حسین ترین ماڈلز کو بھی مات دیتی تھیں۔ معیز کے لیے یہ سب حیران کن لیکن بہت سنسنی خیز تجربہ تھا۔ وہ اب تک درمیانے درجے کے سرکاری اداروں میں تعلیم حاصل کرتا آیا تھا اور اس کے لیے یہاں بکھرے مناظر کہیں نہ کہیں خود فراموشی کی کیفیت بھی پیدا کر رہے تھے۔

وہ اس وقت اکیسویں صدی کا ایلس تھا جو اس ونڈر لینڈ میں وارد ہو کر حیران سے کہیں زیادہ پریشان تھا۔

کلاس فیلوز کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس کے لاشعور میں پنہاں احساسِ کمتری شدت سے عود آیا اور اسی خوف کے زیرِ اثر وہ کسی کچھوے کے مانند اپنی سنجیدگی و کم گوئی کے خول میں پناہ گزین ہو گیا۔ اس کے پاس ان سب سے بات کرنے کے لیے اپنے کسی کارنامے کی کوئی تفصیل نہ تھی۔ الکحل، سگریٹ، شہر کے بہترین شیشہ کیفے، صنفِ نازک سے دلی معاملات و تعلقات...... اس کے لیے ان بھانت بھانت کی بولیوں میں خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

کئی ہفتے گزر جانے کے بعد اسے یہاں کے اساتذہ کے سنجیدہ پیشہ ورانہ رویے کے علاوہ جو واحد بات خوش کن محسوس ہوئی تھی، وہ ایک شناسا چہرے سے دوبارہ ملاقات تھی۔ دسمبر کی اس گلابی شام میں اس کے دل میں میٹھی سی لہر جگانے والی وہ بے نیاز سی لڑکی بھی اس کی کلاس فیلو تھی۔

نمرہ عاقب نامی اسے کہیں نہ کہیں اپنے قبیلے کی باسی معلوم ہوئی تھی لیکن اس کا مہنگا لباس، برانڈڈ جوتے اور بیگ دوسرے ہی پل اس خیال کی نفی کر دیتے تھے۔ کلاس کی دوسری لڑکیوں نے تو چند ہی روز میں لڑکوں سے خاصے بے تکلفانہ روابط استوار کر لیے تھے۔ ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے، ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر گفتگو کرتی یہ لڑکیاں معیز کو کسی اور ہی سیارے کی مخلوق لگتی تھیں۔

شہر بھر کی کریم کلاس سے تعلق رکھنے والے ان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ڈگری محض ایک وقت گزاری اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے ان

کے طرزِ زندگی اور مخصوص سوچ سے بخوبی آگاہی ہو چکی تھی۔ ان سے شناسائی جس قدر بڑھتی جا رہی تھی...... وہ اسی قدر خاموش اور اپنی ذات کے قلعے میں محدود ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''اور سناؤ بھئی ٹھیٹے!! کہاں مصروف تھے کل شام؟''

جنید نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''آئے کیوں نہیں کل میوزک کنسرٹ پر؟''

''کہیں نہیں! بس ذرا ذاتی مصروفیت تھی۔'' معیز اپنے اس نئے لقب پر خاصا چڑنے لگا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز ماڈرن پڑھا کو لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ''ٹھیٹا'' ایک خاص اور زبان زدِ عام ٹائٹل تھا۔

اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر چند ایک لڑکوں نے اس کی کم گوئی کے باوجود اسے اپنے ساتھ نتھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ نبیل، جنید اور رضی اسے زبردستی اپنے گروپ میں گھسیٹ لائے تھے۔ نبیل ایک مشہور مقامی صنعت کار کا بیٹا تھا جس کی فیکٹریوں کی پیداوار بیرون ممالک میں بھی خاصی مشہور تھی۔ جنید کا باپ ایک غیر ملکی بینک میں اعلیٰ افسر تھا۔ رضی بھی ایک محنتی اور سنجیدہ شخص تھا جس کا خاندان بیورو کریسی کے عہدوں پر فائز تھا۔

''ہر بار ہی ایسا کرتے ہو۔ کبھی کسی پروگرام میں تو شامل ہو جایا کرو۔'' نبیل نے بھی وہی شکوہ دہرایا۔ ان سب کے خلوص کا قائل ہونے کے باوجود وہ ان میں گھلنے ملنے سے بہت کتراتا تھا۔ اسے غیر نصابی سرگرمیوں سے بہت ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ ان تقریبات پر استعمال ہونے والے ملبوسات اور دیگر لوازمات کے لیے اس کے پاس وسائل ہی نہ تھے۔ اپنی جملہ ضروریات پوری کرنے کے لیے اس نے شام کے اوقات میں ٹیوشنز پڑھانی شروع کر دی تھیں۔ رات کو تھکا ہارا جب گھر پہنچتا تھا تو نیند کے سوا اسے کوئی دوسری طلب نہ ہوتی تھی۔

''اب کس مراقبے میں گم ہو گئے ہو؟'' رضی نے اسے ٹہوکا دیا۔ ''کیا کوئی انقلاب لانے کے لیے تو ذہنی قلابازیوں میں مگن نہیں رہتے ہو؟''

''ارے نہیں یار! انقلاب کی باتیں رہنے دو۔ یہاں کسی کے کان میں بھنک پڑ گئی تو خواہ مخواہ معتوب ٹھہرائے جاؤ گے۔'' اس نے معنی خیز انداز سے کہا۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو! آج شام 'غزل نائٹ' میں تو آ رہے ہو نا؟'' جنید نے پوچھا۔

''ویسے کتنا عجیب تضاد ہے؟ بزنس کے اسٹوڈنٹس اور غزلیات کے شوقین۔'' معیز شرارت سے بولا۔ ''دل، جگر، ہجر، وصل اور کہاں بزنس کے داؤ پیچ اور باریکیاں۔''

''ارے! یہ تو ان اردو ڈیپارٹمنٹ والوں نے ارینج کروایا ہے۔ ہم سب تو محض شغل میلے کے لیے جا رہے ہیں ساتھ۔'' جنید نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

معیز ان سب کی اس مخصوص اصطلاح سے بھی خوب واقف تھا۔ دیگر ڈیپارٹمنٹس کی صنفِ نازک سے روابط بڑھانے کے لیے وہ ایسے کسی بھی موقع سے نہیں چوکتے تھے۔ اس نے مزید جرح سے بچنے کے لیے آنے کی ہامی بھر لی اور اپنے گنے چنے قابلِ قبول ملبوسات کا تصور ذہن میں لا کر 'بہترین' انتخاب پر غور و فکر کرنے لگا۔

☆☆☆

غزل نائٹ کا انعقاد ایک مشہور ہوٹل میں کیا گیا تھا اور معیز وہاں حقیقی معنوں میں بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نامور شعرا اور نوجوان ادیبوں کی آمد نے گزرتے وقت کا بالکل احساس نہ ہونے دیا۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن اسے اپنی پریشانیاں اور ہمہ وقت ذہن کو بوجھل رکھنے والی سوچیں فراموش ہو گئی تھیں۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ کے کئی لڑکے خاموشی سے اپنے پروگرام کے مطابق تھوڑی دیر بعد ہی کھسک لیے تھے۔

معیز یہاں نمرہ کی موجودگی پر کافی حیران ہوا تھا۔ یہ لڑکی اب تک ہر موڑ پر اسے حیران ہی کرتی آئی تھی۔ بھیگتی رات اور جذبات سے لبریز شاعری نے وہاں موجود اکثریت پر ایک سحر طاری کر رکھا تھا۔ ہال میں چھائی نیم تاریکی نے تمام ترذی نفوس کو ایک دھند لکے میں ڈھانپ کر اسرار کی ایک انوکھی ہیئت دے دی تھی۔

اس کی بھٹکتی نگاہیں بار بار نمرہ کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس سے اگلی رو میں بائیں جانب بہت وقار و تمکنت سے براجمان تھی۔ اسٹیج پر جاری پروگرام اگلے آرٹسٹ کے انتظار میں لمحاتی تعطل کا شکار تھا۔ اسی پل وہ اپنے ہاتھ میں موجود فون کی طرف متوجہ نظر آئی۔ اس کی دھیمی آواز بھی معیز کی تمام تر حسیات کی بدولت واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ جھنجلاتے ہوئے کسی سے کہہ رہی تھی۔

''سگنل مسئلہ کر رہے ہیں یہاں...... میں بعد میں کرتی ہوں رابطہ۔'' بیزاری اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

چند پل کے لیے دوسری جانب کی گفتگو سننے کے بعد اس نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

''اوکے! پانچ منٹ بعد میں کرتی ہوں دوبارہ

کال۔''

وہ اپنا بیگ اٹھائے عجلت میں وہاں سے اٹھ گئی۔ معیز کی نظریں اب بھی اس کے تعاقب میں تھیں۔ تبھی اچانک پچھلی رو سے اس کی سماعت میں پڑنے والے چند فقروں نے اسے سرتاپا سنسنا دیا۔

''ٹھیٹی باہر آرہی ہے...... اس سے بہترین موقع نہیں ملے گا دوبارہ...... وہیں گھیر لوا سے۔''

معیز بخوبی جانتا تھا کہ اس کے علاوہ یہ ٹاسک اور کسے دیا جاتا ہے۔ صورتِ حال کی سنگینی نے اسے ایک پل کے لیے بوکھلا دیا۔ اس نے اپنا رخ موڑ کر آواز کے ماخذ کی جانب دیکھنا چاہا لیکن اسی لمحہ ہال کی روشنیاں ایک بار پھر مدھم ہوگئیں اور اسٹیج پر اگلے پروگرامز کا آغاز ہوگیا۔

اس کے اندر بے چینی نے شدت سے سر اٹھایا اور وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر نمرہ کے پیچھے چل دیا۔ باہر وسیع و عریض لابی بالکل خالی تھی۔ خدشات سے دھڑکتے دل کو بمشکل قابو کرتے وہ لابی سے باہر آیا تو دائیں جانب پارکنگ میں اسے ایک نسوانی وجود دو بھاری بھرکم افراد کے نرغے میں گھرا نظر آیا۔

وہ نمرہ ہی تھی...... اور اس وقت اچھی خاصی مشکل میں گرفتار تھی لیکن اس کی آنکھوں میں کسی بھی خوف یا ہراس کا شائبہ نہ تھا۔ وہ مخالفین کے سامنے اب بھی اپنے مخصوص اعتماد سے تن کر کھڑی تھی۔

''مجھے ترنوالہ مت سمجھو جمی! تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ میری راہ میں مت آیا کرو...... ورنہ......'' اس نے پُرتپش لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ورنہ کیا...... یو......'' اس نے ایک بے ہودہ گالی دیتے ہوئے دانت پیسے۔

''ورنہ میں سوسائٹی کے سرکردہ افراد کے سامنے یہ معاملہ اٹھاؤں گی...... تمہاری ساری بدمعاشی ناک کے رستے نکل جائے گی۔''

''جمی نے بہت دیکھی ہیں تیرے جیسی فاختائیں...... میری گرفت میں آیا ہوا شکار بھی میری مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا...... تمہاری یہ ساری اچھل کود پل بھر میں ختم کرسکتا ہوں میں۔'' اس کی آواز میں تنفر و پھنکار عیاں تھی۔

وہ ان کی یونیورسٹی کا ایک متنازعہ فرد تھا جس کے پس منظر سے ایک نہیں کئی ایک کہانیاں وابستہ تھیں۔ اس کا تعلق ایک بااثر سیاسی روابط کے حامل خاندان سے تھا۔ اس کے والد 'فرازالدین' کو برسرِ اقتدار پارٹی کی ناک کا بال سمجھا جاتا تھا جس کے بارے میں شنید یہی تھا کہ مخالفین کے سیاسی جلسے و کارروائیاں اس کی موجودگی میں کبھی بھی 'پرامن' نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس کے ماتحت افراد میں ہر طرح کے بدمعاش بھی شامل تھے جو اپنے 'ٹارگٹ' کو تہس نہس کرنے میں کمال کا ملکہ رکھتے تھے۔

جمال الدین عرف جمی والد کے سیاسی روابط اور بے بہا دولت کے بل پر اس ادارے میں پچھلے کئی سال سے انتہائی طمطراق سے فیل ہونے کے باوجود اپنے ''اصل کام'' کی تکمیل میں بلا مبالغہ ایک 'ٹاپر' تھا۔ طلبہ میں مطلوبہ 'مال' کی سپلائی اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھی۔ لڑکیوں سے دوستی کے نام پر فلرٹ اور جسمانی روابط میں بھی اس کا کوئی مدِمقابل نہیں تھا۔ نمرہ پر اس کی نظر کافی عرصے سے تھی لیکن وہ اس کے لیے مشکل ترین ہدف ثابت ہوتی آئی تھی۔ آج یہ سنہری موقع ملتے ہی جمی کی اندرونی خباثت کھل کر سامنے آگئی تھی۔

نمرہ کی دیدہ دلیری پر وہ مزید آپے سے باہر ہوگیا۔

وہ اسے دائیں ہاتھ سے دبوچے ہوئے کسی بھی طرح گھسیٹ کر اپنی گاڑی...... تک لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کے لڑکھڑاتے قدم اور بہکی ہوئی آواز سے عیاں تھا کہ وہ اس وقت شدید نشے میں ہے اور ایک ذرا سی بیرونی مدد نمرہ کو بہتر دفاعی پوزیشن میں لے آتی۔

معیز کا ذہن انتہائی تیز رفتاری سے اس صورتِ حال کی تبدیلی پر غور کررہا تھا۔ جمی کے ہاتھ میں پسٹل کی موجودگی کے باعث وہ کسی 'احمقانہ ایڈونچر' کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی پل ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری خیال کے تحت اس نے اپنا فون جیب سے نکالا اور بائیں جانب آڑ میں ہوکر پولیس موبائل کا 'آن لائن سائرن' چلادیا۔

جمی نشے میں ہونے کی وجہ سے یکدم بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا۔ اس کی گرفت جیسے ہی کمزور ہوئی، نمرہ نے اسے اپنی نکیلی جوتی سے زیرِ ناف نشانہ بنا کر اپنا بیگ اس کے دوسرے ساتھی کے چہرے پر کھینچ مارا۔ اگلے ہی پل وہ واپس لابی کی طرف سرپٹ دوڑ لگا چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اساتذہ اور انتظامیہ کے دیگر عہدیداران کی موجودگی میں وہ دوبارہ اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا اور باہر جانے کی صورت میں وہ باآسانی دوبارہ اس کا نشانہ بن سکتی تھی۔

معیز اس کی جرأت کو دل میں سراہتے ہوئے ایک گہری سانس لیتا مطمئن انداز میں واپس اندر چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز ہفتہ وار تعطیل تھی۔ موسم نے اچھی خاصی خنکی اختیار کر لی تھی۔ رات گئے غزل نائٹ سے واپسی کے بعد وہ ابھی تک بستر میں ہی موجود تھا۔ پردۂ تصور پر اب بھی وہی مناظر رقص کر رہے تھے۔ تبھی دروازے پر ہونے والی آہٹ نے اسے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔ اس نے کسلمندی سے اس جانب دیکھا۔ رقیہ اس کے چند دھلے ہوئے کپڑے الماری میں رکھنے اندر آئی تھیں۔ چہرے پر جھریوں کا جال اور پیشانی پر تفکرات کی گہری لکیریں اسے ہمیشہ اپنی ذمے داریوں سے جلد از جلد عہدہ برآ ہونے کی ترغیب دیتی تھیں۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا تیری؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''جی! میں تو بالکل ٹھیک ہوں...... مگر یہ گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے آج؟''

''کچھ نہیں......'' وہ افسردگی سے بولیں۔ ''ہونا کیا ہے؟ تیرے ابو بس اسی بھاگ دوڑ میں لگے ہیں کہ کسی طرح دکان والا معاملہ ٹل جائے۔''

''کہاں ہیں وہ اب؟''

''پڑوس میں غفور صاحب کے ساتھ محلے کی فلاحی کمیٹی کے پاس گئے ہیں کہ کسی طرح کوئی حل نکل آئے اور دکانیں مسمار نہ کی جائیں۔''

''فلاحی کمیٹی کی بھی آپ نے خوب کہی...... چند عمر رسیدہ افراد کو زندگی کی اس آخری اننگز میں اِن رکھنے کے لیے کمیٹی بنا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ ان کی اپنی عمر اللہ کرنے کی ہے لیکن وہ یہاں بیٹھے اپنا بڑھاپا مزید خوار کر رہے ہیں۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔

''تو اور کیا کریں پھر؟ کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی ہے ناں۔'' بے بسی اُن کے ہر انداز سے مترشح تھی۔

وہ ترحم سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو کبھی دل سے مسکراتا دیکھا ہو۔ زندگی کے مسائل میں الجھے شوہر کی ہمنوائی میں ان کی سونے جیسی جوانی اور رنگ روپ گہنا کر تانبے کے مانند ہو گیا تھا۔ شوہر کے بہن بھائیوں کو زندگی کے میدان میں پختہ کار بناتے اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی جمع کرنے کا موقع ملا نہ فرصت۔

وہ سبھی اُڑان کے قابل ہوتے ہی ایک ایک کر کے یہ آشیانہ چھوڑ کر چلتے بنے۔ بھائی کی قربانیاں ان کا حق تھیں جسے انہوں نے مکمل استحقاق سے وصول کیا تھا۔ آخر بھائی نے بھی تو ترکے میں ملی دکان اب تک سنبھال رکھی تھی۔ انہوں نے اپنا 'شرعی حصہ' ترک کر کے اپنے تمام فرائض ادا کر دیے تھے اور اب اپنی اپنی زندگیوں میں نہایت کامیاب تھے۔

''وہ...... میں...... کچھ سوچ رہی تھی۔'' ماں کی ہچکچاتی آواز نے اسے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

''کیا ہوا؟ کچھ کہنا چاہتی ہیں کیا؟'' وہ ان کا تذبذب بھانپ گیا تھا۔

''ہاں...... لیکن بس تو اپنے ابو کو مت بتانا ابھی یہ بات۔'' وہ اس سے مشروط حلف لے رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے! نہیں بتاتا...... لیکن بتائیں تو سہی مسئلہ کیا ہے؟'' اس نے مشقت سے سخت ہو چکے اُن کے ہاتھ نرمی سے سہلائے۔

''تو ایک بار اپنے چھوٹے چچا کے پاس چلا جا چپکے سے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولیں۔

''اس سے کیا ہوگا امی جی؟'' وہ اپنی ناگواری دبا کر بولا۔

''ہوسکتا ہے بہت کچھ...... اگر تو ذرا سی ہمت کرے تو۔'' وہ بیٹے کی نیم رضا مندی بھانپ کر ذرا جوش میں آ گئیں۔ ''تیرے ابو نے تو بالکل ہی ان سب سے منہ موڑ لیا ہے...... اس کے وکالت کے پرچے ہونے سے پہلے داخلے کے پیسے نہیں تھے تو میں نے اپنے جہیز کی بالیاں بیچ دی تھیں۔ وہ اتنا بھی بے دید نہیں ہوسکتا کہ بھائی کو اس مشکل وقت میں سہارا نہ دے۔'' انہوں نے کئی دفعہ کی کہی ہوئی بات ایک بار پھر دہرائی۔

''آپ کیوں ان کا احسان لینا چاہتی ہیں۔ وہ ہم سے ملنا ہی نہیں چاہتے تو چھوڑ دیں ان کو ان کے حال پر۔'' وہ کڑواہٹ سے بولا۔

''یہ تو جی کو جی ہوتا ہے بیٹا! اگر کسی سے ملتے رہیں گے تو ہی رشتے مضبوط رہیں گے ناں!''

اسے ماں کی سادگی پر افسردگی ہونے لگی۔

''ایک بار بات تو کر و اس سے جا کر...... وکیل ہے وہ...... ٹی وی پر دیکھتا نہیں تو کہ یہ کالے کوٹ والے کس طرح سب کو اپنے دباؤ میں لے آتے ہیں۔''

اُن کے خوابوں کی اس اُڑان پر معیز خوفزدہ ہو چلا تھا۔ وہ فطری طور پر کافی عدم اعتمادی کا شکار تھا۔ احساسِ محرومی کسی ناگ کی طرح پھن پھیلائے اسے ایک اَن دیکھے

دباؤ کا شکار رکھتی تھی۔
''پھر جائے گا ناں۔'' ماں کی امید بھری نظریں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئی تھیں،
''اچھا ٹھیک ہے...... کرلوں گا بات جا کے۔'' وہ ٹالتے ہوئے بولا۔
اس کی رضامندی پا کر ان کی آنکھوں میں امید کی چمک نے کئی چراغ روشن کردیے۔ وہ اس متوقع ملاقات کی جزئیات پر غور و فکر کرتا ایک بار پھر اپنے ذہنی جمناسٹک میں مشغول ہوگیا تھا لیکن فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کی رو منقطع کردی۔
اسکرین پر ایک انجان نمبر دیکھ کر اس نے قدرے بیزاری سے کال ریسیو کرلی اور دوسری جانب نمرہ کی آواز سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کبھی اس سے بات کرے گی۔
''کیا ہوا؟ کس مراقبے میں چلے گئے ہو؟'' اس کی کھنکتی آواز نے معیز کے حواس مزید مختل کردیے۔
''کچھ نہیں...... بس یہی سوچ رہا تھا...... آپ کو میرا نمبر کیسے مل گیا؟'' اس سے کوئی اور جواب بن نہ پڑا۔
اس کی بودی دلیل پر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ''حد ہے بھئی! تم تو یوں بی ہیو کررہے ہو جیسے کوئی لڑکی ہو...... اور کسی لڑکے نے کال کردی ہو...... اب تو لڑکیاں بھی ایسا ردِعمل نہیں دیتیں۔'' شوخی اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔
''نہیں!! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے...... بس ذرا حیران ہوگیا تھا میں۔'' وہ جھینپ گیا۔
''آہاں...... حیران۔'' اس نے لمحاتی توقف کے بعد کہا۔ ''حیران تو تم نے مجھے کردیا تھا۔''
''میں نے؟ وہ بھلا کب۔''
''واقعی اتنے انجان ہو یا بن رہے ہو؟'' وہ اب سنجیدہ ہوگئی تھی۔ ''میں کل رات کی بات کررہی ہوں...... کافی حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تم نے۔''
''تت...... تو...... آپ نے دیکھ لیا تھا مجھے؟''
''یس! آف کورس...... نشے میں جمی تھا...... میں تو مکمل ہوش و حواس میں تھی ناں۔''
''مجھے افسوس ہے...... میں کوئی خاطر خواہ قدم نہیں اٹھا سکا۔ اصل میں وہ پسٹل......''
اس کی ضرورت بھی نہیں تھی ویسے...... اس سچویشن میں بنا سوچے سمجھے کود پڑنا بے وقوفی ہی ہوتی۔'' وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔
''مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا بہرحال...... اچھی خاصی بیدار مغز ہونے کے باوجود میں کل اس مصیبت میں پھنس گئی۔'' وہ تاسف زدہ تھی۔
''شکریہ کی ضرورت نہیں ہے جی! مگر جمی سے الجھنا آپ کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔'' وہ دبے دبے لہجے میں بولا تو وہ ایک بار پھر بے اختیار ہنس پڑی۔
''جمی جیسے تھرڈ کلاس غنڈوں کو نکیل ڈالنی آتی ہے مجھے...... کل تو بے خبری میں ماری گئی تھی...... تمہاری اس فکر و احساس کی مقروض رہوں گی میں'' اس کی مسکراتی آواز معیز کو کیف کی ایک نئی لذت سے آشنا کررہی تھی۔
''پھر بھی خیال رکھیے گا۔ بعض اوقات پل بھر کی بے خبری ہی عمروں پر محیط بڑے نقصانات سے دوچار کردیا کرتی ہے۔''
''کیوں نہیں جناب! میں اس نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' اس کا شرارتی انداز معیز کو قدرے نروس کررہا تھا۔ یونیورسٹی میں سنجیدہ اور آدم بیزار نظر آنے والی نمرہ کا یہ روپ اس کے لیے بہت حیران کن تھا۔
اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد اس نے فون بند کردیا اور معیز ایک سرشاری میں مبتلا اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہوگیا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ یہ لمحاتی بے خبری اس کی زندگی کی نئی راہیں متعین کرنے والی تھی۔

☆☆☆

موسمِ سرما کی چند تعطیلات کے بعد تمام تعلیمی ادارے دوبارہ کھلتے ہی حسبِ معمول سرگرمیوں کا آغاز ہوگیا۔ پہلے روز جب وہ یونیورسٹی پہنچا تو نمرہ نے اسے دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے ہاتھ ہلایا اور باوقار انداز میں اس کے پاس آکر بولی۔
''آگئے تم۔ میں تو کافی دیر سے منتظر تھی تمہاری۔''
''وہ کیوں بھلا؟'' معیز کا احساسِ کمتری پھر سے عود آیا تھا۔
''وہاٹ ڈو یو مین؟ وہ کیوں بھلا! میری انسلٹ کررہے ہو تم اب۔'' وہ تنک کر بولی۔
''نن...... نہیں، میرا وہ مطلب نہیں تھا...... میں نے تو بس یونہی روا روی میں کہہ دیا تھا۔'' وہ سٹپٹا گیا۔
اپنی کم ہمتی اور بزدلی کے باوجود اسے نمرہ کی یہ توجہ اور اپنائیت بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بھی غالباً اس کی عدم اعتمادی بھانپ چکی تھی اس لیے اپنی ٹون بدل دی اور اسے

لیے کینٹین ٹیریا کے ایک خالی گوشے میں آگئی۔

”تم نے میرے لیے جو بھی کیا...... اور اس پہ مستزاد اس سادگی نے تمہاری عزت بہت بڑھا دی ہے میرے دل میں...... لیکن ایک حقیقت تمہیں بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے۔“

معیز سوالیہ نظروں سے اسے صرف دیکھ کر رہ گیا۔

”فرض کرو! اگر جمی جیسا شاطر انسان نشے میں ہونے کے باعث اس اتفاقی حادثہ کے دباؤ میں نہ آیا ہوتا تو میرے ساتھ تمہیں بھی اچھا خاصا نقصان پہنچا تا وہ۔“ وہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہیں آپ۔“

”تو کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایسی کسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس ذاتی دفاع کا کوئی حق محفوظ ہونا چاہیے؟“

”مگر یہ سب ہو گا کیسے؟“ وہ اپنی بوکھلاہٹ اور احساسِ کمتری اس کے سامنے عیاں ہوتے دیکھ کر بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ دوسری جانب وہ اس کی اندرونی کیفیت بھانپ چکی تھی اس لیے انتہائی ملائمت اور اپنائیت سے گویا ہوئی۔

”ہم اس وقت جس ماحول میں سانس لے رہے ہیں...... یہاں بقا ایک کٹھن اور جاں گسل امر بن چکا ہے...... بے ریائی اور اپنی ذات میں مگن رہنا ایک صریح خودکشی ہے۔“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی اور پھر دھیرے سے بولی۔

”تم ایک اچھے انسان ہو معیز! مگر یہاں اس ماحول میں ایسی سادگی تمہیں بیک فٹ پر لے جائے گی...... اگر کل کلاں کو جمی یا اس جیسے کسی انسان سے تمہارا واسطہ پڑ جائے تو ہر بار ویسا ہی بلف تو کام نہیں آئے گا ناں؟“

”ہوں! میں جانتا ہوں اس حقیقت کو۔“

”تو پھر تم سیلف ڈیفنس کی ٹریننگ کیوں نہیں لیتے؟“ کچھ دیر خاموشی ان دونوں کے مابین حائل رہی جسے معیز نے نظریں چراتے ہوئے دھیمی آواز سے توڑا۔

”میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس سب پر ہونے والا خرچ اور وقت میری استطاعت سے باہر ہیں۔“

”تمہیں کس نے کہا کہ اس پر خرچ کرنا پڑے گا؟“

”تو کیا یہ سب کسی ہوائی ذرائع سے یا جادو کی چھڑی گھمانے سے خود بخود ہوتا جائے گا؟“ وہ اب اس کی پریشانی سے محظوظ ہونے لگی تھی۔

”یونی کی انتظامیہ نے حالیہ دہشت گرد واقعات میں اضافے کے بعد طلبہ کو ذاتی سطح پر اسلحہ اور فائٹنگ کی بنیادی تکنیکس کے استعمال کی ٹریننگ کا فیصلہ کیا ہے...... اور اگر تم چاہو تو اس میں حصہ لے سکتے ہو۔“

”تمہیں کیسے پتا یہ سب؟“ وہ شدتِ حیرانی سے تمام تکلفات بھول گیا۔

”یونی کی مختلف سوسائٹیز کی ممبر ہوں میں...... اس لیے ہر خبر پر نظر...... سب سے پہلے...... سب سے تیز۔“ اس نے تفاخر سے بتایا۔ ”ویسے میں خود بھی یہ سنہری موقع ضائع نہیں کرنا چاہتی اس لیے اس پروگرام میں بھرپور شرکت کا ارادہ ہے میرا۔“

”تو ٹھیک ہے پھر! میں بھی تیار ہوں۔“ وہ پُرجوش ہو گیا۔

”دیٹس گریٹ۔ یہ ہوئی ناں بات۔“ اس کی آنکھوں میں کوندنے والی چمک معیز کے رگ و پے میں ایک انوکھی لذت آمیز سنسنی دوڑا گئی۔

☆☆☆

”معیز بیٹا، میں نے ایک کام کہا تھا تجھ سے۔“ وہ شام ڈھلے ٹیوشن پڑھا کے گھر لوٹا تو ماں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”مجھے یاد ہے امی! لیکن میرے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے؟“ وہ تھکاوٹ سے چور تھا۔

”وقت گزرتا جا رہا ہے...... پریشانی بڑھ رہی ہے۔ تیرے ابو بھی روز بروز خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔“ وہ بلا توقف بولتی چلی گئیں۔

”اچھا ٹھیک ہے، کرتا ہوں کچھ۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

اگلے دن وہ اپنی کلاسز آف ہونے کے بعد پژمردہ طبیعت سے چچا کے گھر کی طرف چل دیا۔ ان کا ڈیفنس میں دو کنال کا گھر تھا جو صادق بیگ اور اس کی اولاد کے لیے محل ہی تھا۔ حق حلال سے پرورش پانے والے اس کے چچا نے اپنی وکالت سے خوب فائدے اٹھائے تھے۔

ابتداً فوجداری وکالت کے خارزار میں وہ ہائیکورٹ کے ایک جغادری وکیل کا جونیئر تھا۔ اس کی زندگی میں وہ ڈھٹائی سے اس کی خاموش اور غیر مشروط چاکری کرتا رہا اور بعد از موت اس کی بیوہ کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس کے حسن و شباب کا جزیرہ بھی اب اپنی آب و تاب کھونے لگا تھا لیکن جذبات کے بحر میں پیدا ہونے والے تلاطم کے

لیے اس نے پہلے ہی شوہر کے اس بے دام غلام کو اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا جو نہایت تابعداری سے اس کے وقت بے وقت بلاوے پر خندہ پیشانی سے آن موجود ہوتا تھا۔ اب بیوگی کے بعد اس نے کسی نئے شکار کے بجائے واجد بیگ ہی کو مستقل نوکری پر رکھ لیا۔ اس نئے شوہر کو صرف ذہانت ہی سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا۔ اور اس ذہانت کے ساتھ اس نے سابقہ شوہر کی بے دریغ دولت کا بھی شاطرانہ انداز میں استعمال کیا۔

واجد بیگ بدنام زمانہ مجرموں کو بھی مکھن سے بال کی طرح نکال لاتا تھا۔ اس کی خود غرضی اور سفاکی وکالت کی دنیا میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی اور اکثر اسے 'قصاب' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اپنے اس لقب سے وہ خود بھی واقف تھا اور اسے اپنے لیے کسی گولڈ میڈل سے کم نہیں سمجھتا تھا۔

چچا کی ان گوناگوں خوبیوں سے معیز بخوبی آگاہ تھا اور اپنی کھٹارا 'تھرڈ ہینڈ بائیک' پر اس محل نما کوٹھی کے سامنے کھڑا وہ اپنے ذہن میں تمام متوقع فقرے ترتیب دیتا رہا جو واجد بیگ کا دل پسیج دیتے۔ ستون کے ساتھ لگی ہوئی بیل بجا کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ گیٹ پر لگے کیمرے کے باعث اسے یقین تھا کہ اس کا 'عام سا حلیہ' گارڈز میں رعونت پیدا کر دے گا۔

کچھ لمحوں بعد داہنی طرف موجود کیبن سے کلف لگی وردی اور مونچھوں والا ایک خونخوار گارڈ برآمد ہوا اور اکھڑ لہجے میں گویا ہوا۔

''بولو بھئی، کس سے ملنا ہے؟ کہیں کچھ بیچتے ہوئے رستہ تو نہیں بھول آئے اِدھر؟''

''مجھے واجد بیگ سے ملنا ہے..... نجی کام کے سلسلے میں۔'' معیز نے بمشکل اس کے تیور نظر انداز کیے۔

''نجی کام.....'' وہ سر تا پا اسے دیکھ کر استہزائیہ ہنسا۔ ''ان کے دفتر میں مل لینا جا کر..... ویسے ان کی مشورہ فیس دینے کے لائق بھی ہو کہ نہیں؟''

''مجھے دفتری کام نہیں ہے ان سے بھائی! کہہ تو رہا ہوں نجی کام ہے..... ان سے اتنا کہہ دو کہ معیز بیگ آیا ہے..... ان کے بڑے بھائی صادق بیگ کی اکلوتی اولادِ نرینہ۔'' احساسِ ذلت سے اس کا دل بھر آ رہا تھا۔

چند لمحوں کے لیے وہ وہیں کھڑا متذبذب نظروں سے اسے گھورتا رہا پھر کیبن میں جا کر انٹر کام کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد خودکار گیٹ کھلا اور ایک فربہ گارڈ اسے اپنی معیت میں لیے ڈرائنگ روم میں چھوڑ گیا۔ بیش قیمت نوادر سے سجے، رنگوں اور روشنیوں میں نہائے اس ہال میں معیز کو اپنا وجود کسی کباڑ کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔ زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی اور اعصاب پر مزید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

ایک ملازم کسی روبوٹ کے مانند اسے مشروبات اور ہلکے اسنیکس سرو کر گئی لیکن وہ نروس انداز میں وہاں لگی نمائشی تصویریں دیکھتا چلا گیا جن میں اس کی ماں کی ہم عمر ایک عورت نیم عریاں لباس میں کسی نہ کسی مشہور شخصیت کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ دولت و تعیش سے لت پت واجد بیگ کی عمر رفتہ بھی بزبانِ تصاویر اس کے سامنے موجود تھی۔

دس منٹ بعد وہ اپنے بیش قیمت پارٹی ڈریس میں ملبوس ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور بڑے تپاک سے اسے گلے لگا کر بولا۔

''زہے نصیب! آج اس غریب خانہ کو کیسے رونق بخش دی میرے بھتیجے نے؟''

اور معیز جوائن کے تمام تر رویوں اور ردِعمل کے لیے اپنے تئیں تیار ہو کر آیا تھا۔ اس شیریں لہجے پر بوکھلا گیا۔ اس کی گھبراہٹ کسی طور بھی کم نہیں ہو رہی تھی۔ واجد کی گھاگ نظروں نے اس کی یہ کیفیت بھانپ لی تھی اس لیے مزید حلاوت سے بولا۔

''گھر میں سب کیسے ہیں بیٹا؟ بھائی، بھابی اور میری گڑیا انعم؟''

''ٹھیک ہیں..... ٹھیک ہیں سب.....'' اس سے بات کرنا بھی دشوار ہونے لگا تھا۔

''تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' وہ اب اس کی حالت سے محظوظ ہونے لگا۔

''بہترین۔''

''خیریت سے آنا ہوا؟''

''جی، وہ ایک مسئلہ درپیش تھا تو امی نے آپ.....''

''ہونہہ، جانتا ہوں۔ اسی بھلی عورت نے بھیجا ہو گا ورنہ ہمارے بھائی کی ہٹ دھرمی سے کون واقف نہیں۔'' اس نے قطع کلامی کی۔ ''خیر بتاؤ! کیا مسئلہ ہے؟''

معیز نے اٹکتے اور جھجکتے ہوئے ساری صورتِ حال اسے بیان کر دی۔

''تو اس سارے قضیے میں میری کیا ضرورت پڑی تم لوگوں کو؟'' اس کے ماتھے پر پڑے بل گہرے ہونے لگے۔

''آپ ان دکانوں کو مسماری سے رکوانے کے لیے اگر کوئی قانونی راہ یا مشورہ دیں تو......''

''میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اپنے باپ کو سمجھاؤ کہ اس بڑھاپے میں اپنے ساتھ اولاد کو بھی خوار نہ کرے۔''

کیا کہنا چاہتے ہیں آپ چچا؟'' اسے بھی اب غصہ آنے لگا تھا۔

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں برخوردار کہ اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ کسی بھی حیلے حربے سے اس منصوبے کی تکمیل رکوا سکتے ہو تو یہ خام خیالی ترک کردو۔''

''تو کیا کریں پھر ہم؟'' وہ تڑخ گیا۔

''کرنا کچھ بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے ایک سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ''سرکاری اہلکار دکانوں کے بدلے جو رقم دے رہے ہیں اسی پر اکتفا کرلو...... ورنہ اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''ہمارے باپ دادا کی نشانی کی قیمت کیسے وصول لیں بھلا؟''

''تو ٹھیک ہے! نہ وصولو! وہ رقم تمہارے باپ کے جعلی دستخط کے ساتھ کسی نہ کسی اہلکار کے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گی اور پھر صادق بیگ اپنے اعلیٰ خیالات کی روٹی اپنی ہمالیہ سے بلند انا کی چٹنی کے ساتھ کھلائے گا تم لوگوں کو۔'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔ ''آج جس منصوبے کو رکوانے کے درپے ہو تم سب! مستقبل قریب میں تمہی لوگوں نے اس کے ثمرات سے سب سے زیادہ مستفید ہونا ہے...... اور رہی بات باپ دادا کی نشانیوں کی...... مرنے والوں کی نشانیوں کا طوق گلے میں ڈال کر زندہ افراد کو درگور کرنے کا مشورہ کوئی غیر بھی نہ دے گا تمہیں۔''

معیز میں مزید برداشت کا یارا نہ رہا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بڑی مہربانی چچا! اپنا قیمتی وقت عطا کرنے کی۔''

''مہربانی کیسی بھتیجے، تم لوگوں کا حق ہے مجھ پہ۔'' اس کی سابقہ ٹون بحال ہو چکی تھی۔

وہ بوجھل اعصاب کے ساتھ وہاں سے لوٹ آیا۔ گھر پہنچ کر ماں کے چہرے پر امید و بیم کی کیفیت نے احساسِ شکستگی مزید بڑھا دیا۔

''کیا بنا؟ کچھ کہا تیرے چاچے نے؟''

''اس نے کیا کہنا ہے؟ جو سچ تھا وہی بولا اس نے بس۔''

''تو کیا وہ بھی ہماری مدد نہیں کر سکتا کوئی؟'' امید کا دامن چھوٹتے ہی ان کا چہرہ تاریک ہونے لگا۔ ''مجھے تو بڑی آس تھی کہ وہ کوئی بہتر حل بتائے گا ہمیں...... میں نے اس کے پرچوں کے لیے اپنے جہیز کی بالیاں بیچ دی تھیں...... وہ اتنا سا صلہ بھی نہ دے سکا۔''

''بس کرا دیں امی! کاش کہ آپ نے بالیاں نہ ہی بیچی ہوتیں...... بالیوں کے ساتھ اس کا احساس اور انسانیت بھی بک گئی...... وہ تو سلامت رہ جاتے'' وہ تلخی سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

اگر کوئی معیز بیگ سے پوچھتا کہ زندگی میں فرحت آگیں لمحے کب در آتے ہیں تو وہ بلا جھجک مارچ کی چمکیلی صبحوں اور روشن دوپہروں کا نام لیتا۔

یونیورسٹی میں ٹریننگ کلاسز کا آغاز ہونے سے بھی ڈیپارٹمنٹس میں جوش و ولولے کی ایک لہر دوڑ اٹھی۔ معیز اور ثمرہ بھی سوئے اتفاق ایک ہی گروپ کا حصہ تھے۔ دونوں کے مابین تکلف کی دیواریں تیزی سے گر رہی تھیں اور ایک ہم آہنگی پروان چڑھنے لگی تھی۔ لیکن اس بے تکلفی میں بھی اسے ثمرہ کے گرد ایک خول طاری محسوس ہوتا تھا۔

ٹریننگ کلاسز میں گزرنے والے وقت کی بدولت اس کے مزاج کا گلیشیر دھیرے دھیرے پگھلنے لگا تھا۔ وہ اکثر فارغ اوقات میں ایک ساتھ نظر آنے لگے۔ ان کی باہمی گفتگو زیادہ تر ٹریننگ کلاسز میں سکھائی جانے والی تکنیکس کے گرد گھومتی تھی۔

جی تھری رائفل کے پارٹس کو کھولنے اور جوڑنے کی عملی تربیت نے انہیں ایک انوکھی سنسنی سے دوچار کر دیا تھا۔ ان سب کی پھرتی و چابک دستی دیکھ کر ٹرینر صفدر محمود بھی متاثر ہونے لگا تھا۔ وہ مضبوط جسامت، اکہرے بدن، گہرے سانولے رنگ اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ قدرے چوڑا دہانہ اور پتلے پتلے ہونٹ اس کی سفاک طبیعت کا پتا دیتے تھے۔ مقابل کی آنکھوں میں جھانک کر دبنگ اور مضبوط لہجے میں گفتگو کرتا یہ ٹرینر..... اسلحہ کی تربیت سے زیادہ ذہنی مضبوطی اور خود اعتمادی کو فوقیت دیتا تھا۔ اکثر و بیشتر اپنے طلبہ کے سامنے ایک بات دہراتا۔

''ہتھیار بیک وقت آپ کا بہترین دوست اور دشمن ہے...... اس کا ساتھ کبھی بھی آپ کو کمزور محسوس نہیں ہونے دے گا۔ لیکن یہ بہت بے وفا ہوتا ہے...... صرف ایک ہتھیار ایسا ہے جس کا ساتھ اور استعمال آپ کو کبھی بھی کہیں بھی دغا

نہیں دے گا...... اس کا ساتھ ہی آپ کے مقابل پر کامیابی کی دلیل ہے۔‘‘ وہ ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑ دیتا۔

’’کس ہتھیار کی بات کر رہے ہیں؟‘‘

’’کہاں دستیاب ہے یہ؟‘‘ ہال میں ملی جلی آوازوں نے ایک ہلچل بپا کردی۔ صفدر محمود نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور قدرے توقف سے بولا۔

’’حاضر دماغی...... خود اعتمادی......اور قوتِ ارادی...... کسی بھی اسلحے سے زیادہ طاقتور اور موثر ہیں۔ دشمن سامنے ہوں اور آپ ان سے لیس نہ ہوں تو کوئی دوسرا ہتھیار کامیابی کی ضمانت نہیں...... کسی صورت بھی نہیں۔‘‘

اس کی گرج دار آواز معیز کے ذہن میں بے ہزاروں سوالوں کے جواب خود بخود دے رہی تھی۔ اس نے اپنے وجود میں ایک نئے جوش کے سوتے پھوٹتے محسوس کیے۔ اندرونی غبار کے اخراج کو نیا رستہ ملنے لگا۔ جی ون، ٹو، تھری رائفلز اور نائن ایم ایم پسٹلز کا ٹھنڈا لمس، اس کے روم روم میں بسی حدت پر بہت سکون بخش پھوار برساتا تھا۔ لیکن اب بھی دل میں کہیں نہ کہیں ایک خلش و بے چینی بسی تھی جو اپنی تسخیر کے لیے اسے بے حال رکھتی تھی۔

☆☆☆

پہلے سمسٹر کے اختتام کے بعد معیز کی پڑھائی میں سنجیدگی جنون کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے گھریلو حالات کی تبدیلی میں اب عملی کردار ادا کرنے کا متمنی تھا۔ پارٹ ٹائمز ٹیوشنز میں بھی اس نے دانستہ اضافہ کردیا اور نتیجتاً اداسی، اضطراب اور تھکن اس پر غالب رہنے لگی۔

وہ ایک سنگی بینچ پر بیٹھا خالی نظروں سے اپنے سامنے درختوں پر نظر آتے پرندوں کے آشیانوں میں رزق و توکل کے نئے مفہوم تلاش کر رہا تھا جب نمرہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

’’کیا بات ہے چیمپ! اتنے افسردہ کیوں رہنے لگے ہو آج کل؟‘‘

’’ایسا تو کچھ بھی نہیں۔ بس شاید بدلتے موسم کا اثر ہے طبیعت پہ۔‘‘ اس کے سرسری انداز پر وہ بالکل قائل نہ ہوئی۔

’’جب تک داخلی موسم میں خوشگواریت قائم رہے، خارجی موسم بالکل بے اثر ہوتے ہیں۔ اداسی کا تعلق بھی داخلی عوامل سے منسلک ہوتا ہے۔ مائنڈ اِٹ۔‘‘ اس نے خلوص سے کہا۔

’’کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں...... ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھوئے رہتے ہو۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے شیئر کرسکتے ہو۔‘‘

معیز بھی اب یہ بار اٹھائے تھک چکا تھا، اس نے اپنی تمام تر الجھنیں اور پریشانیاں اس کے سامنے کھول کر رکھ دیں۔ وہ کچھ پل خاموشی کے بعد اسے دلاسا دیتے بولی۔

’’اپنا حق مت چھوڑو...... انکل کو بھی سمجھاؤ۔ ورنہ مسائل میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔‘‘

’’وہ سمجھیں تب ناں!‘‘

’’سمجھ جائیں گے۔ تم مضبوط رکھو خود کو بس۔‘‘

’’کاش! میں تمہاری طرح بن پاتا نمرہ!‘‘

’’بیکار بات ہے۔ تمہاری اپنی ایک الگ انفرادیت ہے جو بہرحال بہت مضبوط ہے۔‘‘ اس نے سر جھٹکا۔

’’تم نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ تم یہاں کئی سوسائٹیز کی ممبر ہو۔‘‘ وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ نمرہ نے محض تائید میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

’’میں بھی کوئی سوسائٹی جوائن کرنے کے لیے کافی دنوں سے سوچ رہا تھا۔‘‘

’’ذمے داریاں بہت بڑھ جائیں گی معیز! کیسے کرو گے اتنا سب کچھ مینیج۔‘‘ وہ اسے ٹال رہی تھی۔

’’جس طرح اب تک کرتا آیا ہوں۔ تم بس مجھے طریقہ کار وغیرہ سے آگاہ کردو۔‘‘ وہ اپنے ارادے سے پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔

’’آل رائٹ۔ میں تمہیں فارمز وغیرہ لا دوں گی۔‘‘ وہ کچھ الجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

’’میں منتظر رہوں گا۔‘‘

اگلے چند دن معیز کے لیے کافی پُرجوش تھے۔ نمرہ کے مہیا کردہ کوائف اور انٹری فارمز کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نے ’میڈیا سوسائٹی‘ کی رکنیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک عمومی نفسیات کے تحت اسے اس سوسائٹی کے نام اور متعلقہ لائحہ عمل میں ایک بے عنوان کشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس نئے تجربے کے لیے جوش اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیات کا شکار تھا۔

تین دن بعد اسے سوسائٹی کے اعلیٰ عہدیداران کی جانب سے گروپ انٹرویو کے لیے طلب کرلیا گیا۔ ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں لمبائی میں بنے زینوں پر بہت سے طلبا امیدوار بیٹھے نظر آرہے تھے۔ دائیں جانب چند کرسیاں موجود تھیں جن پر براجمان سنجیدہ صورت افراد

باری باری ان طلبہ کو بائیں جانب رکھے ڈائس پر بلا کر اپنے تیکھے سوالات کی زد میں لے رہے تھے۔

معیز اپنی باری پر میانہ چال چلتا ہوا ڈائس پر پہنچ کر خاموشی سے کھڑا ہوگیا۔ لمحاتی توقف کے دوران میں ایک تندرو جج نے اس کے فارم پر سرسری نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ویل جنٹلمین! آپ اپنا تعارف کروائیں گے ہمیں؟''

''میرا نام تو خیر آپ سب فارم پر پڑھ ہی چکے ہوں گے...... میرا مختصر تعارف بس اتنا ہے کہ میں اندرونِ شہر کا رہائشی ہوں اور یہاں اسکالرشپ کی بنیاد پر آیا ہوں۔'' اس نے بے نیازی دکھاتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب! آپ کی ذہانت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں پھر۔'' اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

''بالکل! میری ذہانت شک و شبہات سے بالاتر ہے۔'' وہ بہت اعتماد سے اپنے اسٹروکس کھیل رہا تھا۔

''آپ ایک مکمل سمسٹر گزار چکے ہیں یہاں...... لیکن اب ہی کیوں اس سوسائٹی میں شمولیت کا خیال آیا آپ کو؟ پہلے یہ قدم کیوں نہیں اٹھایا آپ نے؟'' ایک دوسرے جج نے ماتھے پر بل ڈالے استفسار کیا۔

''جی، وہ اصل میں پہلے میں سو رہا تھا۔'' اس نے معصومانہ انداز میں جواب دیا تو ہال میں موجود بھی طلبہ کے لبوں پر بھی ہنسی امڈ آئی۔

ججز کی سنجیدہ نظروں میں پوشیدہ مسکراہٹ سے اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ انہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ مزید چند ایک سرسری سوالات کے بعد اس کے فارم پر کچھ کمنٹس کا اندراج کر کے وہ دوسرے امیدوار کی جانب متوجہ ہوگئے۔

اگلے دن نوٹس بورڈ پر نتائج کی لسٹ میں اپنا نام دیکھ کر اس کے جذبۂ جوش میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اسے پینل انٹرویو کے لیے منتخب کرلیا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں فوری طور پر نمرہ کا خیال در آیا۔ وہ اس انٹرویو کے لیے اس سے تفصیلی بات چیت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی غیر حاضری کے باعث افسردہ دل لیے وہ اپنی دیگر مصروفیات میں الجھ گیا۔

نمرہ عاقب اس کے لیے بہت اہمیت اختیار کرنے لگی تھی۔ اس کی سوچ، عادات و اطوار اور ذہنی سطح یہاں کی دیگر لڑکیوں سے قطعی منفرد تھی اور وہ اس انفرادیت کا اسیر ہو چلا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد نمرہ جب یونیورسٹی آئی تو قدرے نڈھال لگ رہی تھی۔ معیز کے بارہا استفسار پر بھی وہ اسے ٹال گئی اور گروپ انٹرویو میں کامیابی کے لیے سراہتے ہوئے کہنے لگی۔

''پینل انٹرویو ایک مختلف تجربہ ہوگا معیز۔ اگر کامیابی چاہتے ہو تو انہیں اپنی سوچ اور شخصیت کی مضبوطی سے متاثر کرنا ہوگا۔ وہاں محض اعتماد و حاضر جوابی کافی نہ ہو گی۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا...... میں کافی پُرامید ہوں۔''

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا اور پھر اپنی ایک الجھن کو الفاظ کا پیراہن دے کر بولا۔

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے نمرہ کہ تم بھی میری ہی طرح الجھنوں میں مبتلا ہو...... لیکن تنہا ان سے نبرد آزما ہو۔''

''نہیں، الجھن تو مجھے کوئی بھی نہیں! ہاں وقتی طور پر کچھ پریشانیاں ضرور درپیش ہوتی ہیں...... تاہم ان سے نمٹنا بھی کوئی بڑا ایشو نہیں۔'' وہ اعتماد سے بولی۔ ''مگر ابھی تم میری فکر چھوڑو اور اپنے انٹرویو کے بارے میں سوچو۔''

معیز اس کا گریز بھانپ کر خاموش ہوگیا۔

پینل انٹرویو اس کے لیے واقعی قدرے منفرد تجربہ ثابت ہوا تھا۔ درمیانے سائز کے اس دفتر نما کمرے کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گلاس ٹیبل، مخملیں فرنیچر اور دیواروں پر آویزاں فن پاروں میں نفاست و خوبصورتی نمایاں تھی۔

سوسائٹی پریذیڈنٹ اور وائس پریذیڈنٹ کے ساتھ پینتالیس سال سے متجاوز ایک اور شخص بھی موجود تھا جو بظاہر لاتعلقی سے اپنے سامنے دھری کچھ فائلز کے مطالعے میں مصروف تھا لیکن اس کی اندرونی حسیات اپنے گرد و پیش پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھیں۔ نفیس تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ کسی گہرے اور شانت سمندر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ریم لیس چشمے اور بالوں سے جھانکتی سفیدی نے اس کی شخصیت کو مزید بارعب بنا دیا تھا۔ وہ مخاطب کے حواس مختل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔

دونوں پریذیڈنٹس اس کے فارم پر لکھے کمنٹس دیکھ کر زیرِلب مسکرائے اور وائس پریذیڈنٹ نے اس سے استفسار کیا۔

''آپ نے اپنی بیداری کی وجہ بیان نہیں کی مسٹر

معیز؟“

”میری بیداری ٹریننگ کلاسز کی مرہونِ منت ہے سر!“

”اس ٹریننگ کے پسِ پردہ عوامل نے کیوں یہ اثرات اجاگر نہیں کیے؟“ پریذیڈنٹ نے بھی لقمہ دیا۔

”یہ پسِ پردہ عوامل بیداری نہیں...... دباؤ پیدا کرتے ہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”کیسا دباؤ؟“ اس ادھیڑ عمر شخص نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔

”ان عوامل کے پیچھے جو بھی قوتیں کارفرما ہیں، وہ اپنے مقاصد میں کامیابی تو بہرحال حاصل کر ہی لیتی ہیں۔ وہ ہمیں دباؤ میں لاتی ہیں اور ہم اپنے تعلیمی ادارے بند کر دیتے ہیں۔“

”تو جان بوجھ کر خطرات میں کودنا بھی کہاں کی دانشمندی ہے؟“

”دانشمندی تو یہ بھی نہیں کہ ہم اپنا نظامِ زندگی معطل کر دیں...... بلکہ میں اسے عیاشی قرار دوں گا...... جسے ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا...... یہاں موجود اکثریت کو اس نظام کی معطلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بیرونِ ممالک سے ڈگریوں کے حصول کی استطاعت بھی رکھتے ہیں...... نقصان میں تو ہم جیسے لوگ رہتے ہیں ہمیشہ۔“

”تو آپ اس نقصان سے بچنے کے لیے کیسے اقدامات کے قائل ہیں؟“ سوسائٹی پریذیڈنٹ نے پوچھا۔

”جو بھی اس وقت اور ان حالات کی ڈیمانڈ ہوگی۔“

اس کے جواب نے ادھیڑ عمر شخص کے چہرے پر گہری دلچسپی کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ اس نے کھنکھار کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کی اس مثبت سوچ نے کافی متاثر کیا ہے مسٹر معیز! میں آپ کو اپنی ذاتی صوابدید پر جنرل کے بجائے ایگزیکٹو ممبر کی حیثیت سے منتخب کر رہا ہوں...... وش یو بیسٹ آف لک۔“ میڈیا سوسائٹی کے کرتا دھرتا ارسلان شاہ نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

ٹریننگ کلاسز میں صفدر محمود کے ان لیکچرز کے بعد اب سوسائٹی میں شمولیت و فعالیت سے معیز کے ذہن پر ہمہ وقت چھائی رہنے والی مایوسی کی دھند چھٹنے لگی تھی۔ ایگزیکٹو ممبر کی حیثیت سے ہونے والے انتخاب نے اس کی ذمے داریوں میں گوناگوں اضافہ کر دیا تھا۔ آخری سمسٹر کی پڑھائی اور شام کے اوقات میں ٹیوشنز بھی وہ بہت خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ ارسلان شاہ کی ذاتی دلچسپی بھی اس سے مخفی نہ تھی۔ وہ چند ماہ میں ہی سوسائٹی کا ہر دلعزیز ممبر بن گیا تھا۔ احساسِ کمتری کے آسیب سے اس کی لاتعلقی میں اضافے کا تناسب بڑھنے سے اس کی زندگی میں بہت مثبت تبدیلیاں در آئی تھیں۔

تاہم ان سب کے باوجود وہ تاحال دوستی وغیرہ جیسے رشتوں سے خائف رہتا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب اب بھی رضی، جنید، نبیل اور نمرہ ہی پر مشتمل تھا۔ نمرہ کے بارے میں اس کے خیالات تیزی سے تبدیلی کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھی اسے بہت پسند کرتی ہے۔ معیز نے اس سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب قدرے پُرسکون ہو گیا تھا۔ مستقبل کے بارے میں اس کا یہی منصوبہ تھا کہ وہ لازماً عملی زندگی میں اپنے قدم جمانے تک اس کا انتظار کرے گی۔ مگر تقدیر کے ترکش میں پوشیدہ تیر اس کے متوقع رومانوی خیالات کو لہولہان کر گئے تھے۔

پچھلے کئی دن سے وہ یونیورسٹی سے غیر حاضر تھی اور اس کا نمبر بھی متواتر آف رہنے لگا تھا۔ معیز کی بے چینی فزوں تر ہونے لگی تھی۔ اس کے گھر بار کے متعلق اسے صرف اتنا ہی علم تھا کہ اس کے خاندان میں والدہ کے سوا کوئی دوسرا فرد نہیں ہے۔ بے چینی جب تشویش میں ڈھلنے لگی تو ایک اور افتاد آن پڑی۔

صادق بیگ کی بیروزگاری کسی ناگہانی آفت کی طرح اس کے اہلِ خانہ پر ٹوٹی تھی۔ ان کے علاقے کی بھی دکانیں مسمار کر کے ترقیاتی منصوبے کے لیے بھاری مشینری کی تنصیب نے صادق جیسے بھی افراد کی امیدوں کا قلعہ قمع کر دیا۔ گھر پر چھائے تناؤ کا کہر ہر فرد کے اعصاب کو یخ بستہ کرنے لگا تھا۔ افرادِ خانہ ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھرتے تھے لیکن اس دڑبے نما گھر میں وہ کب تک باہمی خاموشی اختیار کر سکتے تھے؟

صادق بیگ کا چڑچڑاپن، بیزاری اور کوفت بڑھنے سے گھر میں جھگڑے بھی بڑھتے گئے۔

”تنگ آ گئے ہو تم لوگ مجھ سے...... اسی لیے اپنے کاموں میں مصروفیت کا ڈھونگ کرتے ہو...... مجھے میری بیروزگاری جتانے کے لیے ایسا کرتے ہو۔“

”ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ؟ کچھ وقت کی بات ہے پھر معیز کو نوکری مل ہی جائے گی۔“ رقیہ انہیں ہر ممکن تسلی دیتیں۔

"اس تھوڑے سے وقت میں بھی بہت سا وقت باقی ہے......" ان کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔

"واجد یا شعیب سے بات کرلیں...... قرض لے لیتے ہیں تھوڑی رقم...... لوٹا دیں گے انہیں بعد میں۔" وہ ڈرتے ہوئے بولیں۔

"ہرگز نہیں! میں ان کی کمائی سے کسی صورت ادھار نہیں لوں گا۔" انہیں بھائیوں کی بے حسی اور موقع پرستی کا بہت قلق تھا۔

"آپ اجازت دیں تو میں کسی کوچنگ سینٹر میں چھوٹی موٹی جاب کرلوں۔" انعم نے پہلی بار اس بحث میں حصہ لیا۔

"ایسا سوچنا بھی مت! مجھے فاقہ کشی منظور ہے لیکن اس عمر میں بیٹی کی کمائی کھانے کے طعنے مجھے برداشت نہیں۔" ان کی انا کا بت بھی بہت بلند تھا۔

"میں کرلوں گا کوئی نہ کوئی بندوبست! آپ پریشان نہ ہوں۔" معیز نے مسکراتے ہوئے انہیں دلاسا دیا۔

"تم اپنی پڑھائی چھوڑنے کا تصور بھی ذہن میں مت لانا۔" انہوں نے کسی متوقع خطرے کے پیش نظر اسے متنبہ کیا۔

"ایسی حماقت میں ہرگز نہیں کروں گا...... بے فکر رہیں۔"

یہ وقت معیز کے لیے بہت کڑا تھا۔ حالات کی بہتری کی کہیں کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اس موقع پر اسے نمرہ کی کمی بھی بہت کھلنے لگی تھی۔ وہ خلوص دل سے اس کے مسائل میں دلچسپی لے کر اسے کوئی نہ کوئی منطقی راہ سجھا دیا کرتی تھی۔

دوطرفہ ذہنی دباؤ میں اس کی کارکردگی پر نمایاں منفی اثرات نظر آنے لگے۔ انتظامیہ پہلے پہل تو اتفاق سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی لیکن جب غیر حاضر دماغی اور غلطیوں میں تسلسل پیدا ہوگیا تو ارسلان شاہ نے ایک روز اسے اپنے دفتر میں طلب کرلیا۔ وہ خدشات و تفکرات میں گھرا اس کے پاس پہنچا۔

"آؤ معیز بیگ، بیٹھو۔" اس نے اپنے سامنے رکھی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور کچھ دیر اس کا بغور جائزہ لینے کے بعد سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کیا۔

"کیا پریشانی ہے تمہیں آج کل؟"

"کوئی پریشانی نہیں ہے سر!"

"اگر ایسا ہے تو اپنی موجودہ کارکردگی کی کیا توجیہہ دو گے تم؟" وہ اب بھی کافی نرمی سے مخاطب تھا۔

معیز سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

"دیکھو معیز، ہم سب یہاں پر ایک ٹیم اور ایک خاندان کے مانند ہیں جس کا ہر فرد دوسرے سے مربوط ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے ورکرز کی نجی زندگی کے مسائل کو اپنے ذاتی مسائل گردانا ہے...... اس لیے اگر تمہیں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہے تو مجھے بلا جھجک بتا سکتے ہو...... ہم اس کا کوئی بہتر حل نکال لیں گے۔"

"آپ کے اس خلوص کی میں دلی قدر کرتا ہوں سر! اور اس خاندان کا فرد ہونا اپنی خوش قسمتی تصور کرتا ہوں۔"

"تو پھر بتاؤ کیا پرابلم ہے؟" اس نے اپنی ریوالونگ چیئر کی پشت پر قدرے آرام دہ پوزیشن لیتے ہوئے سگار سلگالیا۔

معیز نے کسی ٹرانس کے تحت بلا کم و کاست اسے سارا ماجرا بتادیا۔ ارسلان شاہ کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں جھلکنے لگیں اور آنکھیں کسی گہرے خیال میں ڈوب گئیں۔ چند لمحوں کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد وہ دوسرا سگار سلگاتے ہوئے بولا۔

"یہ کوئی لاینحل مسئلہ نہیں ہے۔ اسے بہر طور بآسانی حل کیا جاسکتا ہے۔" اس کا اطمینان دیدنی تھا۔ "تمہارے والد کی خودداری اور عزتِ نفس کی میں قدر کرتا ہوں اور ان کے لیے ایک بہترین رستہ سجھا سکتا ہوں۔"

"اگر ایسا ہوجائے تو ہم سب کی زندگیاں اپنی پٹری پر لوٹ آئیں گی۔"

"میں انہیں اپنے کسی بھی عزیز یا واقف کار کے یہاں جاب دلوا سکتا ہوں لیکن یہ امر ان کے خلاف مزاج ہو گا...... انہوں نے تمام زندگی ذاتی کاروبار میں گزاری ہے اور اب اس عمر میں کسی کی نوکری کو وہ اپنی محتاجی تصور کریں گے۔"

معیز اس کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی سے بہت متاثر ہوا اور ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

"آپ کے اس تجزیے سے میں اختلاف نہیں کروں گا...... لیکن اس صورتِ حال کا کیا حل سوچا ہے آپ نے؟"

"میں تمہیں ایک معقول رقم بطور قرض فراہم کرسکتا ہوں...... جسے تم اپنی سہولت کے تحت مجھے لوٹا دینا۔"

وہ اس پیشکش پر خوشی سے بے حال ہوگیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ ارسلان نے ہاتھ اٹھا کر اسے نرمی سے ٹوک دیا۔

''شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں! تم بس انہیں مطمئن کرنے کے لیے اس قرض کا کوئی جواز سوچ لینا...... مجھے یقین ہے وہ بآسانی قائل ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔''
اس نے اپنے آفس بیگ سے چیک بک نکال کر بے نیازی سے رقم بھری اور دستخط کرنے کے بعد معیز کو چیک تھماتے ہوئے متانت سے گویا ہوا۔
''میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں اس وقت یہی سوال پنپ رہا ہوگا کہ میں یہ مہربانی کسی ذاتی مفاد کے تحت تو نہیں کر رہا۔''
''نن...... نہیں سر، ایسا تو کچھ بھی نہیں۔'' وہ جھینپ گیا۔
''تم اپنے معاملات بہتر ڈھب پر لے آؤ۔ زندگی نے موقع دیا تو اس کا جواب بھی میں ضرور دوں گا۔'' وہ اس کی توضیح نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اسمارٹ فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔
چیک ہاتھ میں تھامتے ہی معیز کو اپنے تمام مسائل اور مشکلات پل بھر میں تحلیل ہوتے محسوس ہونے لگے۔ گھر پہنچ کر اس نے وہ چیک صادق بیگ کے حوالے کیا تو وہ فوراً مشکوک انداز سے بولے۔
''کس نے دیا ہے یہ تمہیں؟''
''فکر نہ کریں کسی چچا یا پھوپھو سے نہیں لیا میں نے۔ میرے دوست کے والد نے بطور قرض دیا ہے۔'' اس نے بات بنائی۔ ''آپ کو علم تو ہے وہاں سب کتنے مال دار ہیں۔ یہ چھوٹی موٹی رقوم ان کے لیے اتنی اہم نہیں ہوتیں۔''
''دولت کم ہو زیادہ...... اس کی اہمیت کبھی بھی کم نہیں ہوتی بیٹا! انسان اپنے مفاد کے بنا کسی کو خیرات تک نہیں دیتا...... اس میں بھی اسے دعاؤں یا اپنے مصائب ٹالنے کا لالچ ہی گھیرے ہوتا ہے۔'' انہوں نے گویا اپنی زندگی کا نچوڑ بیان کر دیا۔ ''اس قرض کو جلد از جلد لوٹا دوں گا میں...... کیونکہ قرض کی لعنت اپنے ساتھ کئی ایک نادیدہ الجھنیں لے آیا کرتی ہے اور ہم مزید کسی آزمائش کے قابل نہیں رہے۔''
''میں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کے ساتھ ہوں۔''
وہ محبت سے ان کے ہاتھ تھام کر بولا تو انہوں نے آبدیدہ ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

معاشی حالات میں بہتری کی صورت پیدا ہوتے ہی اطمینان و فرحت کی ایک لہر نے ان کی زندگیوں کو اپنے احاطے میں لے لیا۔ گھریلو سکون میسر ہوا تو اس کی ذہانت مزید چمک اٹھی۔ فائنل سمسٹر کے امتحان اب زیادہ دور نہیں تھے۔ سوسائٹی میگزین کے لیے بھی اس کے لکھے گئے کالمز اور آرٹیکلز نے بہت کم وقت میں مقبولیت کی سند پا لی تھی۔ ان سب کامیابیوں میں اس کے دل میں اب بھی ایک خلش باقی تھی جو خوشی اور فخر میں بھی دل کا ایک کونا اداس رکھتی تھی۔
نمرہ کی نجی مصروفیات نے اسے کافی الجھا رکھا تھا۔ اس کی والدہ کی ناسازیٔ طبع نے اس کے رویے میں بہت گریز پیدا کر دیا تھا۔ معیز اب سنجیدگی سے اسے اپنا حالِ دل سنانے پر غور و فکر کر رہا تھا۔ وقت کو گویا پر لگ چکے تھے۔ فائنل امتحانات میں بہت کم عرصہ باقی رہ گیا تھا۔ اس نے امتحان سے پہلے ہی اسے اعتماد میں لینے کا تہیہ کر لیا تھا لیکن وہ پچھلے تین دن سے پھر غیر حاضر تھی۔ اس کی عدم موجودگی اب معیز کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ اس پہ مستزاد اُس کا نمبر بھی مسلسل آف تھا۔ وہ بلا مبالغہ سیکڑوں دفعہ اسے کال کر چکا تھا لیکن جواب ندارد۔ وہ سوشل میڈیا بھی استعمال نہیں کرتی تھی ورنہ معیز اسے کسی بھی طرح اپنا کوئی پیغام پہنچا دیتا۔
بے چینی اب تشویش میں ڈھلنے لگی تھی۔ پانچویں روز جب وہ کلاس میں اسے نظر آئی تو معیز نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔ فری پیریڈ میں اس کے مخصوص سنگی بینچ پر پہنچتے ہی وہ اس پر برس پڑا۔
''حد ہوتی ہے نمرہ بے پروائی کی بھی۔''
''کیوں؟ ایسا کیا ہوگیا بھئی؟'' اس نے دانستہ بے نیازی اختیار کی۔
''اتنے دن سے کہاں غائب تھیں تم؟ مجھے کوئی اطلاع تو دے دیتیں۔'' تبھی اس کی نظر نمرہ کی گردن کے گرد لپٹے اسکارف کی اوٹ میں پڑی جہاں کچھ مدھم خراشیں دکھائی دے رہی تھیں۔
''یہ نشان کیسے ہیں نمرہ؟'' وہ پریشانی سے بولا۔
''ایک ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا چھوٹا سا......''
''کیسا ایکسیڈنٹ؟ اگر کوئی سنجیدہ مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔'' وہ نرم روئی سے پوچھنے لگا۔
''جمی سے میرا جھگڑا ہوا تھا پھر سے۔'' اس کے ان الفاظ پر معیز کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ''امی کے لیے میڈیکل اسٹور پر کچھ دوائیں لینے جانا پڑا تھا مجھے...... اس نے راستے میں ہی زبردستی کرنے کی کوشش کی مجھ سے۔''
''تم نے کوئی رپورٹ نہیں کی اس کے خلاف؟'' وہ طیش میں آگیا۔

''میں ایسے چوچلوں کی متحمل نہیں ہو سکتی معیز! اسے خود ہی ایسی چار چوٹ پہنچائی ہے کہ آئندہ میری راہ میں نہیں آئے گا اب۔''

''فون کیوں آف تھا تمہارا؟'' اسے شدید بے چینی لاحق ہو چکی تھی۔

''اسی بھاگ دوڑ میں گر کے ٹوٹ گیا تھا۔ نیا لینے کا وقت نہیں مل سکا۔'' وہ غائب دماغی کا شکار تھی۔

لمحاتی سوچ بچار کے بعد معیز نے اسے اپنا فون تھما دیا اور کہا۔ ''جب تک تمہارا فون ٹھیک نہیں ہو جاتا...... اسے اپنے پاس رکھ لو۔''

''اور تم؟ تم کیا کرو گے تب تک؟''

''میں اس سیٹ سے کام چلا لوں گا۔'' اس نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا اور قدرے سستا سا موبائل نکال کر دکھایا۔ ''یہ نمبر بھی اس میں سیو ہے۔ مجھ سے رابطے میں رہنا بس۔''

نمرہ اسے خاموش نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر پوچھا۔ ''اتنی مہربانیاں کیوں مجھ پہ؟''

''جن سے اپنائیت و چاہت کا رشتہ استوار ہو جائے ان پر مہربانیاں نہیں کی جاتیں نمرہ، ان کا شایانِ شان حق ادا کیا جاتا ہے بس۔'' اس نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ دی۔

وہ اب بھی خاموشی سے اسے یک ٹک دیکھتی رہی۔

''بہت سادہ ہو تم معیز! ایسی سادگی زندگی میں بہت سے مقامات پر ٹھوکریں کھلاتی ہے۔''

''اتنی قنوطی کیوں ہو رہی ہو آج؟''

''پتا نہیں! شاید امی کی طبیعت کی ٹینشن سے۔''

''میں تمہاری والدہ سے ملنا چاہتا ہوں نمرہ......''

''یہ عمر بھر کے معاملات ہیں معیز! اتنی جلد بازی بھی اچھی نہیں ہوتی۔'' وہ اس ملاقات کے پس پردہ خواہش بھانپ چکی تھی۔ ''میں چلتی ہوں ابھی۔ پروفیسرز سے کچھ اہم پوائنٹس پر تفصیلی بات چیت کرنی ہے۔ دو ایک دن میں موبائل لوٹا دوں گی تمہیں۔''

وہ سست روی سے اسٹاف روم کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے ٹھیلے! آج کل بہت اکیلے گھوم رہے ہو؟ تمہاری گرل فرینڈ کہاں غائب ہے؟'' جنید کے معنی خیز انداز پر اسے غصہ آ گیا۔ وہ چاروں اس وقت کینٹین میں بیٹھے تھے۔

''شٹ اَپ جنید، بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو ایک بار...... وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔''

''اتنا ہائپر کیوں ہو رہے ہو معیز؟ تحمل سے بات کرو۔'' نبیل نے اسے نرمی سے ٹوکا۔

''اصل میں قصور تم لوگوں کا بھی نہیں ہے...... تم لوگوں کی ذہن سازی ہی ایسی ہوتی ہے بچپن سے کہ وہ بوائے فرینڈز اور گرل فرینڈز کے مدار سے باہر ہی نہیں آتا۔''

''یہ ہم نہیں...... سارا ڈیپارٹمنٹ ہی کہتا ہے معیز۔'' رضی نے کہا۔ ''لیکن تمہارا ذاتی معاملہ ہے...... اس لیے ہم آئندہ اس ٹاپک پر بات نہیں کریں گے...... اوکے۔'' اس نے صلح جویانہ انداز میں کہا۔

''لیکن میں تو کروں گا بات۔'' جنید بھی اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''وہ بہت گہری لڑکی ہے...... اگر گرل فرینڈ نہیں ہے تو کیوں اس کے ساتھ نظر آتی ہے؟''

''تم جیلس ہو رہے ہو کیا؟'' معیز کی برداشت ختم ہو چلی تھی۔

''جیلس نہیں ہو رہا ایڈیٹ، سمجھا رہا ہوں تمہیں...... اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو...... بڑے دھوکے ہیں اس راہ میں۔'' وہ بھی تلخ ہو گیا۔

''مجھے کسی بھی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری اس ہمدردی کا شکریہ!'' وہ اپنی کتابیں اور بیگ اٹھائے وہاں سے اٹھ گیا۔

اگلے روز نمرہ نے اسے فون لوٹاتے ہوئے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تمہارا اپنے گروپ سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں۔ جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔ بس تلخ کلامی ہوئی تھی کچھ۔'' اس کے ذہن میں ایک خدشہ سرسرایا۔ ''تمہیں کیسے علم ہوا اس بات کا؟''

''جنید آیا تھا صبح میرے پاس۔ اسی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ میرے بارے میں کچھ تحفظات کا شکار ہے۔''

''تم نے کوئی جواب نہیں دیا اسے؟''

''کیا فائدہ؟ مجھے اب ایگزامز کی تیاری کے لیے زیادہ وقت گھر پہ ہی گزارنا ہے...... آج بھی صرف تمہیں فون لوٹانے کے لیے چلی آئی۔''

''میں نے کچھ اور بھی کہا تھا تم سے۔'' اس نے دھیمی

آواز میں کہا۔ متوقع انکار کا خوف اس کے دل کو کسی تیز دھار نشتر سے گھائل کر رہا تھا۔

”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“

”ایگزامز سے فارغ ہو لیں...... پھر میں تمہیں ملوا دوں گی امی سے۔“ وہ مسکرائی۔

”میں منتظر رہوں گا تمہاری کال کا۔“ وہ نہال ہو گیا۔

☆☆☆

معاشی اور جذباتی آسودگی سے معیز کی خفتہ صلاحیتیں بھی آشکار ہونے لگی تھیں۔ اس کے پیپرز توقعات سے بھی بڑھ کر اچھے ہوئے تھے۔ سوسائٹی میگزین کے لیے اس کی تحریری صلاحیتوں نے ارسلان شاہ کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا اور اس نے فائنل سمسٹر کے بعد اسے ایک اہم پیشکش کا عندیہ دے دیا تھا۔

ایک طویل اور تھکا دینے والی مسافت کے بعد زندگی اب اسے بہت مہربان لگنے لگی تھی۔ سرشاری اور جوش اسے مزید آسمانوں کی تسخیر پر اکساتے تھے۔ وہ نمرہ کی کال کا بے چینی سے منتظر تھا اور اس انتظار میں پوشیدہ ایک میٹھی سی لذت و سرور کی کیفیت بھی اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھی۔ وہ اب خود سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بڑے صبر سے اس نئے کیف سے خود کو بہلا رہا تھا۔

کئی دن اس یاس و آس کی کیفیت میں گزر گئے اور پھر بالآخر اس کا میسج موصول ہوا۔

”اب بھی قائم ہو کیا اپنے دعوے پر؟“

معیز نے فوراً اسے کال کر دی اور اس کی آواز سنتے ہی بیتابی سے بولا۔ ”میں تو کب سے منتظر ہوں تمہاری کال کا۔“

”اچھا! تو پھر دیر کس بات کی۔ آج رات میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ اس نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ”آٹھ بجے تک پہنچ جانا۔ ایڈریس میں تمہیں سینڈ کر دیتی ہوں۔ بس وقت پر پہنچ جانا۔“

”سر کے بل پہنچوں گا میں۔“ اس کا جوش دیدنی تھا۔ الوداعی کلمات کے بعد نمرہ نے فون بند کر دیا۔ اگلے ہی پل اس نے ایڈریس بھی میسج کر دیا تھا۔ وہ بلڈنگ اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس کی بائیک صادق بیگ کا ایک دیرینہ دوست کسی کام کے سلسلے میں دو دن کے لیے لے گیا تھا اور اب اسے پیدل ہی جانا تھا۔ خوشی اور جوش میں اسے یہ مسافت بھی بھلی لگ رہی تھی۔

رات تک وہ اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے ہلکان ہو چکا تھا۔ ذہن میں مختلف خدشات پنپتے رہے۔ نمرہ کے رکھ رکھاؤ سے وہ بہت متمول اور آسودہ حال گھرانے کی لگتی تھی۔ وہ نمرہ کی والدہ کو اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے وہی تاثر دینا چاہتا تھا۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد اپنا ہلکا سفیدی مائل تھری پیس سوٹ پہننے کا فیصلہ کیا۔ دھاری دار سرخ ٹائی لگا کر آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اسے اپنی گھبراہٹ میں قدرے کمی محسوس ہوئی۔

مزید انتظار کی اب اس میں بالکل تاب نہ تھی۔ مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی وہ اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا اور کال بیل بجا کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اگلے دس منٹ میں اس نے کئی بار بیل بجائی لیکن کوئی بھی آ کے نہ دیا۔ پریشانی کے عالم میں اس نے نمرہ کا نمبر کئی بار ڈائل کیا۔ فون آن تھا لیکن اس نے کال ریسیو ہی نہیں کی۔ وہ اپنی آمد کی اطلاع کا میسج بھی کر چکا تھا اس لیے یہ امکان بھی نہیں تھا کہ وہ کسی مصروفیت میں الجھ گئی ہو گی۔

اضطراری کیفیت میں اس نے دروازے کو ہینڈل سے پکڑ کر دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ وہ حیران تو ہوا لیکن پریشانی میں بغیر سوچے سمجھے اندر داخل ہو گیا اور نمرہ کو آوازیں دینے لگا۔ اپارٹمنٹ دو کمروں اور ایک وسیع لاؤنج پر مشتمل تھا۔ لاؤنج کے ایک کونے میں امریکن اسٹائل کچن تھا جہاں اس وقت نیم تاریکی تھی۔ وہ اضطراب کے عالم میں کمروں کی جانب بڑھا لیکن ان کے دروازے لاکڈ تھے۔

وہ واپس لاؤنج میں آیا اور خالی الذہنی کے عالم میں دیواروں پر لگی تصاویر دیکھتے اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ ایک تصویر میں اسے نمرہ چہرے پر انتہائی غصیلے تاثرات کے ساتھ دکھائی دی۔ درمیان سے مانگ نکالے کھلے بالوں میں وہ ’ڈینجر لیڈی‘ کا تاثر دے رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پستول تھا جس کی نال سے نکلتے دھوئیں میں سالِ نو مبارک کے الفاظ وہ بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں دستے کی گرفت سے در آنے والی سختی، سفیدی اور دو خون آلود خراشیں بہت قدرتی تاثر دے رہی تھیں۔ وہ نمرہ کی اس ادا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اسی پل تصویر کے گلاس فریم میں اسے ایک منظر نے ساکت کر دیا۔ وہ جھٹکے سے پلٹا اور بائیں جانب موجود ایک ساکٹ میں نصب تمام سوئچ آن کر دیے۔

نمرہ اوندھے منہ کچن کے فرش پر غیر فطری انداز میں لیٹی تھی۔ اس کے پیٹ اور کمر کے آس پاس خون کا ایک

تالاب موجود تھا اور پشت میں ایک کمان دار خنجر گڑا تھا۔ معیز کی ٹانگوں نے اس کے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تو وہ بے دم ہو کر نیچے بیٹھ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنا بے جان ہوتا وجود گھسیٹتا آگے بڑھا اور بے اختیار اس کے جسم کو بار ہا چھوا۔ اس کا دماغ یکسر ماؤف ہو چکا تھا۔ نمرہ کے پھٹے ہوئے کپڑے اور دائیں رخ سے نظر آتے چہرے پر موجود خراشوں نے اس کے حواس مزید سلب کر دیے۔ اپنی انگلیاں دیوانوں کی طرح اس نے چہرے سے رگڑ ڈالیں۔

خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے کمر میں گڑے خنجر کو نکالنے کے لیے تھاما اور پھر یکدم کرنٹ کھا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی جیب سے رومال نکال کر اس نے تمام ممکنہ جگہوں پر لگے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے۔ پیشانی پر تشویش اور بے بسی کے گہرے بل لیے وہ گہرے سانس لیتا دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ تبھی اس کی نظر نمرہ کی اسی تصویر کے گلاس فریم پر دوبارہ پڑی۔ خون آلود لکیریں اس کے چہرے پر بھی موجود تھیں۔

وہ اپنا چہرہ جنونی انداز میں رگڑتا اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ اس کیفیت میں مرکزی رستہ اختیار کر کے مکینوں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا بلڈنگ کے عقبی جانب بے ہنگامی زینوں سے اس نے باہر کی راہ لی۔

☆☆☆

وہ دور دیہ سڑک پر کسی روبوٹ کے مانند چل رہا تھا۔ ذہن پر ایک بھیانک سناٹا طاری تھا۔ اسے اپنے آس پاس موجود ہر شے سرخ رنگ میں رنگی محسوس ہو رہی تھی...... گہرا سرخ...... لہو رنگ۔ دماغ پر دھند سوار تھی۔

بصارت میں قید وہ خونی منظر اس کے اعصاب میں شدید کھنچاؤ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ حسیات بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ اس کی انگلیوں کی پوروں نے موت کی ٹھنڈک کو محسوس کیا تھا۔ وہ ٹھنڈک اب پوروں سے اس کے ہاتھوں میں اتر رہی تھی۔ تشنج کی ایک لہر اس کے روم روم میں سرایت کرنے لگی۔

اسے گمان ہونے لگا ابھی کوئی پل ایسا آئے گا کہ اس کا برف ہوتا وجود پاش پاش ہو کر ان ہواؤں میں بکھر جائے گا۔ معدہ کسی تیز نکیلی شے سے کھرچتا محسوس ہونے لگا۔ درد کی ایک شدید لہر اس کے پیٹ میں اٹھی اور وہ سڑک کے کنارے دہرا ہو کر گر گیا۔ منہ میں کسی سیال مادّے کی کڑواہٹ سے اس کا دل متلانے لگی اور سیاہ کولتار کی سڑک پر

وہ کتنی ہی دیر ابکائیاں کرتا رہا۔ وہ بے طرح ''نروس ڈائیریا'' کا شکار ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے لرزتی ٹانگوں سے سامنے موجود مسجد میں جا کر اپنا چہرہ دھویا۔ اس کے پردۂ تصور پر اب بھی ایک جیتے جاگتے، زندگی کی حرارت سے بھرپور ہزاروں تمناؤں سے گندھے وجود کی ایک شبیہ لہرائی جو اب صرف ایک مقتول تھا۔

یقین اب بھی بہت دشوار تھا۔

یونہی بے مقصد چلتے چلتے وہ اسی بک اسٹال کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس حالت میں گھر والوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اندر جا کر بلا جواز کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب دکان میں موجود لڑکوں نے اس کی وحشت اور سراسیمگی کو مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کیا تو اسے اپنی نازک صورتِ حال کا اندازہ ہوا۔ اس نے بنا دیکھے چند کتابیں نکالیں اور کچھ رقم حارث کو تھما کر بولا۔

''یہ ان کتابوں کی ایڈوانس پیمنٹ اپنے پاس رکھ لو حارث! میں کل آ کر بقیہ حساب کلیئر کر کے کتابیں لے جاؤں گا۔'' وہ بشاشت سے کہتا وہاں سے چل دیا۔

گھر پہنچ کر بھی اس کی کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا تھا لیکن اس نے چہرے پر مصنوعی خوشگوار تاثرات سجا لیے تھے۔ اس رات اسے بالکل نیند نہیں آئی تھی۔ نمرہ کے زخمی وجود کا تصور اس کے شکستہ خوابوں کو مزید لہولہان کر رہا تھا۔

اگلے دو دن وہ بظاہر اپنے معمول کے مطابق کاموں میں مصروف رہا لیکن پُرہول خدشات کی وحشت اسے بے حال کر رہی تھی۔ وہ بار بار مقامی نیوز چینلز میں لاشعوری طور پر نمرہ کی لاش کی دریافت کی کوئی خبر تلاشتا رہا لیکن جب ایسی کوئی بھی خبر نہ ملی تو مزید الجھن کا شکار ہو گیا۔ اس کے ذہن میں اس حادثے کے مجوزہ امکانات جگالی کرتے رہتے تھے۔

ایک امکان تو یہ بھی تھا کہ شاید اس کی والدہ نے خاموشی سے اس کی تدفین میں عافیت سمجھی ہو لیکن اس صورت میں ایک فوری خیال یہ ابھرتا تھا کہ اس نے معیز کو اپنی والدہ سے ملاقات کے لیے بلایا تھا مگر گھر میں تو کوئی ذی نفس موجود ہی نہ تھا۔

اگر یہ ڈکیتی کی کوئی واردات تھی تو اس صورت میں بھی گھر میں کسی قسم کی کوئی بے ترتیبی نظر نہ آئی تھی۔ وہ جس قدر سوچتا اس کا دماغ الجھتا رہا۔ لیکن ان سب سے قطع نظر اس کے بہیمانہ قتل اور بے حرمتی کا دکھ اس کے دل میں کسک پیدا

کر گیا تھا۔

زندگی عجب جمود کا شکار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

قیامت قبل از قیامت کیا ہوتی ہے؟

اگر کوئی یہ سوال معیز بیگ سے پوچھتا تو وہ بڑے کرب سے اس رات کا نام لیتا۔ ہر گزرتا لمحہ اس کی رگوں میں چنگاریاں چٹخاتا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی جمی کے سوا کوئی دوسرا نام اس کے ذہن میں نہ آتا۔ لیکن بے بسی میں اپنے بال نوچنے کے سوا وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ فارغ البالی کے باعث وہ دکان پر صادق بیگ کا ہاتھ بٹادیا کرتا تھا۔

اس نے مرکزی سڑک پر ایک چلتی ہوئی دکان خرید لی تھی۔ سابقہ گڈول اور اس کی دیانت داری نے اس دکان میں خاصی برکت پیدا کر دی اور گھر میں پہلے سے بڑھ کر خوشحالی محسوس ہونے لگی تھی۔ ارسلان شاہ کی اعلیٰ ظرفی اور بے لوث مدد نے اس کا رُواں رُواں مقروض کر دیا تھا۔

اس روز بادلوں نے آسمان کا سینہ اپنے آنچل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس خوشگوار موسم میں اس کی اندرونی گھٹن بڑھنے لگی تھی۔ وہ صادق کے ساتھ دکان پر گاہک نمٹانے میں مصروف تھا جب موبائل کی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

اس نے بے دلی سے نظر دوڑائی۔ کسی انجان نمبر سے ایک چند حرفی پیغام موصول ہوا تھا۔

''اپنا فیس بک اور واٹس ایپ اکاؤنٹ چیک کرو......جلدی۔''

وہ ایک پل کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ اسے شبہ تھا کہ کسی کلاس فیلو نے جان بوجھ کر سسپنس پھیلانے کے لیے یہ میسج کیا ہے۔ وہ پہلے بھی یونہی ہنسی مذاق میں ایک دوسرے کا ریکارڈ لگاتے رہتے تھے اس لیے وہ کوئی خاطر خواہ توجہ دیے بغیر اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو گیا۔

پندرہ منٹ بعد پھر وہی میسج موصول ہوا تو اس پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ ان سوشل سائٹس کے وقت بے وقت ''نوٹیفیکیشنز'' کی وجہ سے اپنا موبائل انٹرنیٹ ڈیٹا اکثر آف ہی رکھتا تھا۔ بیزاری اور کوفت کے عالم میں اس نے ڈیٹا آن کیا تو فیس بک اور واٹس ایپ میسنجر پر کچھ نئے پیغامات موصول ہوئے تھے۔ اس نے واٹس ایپ اکاؤنٹ کھولا تو سامنے اسی نمبر سے کچھ تصویروں اور ٹیکسٹ میسجز پر نظر پڑتے ہی وہ خوف سے منجمد ہو گیا۔

خودکار نظام کے تحت واٹس ایپ آن ہوتے ہی تصاویر خود بخود ڈاؤن لوڈ ہو چکی تھیں۔ نمرہ کی لاش ایک بار پھر اس کے سامنے تھی لیکن اب یہ لاش کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے ایک بار پھر ان تصاویر کو غور سے دیکھا۔ منظر اب بھی وہی تھا۔

وہ اس کی لاش میں گڑا خنجر تھامے بیٹھا تھا۔ سائڈ پوز سے لی گئی ایک تصویر میں اس کا چہرہ بخوبی پہچانا جا رہا تھا۔ اگلی تصویر میں وہ اس خنجر سے اپنے فنگر پرنٹس مٹاتا نظر آرہا تھا، باقی تصاویر میں کمروں کے دروازوں سے اپنی موجودگی کے نشانات صاف کرتا معیز بآسانی ایک ''مفرور قاتل'' کے فریم میں مکمل فٹ بیٹھ رہا تھا۔

اس نے دھندلاتی بصارت سے ٹیکسٹ میسج پڑھے۔

''اس نمبر کو اپنے موبائل میں محفوظ کر لو۔ بلاک کرنے کی صورت میں میرے پاس نئے نمبروں کی کمی تو نہیں لیکن تمہارے پاس اپنے 'بچاؤ' کے چنیدہ مواقع میں ایک کمی ضرور ہو جائے گی۔''

معیز نے کانپتے ہاتھوں سے وہ نمبر اپنی فون بک میں محفوظ کر لیا۔ اب اس اکاؤنٹ ہولڈر کی پروفائل پکچر بھی ظاہر ہونے لگی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ ایک پُر اسرار سی تصویر تھی جس میں کسی ہیولے نے سیاہ رنگ کی جیکٹ اور سر پر سیاہ ہی ہڈ پہن رکھا تھا۔ چہرے کے نقوش کی جگہ بھی صرف تاریکی جھلک رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی پُراسرار تصاویر انٹرنیٹ پر ہی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوتی ہیں۔

کچھ لمحوں بعد اس نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ چیک کیا تو حسب توقع وہاں بھی یہی تصویریں اور پیغام موجود تھا۔ اس نے بھیجنے والے کی پروفائل کھولی تو وہی پروفائل پکچر اسے یہاں بھی نظر آئی۔ ''دی ڈارک ہنٹر'' کے نام سے بنی اس پروفائل کا ہر کونا اس نے کھنگال ڈالا لیکن مزید پُراسراریت کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ جانے یہ کون سا شکاری تھا جو اس کی زندگی تاریک کرنے کے لیے وارد ہو گیا تھا۔

اس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ کچھ منٹوں بعد اسے ایک اور میسج موصول ہوا۔

''دیکھ لیں اپنی تصاویر، زبردست ہیں ناں؟؟'' دوسری جانب وہ بِنا دیکھے ہی اس کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے لرزتے ہاتھوں سے اسے جواب بھیجا۔

”میں تاریکی کا شکاری ہوں۔“
”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“
”بتا دوں گا وہ بھی...... پہلے ذرا اپنے حواس بحال کرو اور گھر پہنچ کر مجھ سے بات کرو۔“ وہ اس کی ہر کیفیت سے باخبر دکھائی دے رہا تھا۔
معیز کی اُڑی ہوئی رنگت، پسینے سے تر چہرہ دیکھ کر صادق بیگ نے خود ہی اسے گھر روانہ کر دیا۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر یخ بستہ پانی کے دو گلاس حلق میں انڈیلے اور ہانپتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا۔
تھوڑی ہی دیر بعد موبائل کی گھنٹی تواتر سے بجنے لگی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اس نمبر کو دیکھتا رہا لیکن فون اٹھانے کی ہمت نہ کرسکا۔ چوتھی مرتبہ میں اس نے ڈوبتے دل سے فون اٹھایا ہی تھا کہ ایک سرد اور سفاک آواز اس کی سماعت میں پڑی۔
”میں تمہارا ذاتی ملازم نہیں ہوں معیز بیگ۔ آئندہ میری کال نظر انداز کرنے کی غلطی کبھی غلطی سے بھی مت کرنا...... انڈر اسٹینڈ؟“
”وہ...... ہم...... میں رستے میں تھا۔“ وہ گھگیا گیا۔
”تمہارے باپ کی نئی دکان سے گھر کا فاصلہ بارہ منٹ ہے...... اور میں نے تمہیں بیس منٹ بعد کال کی ہے۔ مجھ سے بلف کرنے کا خیال بھی ذہن میں مت لانا یو ایڈیٹ! میں چاہوں تو ایک سیکنڈ میں تمہاری شہ رگ مسل سکتا ہوں۔“ اس کا سرد لہجہ شدید گرمی میں بھی معیز کا بدن یخ کر گیا۔
”ک...... کون ہو تم آخر؟“
”کہا نا تم سے! شکاری ہوں میں...... تاریکی سے وار کرتا ہوں...... میری کہی ہر بات ایک ہی دفعہ اپنے ذہن میں بٹھا لو تو بہتر ہے...... مجھے بار بار ایک ہی بات دہرانا پسند نہیں ہے۔“
”میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“
”تم نے تو بگاڑا ہے سب کچھ...... نمرہ عاقب کا قتل کیا ہے تم نے۔“ اس کی آواز میں طنز و استہزا کی جھلک تھی۔
”میں نے نہیں کیا اُس کا قتل...... وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔“ وہ پھٹ پڑا۔
”کون کرے گا اس بات کا یقین؟ تمہاری یہ تصویریں ثبوت ہیں اس بات کا کہ تم وہاں سے کس حالت میں بھاگے تھے۔ انہیں کوئی بھی فرانزک لیب جھوٹا ثابت نہیں کر سکے گی۔ یہ سو فیصد اوریجنل ہیں۔“
”صرف تصویروں سے کچھ ثابت نہیں کر سکو گے تم۔“
”تمہیں کیا لگتا ہے صرف یہی میرا ہتھیار ہیں...... میرے پاس ترپ کے بے شمار پتے موجود ہیں۔“
کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“
”تمہیں بس ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے میرا...... اور ہر صورت کرنا ہے۔“
”اور اگر میں انکار کردوں تو؟“
”انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تمہارے پاس۔“ وہ غرایا۔
معیز کے حلق میں ایک گلٹی ڈوب کر ابھری۔ ”کیا کرنا ہے مجھے؟“
”فی الحال میری اگلی کال کا انتظار کرو...... اور اپنا ذہن مکمل تابعدار بنا کر رکھو۔“ ڈارک ہنٹر کی پُرسکون آواز نے اس کا سکون غارت کر دیا۔

☆☆☆

کمرے کی حبس زدہ فضا میں خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ معیز بستر پر چت لیٹا خالی نظروں سے چھت پر لگے پنکھے کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ذہن اس وقت پنکھے سے بھی کہیں زیادہ رفتار سے گھوم رہا تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے ان پے در پے حادثات نے اس کے حواس شل کر دیے تھے۔ وہ اس وقت نفسیاتی طور پر اس کیفیت کا شکار ہو چلا تھا جب کوئی بھی افتاد کسی ڈراؤنے خواب کے مانند لگنے لگتی ہے۔
گلی میں کھیلنے والے بچوں کے شور کی آواز جب سماعت میں پڑتی تو اعصاب جھنجلا اٹھتے اور 'ڈارک ہنٹر' کی باتیں ایک بار پھر دل و دماغ میں چبھن پیدا کر دیتیں۔ موبائل فون ہاتھ میں لیے اس نے ایک بار پھر ان تصاویر اور میسجز کو بغور دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ یہ سب واقعات اس کے ساتھ 'بیت' چکے ہیں اور 'ڈارک ہنٹر' اس کی ذہنی اختراع نہیں ہے۔
اب اس نے اپنے دفاع کا رستہ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اسے سائبر ورلڈ کے بارے میں زیادہ معلومات تو نہیں تھیں لیکن وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی 'باعلم فرد' ذرا سی محنت اور دماغ سوزی سے سوشل میڈیا کے پردے میں چھپی ہوئی اصل شخصیت ڈھونڈ سکتا ہے۔ اس خیال نے اس کے ڈوبتے ہوئے دل کو کافی تقویت دی۔ مزید کچھ دیر سوچ بچار کے بعد اس نے حارث سے ملنے کے لیے علاقے کے انٹرنیٹ کیفے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

شام کے سائے دھیرے دھیرے رات کی تاریکی سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ اس کیفے نما بک اسٹال کا ماحول بھی حسبِ معمول پُرسکون اور خاموش تھا۔ اس نے گلاس ڈور کھول کر ہچکچاتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ حارث اسے دیکھ کر گرمجوشی سے مسکرایا۔

''ارے آیئے معیز بھائی! آپ تو عید کا چاند ہی ہو گئے ہیں۔''

''نہیں یار! ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے...... طبیعت خراب رہی بس میری۔'' اس نے اپنے ذہن میں صفدر محمود کے دیے گئے لیکچرز کو دہرانا شروع کر دیا تھا۔

''ہاں جی! وہ تو اس دن آپ کی حالت سے ہی عیاں تھا کہ آپ کی ذہنی و جسمانی کیفیت عدم توازن کا شکار ہے۔''

معیز کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اس دن سے آپ کی کتابیں بھی جوں کی توں پڑی ہیں میرے پاس۔ اگر ارادہ بدل گیا ہو تو ایڈوانس واپس کروا دوں گا میں آپ کو۔''

''ہاں وہی لینے آیا تھا میں بھی۔'' اس نے بقیہ رقم کی ادائیگی کر دی اور چند فروعی باتوں کے بعد پوچھا۔

''تمہاری ڈگری مکمل ہو گئی حارث؟''

''جی ہاں! اب تو رزلٹ کا انتظار ہے بس۔''

''میں بھی سوچ رہا ہوں کہ رزلٹ آنے تک کوئی چھوٹا موٹا آئی۔ ٹی کورس کر لوں۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔

''ضرور کیجیے گا...... اور میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بھی ضرور بتایئے گا۔''

''ہمم...... ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے اگر تم کوئی مشورہ دے سکو تو...... میری کلاس کا ایک لڑکا فیک پروفائل سے سب کے لیے چیلنج بنا ہوا ہے۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ اسے کیسے بے نقاب کیا جائے؟''

''یہ کون سی مشکل بات ہے؟ مجھے دکھایئے پروفائل اس کی۔ ابھی پتا چل جائے گا کون تیس مار خان ہے اس پروفائل کے پیچھے۔''

معیز نے اسے اپنے موبائل پر ڈارک ہنٹر کی پروفائل دکھا دی۔ وہ کچھ دیر اس کی تفصیلات پر غور کرتا رہا اور اپنے فون سے چھیڑ خانی میں مصروف ہو گیا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے مایوسی سے کہا۔

''بہت شاطر کھلاڑی ہے یہ...... کہیں کوئی سراغ نہیں چھوڑا اس نے۔''

''شاطر تو واقعی بہت ہے...... ہم بھی دوستوں میں شرط لگی ہوئی ہے اسے بے نقاب کرنے کے لیے۔''

''ایک کام ابھی بھی ہو سکتا ہے...... میں اس کا آئی پی ایڈریس معلوم کر سکتا ہوں مگر اس میں رسک یہ ہے کہ اسے الرٹ مل جائے گا۔''

''نہیں! رہنے دو۔ اتنا بھی بڑا ایشو نہیں خیر یہ۔'' وہ اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکلا تو مایوسی ایک بار پھر اسے آغوش میں لے چکی تھی۔

وہ بنا سوچے سمجھے واجد بیگ کے گھر کی طرف ہو لیا۔ اس کے ذہن میں کوئی بھی واضح لائحہ عمل نہیں تھا کہ وہ ان سے اس معاملہ پر کس طرح بات کرے گا۔ ڈوبتے کو تنکے کے سہارے کی آس تھی اس لیے بس ہاتھ پاؤں چلاتا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے ستارے بری طرح گردش میں تھے۔ اس رات جب وہ پسینے سے شرابور 'قانونی مشاورت' کی امید لیے چچا کے گھر پہنچا تو گارڈ نے اس کی توقعات کا فلک بوس قلعہ ایک ہی جھٹکے سے مسمار کر دیا۔

''صاحب فیملی کے ساتھ ورلڈ ٹور پر گئے ہیں...... موسم گرما کے بعد آئیں گے واپس۔''

اس کی امیدیں بالکل بکھر کر رہ گئیں۔ رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو انعم اس کے انتظار میں اب بھی بیدار تھی اور کچھ بے چین دکھائی دے رہی تھی۔

''آ گئے آپ۔ کہاں تھے شام سے اب تک؟'' اس کے لہجے کی کاٹ معیز کے لیے حیران کن تھی۔

''کچھ دوستوں کے ساتھ تھا؟''

''بھائی! کیوں جھوٹ بول رہے ہیں آپ؟''

''جھوٹ کیوں بولوں گا میں...... کہیں ڈکیتی یا قتل کے لیے تو نہیں گیا تھا میں۔'' اپنی بے بسی کا غصہ اس نے انعم پر نکال دیا۔

''آپ کا یہ دوست واجد چچا کے گھر میں رہتا ہے کیا؟'' انعم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''نن...... نہیں...... واجد چچا کا یہاں کیا ذکر بھلا؟''

''آج ابو کے نمبر پر کسی نے کال کر کے بتایا کہ آپ واجد چچا کے گھر موجود ہیں۔ یہ سن کر ان کا طیش اور غصہ عروج پر ہے۔ معیز کا دماغ الٹ گیا۔

''کال...... کس نے کی تھی کال؟''

''خدا جانے کون تھا؟ ابو سے کہنے لگا آپ کا بیٹا آپ کی لاعلمی میں کیا گل کھلاتا پھرتا ہے...... بھی جاننے کا اشتیاق

ہو تو شرفِ ملاقات بخشیے گا۔" وہ ساکت رہ گیا۔ "ابو کی ذہنی کیفیت آپ جانتے ہی ہیں۔ ان کا سابقہ شک یقین میں بدل گیا کہ آپ بچھّوؤں سے رابطے میں ہیں اور دکان کے پیسے بھی انہی سے مانگ کر لائے تھے۔ آپ کی کال کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا۔ اب بھی دوائی دے کر بمشکل سونے بھیجا ہے انہیں۔"

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور اس تاریکی کے شکاری کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی کال بہت جلد آئے گی اور ہوا بھی یہی۔ فون کی گھنٹی بجتے ہی معیز نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر کال ریسیو کر لی۔ دوسری جانب اسے وہی سرد و سپاٹ آواز سنائی دی۔

"ہاؤز دیٹ؟؟"

"کیوں کر رہے ہو ایسا میرے ساتھ؟ میرے گھر والوں کو کیوں گھسیٹ رہے ہو؟"

"آغاز تم نے کیا تھا...... تم نے باہر والوں کو گھسیٹا ہماری اس لو اسٹوری میں...... میں نے گھر والوں کو...... حساب برابر۔" اس کے ان برجستہ جملوں میں بھی موت کی سی ٹھنڈک تھی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"تو میری پروفائل کی چیکنگ کس نے کروائی تھی؟ تمہیں کیا لگتا ہے میں اتنا ہی بے وقوف ہوں کہ ان چھوٹے موٹے ٹریکرز کے جال میں آجاؤں گا، میں تمہاری سوچ، گمان اور اوقات کی سبھی حدود سے اوپر کی چیز ہوں۔" اس کا انداز ہر گزرتے لمحے کھردرا ہو رہا تھا۔ "ابھی صرف تمہارے باپ کو اطلاع دی ہے...... غلطی سے ایک کلک ہو گیا تو یہی ویڈیوز اور تصاویر کسی بھی اعلیٰ پولیس افسر کے نمبر پر بھی پہنچ سکتی ہیں۔ پھر وہی تمہارے حلق سے اگلوائیں گے کہ نمرہ کی موت سے قبل اس کے نمبر پر تمہاری کالز کیوں تھیں؟ اور سی سی ٹی وی کیمرے میں اس بلڈنگ سے تمہاری واپسی کا کوئی ریکارڈ کیوں نہیں ہے؟" وہ ہر طرف سے اسے گھیر چکا تھا۔

"کیا کرنا ہے مجھے؟" اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"گڈ! اب آئے ہو ناں لائن پر۔" اس نے سراہتے ہوئے کہا۔ "صرف ایک معمولی سا کام کرنا ہے تمہیں...... پھر میری طرف سے آزاد ہو گے تم۔"

"کیا کروانا چاہتے ہو آخر؟" معیز کی چھٹی حس کسی بڑے دھماکے کا اشارہ دینے لگی تھی۔

"ارسلان شاہ کا قتل کرنا ہے تمہیں۔" ڈارک ہنٹر نے اطمینان سے کہا۔

☆☆☆

ڈارک ہنٹر کا مطالبہ ان تمام ممکنات میں کہیں بھی شامل نہ تھا جو اس نے سوچ رکھے تھے۔ ایک جیتے جاگتے اور وہ بھی ارسلان شاہ جیسے انسان کا قتل معیز کے لیے ناممکن امر تھا۔ ارسلان اس کے لیے کسی بھی گاڈ فادر سے کم نہیں تھا۔ اس کی سوچ اور نظریات بہت قیمتی اثاثہ تھے اور اس اثاثے کو اپنے ہاتھوں سے ملیامیٹ کرنا...... یہ کام اس سے کیسے ممکن تھا بھلا؟

اس کے ذہن کے دریچوں پر ارسلان شاہ سے کچھ دن پہلے ہونے والی آخری ملاقات دستک دینے لگی۔

فائنل انگزامز ختم ہونے سے پہلے وہ اسے ایک اہم پیشکش کے بارے میں ڈھکے چھپے الفاظ میں عندیہ دے چکا تھا۔ پیپرز ختم ہونے کے بعد اس نے معیز کو اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔ خنک بخش ماحول میں وہ انتہائی دوستانہ انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

"کیا تم جانتے ہو معیز کہ میں نے پہلی ہی ملاقات میں تمہیں ایگزیکٹو ممبر کی رکنیت دینے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا؟"

"نہیں سر! لیکن میرے ذہن میں اس حوالے سے بہت سے سوالات موجود ضرور رہے ہیں۔"

"ہوں میں جانتا ہوں تمہارے تحفظات کے بارے میں۔" اس نے سگار کا خوشبودار دھواں بکھیرتے ہوئے کہا۔ "تم...... تمہارا ذہن...... اور سوچ بہت منفرد ہیں...... انہیں صرف صحیح سمت میں ڈائریکٹ کرنے کی ضرورت تھی۔"

معیز نے جواب میں محض خاموشی پر اکتفا کیا۔

"ہمارے ملک کی بہت بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ کبھی نوجوانوں کے جوش اور جذبے سے مناسب استفادہ حاصل نہیں کر پایا۔ یہاں محض تنگ نظر اور ایک مخصوص سوچ رکھنے والے افراد نے ہر شعبۂ زندگی پر اجارہ داری حاصل کر رکھی ہے۔"

اس نے توقف کیا اور اس کی جانب جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

"جی! ایسا ہی ہے بالکل۔"

"ہمارا اصل خزانہ اس طبقے میں پوشیدہ ہے جس سے تمہارا بھی تعلق ہے۔ لیکن افسوسناک امر تو یہ بھی ہے کہ یہ

طبقہ اپنی معاشی ضروریات کی چکی میں پس کر اپنے حقیقی مدار سے بالکل دور ہوتا جا رہا ہے...... پیٹ کی آگ جب جلتی ہے تو دماغ اس کے شعلوں سے براہِ راست اور سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے...... دوسری طرف ہمارا خوشحال طبقہ ہے جس کے پاس نعمتوں کی فراوانی ہے مگر انہوں نے اس فراوانی کو اپنے اوپر اس قدر حاوی کر لیا ہے کہ ان کا دماغ صرف عیاشی کے مدار میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ اب رہ گیا تیسرا اور سب سے مظلوم و مجبور طبقہ...... ان کے لیے ذاتی بقا ہی حاصلِ زندگی ہوتی ہے...... تعلیم ان کے لیے ایک مہنگی اور ناقابلِ رسائی عیاشی کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے ہیں اور اپنی ناآسودہ خواہشات کی تسکین کے لیے اپنے آپ کو کسی نہ کسی گھٹیا نشے کی لت میں ڈبو کر گمنامی کی موت مر جاتے ہیں۔'' وہ بلاتکان بولتا چلا گیا۔

''میں نے ان تمام عوامل کو بے حد قریب سے محسوس کیا ہے...... میرا سگا بھائی اس کشمکش میں زندگی کا جوا ہار گیا تھا...... زمانہ طالب علمی سے ہی میں نے ارادہ کر لیا تھا اپنے زورِ بازو سے اس ناہمواری کو ایک بہترین ہموار شکل میں ڈھالوں گا۔ اسی مقصد کے لیے میں نے دس سال قبل اس میڈیا سوسائٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ اجراء میرے لیے ایک جنگ سے کم بہرحال نہ تھا...... لیکن مجھے خوشی ہے کہ میری ٹیم نے مجھے توقعات سے بڑھ کر نتائج دیے ہیں۔'' اس نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر اب میں اپنے اس خواب کو مزید دلکش بنانا چاہتا ہوں۔''

''کیا منصوبے ہیں آپ کے اب؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''اس کے دو مراحل ہوں گے...... پہلے مرحلے میں میں میڈیا سوسائٹی کا میگزین قومی سطح پر لانچ کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم سمیت ہزاروں نوجوانوں کی آواز متعلقہ فورمز تک پہنچ سکے۔''

''اور دوسرا مرحلہ کیا ہوگا؟'' اس کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔

''دوسرے مرحلے میں ایک ایسا ادارہ قیام میں لانا چاہتا ہوں جہاں یہ ناہمواری ختم ہو جائے اور ان تینوں طبقات کی نوجوان افرادی قوت و بہترین دماغ اپنی صلاحیتوں کا مکمل اور مثبت استعمال کر سکیں۔''

''بہت نادر خیال ہے آپ کا سر۔'' معیز نے متاثر کن لہجے میں کہا۔

''نادر تو ہے لیکن کٹھن بھی بہت ہے۔''

''کیا حکمت عملی ہے آپ کے ذہن میں اس بارے میں۔''

''میں تمہیں اس میگزین کے کو آرڈینیٹر کی پوسٹ دینا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ ادارے میں بھی بہت سی ذمے داریاں تمہاری منتظر ہوں گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''تم...... میں...... لیکن میں کیسے؟'' وہ حسبِ عادت بوکھلا گیا۔

''اس سمسٹر کے بعد تم بالکل فارغ ہو گے۔ کسی اعلیٰ نوکری کی خواہش کرو گے تو اس کے لیے بھی سفارش اور رشوت درکار ہوں گی...... ہزاروں لاکھوں نوجوان ڈگریاں ہاتھ میں لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں...... تاخیر یا ناکامی کی صورت میں اپنے والد کے کاروبار تک ہی محدود ہو کر رہ جاؤ گے...... تو کیا بہتر نہیں کہ میری اس نئی ٹیم کا حصہ بن جاؤ۔'' وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا بہتر مستقبل تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے...... میری طرف سے تمہیں بہترین پیکیج ملے گا۔ کسی قسم کی کوئی معاشی پریشانی نہیں ہوگی۔''

معیز کی خاموشی میں نیم رضامندی کی جھلک رہی تھی۔

''میں جلد ہی آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا سر!''

''گڈ! مجھے یقین ہے کہ تمہارا فیصلہ خود تمہارے اور ہم سب کے لیے بہت مثبت ثابت ہوگا۔'' اس نے پُراعتماد مسکراہٹ سے اسے جانے کا اشارہ کیا اور سگار سلگا لیا۔

☆☆☆

معیز کے چہرے پر موت کی سی سنجیدگی طاری تھی۔ اسے ڈارک ہنٹر کے اس مطالبے کے پسِ منظر میں کسی گہری سازش یا دشمنی کے تانے بانے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب ارسلان اپنے دو اہم ترین پروجیکٹس کی تیاری میں مشغول تھا، اس نئے پاکھنڈ کا سامنے آنا اسے بری طرح ہولا رہا تھا۔ اپنا مستقبل بھی اسے انتہائی مخدوش نظر آنے لگا تھا۔

قسمت کی ستم ظریفی نے اسے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ خوابوں کی تعبیر کے پیچھے لپکتا تو دشمن اس کی شہ رگ بآسانی دبوچ لیتا۔ دوسری طرف ایک جواں سالہ بہن اور بوڑھے والدین کو کسی بارسوخ اور بے ضمیر دشمن کی حیوانیت کی بھینٹ چڑھا دینا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

وہ کوئی دیومالائی کردار نہ تھا جو چشم زدن میں اپنے اس نادیدہ دشمن کو ڈھونڈ کر کشتوں کے پشتے لگا دیتا اور پھر

ساری زندگی چین کی بنسی بجاتا رہتا۔ وہ ایک عام انسان تھا اور کسی بھی عام انسان پر جب کوئی ایسی افتاد آن پڑے تو وہ سب سے پہلے اپنی ذات پر اعتماد کھو دیتا ہے۔

معیز اس وبال سے نکلنے کے تمام راستے سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کر چکا تھا اور پھر بالآخر ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

وہ ایک بڑا ہال نما کمرا تھا جس کی دیواریں بالکل سپاٹ اور چھت قدرے بلند تھی۔ مشرقی دیوار میں ایک الماری موجود تھی جہاں کچھ دفتری فائلز اور جدید کمپیوٹر اسیسریز رکھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ مغربی جانب ایک پروجیکٹر اسکرین نصب تھی۔

ہال کی ڈھیروں کرسیوں میں اس وقت صرف دو ہی نشستوں پر انسانی وجود نظر آرہے تھے۔ سفاری سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے سامنے رکھے کاغذات کا انتہائی عمیق مشاہدہ کرنے میں مشغول تھا۔

اس کے مقابل ایک جوان العمر خاتون بیٹھی تھی جو اپنے لیپ ٹاپ پر بڑی سرعت سے انگلیاں چلانے میں مصروف تھی۔ اس کے نقوش میں غیر ملکی جھلک کے سوا کچھ بھی نامانوس نہیں تھا۔ وہ روایتی مقامی لباس میں تھی اور اپنا سر ایک اسکارف سے ڈھانپ رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے وہ کرسی کی پشت پر نیم دراز ہو گئی اور دائیں کلائی پر بندھی ایک نازک و بیش قیمت گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

''اتنی تاخیر تو کبھی نہیں ہوئی آج تک؟''

اس کی بات پر ادھیڑ عمر شخص کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر مزید تناؤ پیدا ہو گیا، وہ اپنی کھردری آواز میں بولا۔

''یہاں اس میٹنگ کی کوئی تک بنتی ہی نہیں تھی۔''

''کیوں؟ یہاں کیا مسئلہ ہے آخر؟ ہمارا ورک پلیس ہے آخر یہ۔'' عورت نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں مسئلہ نہیں مائی ڈیئر! مسائل کے انبار ہیں...... اب یہی دیکھ لو کہ سی۔ون نے دو بجے یہاں موجود ہونا تھا لیکن ڈھائی بجنے والے ہیں وہ تاحال نہیں پہنچ سکا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ کہیں ٹریفک میں الجھا ہوگا۔' وہ اسے نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

وہ اس کی آنکھوں کی ان کیفیات کا مطلب خوب سمجھ رہی تھی تاہم اس وقت وہ اسے بالکل شہ نہیں دینا چاہتی تھی اس لیے ذرا رکھائی سے بولی۔

''ہم اس وقت آفیشل میٹنگ میں ہیں سی۔ٹو۔ لہٰذا اپنے جذبات قابو میں رکھو۔ ورنہ میں سی۔ون سے تمہارے اس غیر ذمے دارانہ رویے کی رپورٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔

''لگتا ہے دل بھر گیا ہے مجھ سے تمہارا اب۔'' اسے طیش آنے لگا۔

اسی پل ہال میں لگا سرخ بلب روشن ہوا اور وہ چونک کر بیٹھ گئے۔ مشرقی سمت میں واقع دروازہ بے آواز کھلا اور ایک بھاری بھرکم چہرے اور مضبوط جسامت والا شخص اندر داخل ہوا۔ چوڑا جبڑا اور تیز چمکتی آنکھیں اس کی سفاک طبیعت کی آئینہ دار تھیں۔ وہ نیلے رنگ کے عمدہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ کلائی پر ہیرے جڑی گھڑی اور ٹائی پن کی جگہ نظر آتا تراشیدہ زمرد اس کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بالوں کو مکمل سفیدی نے برف کی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا سربراہی کرسی پر بیٹھ گیا اور گلا کھنکھارتے ہوئے نرم آواز میں بولا۔

''تاخیر کے لیے معذرت! آج میں نے چند خاص نکات پر بریفنگ کے لیے یہ ہنگامی میٹنگ طلب کی ہے۔'' اس کی آواز چہرے کے تاثرات سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔

''یس چیف۔ آپ کی ہدایات کے مطابق میں مطلوبہ سارا ڈیٹا یہاں لے آئی ہوں۔'' سی۔تھری ماریہ نے مودبانہ انداز میں کہا۔

وہ تینوں ایک غیر ملکی خفیہ ایجنسی کی ذیلی شاخ کے ایجنٹس تھے جنہیں ان کے اعلیٰ حکام نے چند مخصوص ایشیائی ممالک کا تعلیمی نظام دھیرے دھیرے نامحسوس طریقے سے کیموفلاج کرنے کا خصوصی ٹاسک سونپ رکھا تھا۔

سی۔تھری اس کمیٹی کی اہم ترین فعال رکن تھی جو ایک معروف غیر ملکی پریس کی شائع کردہ کتابوں کی رضاکارانہ ٹرینر کے روپ میں اکثر تعلیمی اداروں کے دوروں میں مصروف رہتی تھی۔ مقامی لب ولہجہ اور حلیہ اس کے لیے انتہائی کامیاب آڑ تھی۔ مختلف ورکشاپس میں اپنی تبدیلی مذہب اور ان ممالک کی خدمت کا پرچار اسے بہت کامیاب ایجنٹ بنائے ہوئے تھا۔

سی۔ٹو ڈاکٹر شیفرڈ ان اداروں کی نوجوان نسل میں نشہ آور ادویات کی ترویج کے لیے مامور تھا۔ سی۔ون کا اصل نام ومقام کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ ہمیشہ کسی بھی مقام

اور صورت میں انہیں ٹریس کرلیا کرتا تھا۔

ی۔ ون اپنے سامنے پھیلے کاغذات کے مشاہدے کے دوران بے چین دکھائی دینے لگا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال گہرا ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذات سے نظریں اٹھائیں اور گمبھیر سنجیدگی سے بولا۔

''گڈ جاب! تمہاری کارکردگی اب تک لاجواب رہی ہے۔ لیکن میں رفتار سے بہر حال مطمئن نہیں ہوں۔''

''کیا مطلب چیف؟ کہاں کمی محسوس ہوئی ہے آپ کو؟'' ماریہ فوراً الرٹ ہوگئی۔

''انہیں ترسیل کردہ کتابوں کا مواد بدلنا ہوگا۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے...... ان کی کتابوں سے حتی الامکان مقامی ہیروز اور مذہبی رہنماؤں کا تعارف ختم کرواور متبادل کے طور پر غیر ملکی سائنسدانوں اور مشہور شخصیات وغیرہ کے نئے ابواب شامل کرو۔ ان کی نسلِ نو کا تعلق اپنے ماضی سے ختم کر دینا انتہائی ضروری ہوگیا ہے۔'' اس نے ماریہ کو ایک ٹائپ شدہ کاغذ تھماتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ٹاسک کی کیا صورتِ حال ہے ڈاکٹر؟'' اس نے اپنی مخصوص ٹون میں شیفرڈ کو مخاطب کیا جو اب بالکل بھیگی بلی بنا نظر آرہا تھا۔

اس نے بھی مؤدبانہ انداز میں چند کاغذات اس کی جانب بڑھا دیے جن پر پھیلے اعداد و شمار اور حروف نے اس کی آنکھوں میں اطمینان کے ہلکے سے رنگوں کے بعد واضح بے اطمینانی دوڑا دی۔

''تمہاری کارکردگی بھی دو تہائی سے پھیر سے آگے نہیں بڑھ رہی۔ کیا میں اسے تمہاری نااہلی سمجھوں؟'' ڈاکٹر شیفرڈ ایک بار کے لیے ہکلا گیا۔

''نہیں چیف! ایسا کچھ نہیں۔ میری ٹیم سو فیصد کارکردگی دے رہی ہے۔''

''تو پھر یہ باقی ایک تہائی تمہاری ادویات کے ثمر سے اب تک محروم کیوں ہیں۔ انہیں تا حال زیر کیوں نہیں کیا جا سکا؟''

''ان کے خاندانی پس منظر اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں چیف! انہیں احساس ذمے داری اور محبت کے انجکشن لگا کر پروان چڑھایا جاتا ہے جس کے طفیل یہ ہمارے اثرات سے مستفید نہیں ہو پاتے۔''

''یہ کوئی قابلِ قبول توضیح نہیں ہے ڈوک۔ اپنی ترغیبات میں اضافہ کرو...... ہائی کمان کی جانب سے اس کمیٹی کی کارکردگی تیز تر کرنے کے بہت سخت احکامات

موصول ہو رہے ہیں اور کسی بھی قسم کی تاخیر اب قابل برداشت نہیں ہوگی...... انڈر اسٹینڈ۔"

"یس چیف!" دونوں بیک زبان بولے۔

"اپنے اسٹیشن چیفس پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالو...... انہیں مہیا کی گئی مراعات میں کمی کی تنبیہہ کرو...... مجھے ہر ادارے سے سو فیصد نتائج درکار ہیں۔" سی۔ ون کا جلالی موڈ انہیں صورت حال کی سنگینی کا بخوبی احساس دلا رہا تھا۔

"اور اگر کوئی سٹیشن چیف اپنی حدود سے تجاوز کرے یا اپنی خوابیدہ حب الوطنی کے زیرِ اثر کوئی بھی مسئلہ کھڑا کرے یا ہماری ترغیبات سے منہ موڑنے کی جسارت کرے تو......" شیفرڈ نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اب یہ بھی میں بتاؤں؟ فائر کر دو اسے...... بلا تاخیر...... جن اداروں کے انتظامی عہدیداران ابھی تک ہماری ٹیم کا حصہ نہیں بن پائے انہیں بھی فی الفور ٹھکانے لگا دو۔ انہیں قائل کرنے میں وقت کے زیاں سے بہتر ہے اپنے قابلِ اعتماد ٹیم ممبرز ان کی جگہ بٹھا دیے جائیں۔ انہیں فائر کے لیے مقامی افراد ہی کو سامنے رکھا جائے...... ان اداروں میں چڑیا بھی پر مارے تو صرف ہماری مرضی سے۔"

اس نے دوٹوک انداز میں کہہ کر میٹنگ برخاست کر دی۔

☆☆☆

"کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟" ارسلان شاہ نے معیز کو اپنے دفتر میں طلب کرنے کے بعد پوچھا۔

"میرے پاس آپشن بھی کوئی نہیں ہے اس لیے مجھے آپ کی پیشکش قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہارے لیے اس سے بہترین آپشن کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا۔" ارسلان مسکرایا۔ "مگر اب میں نے اپنے منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے۔ میں میگزین کے بجائے نیوز چینل لانچ کرنا چاہتا ہوں۔ الیکٹرونک میڈیا عوام وخواص کے لیے زیادہ زود اثر ہوتا ہے۔"

معیز اس کے خوابوں کی چمک سے متاثر ہو رہا تھا لیکن سر پر لٹکتی تلوار نے دل و دماغ میں ایک ایسی خلش پیدا کر دی تھی جس کا کوئی مداوا اسے کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ارسلان کی نظروں سے اس کی یہ گم صم کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس نے نرمی سے استفسار کیا۔

"اینی پرابلم ینگ مین؟"

"نو سر...... ناٹ ایٹ آل...... ناٹ ایٹ آل!" اس نے فی الفور تمام خیالات ذہن سے جھٹک دیے۔

"تو پھر اس خاموشی کی وجہ؟"

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کے اعتبار و یقین کی کسوٹی پر جانے پورا اتر پاؤں گا کہ نہیں؟" اس نے معصومیت سے اپنی الجھنوں کو بہترین آڑ دی۔

ارسلان کی پیشانی پر ناگواری کے واضح بل نظر آنے لگے اور خاموشی کے ایک بوجھل وقفے کے بعد وہ اپنی ناگواری دباتے ہوئے تحمل سے بولا۔

"یہ اصل میں تم نہیں بلکہ تمہارے اندر برسوں سے نمو پانے والا احساسِ کمتری بول رہا ہے۔ تم اس بہترین ادارے میں اپنے بل بوتے پر پڑھنے آئے، اس کے بعد یہاں کے روایتی ماحول میں بھی تم نے اپنی انفرادیت قائم رکھی، اپنے سامنے آنے والے ہر چیلنج سے نبرد آزما ہوتے گئے، میڈیا سوسائٹی میں بے مثال کارکردگی دکھائی...... اور آج جب ان صلاحیتوں کے باعث ایک شاندار مستقبل تمہارا منتظر ہے، تم اسی ہراس میں مبتلا ہو کہ یہ انعام تمہارا حق ہے بھی کہ نہیں؟" معیز اس تفصیلی تجزیے پر خاموش رہ گیا۔

"میرا تم سے کوئی بھی ذاتی مفاد منسلک نہیں ہے۔ میں تمہارے ٹیلنٹ کی بنیاد پر یہ موقع فراہم کر رہا ہوں۔ ورنہ تمہارے بیک اپ کے لیے مجھے بیسیوں نوجوان میسر آسکتے ہیں۔ جو ان الجھنوں کا شکار نہیں ہوں گے جنہیں تم نے اپنی بیڑیاں بنا رکھا ہے...... ہاں مگر کیا تمہیں کوئی ایسا موقع میسر آئے گا؟"

"نہیں آئے گا۔" اس نے اپنی دلی کیفیت پر بمشکل قابو پایا۔

"بی یور سیلف...... بیسٹ آف لک۔"

☆☆☆

ادارے کے قیام اور چینل لانچ کرنے کے لیے کاغذی کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ارسلان شاہ نے اس مقصد کے لیے ایک الگ دفتر بنایا تھا جس میں معیز کے لیے بھی ایک کیبن مخصوص تھا۔ شب و روز کے اس ساتھ سے ان دونوں میں تکلفات کی دیواریں ڈھے رہی تھیں۔ اس کی نجی زندگی کے کئی گوشے تاحال مخفی تھے اور معیز صرف اسی قدر جان پایا تھا کہ اکلوتے بھائی کی موت کے بعد ارسلان کا طرزِ زندگی بدلنے کے باعث بیوی نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

چند ہی روز بعد اسے ڈارک ہنٹر کا فون ایک بار پھر موصول ہوا اور اس نے واضح الفاظ میں اسے الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا۔

"صرف ایک ہفتے کا وقت ہے اب تمہارے پاس...... اس کے بعد میں تمام ثبوت کسی نہ کسی میڈیا رپورٹر کے حوالے کردوں گا۔"

معیز نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک منصوبہ ترتیب دے لیا۔ اسلحے کی بابت صفدر محمود کی ٹریننگ کلاسز کے دوران اسے خاصی معلومات میسر آچکی تھیں۔ اس نے چور بازار سے ایک سائلینسر لگا بریٹا پسٹل خرید لیا۔ وہ کسی بھی ماؤزر، پسٹل، ریوالور یا رائفل کے استعمال کے بجائے اس زنانہ پستول سے اپنے دفاع کا رستہ محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

ارسلان کے معمولات سے واقفیت کی بدولت اسے علم تھا کہ وہ چھ بجے بلاناغہ جاگنگ کے لیے جاتا ہے۔ اس نے اسی وقت پر اسے ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دو دن ساڑھے پانچ بجے کے بعد وہ اس کی ریکی کرتا رہا۔ جاگنگ کے دوران اسے ملنے والے افراد اور واپسی پر اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے اوقات اس نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیے۔ وہ کسی بھی غلطی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

چوتھے دن اس نے اپنی بائیک کی نمبر پلیٹ اتار کر اس پر شوخ سے اسٹیکر چسپاں کردیے تاکہ اس کی پہچان بھی ممکن نہ رہ سکے۔ اپنے چہرے کو ہیلمٹ میں چھپا کر وہ اپنی منتخب کردہ جگہ پر پہنچ گیا تھا۔

ارسلان اپنے مقررہ وقت کے مطابق چھ بج کر پچاس منٹ پر وہاں سے روانہ ہوا۔ معیز نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور اس کی دائیں ٹانگ پر فائر کردیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا تو اس نے دوسری گولی اس کے سینے پر چلانی چاہی لیکن عین موقع پر اس کی آنکھوں میں نمی نے ایک دھند کی چادر تان دی۔ اس نے بنا سوچے سمجھے دو فائر کردیے جو ارسلان کے بائیں بازو اور شانے میں پیوست ہوگئے۔

پارک میں موجود لوگ اسے لہولہان دیکھ کر اس کے گرد جمع ہوگئے اور اسی کی گاڑی میں اسے فوراً اسپتال لے گئے۔ معیز کو اپنی بربادی اب واضح نظر آنے لگی تھی، وہ ایک بہترین موقع گنوا چکا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ جانے کتنی دیر اپنے سر پر پانی انڈیلتا رہا لیکن اعصاب پر چھائی شکستگی کسی طور قابو میں نہیں آرہی تھی۔ کمرے میں واپسی تک وہ اپنے فون پر آٹھ کالز مس کرچکا تھا۔ اس نے کسی ٹرانس کے عالم میں نویں کال اٹھائی۔ وہ ڈارک ہنٹر کی لعن طعن کے لیے اپنا ذہن تیار کر چکا تھا۔

"اپنی مشکلات میں اضافہ تو کوئی تم سے سیکھے۔" اس کی غراہٹ نے معیز کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا دی۔

"میں نے پوری کوشش کی تھی......"

"خاک کوشش کی ہے...... اب اس کے گرد تربیت یافتہ گارڈز کی فوج نظر آیا کرے گی۔" اس کی منطقی توجیہہ پر معیز کو اپنی اس کشمکش پر مزید ملال ہونے لگا۔

"مجھے ایک موقع اور دے دو...... میں کوئی رستہ نکال لوں گا۔" اس التجا کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔

"اپنے یہ ڈائیلاگز بند کرو اور میری بات کان کھول کر سنو۔" اس کے درشت الفاظ نے معیز کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ کردیا۔ "کل تمہیں ایک پارسل موصول ہوگا...... تمہیں اس میں موجود پیکٹ اسپتال میں عیادت کے لیے جا کر ارسلان کو تحفتاً پیش کرنا ہے...... اس کام میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تمہارے پاس۔"

"میں اس بار کوئی غلطی نہیں کروں گا۔" معیز نے اس سے زیادہ خود کو یقین دہانی کروائی۔

"گڈ فار یو۔" ڈارک ہنٹر نے فون پٹخ دیا۔

☆☆☆

اگلی صبح اسے بذریعہ کوریئر ایک پارسل موصول ہوا۔ اس نے پارسل پر موجود ایڈریس دیکھے بنا ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ یہ سب کوائف فرضی ہوں گے اور اب اپنی ایسی کسی بھی کوشش سے وہ اپنی مشکلات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

اس پارسل سے ایک سگار بکس برآمد ہوا تھا جو ہوبہو ارسلان کے ذاتی بکس جیسا تھا۔ وہ بالکل سمجھ نہ پایا کہ اسے بطور تحفہ ارسلان تک پہنچا کر ڈارک ہنٹر کیا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ وہ دوپہر کے اوقات میں اسپتال پہنچا تو ارسلان کے کمرے کے باہر گارڈز کا پہرا نظر آتے ہی وہ کچھ بے چینی کا شکار ہوگیا۔

ایک مختصر شناختی پریڈ کے بعد اسے اندر بھیج دیا گیا جہاں اس کا "محسن" سفید پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے نقاہت کے باوجود خوشدلی سے اس کا استقبال کیا اور اپنی غیر حاضری میں اسے مزید ذمے داریاں سمجھانے لگا۔

"بس کیجیے سر! آپ کو یہاں ہمیشہ کے لیے نہیں

رہتا...... یہ سبھی کام میں آپ کی زیرِ نگرانی کرنے کو فوقیت دوں گا۔" معیز نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"زندگی کا کیا بھروسا ہے بھئی! اگر یہ شانے میں لگی گولی ذرا نیچے اتر آتی تو آج میرا رام رام ہو چکا ہوتا۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"کس کی حرکت ہو سکتی ہے یہ؟"

"خدا جانے...... پولیس کو ٹارگٹ کلنگ کا خدشہ ہے۔" اس نے بے نیازی سے سر جھٹکا اور پھر ایک فوری خیال کے تحت کہنے لگا۔

"مجھے کل اسلام آباد میں کچھ کاغذات جمع کروانے ہیں، نیوز چینل کے سلسلے میں۔ میرا جانا تو اب ناممکن ہی سمجھو...... اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو تم چلے جاؤ۔"

"کیوں نہیں سر! میں ضرور جاؤں گا۔" اس نے یقین دہانی کروائی اور پھر ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں آپ کے لیے کچھ لے کر آیا ہوں...... اگر آپ قبول کرنا چاہیں تو۔"

"ضرور قبول کروں گا بھئی۔"

معیز نے سگار بکس اسے تھما دیا۔ ارسلان کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ بکھر گئے۔

"بہت شکریہ تمہارا...... میں واقعی ان کی کمی بہت محسوس کر رہا تھا۔ لیکن انہیں یہاں سے ڈسچارج کے بعد استعمال میں لاؤں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

اسی پل ارسلان کے کچھ مزید ملاقاتی آ گئے۔ اس نے معیز کو کاغذات کے سلسلے میں ضروری ہدایات دے کر اپنے ٹریول ایجنٹ کا نمبر دے دیا۔ الوداعی کلمات کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

روانگی سے قبل بھی ارسلان نے اسے فون پر کئی ایک ہدایات دی تھیں۔ وہ اسی شام اپنی صوابدید پر ڈسچارج ہو کر اپنا علاج ذاتی ڈاکٹرز سے گھر میں ہی کروانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن ابھی وہ کوئی بھی طویل سفر اختیار کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

اسلام آباد پہنچ کر بھی وہ مسلسل اس سے رابطے میں رہا۔ یہاں معیز کی مصروفیات میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، وہ اپنی ہر میٹنگ کی پل پل خبر ارسلان کو شام کے بعد فون پر دیتا تھا مگر تیسرے دن اس کے تمام رابطے یکدم منقطع ہو گئے۔ معیز نے آفس کے نمبر پر بھی بہتیری کوشش کی لیکن ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آسکا۔ ارسلان شاہ کا غیاب اس کے خدشات کو ہوا دینے لگا تھا۔

اس روز تھکاوٹ کے باعث وہ ہوٹل پہنچتے ہی سو گیا۔

اگلے دن صبح ناشتے سے قبل ٹی وی چینلز بدلتے ہوئے ایک خبر پر نظر پڑتے ہی اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ارسلان کا گھر کسی آتش گیر مادے کے پھٹنے کے باعث خاکستر ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں اس سمیت تین افراد موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔ معیز کے گرد و در و دیوار گھومنے لگے اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بستر پر ہی گر گیا۔ ارسلان کی موت متوقع سہی لیکن اسے بری طرح جھنجوڑ گئی تھی۔

ایک ہمدرد، خدا ترس بہترین دماغ اپنے خوابوں سمیت نابود ہو گیا تھا......

اس حادثے کے بعد پولیس نے اسے بھی اپنی تفتیش میں شامل کر لیا لیکن اس کی غیر موجودگی کے شواہد اس قدر مضبوط تھے کہ اس کی راہیں خود بخود آسان ہوتی گئیں۔ ارسلان شاہ کے ساتھ لقمۂ اجل بننے والے افراد کے بارے میں تفتیشی ٹیم کوئی بھی بیان نہیں دے رہی تھی۔ بریت اس کے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھی۔

عجب مقتول تھا وہ...... اپنے قاتل کے بچاؤ کا سامان خود ہی پیدا کر گیا تھا۔

☆☆☆

زندگی معیز بیگ کو ایک بار پھر اسی مقام پر لے آئی تھی جہاں سے اسے اپنا سفر دوبارہ شروع کرنا تھا۔ مگر اب اس مسافت میں کوئی سایۂ دیوار تک نہ تھا۔ ریزہ ریزہ خوابوں کی کرچیاں اس کے وجود کو لہولہان کر چکی تھیں۔

پہلے نمرہ اور پھر ارسلان شاہ...... اس کی زندگی کو نئی جہتیں دینے والے دونوں منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے تنہا چھوڑ گئے تھے۔ نمرہ کی کمی دل کی کسک تھی تو ارسلان سے محرومی ایک خلش۔ اس چھتنار درخت کے سائے سے اس کے باعث ہزاروں افراد محروم ہو گئے تھے۔ یہ احساس اسے دن رات کچوکے لگاتا تھا۔

کچھ دن گزرنے کے بعد اسے 'ڈارک ہنٹر' کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا...... "اب تم آزاد ہو۔"

اس چند حرفی جملے نے اس کے دل و دماغ پر کہر جما دیا۔ اس آزادی کے عوض اس کی روح کو ایک ایسا روگ لگ گیا تھا جو کہیں گہرائی میں پنجے گاڑے اسے ریشہ ریشہ ادھیڑ تار رہا تھا۔ تاریکی کا وہ شکاری جانے کس سمت سے اس کی زندگی میں در آیا تھا اور اسے بھی تاریک راہوں میں

دھکیل کر اسے نابود ہوا گویا لا وجود تھا۔

اپنے وجود کو مزید شکست و ریخت سے بچانے کے لیے اس نے معروفیات کے انبار میں خود کو قید کر لیا۔ دل کے نہاں خانوں میں اپنے 'جرم کی گرفت' کا خوف اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے مقابلے کا امتحان پاس کر کے پولیس فورس میں بھرتی کا فیصلہ کر لیا۔

اسی پر اکتفا نہ ہوا تو ایک نجی ادارے میں کامرس کی تدریس کا آغاز بھی کر دیا۔ اس جاب اور اپنی پڑھائی میں وہ بیس سے بائیس گھنٹے لگاتار کام کرتا۔ وہ بری طرح بے خوابی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ ان چند گھنٹوں کی نیند میں اسے تین آتش گزیدہ، بدہیئت ہیولے اپنی سرخ زبانیں نکالے اپنی طرف لپکتے محسوس ہوتے اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔

ملال و پچھتاوے اب حد سے سوا ہونے لگے تھے۔ انہی دنوں انعم کی شادی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا۔

☆☆☆

انعم کے لیے صادق بیگ کے ایک دیرینہ دوست نے اپنے بیٹے کے لیے دستِ سوال دراز کیا تھا۔ محمد نبی کا خاندان اسی شہر میں برسوں سے آباد تھا لیکن اس کا بیٹا محمد طلحہ روزگار کے سلسلے میں کراچی میں رہتا تھا۔ صادق بیگ اور رقیہ برسوں کی اس شناسائی کی بدولت رسمی سوچ بچار کے بعد انہیں 'اقرار' کہلوا دینا چاہتے تھے لیکن معیز خود ایک بار طلحہ سے ملنے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔

''میرا برسوں پرانا دوست ہے محمد نبی! مجھے اس پر مکمل اعتماد ہے بیٹا۔'' صادق آخر وقت تک اسے یہی کہتا رہا۔

''بالکل ہوگا اعتماد...... میں اس اعتماد پہ کوئی انگلی نہیں اٹھا رہا...... لیکن میں ایک بار خود اپنی تشفی کرنا چاہتا ہوں۔ طلحہ ان کا بیٹا ہے اور کبھی والدین کو اپنی اولاد بے عیب ہی نظر آتی ہے۔'' اس کی متانت و سنجیدگی نے صادق بیگ کا سینہ فخر و انبساط سے لبریز کر دیا۔

''چلو جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔'' وہ اسے شفقت سے نہارتے چلے گئے۔

معیز اگلے ہی دن کی ٹکٹ کٹوا کر کراچی روانہ ہو گیا۔ طلحہ سے ذاتی ملاقات سے قبل وہ اس کے کردار و شخصیت کے بارے میں مکمل اطمینان حاصل کر چکا تھا۔ بالمشافہ ملاقات میں بھی وہ اسے اپنی بہن کے لیے بالکل موزوں نظر آیا تھا۔ اس نے صادق کو فون کر کے اس رشتے کو سندِ منظوری عطا کرنے کا عندیہ دے دیا۔

طلحہ سے ملاقات ہونے کے بعد وہ فوری واپسی کا خواہشمند تھا لیکن اس نے بہت محبت بھرے اصرار سے معیز کو کچھ دن کے لیے روک لیا اور کہنے لگا۔

''کراچی آ کر آپ یہاں کے تفریحی مقامات کے دیدار سے محروم رہیں، ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟''

اگلے دو دن وہ اس کے ساتھ سی ویو، مزارِ قائد وغیرہ کا دورہ کر چکا تھا لیکن تیسرے دن اپنے دفتر میں ہنگامی میٹنگ کے باعث وہ مصروفیت میں گھر گیا تھا۔ معیز نے اس شام خود ہی شہر گردی کا فیصلہ کر لیا۔

اپنے ایک کولیگ سے اس نے کراچی کی ''اولڈ بک مارکیٹ'' میں چھپے نادر کتابوں کے ذخائر کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس نے ٹیکسی کے ذریعے وہیں کا رخ کیا۔ کتابوں کی اس دنیا میں کھوئے کتنا وقت گزرا اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ ہوش تو تب آیا جب اس نے اپنی پشت پر ایک مانوس آواز میں چند فقرے سنے۔

''ان کتابوں کا بل بنا دیجیے۔''

وہ کرنٹ کھا کر پیچھے مڑا تو.... عبایہ میں ملبوس ایک خاتون کی پشت اپنی جانب پائی۔ اس قد کاٹھ اور آواز کو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ آواز تاریک راتوں میں جگنوؤں کی طرح اسے جینے کا حوصلہ دیا کرتی تھی۔ اس نے بھی فوراً اپنی کتابوں کی ادائیگی کی اور ایک مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ دل و دماغ میں ایک حشر برپا ہو چکا تھا۔

وہ نقاب پوش خاتون پیدل ہی تنگ گلیوں اور ٹیڑھے میڑھے رستوں پر چلتی جا رہی تھی۔ معیز نے بہت مہارت سے اس کا تعاقب جاری رکھا اور بالآخر وہ ایک نچلے درجے کی بستی میں سال خوردہ گھر کے سامنے جا رکی۔

معیز کچھ دیر اس گلی کے نکڑ پر کھڑا رہا اور پھر اپنی تیز تر ہوتی دھڑکنوں پر قابو پاتا اسی گھر کی طرف چل دیا۔ دروازے پر دستک کے بعد اسے اندرونی جانب سے قدموں کی چاپ اپنے ذہن پر کسی بھاری گرز کے مانند لگ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور کائنات کی گردش تھم سی گئی۔

معیز کے سامنے نمرہ عاقب کھڑی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں ساکت نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ

رہے تھے۔ یہ لمحہ دونوں ہی کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ سابقہ سنسنی اور بے یقینی ختم ہوئی تو طیش کی ایک لہر نے معیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے ٹھوکر مار کر دروازہ مکمل کھولا اور آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے نمرہ کے بالوں کو دبوچ لیا اور کراہ کر بولا۔

''تم زندہ تھیں نمرہ...... میرے ساتھ اپنی موت کا وہ بھیانک کھیل رچا کر یہاں اپنی زندگی جی رہی ہو...... میں وہاں ہر پل ایک نئی موت مرتا رہا...... اور تم یہاں......''

شدتِ غم سے وہ اپنی بات پوری نہ کر پایا اور اسے بالوں ہی سے دھکیلتا گھر کے صحن میں لے گیا۔

''چھوڑ دو مجھے معیز۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

''کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا...... اور وہ ڈارک ہنٹر...... وہ کون تھا...... کون تھا وہ نمرہ؟؟'' وہ حلق کے بل چلّایا۔

''میں تھا ڈارک ہنٹر...... چھوڑ دو نمرہ کو۔'' اس کے عقب سے ایک شستہ آواز ابھری۔

معیز جھٹکے سے مڑا اور اس آواز کے مالک کو دیکھ کر جھرجھرا کر رہ گیا...... وہ واقعی ''ڈارک'' ہنٹر تھا۔

جگہ جگہ سے کٹی پھٹی اور جھلسی ہوئی جلد کے نیچے سے جھانکنے والے مندمل زخم اور چربی کے نشان عجیب کراہیت کا احساس پیدا کر رہے تھے۔ وہ مختصر الوجود شخص وہیل چیئر پر بیٹھا تھا جس کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کٹ چکی تھیں۔ اس کی حالتِ زار دیکھ کر معیز کو اس کے نام سے وابستہ اپنا خوف اور دباؤ یاد آیا تو وہ خود پر اور اپنی کم ہمتی پر نفرین بھیجنے لگا۔

''تم اندر جاؤ سجاد...... میں اس سے نمٹ لوں گی۔'' نمرہ نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

''میں یہیں رہوں گا نمرہ...... تم اسے بیٹھک میں لے جاؤ۔'' اس کی آواز میں ایک مستقل کرب پنہاں تھا جو مقابل کے دل کو پگھلانے لگتا تھا۔

نمرہ اسے لیے ایک سادہ سے کمرے میں آ گئی۔ اس کے انداز میں جھلکتی بے نیازی معیز کے دل کو مزید سلگا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے ناخن کریدتی الفاظ مجتمع کرتی رہی اور پھر اس کا ہاتھ تھامے ماضی کے جھروکوں میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

زندگی کا حُسن کیا ہے؟

اگر کوئی یہ سوال نمرہ عاقب سے پوچھتا تو وہ بڑے فخر و مان سے اپنی زندگی کا حوالہ دیتی۔

زندگی گزارنے کے لیے جو بنیادی آسائشیں درکار ہوتی ہیں وہ سبھی تو اس کے پاس موجود تھیں۔ جان چھڑکتے والدین...... سکون و محبت بھرا ایک سادہ سا آشیانہ اور محبتیں لُٹاتا ایک بھائی۔

نمرہ عاقب کی زندگی اس دنیا میں ہی جنت کا مکمل نمونہ تھی۔ اس کے والدین کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا۔ انہوں نے اپنی تمام تر استطاعت بروئے کار لاتے ہوئے اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے بہت سے خواب دیکھے تھے اور ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تمام وسائل بھی استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا تھا۔

عاقب علی ایک سرکاری ملازم تھا۔ ریلوے کے محکمے میں برسوں سے کام کرنے والے اس شریف النفس انسان کی زندگی میں اپنی اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کوئی تمنا نہیں تھی۔ وفا شعار اور ہمدرد بیوی کے بعد اطاعت گزار اولاد اس کے لیے حاصلِ زیست تھی۔ نمرہ اس کی بڑی بیٹی تھی جس کی قدرتی ذہانت اور محنت کی بدولت وہ ہر سال وظیفہ حاصل کر کے اپنے تعلیمی مدارج بہت سکون سے طے کرتی رہی وگرنہ مہنگے اداروں میں جدید تعلیم کا خواب واقعی ایک خواب ہی بن کر رہ جاتا۔ وہ ہر سال اپنے اعلیٰ ترین تعلیمی نتائج سے والدین کی ہمت ازسرِ نو توانا کر دیتی اور ان کی خوشی و اعتماد میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔

عاقب علی کی زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ اس دن آیا جب اس کی بیٹی نے انٹر کے امتحان میں صوبے بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ میڈیا اور پریس کے کئی ایک نمائندے جب اس کے انٹرویو کے لیے ان کے چھوٹے سے گھر میں آئے تو ان دونوں کے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ کئی نجی اداروں کی جانب سے نمرہ سمیت پوزیشن لینے والے تمام طلبہ کو ان کی من پسند فیکلٹی میں داخلے کے لیے خصوصی مراعات کا اعلان کم از کم عاقب علی کے خاندان کے لیے من و سلویٰ سے کم نہیں تھا۔

اس رات وہ تمام اہلِ خانہ خوشی سے بے حال اور نیند سے کوسوں دور تھے۔ عاقب نے بیٹی سے پوچھا۔

''کس شعبے میں داخلہ لینے کا سوچا ہے ممی؟''

''میں کامرس کا انتخاب کرنا چاہتی ہوں بابا۔''

''اونہوں! انتہائی بور فیلڈ ہے یہ۔ اس میں آگے بڑھنے کا کیا اسکوپ ہے بھلا؟'' اس کے اکلوتے چھوٹے بھائی نے دانستہ ناک بھوں چڑھائی۔

''میڈیکل، انجینئرنگ میں تو سبھی لڑکیاں جاتی ہیں

لیکن میرا ارادہ کامرس میں ڈاکٹریٹ کرنے کا ہے۔'' اس کے مضبوط ارادے چمکتی آنکھوں میں ستاروں کے مانند جھلملا رہے تھے۔

''جو مرضی فیلڈ اختیار کرو نمی! لیکن اپنے والدین کا فخر د غرور کبھی، کسی بھی موقع پر ڈگمگانے مت دینا۔'' پروین نے ہمیشہ کی طرح اپنی بیٹی کو احساس ذمّے داری کا ایک اہم ترین سبق یاد دلایا۔

''ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا...... مجھے آسمان کی بلندیوں کو چھونا ہے۔ اپنے نام کے ساتھ بہت سے اعزازات وصولنے ہیں۔'' اس نے امید و یقین کے جگنو والدین کو تھما دیے۔

''اور آپ کیا کرنا چاہتے ہیں محترم؟'' عاقب علی نے سجاد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

وہ نمرہ سے محض سال بھر چھوٹا تھا اور دونوں میں بلا کی دوستی و ذہنی ہم آہنگی تھی۔

''میری فیلڈ صرف کمپیوٹر اور آئی۔ ٹی ہے۔ سائبر ورلڈ کی تسخیر ہی میرا واحد اور سب سے بڑا خواب ہے۔ اور آپ دیکھیے گا بابا...... یہ نمی تو تیسری پوزیشن پر دم توڑ بیٹھی ہے...... میں پہلی پوزیشن حاصل کروں گا۔'' اس نے بہن کو ایک اور چٹکی بھری۔

''ضرور حاصل کرنا...... میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' نمرہ نے بے حد خلوص و محبت سے اسے کہا تو وہ بھی سب چھیڑ چھاڑ فراموش کر کے مسکرانے لگا۔

☆☆☆

خوابوں کی تکمیل کا سفر جاری ہوا تو نمرہ پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدگی اور لگن سے اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئی۔ اس نے اپنی سہولت کے مطابق ایک نجی ادارے کا انتخاب کیا تھا جس کا تعلیمی نظام بہت شہرت یافتہ تھا۔ بہترین اساتذہ کے ساتھ نے اس کی ذہانت کو کندن کی طرح چمکا دیا۔ ایک عام سے گھرانے کی اس عام سی لڑکی نے بہت جلد وہاں اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ پروفیسرز کی محبت و شفقت اس کے ارادے مہمیز کرنے لگی اور اس کی پرواز بلند تر ہونے لگی۔

اساتذہ بھی اس سے بہت متاثر تھے اور اس کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے لیے اکثر و بیشتر اسے غیر نصابی سرگرمیوں میں شمولیت کا مشورہ دیا کرتے۔ ایک روز اکاؤنٹنگ کی پروفیسر نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد اسے کہنے لگیں۔

''میں ایک عشرے سے اس ادارے کے ساتھ منسلک ہوں...... لیکن آپ جیسی ذہین طالبہ میں نے کسی سیشن میں نہیں دیکھی۔''

''بہت شکریہ میم، یہ آپ سب کی محنت ہی کا اثر ہے۔'' نمرہ نے متانت سے کہا۔

''اپنے ٹیلنٹ کو محض نصابی کتابوں تک محدود نہ رکھو۔ اپنے معیار میں تبدیلی لاؤ۔'' پروفیسر شہلا نے انتہائی خلوص سے کہا۔ ''آپ کی صلاحیتوں کو مزید جلا ملے گی۔''

''یہ سب کیسے ممکن ہے بھلا؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''ممکن کیوں نہیں بھلا؟ یہاں اس ادارے میں کئی سوسائٹیز قائم ہیں...... آپ اپنے ذوق کے مطابق کسی بھی سوسائٹی کی ممبر بن جاؤ...... ذہنی تفریح کے ساتھ پڑھائی میں بھی بہت مثبت تبدیلیاں محسوس کریں گی آپ۔''

''او کے میم، میں آپ کے اس مشورے پر ضرور عمل کروں گی انشاء اللہ۔''

''وِش یو بیسٹ آف لک۔'' پروفیسر نے بھرپور محبت سے کہا۔

☆☆☆

اس کی ڈگری کا پہلا سال نہایت ہموار طریقے سے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتا گزر گیا۔ اس نے پروفیسرز کی ہدایات کے مطابق غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی وقت صرف کرنا شروع کر دیا تھا اور اس نئے مشغلے میں اسے بہت لطف آنے لگا۔ اپنے ہم عمر افراد کی مخصوص سوچ و نفسیات کے عین مطابق اس نے بھی میڈیا سوسائٹی کے انتخاب کو ترجیح دی تھی۔ دیگر ہم عصروں کی طرح وہ بھی یہی گمان پالے بیٹھی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی قوتِ پرواز سے اس دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ٹھہرے گی۔ لیکن بھول گئی تھی کہ بلند پروازی میں تند و تیز ہوائیں، طوفانی جھکڑ اور شرابور کرتی بارشیں حوصلوں کی آزمائش کے لیے ایک لازمی شرط ہوتی ہیں۔ اس کی زندگی کی پہلی آزمائش لیے اس کے در پہ آن پہنچی تھی۔

عاقب علی کا اچانک بیمار ہونا ان سبھی کے لیے ایک ناگہانی آفت ثابت ہوئی تھی۔ آنکھوں میں اترنے والی زردی مائل کیفیت کو وہ معمولی یرقان سمجھ کر دیسی علاج کرواتا رہا۔ لیکن جب یہ زردی چہرے کی رنگت میں گھلنی شروع ہوئی تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مختلف ٹیسٹ کروانے پر ان سبھی کے اعصاب پر گویا بجلی گری تھی۔ اسے آخری درجے کا ہیپاٹائٹس سی تشخیص ہوا تھا۔

زندگی میں اتنا کمایا تو تھا نہیں کہ مشکل وقت کے لیے کسی تجوری کے منہ کھل جاتے۔ تھوڑی بہت جمع شدہ رقم چند دن بھی نہ نکال پائی۔ قضا کے سامنے مجبور ہو کے عاقب علی اپنی ذہین اولاد اور سیدھی سادی بیوی کو دنیا کے تھپیڑوں کے حوالے کر کے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔

ذہانت و حکمت موت کے آگے بے بس ہو گئی۔

عاقب علی زندگی کے اس سفر میں ان کا ایک سائبان تھا۔ اس رشتے سے محروم ہوتے ہی خوابوں کا محل عجب بھدی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ ہر موسم ایک آزمائش بن کر نازل ہونے لگا۔ تب انہیں یہ جان لیوا احساس ہوا کہ اپنی تمام صلاحیتوں اور ذہانت کے باوجود اس دنیا میں بقاء کے لیے ایک طویل اور کٹھن جنگ کا سامنا تھا۔

اور پھر ہولنا کی و تباہی سمیت اس جنگ کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے تیسرے سمسٹر کے اختتام پر ایک ہی خبر زبان زدِ عام تھی۔ ”نمرہ عاقب نے بڑی بُری طرح اس سمسٹر میں مار کھائی ہے۔“

پروفیسرز حیران تھے تو طلبہ بہت خوش و پُرجوش۔ ان کے لیے ایک مثال بن کر تمام ٹیچرز کی زبان پر رہنے والی اس طالبہ کا یہ زوال بہت سے طلبہ کے لیے ایک چٹخارے دار خبر تھی۔ وہ یا لآخر ان کی سطح پر آ گئی تھی۔

اعلیٰ انتظامیہ نے اپنے اصول و ضوابط کے تحت اس کی اسکالر شپ منسوخ کر دی۔ اس ادارے میں متواتر اسکالر شپ کے لیے ہر سمسٹر میں اپنا جی۔ پی۔ اے برقرار رکھنا اولین شرط قرار دی گئی تھی جسے نمرہ نے اب تک انتہائی کامیابی سے پورا کیا تھا...... مگر اب اپنے سائبان سے محرومی کے بعد اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف پینشن میں ماں کے ساتھ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ سجاد بھی اسکالر شپ ہی کی بنیاد پر ایک وفاقی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہیں ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔

وہ اب دو کشتیوں کی مسافر تھی۔ ڈوبنا تو مقسوم تھا۔

ایسے وقت میں جب اپنی پڑھائی کی ذمے داریاں نبھانے میں ناکامی کا سامنا تھا وہاں اب غیر نصابی سرگرمیاں کسی عیاشی سے کم نہ تھیں۔ اس کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی اور خواب بکھرتے جا رہے تھے۔ تبھی دستِ غیب سے اس کے لیے ایک غیر متوقع مدد نے اس کی زندگی میں تبدیلی کی ایک بادِ بہاری کی نوید سنا دی۔ ایک ایسی مدد جو اس کی سوچ اور گمان سے بھی بالاتر تھی۔

وہ تین روز سے یونیورسٹی سے مسلسل چھٹی پر تھی۔ سمسٹر کے ایسے بدتر نتائج کے بعد اسے اپنا مستقبل اندھیروں میں ڈوبتا نظر آ رہا تھا۔

اس شام ارسلان شاہ ان کے گھر چلا آیا تھا۔ اس کی آمد جتنی حیران کن تھی، دوستانہ رویہ اس سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین تھا۔ عوامی لباس میں اپنی خوبرو شخصیت اور جادوئی مسکراہٹ کے ساتھ وہ ان سے یوں بات چیت کر رہا تھا گویا برسوں کی شناسائی رہی ہو۔

”گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں...... لیکن آپ سے اس کم ہمتی کی مجھے توقع نہ تھی۔“

”زندگی جب اپنی آزمائش لینا شروع کرتی ہے تو بلند ہمتی سب سے پہلے چھینتی ہے۔“ مایوسی اس کے ہر انداز میں جھلکنے لگی تھی۔

”آزمائشیں اور مشکلات وقتی ہوتی ہیں...... روتے دائمی ہوتے ہیں۔ انہیں حل بھی تو کیا جا سکتا ہے۔“

”کچھ مشکلات لاینحل ہوتی ہیں سر! ان کے اثرات اصل نقوش سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتے ہیں۔“

”جی۔ پی۔ اے میں تنزلی کوئی ایسا زندگی و موت کا مسئلہ بھی نہیں ہے کہ اس سے مایوس ہو کر ہمت ہار دی جائے۔ اگلے سمسٹر میں اس ساری کمی کا ازالہ بھی تو کیا جا سکتا ہے۔“

اس کے شفیق لہجے سے نمرہ کا دل بار بار بھر آ رہا تھا۔

”مجھے اس بات سے انکار نہیں لیکن اگلے سمسٹر کی فیس میری استطاعت سے باہر ہے۔“

”تو کیا اپنے خوابوں کی منزل سے دستبرداری کی استطاعت ہے آپ میں؟ اپنے مقاصد فراموش کر کے زندگی گزار لو گی؟“ وہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”نہیں...... اس بات کا یارا بھی نہیں ہے۔“ وہ کراہی۔

”میں تمہاری اس سمسٹر کی فیس ادا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن تم اپنا یہ قیمتی تعلیمی سال ہرگز برباد نہیں کرو گی۔“ ارسلان شاہ نے آپ سے تم کا فاصلہ ایک جست میں طے کرتے ہوئے اپنائیت بھری دھونس سے کہا۔

”لیکن ہم پر یہ کرم نوازی کیوں؟“ پروین نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”میں یہ کرم نوازی اپنے کسی بھی ذاتی مفاد کے لیے

نہیں کر رہا، میں نمرہ کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتا ہوں...... اس کی ذہانت ایک اثاثہ ہے اور بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔'' اس کا ٹھہرا ہوا لہجہ دل میں گھر کر رہا تھا۔ ''یہ میرے لیے بالکل میری بیٹی جیسی ہی ہے۔ اور کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو غلط فیصلوں کی بھینٹ چڑھتے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔''

اس نے ایک اور داؤ کھیلا جو اس بار مکمل نشانے پر بیٹھا۔

''میں تمہاری خودداری اور عزتِ نفس کو بھی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔ یہ رقم اپنی سہولت کے مطابق جب چاہو، جیسے چاہو مجھے لوٹا دینا...... اور اگر نہ لوٹا سکو تو بھی میں کبھی تم سے تقاضا نہیں کروں گا۔ میرے میگزین کے لیے تمہارے تخلیقی خیالات ہی اس کا بہترین نعم البدل ہوں گے۔''

اس نے گیند اب نمرہ کے کورٹ میں پھینک دی تھی جو اپنی قسمت کی اس یاوری پر اب بھی بے یقینی میں مبتلا تھی۔

''م...... مجھے منظور ہے۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی اور لرزش نمایاں تھی۔

ارسلان شاہ نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

مثبت ذہانت کے حامل افراد کی ایک بڑی کمزوری ہمیشہ ہی ان سے وابستہ رشتے ناتے اور جذبات ہوتے ہیں۔ نمرہ اور اس کی والدہ ارسلان کے اس خلوص سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اس کی جہاندیدہ ماں ارسلان کی آنکھوں سے جھلکنے والی شرافت و انسانیت کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ نمرہ کے سر پر باپ کی طرح ہاتھ رکھ دینے سے وہ ان کے لیے ایک گاڈ فادر بن گیا تھا۔

رواں سمسٹر کے لیے ایک بھاری رقم کی ادائیگی ہونے کے بعد اس کی اپنائیت و محبت نے اس بیس سالہ ناپختہ کار لڑکی کا رُواں رُواں مقروض کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ محنت کرنے لگی تھی۔ اساتذہ اور ساتھی طلبہ کی نظروں میں اپنی گمشدہ ساکھ بحال کرنے سے کہیں زیادہ اہم اس کی اپنی نظروں میں اپنے مقام کی بحالی تھا۔

خودکار قدرتی نظام کے تحت زندگی اپنے معمول پر واپس لوٹنے لگی تھی۔ یتیمی کی کڑی دھوپ کی موجودگی تو ایک اٹل حقیقت کی طرح اب بھی برقرار تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ اب ان کے وجود یہ تپش سہارنے کے قابل ہو گئے تھے۔

سجاد بھی وفاقی یونیورسٹی میں اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے میں جتا ہوا تھا۔ گھر کے اس اکلوتے مرد سے یہ دوری بادلِ ناخواستہ ہی سہی لیکن برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ہر گزرتے دن نمرہ کو ارسلان شاہ کی سوچ اور منفرد خیالات کا گرویدہ بنا رہے تھے۔ سوسائٹی کے تفویض کردہ کاموں میں اس کی لگن قابلِ دید تھی۔ لاشعوری طور پر اس وسیلے سے اس کے قرض کی ادائیگی کی خواہش اب جنون میں ڈھلنے لگی تھی۔ اور وہ حقیقتاً اس کے کام سے بہت متاثر ہونے لگا تھا۔ اس نے سوسائٹی پریذیڈنٹس کو بھی اس کی بابت خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں اور اس سے براہِ راست رابطہ استوار کر رکھا تھا۔

''ویلڈن نمرہ! تمہارا کام تو پہلے سے مزید نکھر گیا ہے۔ تمہاری محنت لاجواب ہے۔''

''تھینک یو سر! آپ کے اعتماد اور یقین ہی کا اعجاز ہے یہ سب۔''

''اگر ذاتی طور پر کسی بھی قسم کی کوئی مدد درکار ہو تو مجھے بلاجھجک بتا دینا۔''

''آپ نے میرے لیے جو کیا ہے، میں اسی کے لیے بہت ممنون ہوں آپ کی۔''

''میں تمہیں ایک اور اہم ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں نمرہ!'' اس نے محتاط انداز میں بات کا آغاز کیا۔ ''میں طلبہ میں منشیات اور طالبات کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے واقعات میں بڑھتے اضافے کے خلاف مقامی طور پر سب اداروں کے ساتھ ایک سیمینار منعقد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی کلی ذمے داری تمہیں ادا کرنی ہوگی۔''

''میں تیار ہوں سر! آپ کو بالکل مایوسی نہیں ہوگی۔'' وہ اعتماد سے کہہ کر اٹھ گئی۔

اس کام کے لیے نمرہ نے تین دن میں ایک بہترین رپورٹ تیار کر لی تھی۔ چیف کو آرڈی نیٹر اس کی تیار کردہ رپورٹ سے کافی متاثر ہوا تھا لیکن چند ایک نکات سے اختلاف کے باعث اس نے حتمی منظوری بہرحال ارسلان شاہ کی صوابدید پر چھوڑ دی۔

ارسلان دو روز سے دفتری امور کو وقت نہیں دے رہا تھا۔ رواں ہفتے میں آنے والی دو عوامی چھٹیوں کے باعث مزید تاخیر بھی مناسب نہیں تھی اس لیے چیف کوآرڈی نیٹر امجد عزیز نے اس سے فون پر رابطے کے بعد نمرہ کے لیے 'ذاتی ملاقات' کا وقت مقرر کر دیا۔

ارسلان کا گھر یونیورسٹی سے قریب ہی واقع تھا۔ ملاقات کے لیے شام پانچ بجے کا وقت مقرر تھا لیکن جوش اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی وجہ سے وہ چار بجے ہی اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ سبز بیلوں اور رنگ برنگے پھولوں سے لدا یہ خوبصورت بنگلا اسے بہت بھایا تھا۔

گیٹ پر متعین گارڈز کو اس متوقع ملاقات کی خبر پیشگی دی جا چکی تھی تاہم اس کی وقت سے پہلے آمد کے باعث وہ اسے اندر بھیجنے میں قدرے متامل تھے۔ ارسلان چند اہم مہمانوں کے ساتھ ضروری میٹنگ میں مصروف تھا اور اس موقع پر سب کے لیے ''ڈوناٹ ڈسٹرب'' کے علاوہ جائے ملاقات کے گرد 'کرفیو' کا پروانہ جاری ہو جایا کرتا تھا۔

''میں انہیں قطعی ڈسٹرب نہیں کروں گی...... انتظار کر لوں گی مہمانوں کی رخصتی کا۔'' اس کے التجائیہ انداز اور گرمی د پسینے سے شرابور خستہ حال وجود پر گارڈ نے لحاتی غور و فکر کے بعد اسے ڈرائنگ روم میں بھیج دیا تھا۔

''یہیں رہیے گا میڈم بس......'' وہ اسے متنبہ کر کے چلا گیا۔

نمرہ گھر کی سجاوٹ اور دلکشی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر تو وہاں خاموشی سے بیٹھی رہی لیکن پھر... بوریت کی وجہ سے در و دیوار پر نظر آنے والی نادر پینٹنگز کو قریب سے دیکھنے کی خواہش لیے اٹھ گئی۔ ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے اس کی نظر ایک ملحقہ کمرے میں نظر آتی 'کتابوں' پر پڑی...... کتابیں تو ویسے بھی اس کی بہت بڑی کمزوری تھیں...... وہ بلا سوچے سمجھے اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جو ایک ''نوگو ایریا'' تھا۔

ارسلان اپنے مہمانوں کے ساتھ اسی کمرے میں موجود تھا۔ اپنی فاش غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے فوری طور پر وہاں سے پلٹنا چاہا لیکن سماعت میں پڑنے والے چند فقروں نے قدم وہیں جکڑ لیے۔

''مسٹر جمی، اپنی سپلائز میں تیزی پیدا کرو...... یہ بہانے میں بہت عرصے سے سن رہا ہوں۔'' اس غیر ملکی لب و لہجہ میں 'جمی' کا ذکر اسے ساکت کر گیا تھا۔ وہ جمی کی شہرت سے واقف تھی اور یہاں اس کی موجودگی زلزلے جیسے کسی بڑے جھٹکے سے کم نہ تھی۔

''آل رائٹ ڈاکٹر لیکن ان سپلائز میں کمی آپ کے مقرر کردہ نئے نرخ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اپر کلاس کے لیے ان 'ادویات' کی خریداری کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوتی۔ قیمت میں اضافہ درمیانے اور نچلے طبقے کے افراد کی قوتِ خرید متاثر کرتا ہے۔'' جمی کی آواز سن کر اسے اب اپنی قوت سماعت پر کوئی شائبہ نہ رہا تھا۔

''اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔'' ارسلان شاہ کی پُرتفکر آواز نے اس کے ڈوبتے ذہن پر ایک اور ضرب لگائی۔

''کوالٹی میں فرق پیدا کر دو ڈاکٹر...... موخر الذکر افراد کے لیے قیمت کم ہی رکھی جائے لیکن 'دوائی' کے معیار میں فرق پیدا کر کے اپنے منافع کی شرح قائم رکھی جائے۔ اس کمی سے ان طبقات میں طلب کی شرح میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔''

''گڈ آئیڈیا مسٹر شاہ! آپ کا انتخاب ہمارے بہترین فیصلوں میں سے ایک رہا ہے۔'' اسی غیر ملکی آواز نے سراہتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے 'اسپانسر شپ' ٹارگٹ کی کیا تفصیلات ہیں؟''

''اس سلسلے میں 'متاثرین' کو کسی نہ کسی مالی مدد کے ذریعے اپنے کیمپ میں شامل کرنے کا سلسلہ جاری ہے لیکن رفتار بہرحال ابھی کم ہے۔ انہیں مستقبل قریب میں آپ کے ملک میں بھیج دیا جائے گا جہاں ان کی 'برین واشنگ اور تربیت' آپ کے اپنے ہاتھ میں ہوگی' ارسلان کی اس ذو معنی بات کا بین السطور مطلب وہ بخوبی سمجھ گئی تھی اور اپنی سسٹر فیس کی ادائیگی کا اصل مقصد بھی اس کے سامنے آگیا تھا۔

وہ مزید وہاں کھڑی نہ رہ سکی اور الٹے قدموں لوٹ آئی تھی۔ گارڈ کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ گھر سے ہنگامی کال کا بودا بہانہ کر کے وہاں سے ایسے بھاگی تھی جیسے کسی آسیب نے اس کا پیچھا لے لیا ہو۔

ذہن ان انکشافات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ مہذب، شائستہ، نرم خو اور ہر وقت جذبۂ حب الوطنی سے لتھڑے ارسلان شاہ کا یہ اصل روپ اس کے لیے اب بھی ناقابلِ یقین امر تھا۔ وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی...... اور جتنا الجھتی رہی اتنا ہی مزید سوچتی رہی۔ اس سچائی کو برداشت کرنے سے زیادہ کٹھن اس کے دماغ میں پنپنے والا ایک اور سوال تھا...... ''اب کیا کروں؟''

یہ سوال اس کے ذہن کی دیواروں پر منہ زور لہروں کی طرح اپنا سر پٹخ کر اس کی سوچیں گھائل کر رہا تھا۔ اگلی دو عوامی تعطیلات میں ان سوچوں نے اسے بے حد مضمحل کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس کے ذہن پر ایک گہری دبیز دھند طاری تھی۔ دور کسی آواز کے تعاقب میں ذہن میں کچھ جگنو سے چمکے تھے لیکن نیم مدہوشی پھر سے اس پر طاری ہو جاتی۔ دفعتاً چہرے پر پڑنے والے ٹھنڈے پانی نے اس کے حواس قدرے بحال کر دیے لیکن دماغ اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کہاں موجود ہے؟ پلکوں پر منوں بوجھ لدا محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ لمحوں بعد جب ذہن نے اردگرد ماحول سے ربط بحال کیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں موجود پایا جس میں فرنیچر کے نام پر صرف ایک ہی بیڈ موجود تھا۔ دیواروں سے عجیب سی وحشت برستی دکھائی دے رہی تھی۔

اپنی یہاں موجودگی کے احساس نے اسے متوحش کر دیا تھا۔ مارکیٹ سے کتابیں خرید کر واپسی پر ایک نامانوس اور تیز بُو کے قوتِ شامہ سے ٹکرانے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس نے ایک فوری خیال کے تحت اپنے وجود اور کپڑوں کو ٹٹول کر دیکھا اور خود کو 'صحیح سلامت' پا کر بے اختیار شکر ادا کیا۔

اگلے ہی پل کمرے کا اکلوتا دروازہ کھلا اور نووارد پر نظر پڑتے ہی اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی...... وہ ارسلان شاہ تھا...... ایک فرشتہ صفت، ہمدرد انسان...... جس نے اسے اپنی بیٹی کا درجہ دیا تھا اور اب وہی فرشتہ آنکھوں میں غیظ و غضب سموئے اس کا وجود بھسم کر رہا تھا۔

اس نے ہمت مجتمع کی اور اس سے پوچھا۔ ''مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''تمہاری اصل جگہ دکھانے اور سمجھانے کے لیے۔''

اس کی زہریلی پھنکار نے نمرہ کے حواس سلب کر دیے۔

''مم...... میں سمجھی نہیں! کیا مطلب ہے آپ کا۔''

''نہ...... نہ...... نہ...... نہ...... یہ اداکاری میرے ساتھ نہیں چلے گی...... سمجھتی سب کچھ ہو تم مگر مجھے بے وقوف سمجھنے کی غلطی ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے...... تم کیا سمجھی تھیں کہ کوئی میرے گھر آئے گا...... میرے اسٹڈی روم کے باہر بت کے مانند کھڑا رہ کر انہی قدموں واپس چلا جائے گا اور میرے سی سی ٹی وی کیمروں کے ساتھ گارڈز کی زبانیں بھی خاموش ہو جائیں گی۔'' اس کے چہرے پہ چھائی خشونت نمرہ کو کسی بڑے نقصان کا اشارہ دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جمی اندر داخل ہوا۔ اس کے پاس ایک جدید ڈیجیٹل کیمرا موجود تھا جس کے ساتھ تھوڑی چھیڑ چھاڑ کرنے کے بعد اس نے بائیں انگوٹھے سے ارسلان کو 'اوکے' کا اشارہ کر دیا۔ وہ بستر کے ایک جانب کسی روبوٹ کے مانند کھڑا ہو گیا تھا۔

ارسلان کے بڑھتے قدم اور آنکھوں میں پوشیدہ خباثت دیکھ کر نمرہ کو کسی معجزے کا انتظار نہ رہا۔ وہ بڑے اہتمام سے اسے پامال کرتا رہا اور جمی مشاقی سے ان مناظر کو کیمرے میں محفوظ کرتا گیا۔ ارسلان کے بعد اس مفتوح زمین پر اس نے بھی اپنے نشانات ثبت کر ڈالے۔ اس بار ان مناظر کی عکس بندی سگار کا دھواں اُڑاتے ارسلان کے ذمے تھی۔

نمرہ کو محسوس ہوا کہ شاید اس کے ناکردہ گناہوں کی یہ سزا یہیں تک محدود تھی لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ ساری رات ارسلان شاہ کے گارڈز بھی اس سے خراج وصول کرتے رہے تھے اور ہر بار جمی 'پس منظر کی تبدیلی' کے ساتھ اس کی بربادی محفوظ کرتا رہا۔ نمرہ کی قوتِ برداشت ختم ہوئی تو وہ بے ہوش ہو گئی لیکن اس کا نیم مردہ تن اسی عذاب سے دوچار رہا۔

رات اپنا سفر طے کرتی رہی اور خوابوں کی تتلیاں ایک ایک کر کے اپنی موت خود ہی مر گئیں۔ ذہانت جبر و استحصال کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اپنے وجود پر شرمسار ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

پروین کا دل کئی دنوں سے واہموں اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ بیٹی کی حالت نے اسے مزید بے چینی لاحق کر دی تھی۔ وہ تنِ تنہا عورت اس کی حفاظت و بقا کے قابل نہیں تھی اس لیے ہر ماں کی طرح اس نے بیٹی کی شادی کا ایک 'آفاقی حل' سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ نمرہ کی جانب سے اسے احتجاج اور کسی نہ کسی ردِعمل کی توقع بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے اپنا تعلیمی کیریئر جنون کی حد تک عزیز رہا ہے اس لیے کسی بحث و تمحیص کے بغیر ہی شادی کے لیے رضامند ہو جانا اسے کسی 'انہونی' کے خوف میں مبتلا کرنے لگا تھا۔

اپنے دل کی صداؤں کو دباتی وہ نمرہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ شام کے سائے رات میں ڈھل گئے۔ آسمان نے سیاہ ماتمی ردا اوڑھ لی لیکن اس کی واپسی نہ ہوئی۔ پروین کے دل و دماغ میں ایک محشر برپا ہونے لگا۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کے مانند دروازے سے باہر کئی مرتبہ جھانک چکی تھی لیکن نمرہ کے کہیں کوئی آثار ہی نہ تھے۔ اس نے لرزتے وجود سے بارہا اس کا نمبر ملایا مگر ہر بار موبائل آف ہونے کا صوتی پیغام اس کی رگوں میں مزید درد پیدا کر دیتا۔

دل پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے رات ڈھلتی گئی، خوف و دہشت سے اس کے احساسات منجمد ہوتے گئے۔ سیڑھیوں میں شل ہوتے جسم کے ساتھ بیٹھی اسے اپنا وجود برف زار میں مقید محسوس ہو رہا تھا۔ صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے اسے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی تو زندگی کا احساس لوٹ آیا۔ بیرونی دروازہ رات ہی سے کھلا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی بصارت نے بیٹی کا لہولہان وجود دیکھا تو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس پہ گزری قیامت کے احساس نے اس کے برف میں ڈھلے وجود پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ ایک ہی پل میں پاش پاش ہو گیا۔

نمرہ کے لیے خود پہ گزری قیامت سے زیادہ ماں کی میت کا دیدار تباہ کن تھا۔ سجاد کی آمد کے بعد اسے دفنا دیا گیا اور وہ اپنی زندہ لاش کا تعفن بھائی سے چھپانے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہی۔ سجاد کی نظروں سے بھی بہن کے چہرے اور ہاتھوں پر زخموں کے نشانات مخفی نہ رہ سکے تھے۔ سوم کے بعد اس نے نمرہ سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی۔

”مجھے ابھی اس حالت کے ذمے داران کا نام بتا دو نمی۔“

اس کے لہجے کی تپش سے نمرہ کو خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے بات بنانے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ اسے متنبہ کرتے ہوئے بولا۔

”کوئی جھوٹ مت بولنا میرے ساتھ...... میں ننھا بچہ نہیں ہوں جو کسی بھی الف لیلوی داستان پر آنکھیں بند کے یقین کرلوں گا۔“

”کیا کر لو گے تم وہ سب جان کر؟ جو وقت بیت گیا ہے وہ واپس نہیں آئے گا کبھی۔“ اس کے آنسو چھلک گئے۔

”نہیں آئے گا...... لیکن میں انہیں سزا دلوائے بغیر سکون سے نہیں رہ سکتا...... کسی صورت بھی نہیں۔“ نوجوانی کا جوش اس کا چہرہ دہکا رہا تھا۔ ”یونیورسٹی میں میرے کئی دوستوں کے والد اور بھائی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ میں ان کی مدد لوں گا...... مگر خاموش نہیں بیٹھوں گا۔“

نمرہ نے اسے محتاط الفاظ میں ساری داستان کہہ سنائی۔ سجاد کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیرونی دروازہ پار کر گیا۔

☆☆☆

سجاد، عمر کے اس دور میں تھا جب انقلابی خیالات ذہن پر دستک دیتے ہیں تو ان کی گونج سے وہ پوری دنیا کو تبدیل کر دینے کے خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیتے ہیں۔ اس کی یونیورسٹی میں بھی دوست اچھے اور بارسوخ گھرانوں کے چشم و چراغ تھے اور ان سب میں ایک ہی بات مشترک تھی...... خواب...... اپنا مستقبل بدلنے کے خواب...... اپنے ماحول میں تبدیلی کے خواب...... آسمانوں کی تسخیر کے خواب۔

اس کا ایک قریبی دوست احمد بھی اسی شہر کا رہائشی تھا اور اتفاق سے ان دنوں وہ بھی گھر آیا ہوا تھا۔ سجاد نے اسے میسج کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی اور جلتی آنکھوں اور جھلتے وجود کے ساتھ اس کے گھر جا پہنچا۔ احمد کے والد ایک ڈی۔ ایس۔ پی تھے جن کا سروس ریکارڈ بے داغ تھا۔ مغلپورہ کے علاقے میں پانچ مرلے کے ڈبل اسٹوری گھر میں ان کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ احمد نے اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور انتہائی خلوص و محبت سے اس کی والدہ کی رحلت کی تعزیت کی۔ کچھ دیر بعد ڈی ایس پی رضا مختار بھی بیٹے کے اصرار پر اس کے دوست سے ملنے آ گیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم اور بارعب شخصیت کا مالک تھا جس کی عقابی آنکھوں میں زمانہ سازی کی تیز چمک تھی۔

اس کی جہاندیدہ نظریں سجاد کو دیکھتے ہی ایک ”بڑے کیس“ کا اندازہ لگا چکی تھیں۔ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں خلوص کا بگھار لگا کے اسے مکمل طور پر اپنے اعتماد میں لے لیا۔ سجاد آتشیں آنسوؤں اور بکھرے لہجے میں اپنے خاندان پر بیتی افتاد کے بارے میں بتاتا چلا گیا۔

رضا مختار کی پیشانی کی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ اس نے سجاد کو گلے سے لگا کر اپنی مکمل اعانت کا یقین دلایا اور تسلی تشفی دے کر رخصت کر دیا۔

ڈی ایس پی کا تجربہ اسے یقین دلا چکا تھا کہ سجاد نچلا نہیں بیٹھے گا۔ اگر وہ میڈیا کے کسی بھی نمائندے کے ہتھے چڑھ جاتا تو قومی سطح پر ایک بڑے بھونچال کی آمد یقینی تھی۔ ”ریکٹر اسکیل“ پر اس بھونچال کی شدت بھی اس کی مستقبل شناس آنکھوں نے بھانپ لی تھی۔

اس نے اپنی سروس میں ایسی کئی ’شدتوں‘ میں توازن پیدا کر کے دونوں فریقین کے درمیان حکمت عملی سے ’آف دی ریکارڈ‘ معاملات طے کروائے تھے۔ وہ ایک وائٹ کالر شخص تھا جس نے ’داغ تو اچھے ہوتے ہیں‘ کا کبھی کوئی ٹنٹا نہیں پالا تھا لیکن اس معاملے میں فراز الدین کے بیٹے کی شمولیت سے بڑے برج الٹنے کا امکان تھا۔

رضا مختار نے ارسلان شاہ اور فراز الدین کو مطلع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سجاد کی جذباتیت اور مظلومیت سے اسے کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع نہیں تھی۔ بیٹے کا کیا تھا اسے تو یہ کہہ کر بھی مطمئن کروایا جا سکتا تھا کہ اصل گنہگار خود سجاد اور

اس کی بہن ہی تھے جو دانستہ طور پر معزز اور نامور لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا کر بلیک میل کرتے تھے۔ وہ یقین نہ بھی کرتا تو چند ایک موقع کے گواہ اس کے سامنے لا کر کھڑے کر دیے جاتے۔

اسی رات رضا نے فرازالدین کو ان کے سر پر منڈلا رہی خطرے کی اس تلوار سے آگاہ کر دیا۔ فراز کے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا کیونکہ حزبِ اختلاف والے ان کی ایک کمزوریوں کے درپے رہا کرتے تھے۔ آزاد میڈیا بھی ایسے 'متاثرین' کی بُو سونگھتا پھرتا تھا۔ انہیں ذرا سی بھنک بھی مل جاتی تو فراز کا مستقبل اندھیروں میں ڈوبنا یقینی تھا۔

اس نے ڈی ایس پی کو اس 'مہربانی' کا عوضانہ ادا کر کے فوری طور پر جمی اور ارسلان شاہ کو طلب کر لیا تھا۔ باہمی رضامندی کے تحت سجاد کے اغوا کی حکمتِ عملی بنا لی گئی۔ نمرہ سے انہیں کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ اس کی ویڈیوز کی صورت میں وہ اس کے پر قینچ چکے تھے۔

اب یہ سجاد کی بدقسمتی تھی کہ وہ ان کے کارندوں کو گھر سے باہر ہی مل گیا۔ اسے ٹھوکروں، گھونسوں کی زد میں لے کر آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور ان کے ایک نجی عقوبت خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اس رات اسے ہر طرح کے بہیمانہ تشدد سے گزارا گیا۔ تیزاب ملے پانی سے اس کی کھال جھلسا دی گئی۔ گھٹنوں اور ٹانگوں میں پسٹل کے مکمل میگزین خالی کر دیے گئے۔

انیس سالہ وہ ذہین وفطین لڑکا اپنی بہن کے تحفظ کی خواہش میں فرعونیت کی بھینٹ چڑھ گیا۔

☆☆☆

نمرہ سجاد کی اس جذباتی کیفیت کے بعد گھر سے غیاب پر بہت پریشان تھی۔ وہ رات ایک بار پھر اس کے لیے ایک نیا امتحان لیے پلِ صراط کی طرح سامنے کھڑی تھی۔ ان کے قریبی رشتے داروں میں ایک بوڑھے ماموں کے سوا سبھی اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ ماموں کراچی میں رہائش پذیر تھے جن کی واپسی اگلے دن طے تھی۔ وہ بھی شوگر کی دوا لے کر سو چکے تھے۔

اس نے کئی بار سجاد کے نمبر پر رابطہ کیا۔ موبائل آن تھا لیکن وہ اس کی کال نہیں اٹھا رہا تھا۔ نمرہ اپنے اس آخری دنیاوی سہارے کے تحفظ کے لیے بلک بلک کر دعائیں کرتی رہی۔ اگلی صبح اس کے ماموں نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔ سجاد کی غیر حاضری ان کے لیے اتنی تشویشناک نہ تھی کیونکہ وہ اس معاملے کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے۔

نمرہ دیوانگی کی حالت میں اسے فون کرتی رہی اور بالآخر شام کے وقت اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔ فون پر ارسلان شاہ کی آواز سن کر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے تعلقات کی وسعت کی تو وہ خود عینی شاہد تھی۔

ارسلان نے سجاد کی واپسی کے معاملات طے کرنے کے لیے اسے ایک بار پھر اپنے گھر بلوایا جہاں اسے بھائی پر ٹوٹنے والی قیامت دیوار گیر ایل ای ڈی پر بہت اہتمام سے دکھائی گئی۔ تشدد کے بعد اس کی جسمانی حالت دیکھ کر نمرہ صدمے سے گنگ ہو گئی تھی۔ خوابوں کا وہ سفر ہر موڑ پر ان سے تاوان وصول رہا تھا۔

اس کی منت سماجت اور غیر مشروط وفاداری کی تحریری یقین دہانی کے بعد ارسلان شاہ نے اسے اپنی ''خصوصی ٹیم'' کی رکنیت دے دی۔ تجرباتی بنیادوں پر اسے منشیات کی ترسیل کا کام سونپا گیا جسے وہ اگلے کئی ماہ تک انجام دیتی رہی۔ اسے ایک الگ اپارٹمنٹ بھی دے دیا گیا تھا تاکہ پرانے شناسا اس کے اکیلے رہنے پر معترض ہو کر مشکلات کھڑی نہ کر سکیں۔ اپنے اہداف میں کامیابی اور وفاداری کے عوض سجاد کو رہائی کا 'پروانہ' مل گیا تھا۔ اس کی ہیئت دیکھ کر دل چھلنی ہونے لگتا تھا۔ بارود کے زہریلے اثرات کے باعث اس کی دونوں ٹانگیں تن سے الگ کر دی گئی تھیں...... اپنے زورِ بازو اور ذہانت کے بل پر سائبر ورلڈ تسخیر کرنے کا خواہشمند اب اپنا وجود وہیل چیئر پر ہلانے سے قاصر تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں فرعون نے خود اعتمادی کے زعم میں اپنی ہلاکت کے اسباب پیدا کیے ہیں۔ ارسلان شاہ نے بھی وہی غلطی دہرائی تھی۔ اپنی فرعونیت کے گھمنڈ میں اسے جسمانی معذوری عطا کر کے آزاد کر دیا تھا لیکن ایک چھوٹا سا نکتہ فراموش کر بیٹھا کہ سجاد کا اصل ہتھیار اس کی ذہانت تھا جسے وہ اسی کے خلاف استعمال میں لا کر وقت کی بساط پر اس کی چال الٹنے والا تھا۔

شطرنج کے اس کھیل میں اب ایک نئی بازی کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سجاد کی زندگی ایک دائرے میں مقید ہو گئی تھی۔ معذوری کی وجہ سے وہ اپنا اولین خواب مکمل نہ کر سکا تھا۔ اور اب اس نے خوابوں کو اپنی آنکھوں سے نوچ کر دفن کر دیا تھا۔ دوست احباب سے بھی اس کے روابط منقطع ہو چکے تھے۔ اس نے بھرپور حکمتِ عملی کی تیاری کے بعد ایک نئے

پروجیکٹ‘ کا آغاز کردیا۔ وہ ارسلان شاہ کی ذات کو مکمل طور پر کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے ہی اپنے ادھورے علم کی تکمیل شروع کردی۔ اسی تحقیقی علم کو استعمال میں لاکر کئی ماہ کی کوششوں کے بعد اس نے ارسلان اور اس سے متعلقہ افراد کے ’محفوظ ترین‘ سائبر اکاؤنٹس تک رسائی حاصل کرلی تھی۔

ارسلان شاہ کا خمیر پڑوسی ملک کے ایک جنگ زدہ خطے سے اٹھا تھا۔ بچپن ہی میں جنگ کے شعلوں میں اپنا گھر بار اور مال و متاع تباہ ہوتے دیکھا تو ذہن کتنی ہی الجھنوں اور گرہوں کا شکار ہوگیا۔ اس کے والد ارمان شاہ نے ہجرت کرکے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کے تین بھائیوں اور دو بہنوں کے خاندان آبائی علاقے میں ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے تھے۔ تباہی کے وہ مناظر ارسلان کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگئے۔ اس کا صرف ایک چچا ان کے ساتھ اس نئے ملک میں اپنے قدم جمانے میں کامیابی سمیٹ پایا تھا۔

پوست کی کاشت ان کا آبائی ہنر تھی اور یہاں بھی انہوں نے منشیات کے لین دین کا کاروبار شروع کردیا۔

بچپن ہی سے نفسیاتی کج روی میں مبتلا ارسلان باپ اور چچا کی طرح اپنی نئی پناہ گاہ کو کبھی بھی دل سے اپنا نہ سکا۔ جنگ کے اثرات نے اسے evil genius بنا دیا۔ اپنی جڑوں سے دوری اور تباہی کے انتقام کا آسیب اس کے حواس پر مکمل غالب تھا۔ اس کی شادی چچا کی بیٹی سے زمانۂ طالبعلمی میں ہی ہوگئی تھی لیکن وہ لاولد ہی رہا۔ عملِ تولید کے لیے اس کا وجود بنجر تھا۔

اس نے جس ادارے میں تعلیم حاصل کی وہاں اس کے ہم وطنوں کے متعلق ایک منفی تاثر عام تھا۔ ذات کی تنہائی، متشدد رجحانات اور انتقامی جذبے کی تسکین میں اس کی زندگی قائمہ زاویہ کی دو انتہاؤں میں قید ہوگئی..... بیشمار دولت......اور ہر ذہین طالبعلم کو اس کے محور سے گمراہ کرنا۔

ارسلان کا خاندانی پس منظر اور ذہنی کیفیت چند عالمی تنظیموں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ ایسے ’گوہرِ نایاب‘ کی تلاش میں تو وہ ہمیشہ ہی رہتے تھے۔ منہ مانگے معاوضے کی ترغیب نے اسے ڈاکٹر شیفرڈ کا ہرکارہ بنا دیا اور وہ ان سے حاصل کردہ دولت اپنے ملک میں ’رفاہِ عامہ‘ کے کاموں کے لیے استعمال میں لاتا رہا۔

سجاد نے اس کی مزید کمزوریاں بھانپ کر کمپیوٹر سافٹ ویئرز کے علاوہ مختلف کیمیکلز کے اثرات پر بھی انٹرنیٹ سے مواد اکٹھا کرنا شروع کردیا۔ اوّل اوّل اس نے کوشش کی کہ ان کے سائبر اکاؤنٹس سے کچھ پختہ ثبوت تلاش کرکے ’خفیہ ایجنسیوں‘ کے حوالے کردے لیکن اسے کامیابی نہ مل سکی تھی۔ اس کا علم ابھی خام تھا۔

اس کے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پا چکا تھا جس سے نمرہ بھی تاحال لاعلم تھی۔ وہ بھائی کی دیوانگی دیکھ کر اس ساری صورت حال کے لیے اپنی ذات کو مورد الزام ٹھہراتی تھی۔ اس ذہنی اذیت سے گزرتے اس کے سامنے ایک اور کوہِ گراں آن کھڑا ہوا۔

گریجویشن مکمل ہوتے ہی یونیورسٹی انتظامیہ نے اس کے شاندار نتائج کی بنیاد پر ماسٹرز کی تعلیم کے لیے اس کی سابقہ اسکالرشپ بحال رکھی تھی۔ اس سال نئے ’اسکالرشپ‘ کی بنیاد پر معیز بیگ نے اس ادارے میں قدم رکھا تھا جس کی ذہانت نمرہ سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ اس کی سادہ لوحی، کم گو فطرت اور تعلیمی نتائج آغاز ہی میں اسے ارسلان کی نظروں میں لے آئے تھے۔ وہ اس انمول ہیرے کو اپنے دام میں جکڑ کر اسے اندھیروں کا راہی بنانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ انتظامیہ کے اصول و ضوابط کے مطابق سوسائٹی کے عہدیداران طلبہ کو زبردستی شمولیت کی ترغیب دینے کے مجاز نہ تھے اس لیے اس نے نمرہ کو چارہ بنایا۔

”میں یہ سب کیسے کرسکتی ہوں ارسلان؟ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔“ نمرہ نے اپنا طیش دباتے ہوئے کہا تھا وہ اسے ’سر‘ اور دیگر معزز القابات سے مخاطب کرنا ترک کرچکی تھی۔

”تم کیوں نہیں کرسکتیں ... صرف تم ہی تو یہ کرسکتی ہو۔“ خباثت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ ”بڑے بڑے زاہد نسوانی کشش کے سامنے اپنی ریاضت بھول جاتے ہیں۔ معیز ایک ’آئیڈیل‘ پس منظر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے بہت جلد تمہاری ذات کا اسیر ہوکر ایک ’بچہ جمورا‘ بن جائے گا۔“

”یہ میری فطرت نہیں ہے ارسلان...... اب تو مجھ پہ رحم کرلو۔“ اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔

”فطرت نہیں ہے تو بنالو...... کیونکہ عنقریب یہ کام تمہیں مستقل بنیادوں پر سونپا جائے گا...... انکار کی صورت میں تمہارا اکلوتا بھائی زندگی کی بازی ہار دے گا۔“ وہ غرایا۔

”اگر یہ شکار نہ ہوسکا تو؟“

”تو ناکامی کی ذمے دار بھی تم ہی ہوگی...... اسے بس میری طرف آنے والے راستے کی نشاندہی کردو۔ اگلے

معاملات میں خود ہی سنبھال لوں گا۔"

اس روز واپسی پر نمرہ کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کردے۔ مگر سجاد کا خیال اسے اپنے ارادے پر عمل کرنے سے روک لیتا تھا۔ وہ اس کی بہن ہی نہیں بلکہ لاٹھی بھی بن چکی تھی۔

سجاد سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے ساری صورتِ حال جاننے کے بعد اسے کہا۔

"وہ جو کہہ رہا ہے...... بے خوف و خطر کر ڈالو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو سجاد تم؟ میں ایک اور مظلوم کی کس طرح تباہی کے رستے پہ رہبری کرسکتی ہوں؟" اسے بھائی کی ذہنی حالت پہ شبہ ہونے لگا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا...... میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو...... اس بار آخری لمحات میں یہ بازی میں ارسلان پر الٹ دوں گا۔" سجاد کی آنکھوں میں لہو اترنے لگا تھا۔

"لیکن کیا کرو گے تم؟ اور کیسے کرو گے؟"

"یہ باتیں ابھی قبل از وقت ہیں۔ تم مجھے اس لڑکے کی بابت ہر بات سے باخبر رکھنا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نظر انداز نہیں کرنی۔" وہ اسے مزید دلاسا دے کر ایک بار پھر انٹرنیٹ میں مشغول ہوگیا۔

معیز بیگ کی غیر نصابی سرگرمیوں میں عدم دلچسپی اور کم ہمتی ارسلان کے منصوبوں میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اسے مطلوبہ رستے کا مسافر بنانے کے لیے انہیں بہت لمبی چوڑی حکمتِ عملی تیار کرنی پڑی تھی۔ غزل نائٹ میں جمی اور نمرہ کے ٹکراؤ کا ڈراما اسٹیج کرنے کے بعد وہ بالآخر اسے اپنے خول سے باہر لے آئے تھے۔

معیز بیگ نادانستگی میں ہولناک رستوں کی مسافت اختیار کرچکا تھا۔ ہر گزرتا دن نمرہ کے پچھتاوے اور ملال میں اضافہ کرنے لگا۔ اس کی الجھنیں سوا ہونے لگیں۔ اس درد کا کوئی درماں نہیں تھا۔

☆☆☆

اسٹڈی روم میں اس وقت خاصی تناؤ کی کیفیت تھی۔ ڈاکٹر شیفرڈ کی پیشانی پر ناگواری اور بدلحاظی کی شکنیں واضح تھیں۔ ارسلان کی آنکھوں میں بھی پریشانی اور کسی گہری سوچ کی جھلک تھی۔ ڈاکٹر کے ایما پر اس کے دونوں مرکزی سپلائر جمی اور نمرہ بھی وہیں موجود تھے۔

"ہم تمہارے تمام مطالبات پورے کرتے آئے ہیں ڈاکٹر لیکن اب یکدم اس بدلحاظی کا کیا مقصد ہے؟" ارسلان نے بے چینی سے دائیں جانب اپنا بوجھ منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"ہم پچھلے پانچ سال سے تمہاری اس سوسائٹی پر سرمایہ کاری کررہے ہیں لیکن نتائج تاحال ایک مخصوص شرح سے آگے نہیں بڑھ پائے۔ ہمیں سالانہ ٹرن اوور میں اضافہ درکار ہے۔" ڈاکٹر نے رکھائی سے کہا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے مسٹر شاہ کہ اس عہدے کے علاوہ اپنا ذاتی ادارہ قائم کرو۔ جہاں تمہیں کُلی اختیار حاصل ہو۔" ماریہ کی یہ تجویز سن کر ارسلان پھڑک اٹھا۔

"بالکل۔ اس سے ہمارا پلان آف ایکشن مزید وسیع ہوگا۔" اس نے جوش سے کہا۔

"اس کے علاوہ بھی تمہیں ہمارے لیے ایک کام کرنا ہے۔" ماریہ نے کہا۔ "اپنے تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے ایک اسکول بھی قائم کرو جہاں میں اپنا مطلوبہ تعلیمی نظام اور ڈاکٹر شیفرڈ کی ادویات متعارف کرواؤں گی۔"

اپنے قومی مفاد کے تحت ماریہ اس وقت ڈاکٹر سے تمام سابقہ اختلافات پسِ پشت ڈال چکی تھی۔ "میری معاون کے طور پر مس نمرہ میرے ساتھ رہیں گی۔"

نمرہ اس بھیانک منصوبے کی کڑیاں سن کر سناٹے میں آگئی۔

"اوکے۔ اسکول کے لیے نمرہ اور میرے ادارے کے لیے معیز بیگ بہترین انتخاب رہیں گے۔ اس پراجیکٹ کی منظوری جمی کے والد اپنی صوابدید پر کروالیں گے۔" ارسلان نے بغیر ردوکد انہیں اپنی رضامندی دے دی تھی۔ جمی بھی اس نئے مشن کے لیے بخوشی تیار تھا۔

نمرہ نے تمام تر تفصیلات سجاد کے گوش گزار کردی تھیں جو اس سفاکی پر ساکت رہ گیا۔ اس نے اپنے منتشر حواس پر قابو پاتے ہوئے اسے کہا۔

"میرے منصوبے پر عمل کا وقت آچکا ہے...... تم مجھے کسی بھی طرح معیز کا فون لادو۔ اس کی ہر نقل و حرکت اور رابطے کی تمام کڑیاں میرے علم میں رہیں گی۔ اس کے علاوہ تمہیں کسی بھی طرح میرے مطلوبہ کیمیکلز اور کچھ کمپیوٹرائزڈ چپس مہیا کرنی ہیں۔"

"تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو سجاد؟"

"تمہارا قتل۔"

☆☆☆

سجاد نے اسے اپنا منصوبہ مکمل طور پر سمجھا دیا تھا جس کے مطابق اسے معیز کے جذبات کا مثبت جواب دے کر اسے اپنے اپارٹمنٹ میں بلانا تھا۔ اس ملاقات کی تیاری کے لیے انہوں نے کئی جگہوں پر کیمرے نصب کیے تھے۔

معیز کی بے ساختہ خوشی اور جذباتی وابستگی کا اظہار کبھی کبھی نمرہ کا دل بوجھل کرنے لگتے تھے لیکن اسے یقینی تباہی سے بچانے کے لیے اس آزمائش میں مبتلا کرنا لازم تھا۔ ارسلان شاہ سے اس کی قربت ہی اس کی فرعونیت کے خاتمے کا واحد ذریعہ تھی۔

اس ڈرامے میں مزید حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہوں نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔ نمرہ کے جسم کا درجہ حرارت مطلوبہ ٹھنڈک تک پہنچانے کے لیے کچھ مخصوص ادویات کا استعمال کروایا گیا۔ کمر پر خنجر کی گرفت کے لیے سجاد ہی کی اختراع کردہ ایک مخصوص بیلٹ پہنا کر بلڈ بینک سے حاصل شدہ خون اس کے جسم کے آس پاس پھیلا دیا گیا تھا۔

نمرہ عاقب کسی کی 'زبردستی' کا نشانہ بن کر ایک لاش کی صورت میں معیز کے سامنے پڑی تھی جس کی ہر ایک اضطراری و غیر اضطراری حرکت کمرے میں بیٹھا سجاد وہاں پوشیدہ کیمروں میں محفوظ کرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

معیز دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسائے نمرہ کے انکشافات سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جوار بھاٹا کی کیفیت طاری تھی۔ نمرہ نے خشک ہوتے حلق میں پانی کے چند گھونٹ اتارے اور اپنا سلسلہ کلام پھر سے جوڑتے ہوئے بولی۔

''تمہاری فطرت اور طبیعت کے پیشِ نظر سجاد کو یقین تھا کہ اپنے خاندان پر پڑنے والی افتاد کے سامنے تم گھٹنے ٹیک دو گے۔ مگر ہمیں یہ بھی علم تھا کہ ارسلان کو قتل کرنا تمہارے لیے کٹھن ترین امر ہوتا جس میں ناکامی کا تناسب کامیابی سے بہت زیادہ تھا اس لیے 'پلان بی' کی تیاری بھی مکمل کر رکھی تھی۔ سگار اس کی کمزوری تھی۔ سجاد نے ان تھک محنت سے اس کے لیے مخصوص سگار تیار کیے جن میں ''نائٹرو گلیسرین اور سی فور'' شامل تھے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچتے ہی وہ کیمیکلز بلاسٹ ہو گئے تھے۔''

ارسلان کے لیے تنفر نمرہ کے ہر انداز میں جھلکتا تھا۔

''اور وہ باقی مقتول کون تھے؟'' معیز کو اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''جمی اور ڈاکٹر شیفرڈ۔'' نمرہ نے کہا۔ ''ان کی موت ہمارے پلان میں شامل نہیں تھی۔ لیکن قدرت نے ان کی ہلاکت کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ ایجنسیز کے حرکت میں آنے کے خوف کی وجہ سے ان کے لواحقین نے اسے ایک حادثے کا رنگ دے دیا۔ رہی بات تمہارے احساسِ جرم کی...... وہ بالکل بے جا ہے۔ ہم جیسے لاکھوں خواب گزیدہ افراد کے لیے ان کی موت ٹھکرانے کی متقاضی ہے۔''

''جمی اور ڈاکٹر شیفرڈ معمولی لوگ تو نہیں تھے جن کی ہلاکت پر کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا تھا۔'' وہ الجھ گیا۔

''فراز الدین اپنی کچھ سیاسی غلطیوں کے پاداش میں اپنی پارٹی سے الگ کر دیا گیا تھا۔ جس کھونٹے پر وہ بے تھا بیل اچھل کود مچائے رکھتا تھا، اس سے محرومی کے بعد خاصا زیرِ عتاب آ چکا تھا۔ ایسی صورت میں بیٹے کی موت کی تحقیقات کے درپے ہوتا تو اس کا کردار اور کارنامے بھی لا محالہ طور پر چھپے تو نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لیے اس نے خاموشی میں ہی اپنی عافیت سمجھی ہو گی۔'' اس کی بات معیز کے دل کو لگ رہی تھی۔

''اور رہی بات ڈاکٹر شیفرڈ کی...... تو وہ یہاں ایک تنہا، سنکی اور باتنی ریسرچ آفیسر کے کور میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ اور ان ایجنٹس کی اموات کے بعد کبھی بھی سرکاری طور پر حق ملکیت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا جاتا۔''

''یہاں کیوں آئے تم لوگ؟'' اس نے ایک اور الجھن بیان کی۔

''ماضی کے آسیب سے چھٹکارے کے لیے ان رستوں کو ترک کرنا بہت ضروری تھا معیز!'' اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے تم نے نمرہ؟ کیا تم مجھ سے......''

''ان حالات میں صرف اپنی ذات کے لیے سوچنا میرے لیے ممکن ہی نہیں۔'' نمرہ نے قطع کلامی کی۔ ''مجھ سے کبھی کوئی ایسی توقع مت رکھنا۔''

''تم نے کوئی جاب شروع کی ہے کیا؟'' اس نے کسی خیال کے تحت استفسار کیا۔

''نہیں، میں سی ایس پی آفیسر کی ٹریننگ لے رہا ہوں...... ماضی کے ان نقوش سے محفوظ رہنے کی ایک غیر اختیاری کوشش تھی یہ میری۔''

''تم نے بھی مستقبل کے لیے کوئی تو لائحہ عمل بنایا ہو گا۔'' معیز نے اسے کریدا۔

''بالکل بنایا ہے...... میں بھی مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہی ہوں۔ لیکن میرا مقصد ایجوکیشن آفیسر بننا ہے۔''

معیز خاموش رہا تو وہ از خود وضاحت دیتے ہوئے کہنے لگی۔

’’اس دور میں جب دیگر ممالک اجرام فلکی تسخیر کرنے میں مگن ہیں...... ہم اپنی نصابی کتب ہی منتخب نہیں کر پا رہے۔ اغیار کا تصنیف کردہ مواد اپنی نسلوں کے ذہن میں ٹھونس رہے ہیں۔ ہماری ان کوتاہیوں کا تاوان ہارپر اور ڈاکٹر شیفرڈ جیسے لوگ ہم سے وصول رہے ہیں۔ میں ایک درمیانی راہ نکالنا چاہتی ہوں۔ ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتی ہوں جہاں صرف سائنسی مضامین بین الاقوامی اداروں کی کتابوں پر مشتمل ہوں گے۔ معاشرتی اور مذہبی مواد ہم خود شائع کریں گے۔‘‘

’’یہ سفر آسان نہیں ہوگا تمہارے لیے۔‘‘ معیز نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

’’میں جانتی ہوں...... ہم عام انسان ہیں معیز! ان قوتوں سے سپر مین جیسی طاقت لیے بھڑ نہیں سکتے...... یہ جن اداروں کا کام ہے وہ سب اسے اپنی اپنی جگہ بہترین طریقے سے انجام دے رہے ہیں...... ہمارا ہتھیار ذہانت ہے...... اور ہم اسی ہتھیار سے اپنا دفاع کرتے ہوئے ان تخریبی قوتوں کا ہر وار ان پر لوٹائیں گے۔‘‘ اس کا یقین اٹوٹ تھا۔

’’مجھے اس ٹیم میں نوکری مل سکتی ہے کیا؟‘‘ وہ مسکرایا۔

’’شیور! کیوں نہیں...... اس کڑے مقابلے میں منشیات کے خلاف ایک اینڈ تم سنبھالے رکھنا...... دوسرے اینڈ سے میں اپنی اننگز کھیلتی رہوں گی۔‘‘ وہ بھی مسکرانے لگی۔

☆☆☆

اور عین اسی وقت ان سے ہزاروں میل دور......

ہال نما کمرے میں ایک بیضوی میز کے گرد کھنچے ہوئے چہروں اور تناؤ زدہ آنکھوں کے حامل نصف درجن افراد بیٹھے تھے۔ یہ دو بہترین ’حلیف ممالک‘ کے ایجنٹس تھے۔ انہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد بے آواز طریقے سے دروازہ کھلا اور سی۔ ون ہال میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر کرخت تاثرات طبیعت مکدر کرتے تھے۔

اس نے سربراہی کرسی سنبھالی اور کھنکھارتے ہوئے بولا۔

’’دشمن کے حریف سے دوستی کسی بھی مقصد میں کامیابی کی دلیل ہے۔ ہم دونوں ممالک کا دشمن مشترک ہے۔ اس لیے اس نئے مشن میں دونوں اطراف کے بہترین دماغ یہاں طلب کیے گئے ہیں۔‘‘

اس نے اپنے سامنے دیوار میں موجود پروجیکٹر آن کر دیا۔ اسکرین پر ایک پہاڑی صوبے کا نقشہ ظاہر ہونے لگا۔ شرکاء پر ایک گہری نظر ڈال کر اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ علاقہ اس ملک کے ذخائر کی آماجگاہ ہے۔ لیکن اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی۔ ڈاکٹر شیفرڈ سے محرومی کے بعد ہم نے ہائی کمان کے احکامات کے مطابق وہاں سے اپنا سیٹ اپ وقتی طور پر کیموفلاج کر دیا ہے۔ اور اس علاقے میں اپنی سرگرمیوں کے آغاز کا فیصلہ کیا ہے۔‘‘

’’اس مشن کے نکات کیا ہوں گے چیف؟‘‘ ڈاکٹر اسمتھ نے پوچھا۔

’’ہم اپنے حلیف ملک کے تربیت یافتہ ارکان یہاں بھیجیں گے جو رنگ و روپ میں یکسانیت کی بدولت مقامی اساتذہ کی جگہ سنبھالیں گے۔ ان کے عوام میں احساسِ محرومی اور انتقامی جذبات پروان چڑھائیں گے۔‘‘

’’ہمیں اس مشن میں زیادہ سے زیادہ اسلحہ کی فراہمی بھی ممکن بنائی جائے۔‘‘ ایک ایشیائی ایجنٹ نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

’’بالکل بنائی جائے گی...... آپ سب کے پیش نظر صرف دو ہی مقاصد ہونے چاہئیں...... عام نوجوانوں میں زیادہ سے زیادہ منشیات پھیلا کر ان کا ذہن کھوکھلا کر دیا جائے...... اور ان کے بہترین دماغ ’برین واشنگ‘ کے لیے ہماری یونیورسٹیز میں بھیجے جائیں...... جو برین مدافعت دکھائے اسے ’فائر‘ کر دیا جائے...... اس ملک کو ذہانت کے معاملے میں مکمل بنجر بنانا ہی ہمارا مشترکہ ٹارگٹ ہے۔‘‘

سی۔ ون کے منہ سے جھڑتے ان پھولوں سے وہاں موجود ایشیائی ایجنٹس کے دل بلیوں اچھل رہے تھے۔

’’ان کے لیے کیسی کتابیں تیار ہوں گی چیف؟‘‘ ہارپر نے استفسار کیا۔

’’جو ان میں صوبائی تعصب اور ناہمواری کو مزید بڑھائیں۔ عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا...... ان کے مذہبی جذبے سے متصادم کوئی بھی متنازعہ مسئلہ نہیں چھیڑا جائے گا۔ اس مشن کے لیے بہت صبر آزما ریاضت درکار ہے۔ مزید تفصیل سب ممبران کو ای۔ میل کر دی جائے گی۔‘‘

وہ پروجیکٹر اسکرین پر انہیں کچھ اہم اور حساس مقامات پر بریفنگ دینے لگا۔

بقا اور ذہانت کے تاوان کی وصولی کے لیے جنگ کا طبل بج گیا تھا۔ نئے سال کے آغاز سے زندگی کے اس اسٹیج پر ایک نئی کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

رگِ جاں

اسما قادری

عمر کی دھوپ ڈھلتی ہے تو دوسرے روپ بھی رنگ بدل کے سامنے آنے لگتے ہیں... جسم بوجھل، چاہتیں گم اور وقت کے سائے نہرے ہوئے لگتے ہیں... اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ اے محبت! ہم تیرے مجرم نہیں... شورشِ قلب و نظر کا شکار ایک وفاگزیدہ کی داستاں... کہکشاؤں کی دنیا میں رچنے بسنے والی دوشیزہ حسنِ فسوں خیز کی مالک تھی... ہر کوئی اس کے حسن کا شیدائی تھا... تمنائی تھا مگر چارہ گری سے ہر ایک کو گریز تھا... فلک کی گردشیں تھیں... کوئی پرسشِ احوال نہ تھا... سود و زیاں کے احساس کو خیرباد کہہ دینے والی معصوم سادہ دل حسینہ بالآخر باغباں تک آپہنچی تھی...

رگِ جاں بن جانے والے رشتوں کی ڈور سے بندھی ایک پراثر کہانی کے رموز......

''ونٹر وکیشنز اسٹارٹ ہونے والی ہیں۔ وکیشنز کے لیے تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟'' عروج نے برگر کا لقمہ حلق سے نیچے اتار کر کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ لیا اور اسی شغل میں مصروف اپنے گروپ کی باقی ماندہ تینوں ساتھیوں سے سوال کیا۔

''کرنا کیا ہے بھئی، خوب مزے سے دیر تک سو کر اٹھیں گے اور باقی دن بھی پوستیوں کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتے ہوئے سردیوں کے یہ آٹھ دس دن سکون سے گزاریں گے۔'' روشی نے فوراً ہی اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''سو بورنگ۔'' اس کا پروگرام سن کر عروج نے ناک چڑھائی۔

''میں تو اس بورنگ پروگرام پر بھی عمل نہیں کر سکتی۔ ڈیڈی کے ڈاکٹر ہونے کا یہ بھی ایک بڑا نقصان ہے۔ وہ ارلی ٹو بیڈ اینڈ ارلی ٹو رائز، میکس آمین ہیلدی ویلدی اینڈ وائز پر پکا یقین رکھتے ہیں اس لیے صبح دیر تک سونے کی اجازت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں ناشتے کی میز پر گھر کا ہر فرد لازماً اپنے سامنے چاہیے ہوتا ہے۔'' لبنیٰ نے معصوم سی.... صورت کے ساتھ اپنا غم بیان کیا۔

''ارے تم اپنے ڈیڈی کے ڈاکٹر ہونے کا رونا رو رہی ہو۔ ہمارے ڈیڈ تو ہوم منسٹری میں ہیں پھر بھی ہمیں صبح دیر تک سونے کی اجازت نہیں ملتی۔'' مہ پارہ نے 'تیرا غم میرا غم ایک جیسا صنم' کے مصداق اپنا دکھڑا رو دیا۔

''ہاں یار یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ لبنیٰ کے ڈیڈی ایسی سختی کرتے ہیں تو اس کی کوئی لاجک سمجھ بھی آتی ہے لیکن تمہارے ڈیڈی ایسے کیوں ہیں۔ ان کے محکمے کا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ ان بگڑے ہوؤں کے درمیان وہ اکیلے سدھرے ہوئے بندے کہاں سے آگئے جو آفس وقت پر جاتے بھی ہیں اور اپنا ٹائم بھی پورا کرتے ہیں۔'' روشی برگر اور کولڈ ڈرنک کو ٹھکانے لگا چکی تھی اور اب اپنے بیگ سے ایک عدد چیونگم برآمد کر کے اس کا ریپر کھولنے میں مصروف

تھی۔ یہ ان کا فری پیریڈ تھا اور چاروں کیفے ٹیریا میں بیٹھی پیٹ پوجا میں مصروف تھیں۔

"ڈیڈ کا فرمان ہے۔ میں اپنے حصے کی ڈیوٹی ایمانداری سے کرتا ہوں کیونکہ مجھے اپنے اعمال کا جوابدہ ہونا ہے۔ باقی لوگ اپنی آخرت کے بارے میں خود سوچیں۔ میں بھلا انہیں دیکھ کر ان جیسا کیوں بنوں اور اچھی بھلی باعزت جاب پر ہو کر اپنا رزق حرام کر کے اپنی اولاد کے منہ میں لقمہ حرام کیوں ڈالوں۔ حرام مال پر پلی اولاد نہ تو میری دنیا سنوارے گی اور نہ ہی مجھے آخرت میں کچھ ملے گا۔" جواب دینے کا فریضہ عروج نے انجام دیا۔ اس کے اس بیان کے دوران مہ پارہ تصدیقی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بہن کی تائید کرتی رہی۔

"سو نائس یار! انکل کی یہی بات تو انہیں سب سے منفرد بناتی ہے اور ہمیں ایک مثال مل جاتی ہے کہ آدمی اگر خود اچھا ہو تو ہر جگہ رہ کر اپنی اچھائی کو ثابت کر سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو کرپٹ ٹھہرا کر اپنے لیے کرپشن کی گنجائش وہی لوگ نکالتے ہیں جو حقیقتاً خود بھی اندر سے کرپٹ ہوتے ہیں۔" لبنیٰ نے فوراً عروج اور ماہ پارہ کے ڈیڈ سہیل مرزا کو سراہا۔ ان چاروں کی دوستی بہت پرانی تھی اس لیے وہ ایک دوسرے کے گھر والوں سے بھی بخوبی واقف تھیں۔

"ارے بھئی ان باتوں میں میرا سوال تو اپنی جگہ ہی رہ گیا۔ آخر پرل گروپ ان چھٹیوں میں کیا کر رہا ہے۔" عروج نے ایک بار پھر اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

"کیا کریں یار، زیادہ سے زیادہ یہی تیر مار سکتے ہیں کہ اپنی اسٹڈیز کو زیادہ ٹائم دے لیں۔ کہیں جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلے پھر بھی چھٹیوں میں کہیں ٹور پر چلے جاتے تھے لیکن آج کل حالات اتنے خراب رہنے لگے ہیں کہ ایسا کوئی پروگرام بھی نہیں بنا سکتے اس لیے طے ہوا کہ پرل گروپ کی قسمت میں ان وکیشنز میں بور ہونے کے سوا کچھ نہیں لکھا۔" لبنیٰ نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک طرح سے فیصلہ سنا دیا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ وکیشنز میں کچھ تو الگ ہونا چاہیے۔ پڑھتے تو ہم سارا سال ہی ہیں اور ماشاء اللہ سے سب ہی کے اچھے مارکس آتے ہیں۔" عروج کو ان چھٹیوں میں کچھ خاص کرنے میں زیادہ ہی دلچسپی تھی۔

"میں ایک آئیڈیا دوں۔" چیونگم چباتی روشی کے دماغ کی کھڑکیاں شاید اس شغل سے کھل گئی تھیں اس لیے اس نے چمکتی آنکھوں سے اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بالکل دو، ہم آئیڈیے کی راہ ہی تو دیکھ رہے ہیں۔" سب سے پہلے عروج اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہم ان وکیشنز میں ونٹر کیمپ لگاتے ہیں۔ ایک نیا تجربہ بھی ہو جائے گا اور انکم کی انکم بھی ہو جائے گی۔" روشی

کے آئیڈیے پر وہ تینوں ہی چونک گئیں۔
''میرے خیال میں تو یہ آئیڈیا فلاپ ہو جائے گا۔ گرمی کی چھٹیاں طویل ہوتی ہیں اس لیے لوگ اپنے بچوں کو سمر کیمپ میں ایڈمیشن کروا دیتے ہیں۔ آٹھ دس دن کی چھٹیوں کے لیے کون اپنا پیسا برباد کرے گا۔'' سب سے پہلے ماہ پارہ نے اعتراض کیا۔
''ایسے بہت سے لوگ مل جائیں گے۔ آج کل کی مائیں بچوں سے بیزار رہتی ہیں اور انہیں بچوں کی تھوڑی سی چھٹیاں بھی اپنے لیے عذاب لگتی ہیں اس لیے وہ چند گھنٹے انہیں گھر سے باہر بھیجنے یعنی ہمارے کیمپ میں داخل کروانے کے لیے بخوشی راضی ہو جائیں گی۔ سب سے بڑھ کر جاب کرنے والی ماؤں کے لیے ہمارا کیمپ ایک اچھی اٹریکشن ہوگا۔ انہیں بچوں کو نانی یا دادی کے گھر دھکیلنے کے مقابلے میں ہمارا کیمپ جوائن کروانا زیادہ بہتر محسوس ہوگا کیونکہ تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے ان کے بچوں کی انجوائے منٹ بھی ہو جائے گی اور وہ کچھ نہ کچھ سیکھ بھی لیں گے۔'' روشی نے اپنے آئیڈیے کا بھرپور دفاع کیا۔
''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن یہ آسان کام نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے ایڈورٹائزمنٹ کرنی پڑے گی۔ دوسرا مسئلہ جگہ اور ضروری سامان کا ہوگا۔ ہم میں سے کوئی اپنے گھر کے لان میں تو یہ کیمپ لگا نہیں سکتا اور کوئی جگہ کرائے پر لے کر انتظام کرنے کا مطلب ہے ٹھیک ٹھاک خرچہ...... اتنی انویسمنٹ کے بعد کچھ بچے گا نہیں۔'' عروج نے اس بار اس کی حمایت کی لیکن ساتھ ہی مسائل بھی سامنے رکھ دیے۔
''اس کا سلوشن ہے نا میرے پاس اسی لیے تو مشورہ دیا ہے۔ پاپا نے میرے نام سے ایک زبردست گھر لیا ہے۔ ان کا ارادہ ہے کہ میری شادی پر وہ گھر گفٹ کریں گے لیکن تم لوگوں کو تو پتا ہے کہ ابھی دور دور تک شادی کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے پاپا فی الحال گھر رینٹ پر دینا چاہتے ہیں۔ ہماری گڈ لک ہے کہ ابھی کوئی کرائے دار نہیں آیا ہے، اس لیے میں پاپا سے اسے کچھ دن یوز کرنے کی اجازت لے سکتی ہوں۔ ہم گھر کو ایک پوزیٹو ایکٹویٹی میں یوز کرنا چاہتے ہیں اس لیے آئی ہوپ کہ پاپا بالکل بھی منع نہیں کریں گے۔'' روشی نے گویا مسئلہ ہی حل کر دیا۔
''یہ تو تم نے بڑی اچھی خبر سنائی۔ تم آج ہی انکل سے اجازت لے لو پھر کل ہم میٹنگ رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا اور کیسے کرنا ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے طور پر آئیڈیاز سوچ لے۔ میٹنگ میں ان آئیڈیاز کو ڈسکس کر کے فائنل کر لیں گے۔'' ماہ پارہ نے فیصلہ سنایا اور وہ سب ''او کے'' کہتی ہوئی اگلے پیریڈ اٹینڈ کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

''مون! تیری پرابلم سولو ہو گئی۔'' مونا المعروف مون صوفے پر بیٹھی اپنے پیر کے ناخنوں پر ناخن پالش لگا رہی تھی اور اس کی دوست کم سیکریٹری صدف دوسرے قریبی صوفے پر بیٹھی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی کہ صدف نے اچانک اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے مونا کو مخاطب کیا۔
''کونسی پرابلم سولو ہو گئی یہاں کوئی ایک مسئلہ تو ہے نہیں۔ دس جھمیلے لگے ہوئے ہیں جان کے ساتھ۔'' مونا نے اپنی مصروفیت روکے بغیر بیزار سے لہجے میں صدف سے دریافت کیا۔
''وہی کاشان والی۔ تجھے ٹینشن تھی نا کہ کاشان سردیوں کی چھٹی میں سارا دن اکیلا گھر میں کیسے گزارے گا تو اس کا ایک حل نکل آیا ہے۔ اب کاشان کو پورا دن اکیلے گھر میں رہ کر بور نہیں ہونا پڑے گا۔ تو ایک نظر یہ اشتہار دیکھ۔'' صدف نے اخبار اس کی طرف بڑھایا تو وہ اخبار لے کر سنجیدگی سے مذکورہ اشتہار... پڑھنے لگی۔
وہ بیس اکیس سال کی نہایت خوب صورت تیکھے نین نقش اور اجلی رنگت رکھنے والی لڑکی تھی جس کا جسم نہایت متناسب اور قد لمبا تھا۔ حسن کی اس دولت کے ساتھ ساتھ وہ اداؤں سے بھی مالا مال تھی اور اسے دیکھنے والے اس کی ایک ایک جنبش پر اپنا دل تھام لیتے تھے۔ حسن اسے ماں سے ورثے میں ملا تھا اور ادائیں اس کے ماحول و تربیت کی دین تھیں کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں عورت کا حسن اور ادائیں ہی سب کچھ ہوتی ہیں۔ اپنی برادری کی دیگر بہت سی خواتین کی طرح اس کی ماں نے بھی چند سال پہلے بالا خانے کو خیر باد کہہ کر ایک پوش علاقے میں لگژری اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ ایسے علاقوں میں اردگرد کے لوگوں کو پروا نہیں ہوتی کہ ان کے پڑوس میں کون کیا کر رہا ہے اس لیے وہ اس لگژری اپارٹمنٹ میں بھی اپنے دھندے کو کامیابی سے جاری رکھے ہوئے تھی لیکن پچھلے دو برس سے اس کا دھندا بالکل چوپٹ تھا کہ جانے کس گھڑی لگنے والی نشے کی لت نے اسے بالکل ناکارہ کر دیا تھا اور گاہکوں کو اس کے اندر کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ خود پر یہ وقت آنے سے بہت پہلے ہی اس نے مون کو کماؤ پوت بنا ڈالا تھا لیکن اس کے لیے راہیں الگ منتخب کی تھیں۔ وہ اسے صرف سولہ سال کی عمر میں فلم نگری

لے گئی تھی لیکن پاکستان کی زوال پذیر فلم نگری بھلا مون کی کم عمری اور حسن سے کیا استفادہ کر پاتی۔ اس نے صرف ایک پنجابی فلم میں کام کیا لیکن وہاں بھاری بھر کم عمر رسیدہ ہیروئنوں کا راج تھا سو وہ خود کو اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر سکی لیکن اس واحد فلم میں کام کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کا چہرہ شوبز کی دنیا میں اجنبی نہیں رہا اور جب وہ فلم سے ٹی وی کی طرف آئی تو کامیابی اس کا نصیب بن گئی۔ نئے نئے چینلز کھل جانے کے باعث چھوٹی اسکرین پر فنکاروں کو خوب کام کرنے کا موقع مل رہا تھا اور وہ اچھا کما بھی رہے تھے۔ مون جیسی خوب صورت اور ''باہنر'' لڑکی کو وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس نے بھی خود کو منوانے کے لیے بہت محنت کی۔ اس کی ماں نے جدید دور کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اسے ایک اچھے انگلش میڈیم اسکول سے میٹرک کروایا تھا جس کی وجہ سے اسے زبان کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن معزز گھرانوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان اسے اپنی کم علمی کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ خود کو اس کامپلیکس سے نکالنے کے لیے اس نے باقاعدہ مطالعے کی عادت اختیار کر لی اور ساتھ ہی اپنے لیے ایک قابل ٹیوٹر بھی رکھ لیا جس نے اس کو مزید پالش کر کے ان ہائی سوسائٹی کی لڑکیوں کے درمیان سر تان کر کھڑا ہونے کے لائق بنا دیا۔ اب وہ بہت اعتماد سے اور بہت اچھا کما رہی تھی۔ دوستوں کے سلسلے الگ تھے جن کے باعث کام نہ ہونے کی صورت میں بھی اس کا ہاتھ کبھی تنگ نہیں ہوتا تھا۔

آج کل وہ ایک بڑے پروڈکشن ہاؤس کے میگا پروجیکٹ میں کام کر رہی تھی اور شوٹنگ کے سلسلے میں اسے اپنی ٹیم کے ساتھ اسلام آباد اور مری وغیرہ جانا تھا۔ اتفاق سے شوٹنگ کا شیڈول سردیوں کی چھٹیوں میں رکھا گیا اور اس کے لیے مسئلہ بن گیا کہ وہ ان چھٹیوں میں سات سالہ کاشان کو پورا وقت اپنی ماں الماس کے رحم و کرم پر کیسے گھر میں چھوڑ دے۔ الماس رات میں نشہ کر کے سوتی تھی تو دن چڑھے تک سوتی رہتی تھی اور اٹھنے کے بعد بھی اس کے ذہن پر بڑی دیر تک نشے کا خمار رہتا تھا۔ اس حالت میں وہ کبھی تو بالکل خاموش رہتی تھی اور کبھی غل غپاڑا اور توڑ پھوڑ کرنے لگ جاتی تھی۔ کاشان ان اوقات میں اسکول میں ہوتا تھا اس لیے اسے اس سارے ہنگامے کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ خود مون کی شوٹنگز بھی عموماً دوپہر کے بعد ہی ہوتی تھیں اس لیے وہ معاملات کو ہینڈل کر لیتی تھی لیکن سردی کی چھٹیوں میں شہر سے باہر شوٹنگ اس کے لیے مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ کاشان کو اپنے ساتھ بھی نہیں لے جاسکتی تھی کہ یہاں [illegible] اسے وکیشنز میں ملنے والا ہوم ورک وغیرہ کروا دیتا لیکن اسے اپنی مصروفیت میں کاشان کو وقت دینا مسئلہ بن جاتا پھر اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ ٹیم کے لوگوں کے لیے کاشان کا وجود ناپسندیدہ ہوتا اور وہ اسے اپنے کام میں خارج تصور کرتے۔ اس لیے وہ بہت فکرمند تھی کہ کاشان کے لیے کیا کرے اور اب اشتہار کی صورت میں جو کسی پرل گروپ کی طرف سے دیا گیا تھا اسے اپنا مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''میرا موبائل دو۔'' اس نے اشتہار پڑھنے کے بعد صدف سے مطالبہ کیا جس نے فوراً ہی شیشے کی میز پر رکھا بیش قیمت اسمارٹ فون اٹھا کر اسے تھما دیا۔ یہ فون مون نے نہیں خریدا تھا بیشتر قیمتی چیزوں کی طرح یہ بھی اسے اس کے کسی دوست نے تحفتاً دیا تھا۔ یہ اور بات کہ ایسے ہر تحفے کی قیمت مون کو اپنے حسن سے چکانی ہوتی تھی۔ اوپر والے نے اسے بہت فراخ دلی سے حسن کی دولت عطا کی تھی اور وہ دل کھول کر اس دولت کو لٹاتی تھی۔ اس کے نزدیک ساری دنیا کنزیومر تھی اور وہ مناسب قیمت ادا کرنے والے کنزیومر کو اپنے حسن و ادا سے فیض یاب کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھی۔ دنیا میں واحد کاشان ایسا فرد تھا جس سے اسے بے لوث محبت تھی اور وہ اس کی بہت پروا کرتی تھی۔ یہی پروا اور فکر نے اسے فوری طور پر اشتہار میں دیے ہوئے رابطہ نمبر کو ملانے پر مجبور کیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''السلام علیکم۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

''مجھے پرل ونٹر کیمپ کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔'' مون نے سنجیدگی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''یس میم، آپ بتائیے آپ کیا جاننا چاہتی ہیں۔'' دوسری طرف مستعدی میں اضافہ ہوا۔ مون نے ایک ایک کر کے وہ ساری معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں جنہیں وہ ضروری خیال کرتی تھی۔ تقریباً دس بارہ منٹ کی گفتگو کے بعد وہ خاصی مطمئن ہو چکی تھی اور اس نے عندیہ دیا تھا کہ وہ کل آفس آ کر ساری فارملیٹیز پوری کر دے گی۔

☆☆☆

''تمہارا آئیڈیا تو زبردست رہا روشی یار۔ ایسے دھڑا دھڑ ایڈمیشن آ رہے ہیں کہ لگتا ہے سارے شہر کی مائیں اپنے بچوں کو ہمارے ونٹر کیمپ میں ایڈمٹ کروانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ میرے خیال میں تو ہمیں جلد ہی ایڈمیشن کلوزڈ کا

بینر لگانا پڑے گا۔'' ابھی ابھی ایک جوڑا اپنے دو بچوں کا ان کے ونٹر کیمپ میں داخلہ کروا کر وہاں سے واپس گیا تھا۔ ان کے جاتے ہی لبنیٰ نے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ یہ تبصرہ کیا۔ وہ چاروں خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور اسی حساب سے انہیں جیب خرچ بھی اتنا ملتا تھا کہ وہ ٹھیک ٹھاک بچت کر لیتی تھیں۔ اپنی اس ایکٹویٹی کے لیے انہیں اپنی بچت کا خاصا بڑا حصہ خرچ کرنا پڑا تھا جو ان کے اندازے سے کافی زیادہ تھا۔ روشی کو ئیں... جانے کے باوجود اخراجات کافی زیادہ آئے تھے۔ مختلف سائٹس پر اس قسم کے کیمپ کی ضروریات اور لوازمات کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ان کا انتظام کرنے میں کافی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ اسٹاف بھی بھرتی کیا گیا تھا اور یہ سب کام انہیں اس عرصے میں کرنے پڑے تھے جبکہ یونیورسٹی میں ان کی کلاسز جاری تھیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کام میں انہیں اپنے والدین کی معاونت حاصل تھی۔ وہ خوش تھے کہ ان کی بیٹیوں کے دماغ میں ایک مثبت سرگرمی کا منصوبہ آیا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں ان کی ہر ممکن اخلاقی مدد کی تھی۔ مالی معاونت البتہ اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ جب وہ اپنا روپیہ لگا کر کام کریں گی تو انہیں فوائد و نقصانات کا اندازہ زیادہ بہتر طور پر ہو سکے گا۔ والدین کا روپیہ لگا کر تجربات کرنے والے عموماً اپنے تجربات سے مناسب سبق نہیں سیکھتے اور ان کے اپنے کام میں لگن بھی کم ہوتی ہے۔ ان چاروں نے بھی جب اپنے اپنے اکاؤنٹس سے رقم نکلوا کر اس منصوبے میں لگائی شروع کی تو ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر ہو گئی کہ معلوم نہیں اخراجات کے مقابلے میں اتنی آمدنی ہو سکے گی یا نہیں کہ انہیں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس مل سکے لیکن اشتہار دینے کے بعد جس طرح ایڈمیشن آنے شروع ہوئے ان کی فکر دور ہونا شروع ہو گئی۔ یہ پوش علاقہ تھا اور ایڈمیشن کے لیے بھی کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ ہی آئے تھے جن میں سے بیشتر وہ تھے جنہیں اپنے بچوں کو چھٹیوں میں گھر پر رکھنے میں کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا لیکن انہوں نے بس بچوں کی ایکٹویٹی اور انجوائے منٹ کے نام پر ان کا یہاں ایڈمیشن کروا دیا تھا حالانکہ یہاں داخلے کے لیے جو فیس مقرر کی گئی تھی وہ بھی ٹھیک ٹھاک تھی کہ بھاری فیس کے بغیر اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ منافع حاصل کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ انہوں نے دفتری اوقات سہ پہر تین بجے سے شام سات بجے تک رکھے تھے اور یونیورسٹی کے بعد باری باری دو، دو کے گروپ میں ایک ایک دن دفتر میں بیٹھتی تھیں۔ عروج اور مہ پارہ بہنیں تھیں اس لیے وہ دونوں ساتھ آتی تھیں جبکہ دوسرا گروپ روشی اور عروج کا تھا۔ دنوں کی تقسیم سے ان کی پڑھائی کا نقصان نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں بائیس دسمبر سے جب کیمپ شروع ہو جاتا تو وہ چاروں وہاں ایک ساتھ مکمل وقت کے لیے موجود رہتیں۔ آج روشی اور لبنیٰ کی باری تھی اور وہ آنے والے کلائنٹس سے ملاقاتیں کرنے کے ساتھ ساتھ آپس میں گفتگو بھی کر رہی تھیں۔

''میں نے ہمیشہ تم لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ میں ایک جینئس ہوں لیکن تم لوگ مانتے ہی نہیں ہو۔'' لبنیٰ کی خوشی کے جواب میں روشی نے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے اترا ہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''تکا لگ جانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بندہ جینئس بھی ہو۔'' لبنیٰ نے منہ بنایا۔

''تکا...... اتنی زبردست پلاننگ کو تکا کہتے ہیں؟'' روشی کو سخت صدمہ ہوا۔

''پلاننگ تو ہم سب نے مل کر کی ہے۔ تمہارا صرف آئیڈیا تھا۔'' لبنیٰ نے صاف گوئی کی انتہا کر دی۔ ممکن تھا کہ روشی جواب میں کوئی سخت بات کہتی اور ان کے درمیان بحث طول کھینچ جاتی کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی اور گیٹ پر موجود گارڈ نے دو خواتین کی آمد کی اطلاع دی۔ انہیں اندر بھجوانے کی ہدایت دے کر وہ دونوں مستعد ہو گئیں اور چہرے پر خوشگوار تاثرات سجا لیے۔ کچھ لمحوں میں ہی دو اسمارٹ سی خواتین ایک چھ سات سالہ بچے کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ دونوں جوان العمر تھیں اور انہوں نے آنکھوں پر سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ قدرے فربہی مائل خاتون نے جینز کے اوپر فل آستین کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ دوسری نے بھی جینز اور ٹی شرٹ ہی پہن رکھی تھی لیکن اس نے چہرے کے گرد اسکارف اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ ماتھے اور ٹھوڑی کا بیشتر حصہ چھپ گیا تھا اور باقی کی کسر سن گلاسز نے پوری کر دی تھی اس کے باوجود اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ اسمارٹ بھی بہت زیادہ تھی۔ روشی اور لبنیٰ فوراً ہی مرعوب ہو گئیں اور ان دونوں کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ بیٹھتے ہی انہوں نے اپنے سن گلاسز اتار دیے اور اس وقت روشی نے اسکارف والی کو شناخت کر لیا۔

''آپ ٹی وی آرٹسٹ موّن ہیں نا؟'' اس نے فوراً ہی پوچھ لیا جس کا جواب اس نے ایک اشتیاقی مسکراہٹ کے ساتھ دیا پھر اپنی ساتھی کا تعارف کرواتے ہوئے بولی۔

''یہ میری دوست صدف ہیں جو میری سیکریٹری کا کردار بھی ادا کرتی ہیں۔''

''آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ لوگوں کے لیے کیا منگواؤں، ٹھنڈا یا گرم؟'' روشی ذرا زیادہ خوش اخلاقی برت رہی تھی۔ وہ ٹی وی ڈراموں کی شوقین تھی اور اسے ہیرو، ہیروئنز سے دلچسپی بھی تھی۔

''تھینکس۔ میں اپنے ڈائٹ پلان سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں کھاتی پیتی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس وقت بھی کم ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر مجھے ایک شوٹ پر جانا ہے۔'' اس کا لہجہ تھوڑا سا بناوٹی ضرور تھا لیکن مترنم آواز کے باعث اس پر جچ رہا تھا۔ ان دونوں کو مزید اصرار کا موقع دیے بغیر اس نے اپنی بات جاری رکھی اور بولی۔

''میں نے نیوز پیپر میں آپ کے کیمپ کا ایڈ دیکھا تھا اور فون پر بات بھی کی تھی۔ اب کاشان کو ساتھ لے کر اس کا یہاں ایڈمیشن کروانے آئی ہوں۔ جو بھی فارملیٹیز ہیں آپ جلدی سے بتادیں تا کہ پروسس کمپلیٹ ہوجائے۔''

''شیور۔'' اس بار لبنیٰ نے اسے جواب دیا اور وہی ساری کارروائی کرتی رہی۔ دوسری طرف سے بھی مون کی سیکریٹری صدف نے ہی، فارم وغیرہ فل کر کے فیس کی ادائیگی کا کام کیا۔ مون نے صرف گارجین کے خانے میں اپنے دستخط کیے۔ لبنیٰ نے ان کے ساتھ آئے کاشان کا بھی ایک مختصر سا انٹرویو لیا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک خاموش طبع اور قدرے شرمیلی طبیعت کا بچہ ہے۔ شکل وصورت میں وہ مون ہی سے مشابہ تھا اور جسم پر موجود قیمتی لباس کی وجہ سے اور بھی زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ کارروائی مکمل ہوتے ہی وہ دونوں بچے سمیت وہاں سے رخصت ہوگئیں تو روشی نے پُرخیال انداز میں لبنیٰ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''تمہارا کیا اندازہ ہے۔ اس بچے سے مون کا کیا تعلق ہے؟''

''فارم میں لکھا تو ہے کہ بچہ اس کا بھائی ہے۔'' لبنیٰ نے فارم ایک فائل میں لگایا اور ساتھ ہی کمپیوٹر پر مصروف ہو گئی۔ وہ اپنے کیمپ میں داخل ہونے والے بچوں کا ریکارڈ تحریری شکل میں کاغذات پر رکھنے کے علاوہ کمپیوٹر میں بھی محفوظ کررہی تھیں۔

''مجھے تو وہ اس کا بیٹا لگا۔ شکل کتنی زیادہ مل رہی تھی دونوں کی۔'' روشی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''شکل ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو بہن بھائیوں کی بھی اکثر ملتی جلتی ہوتی ہے۔'' لبنیٰ نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے اس کے خیال کی تردید کی۔

''وہ تو ہوتی ہے لیکن ان اداکاراؤں کے بارے میں یہی سن رکھا ہے کہ یہ اپنی شادی اور اولاد وغیرہ کو چھپاتی ہیں اور اکثر انہیں اپنا بھائی بہن شو کرتی ہیں۔'' روشی نے شوبز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

''ایسی باتیں تو میں نے بھی سنی ہیں لیکن مون بہت ینگ ہے اور لگتا نہیں ہے کہ وہ اتنے بڑے بچے کی ماں ہو سکتی ہے۔'' لبنیٰ کو اس کی قیاس آرائی قبول کرنے میں تذبذب تھا۔

''تمہیں نہیں معلوم، مون کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے ہے۔ ایسی جگہ سے تعلق رکھنے والیاں بہت کم عمری میں بھی ماں بن جاتی ہیں اور ضروری تو نہیں کہ مون جتنی کم عمر نظر آتی ہے اتنی ہی کم عمر ہو بھی۔ یہ لوگ اپنا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ چالیس بیالیس سال کی عمر میں بھی مزے سے ہیروئنز کے رول کررہی ہوتی ہیں۔ تم نے مون کی بات سنی نہیں تھی کہ اپنے ڈائٹ پلان سے ہٹ کر کچھ کھاتی پیتی نہیں ہے۔ ینگ اور اسمارٹ لگنے کے لیے اور بھی جانے کیا کیا جتن کرتی ہوگی، ایسے میں ہم اس کی اصل عمر کا اندازہ کس طرح لگا سکتے ہیں۔'' روشی نے اپنی بات کے حق میں دلائل دیے۔

''ٹھیک ہے یار، ہونے دو کاشان کو اس کا بیٹا۔ ہمیں کون سا اس سے رشتے داری جوڑنی ہے۔ ہمیں تو اپنے کام اور فیس سے مطلب ہے۔'' لبنیٰ نے گویا بات ہی ختم کردی۔

''تم تو ہو ہی آدم بیزار۔ یہ جینئس لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح کے مسائل پر غور کرتے ہیں۔'' روشی کو اس کی یہ بے نیازی اچھی نہیں لگی اس لیے جل کر بولی۔

''واقعی......! جینئس لوگ اس طرح کے مسائل پر غور کرتے ہیں تو پھر یہ جو دنیا میں ہر روز نت نئے تجربات اور ایجادات ہوتی رہتی ہیں ان کے لیے کون غور وفکر کرتا ہے۔'' لبنیٰ نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کر کے روشی کو مزید جلایا تو اس بار وہ کچھ کہنے کے بجائے صرف ایک زوردار ''ہونہہ'' کر کے رخ موڑ گئی۔ لبنیٰ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی ہنسی روکی ورنہ روشی مزید ناراض ہوجاتی۔

☆☆☆

''کاشان کا ونٹر کیمپ میں پہلا دن.... کیسا رہا صدف! وہ وہاں جا کر خوش ہے نا؟'' مون نے سیل فون پر صدف سے دریافت کیا۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ شوٹنگ پر جا چکی تھی اور اب صدف سے رپورٹ لے رہی تھی۔

"ڈونٹ وری یار! وہ بہت خوش ہے۔ میں نے آج واپسی میں اس سے بات کی تھی وہ بہت خوش تھا۔" صدف نے اسے تسلی دی۔

"ہاں مجھ سے بھی فون پر اس نے یہی کہا تھا لیکن میں تم سے پوچھ کر اپنی تسلی کرنا چاہ رہی تھی۔" مون نے کہا اور پھر اس سے پوچھنے لگی۔ "تم تو کل دبئی کے لیے فلائی کر جاؤ گی۔"

"ہاں دوپہر کی فلائٹ ہے۔ میں کل صبح کاشان کو اس کے کیمپ پر ڈراپ کر دوں گی۔ آگے کے لیے میں نے ڈرائیور کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ ان لوگوں کا سیکیورٹی سسٹم بھی اچھا ہے۔ انہوں نے جو سیکیورٹی کارڈز ایشو کیے ہیں ان کے بغیر بچے کو کسی کے حوالے نہیں کرتے چاہے سامنے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ میں نے آج خود دیکھا تھا کہ ایک کپل بغیر کارڈ کے اپنے بچے کو لینے آگیا تھا تو انہوں نے بچہ ان کے حوالے نہیں کیا۔" صدف نے اسے تفصیلی جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ مون کو کاشان کی کتنی فکر رہتی ہے۔ مون کے حوالے سے اسے خود بھی کاشان عزیز تھا اور اگر اس کے لیے ممکن ہوتا تو وہ مون کی غیر موجودگی میں خود کاشان کی ذمے داری سنبھال لیتی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے خود دبئی جانا تھا۔ وہ ایک صنعت کار کی دوسری بیوی تھی اور ان کی یہ شادی خفیہ تھی اس لیے اس کا شوہر چھپ چھپا کر ہی اس سے ملاقات کا انتظام کرتا تھا۔ اب بھی اس نے صدف کے ساتھ ذرا زیادہ وقت گزارنے کے لیے بزنس کے بہانے دبئی کا یہ ٹرپ ارینج کیا تھا اور ظاہر ہے صدف کو اس کے پاس جانا تھا۔ مون بھی اس کی مجبوری کو سمجھتی تھی اس لیے اسے پابند نہیں کیا تھا۔ یوں بھی اسے معلوم تھا کہ صدف نے جتنی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے اس کے بعد اسے ملازمت کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے اور وہ صرف دوستی نبھانے کے لیے ابھی تک اس کے ساتھ ہے۔

"ان کا سیکیورٹی سسٹم تو مجھے بھی اچھا لگا تھا اسی لیے میں نے کاشان کو وہاں داخل کروا دیا۔ کاش وہ فل ٹائم بچوں کو اپنے پاس رکھ رہے ہوتے تو اور بھی اچھا ہو۔ ممی کے موڈ کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب کیا کر جائیں۔ وہ اپنی زندگی کی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لیے کسی کو بھی نشانہ بنا ڈالتی ہیں۔" مون کے لہجے میں دکھ تھا۔

"تم اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔ تم نے میڈ کو ایکسٹرا سیلری کے وعدے پر راضی تو کر لیا ہے کہ وہ رات کو بھی کاشان کے پاس ہی رہے گی پھر کیا پرابلم ہے؟" صدف ہلکی سی جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی۔ وہ مون کے ساتھ مخلص تھی لیکن ابھی اسے خود اپنے بہت سے کام کرنے تھے۔ کل کی روانگی کے لیے ابھی پیکنگ بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں پرابلم تو کوئی نہیں ہے بس میرا دل کچھ بے چین سا ہے۔ اینی وے، تم اپنے کام نمٹاؤ مجھے بھی اپنے ڈائیلاگز یاد کرنے ہیں۔ دو گھنٹے کی بریک ملی تھی اب پھر شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اسکرپٹ ہاتھ میں لے کر اس پر نظر دوڑانے لگی...... لیکن پتا نہیں کیوں بار بار اس کا دھیان بھٹک جاتا تھا اور کاشان کی طرف سے ہر طرح کے اطمینان کے باوجود وہ خود کو اس کے لیے متفکر محسوس کرنے لگتی تھی۔

☆☆☆

مہ پارہ مختلف بچوں کی بنائی ہوئی ڈرائنگ چیک کر رہی تھی۔ اس نے بچوں کو سادہ ڈرائنگ پیپر دے کر انہیں اس پر اپنی مرضی سے کچھ بھی ڈرا کر کے رنگ بھرنے کی ہدایت کی تھی اور مقررہ وقت پر ان سے وہ پیپر واپس لے لیے تھے۔ بچے اس وقت روشی اور عروج کی نگرانی میں پلے ایریا میں تھے جہاں اسٹاف کی دو مزید ممبران بھی ان کی نگرانی کے لیے موجود تھیں۔ بچوں کی بنائی ڈرائنگز چیک کرتے ہوئے مہ پارہ خاصی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ زیادہ تر بچوں نے کارٹون کریکٹرز کا انتخاب کیا تھا۔ کچھ نے فروٹ باسکٹ، ٹیبل لیمپ اور سینریز جیسی متفرق چیزیں بھی بنائی تھیں۔ ہر بچے کی ڈرائنگ کی صلاحیت مختلف تھی۔ کچھ نے بہت اناڑی پن سے کام کیا تھا۔ کچھ کا کام درمیانہ تھا اور کچھ کے کام میں خاصی نفاست تھی۔ بہرحال ہر ڈرائنگ میں بچکانا پن نمایاں تھا۔ بچوں کے بنائے آرٹ کے ان نمونوں پر مختلف ریمارکس دیتی ہوئی وہ ایک ڈرائنگ پیپر تک پہنچی تو بری طرح چونک گئی۔ ڈرائنگ میں ایک خوب صورت سا گھر موجود تھا جس کے پیش منظر میں ایک مرد اور عورت کے درمیان میں ایک بچہ کھڑا ہوا تھا۔ عورت اور بچے کے چہرے کے نقوش اتنے واضح تھے کہ مہ پارہ کو ان میں مون اور کاشان کی مشابہت تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی لیکن مرد کا چہرہ بالکل خالی تھا۔ اس پر آنکھ، ناک، ہونٹ کچھ بھی نہیں بنائے گئے تھے۔ البتہ لباس کو بڑی خوب صورتی سے اجاگر کیا گیا تھا۔ حقیقتاً مہ پارہ ڈرائنگ کے اس نمونے کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ اتنی مہارت اور نفاست سے بنائی گئی ڈرائنگ صرف ایک سات سالہ بچے کا کارنامہ ہے، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے یونہی کاغذ کے

کونے پر لکھا بچے کا نام دیکھا۔ وہاں کاشان ہی کا نام لکھا تھا۔

''یہ دیکھو لبنیٰ۔ کتنی زبردست ڈرائنگ بنائی ہے کاشان نے۔'' اس نے قریب بیٹھی لبنیٰ کو بھی اپنی حیرت میں شریک کرنا چاہا۔

''امیزنگ یار! کیا یہ سچ مچ کاشان نے بنائی ہے۔ اسے دیکھ کر تو یقین ہی نہیں آرہا کہ یہ ایک بچے کا کارنامہ ہے۔'' لبنیٰ بھی متحیر رہ گئی۔ بے حد عمدہ ڈرائنگ تھی اور چہروں میں مون اور کاشان کی مشابہت نے تو گویا کمال ہی کر دیا تھا، اس پر رنگوں کا استعمال بھی شاندار تھا۔ ہر امتزاج بالکل توازن میں تھا اور کہیں سے بھی معمولی سا بھی کوئی رنگ باہر نہیں نکلا تھا۔

''اتنی پرفیکٹ ڈرائنگ ہے لیکن اس میں مرد کے چہرے کے نقوش نہیں بنائے گئے۔ کیا کاشان نقوش بنانا بھول گیا ہے؟'' ابھی تک ڈرائنگ پیپر پر نظریں جمائے بیٹھی لبنیٰ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ جس درجے کی یہ ڈرائنگ، بنانے والے سے ایسی بھول کی امید نہیں کی جاسکتی۔ شاید اس نے مرد کے نقوش اس لیے نہیں بنائے ہیں کہ اس کے ذہن میں کوئی چہرہ ہی نہیں ہوگا۔ مون ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اسی لیے کاشان نے کپل کی تصویر بناتے ہوئے اس کے پارٹنر کے نقوش نہیں بنائے ہیں۔'' مہ پارہ نے تجزیہ کیا۔

''شاید یہی بات ہے لیکن اس کپل کے ساتھ کاشان نے اپنی تصویر کیوں بنائی ہے؟ وہ مون کا بیٹا تو نہیں ہے۔'' لبنیٰ نے ایک اور اعتراض اٹھایا۔

''مون اس کا خیال تو بیٹے ہی کی طرح رکھتی ہے نا اس لیے وہ خود کو اس سے الگ نہیں کر سکا ہوگا۔'' مہ پارہ کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ روشی دفتر میں داخل ہوئی۔

''کیا چل رہا ہے؟'' اس نے یونہی دریافت کیا۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بن کر ان کے کھیل میں شریک رہی تھی اس لیے اس کا چہرہ قدرے سرخ ہو رہا تھا اور سانس ہلکا سا پھولا ہوا تھا۔

''بس یہ کاشان کی بنائی ڈرائنگ پر تبصرے کر رہے تھے۔'' مہ پارہ نے اسے بتایا اور لبنیٰ نے ڈرائنگ پیپر اس کے حوالے کر دیا۔

''واؤ.... اوسم۔'' روشی جو ایک کرسی پر براجمان ہو چکی تھی ڈرائنگ دیکھ کر بے ساختگی سے بولی پھر اس نے بھی مرد کے بے نقش چہرے کو فوراً نوٹ کر لیا اور حیرت سے بولی۔ ''یہ کیا بھئی، اس نے مرد کے نقوش کیوں نہیں بنائے؟''

''اسی پوائنٹ کو میں اور لبنیٰ بھی ڈسکس کر رہے تھے۔'' مہ پارہ نے اسے وہاں ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

''اس تصویر کو دیکھ کر تو مجھے اور بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے کہ کاشان مون ہی کا بیٹا ہے اس لیے اس نے اس کپل کے ساتھ اپنی تصویر بنائی ہے۔ بے چارہ اپنے باپ کو جانتا ہی نہیں ہوگا اس لیے اس نے مرد کے چہرے کے نقوش نہیں بنائے ہیں۔ بے چارہ بچہ...... کتنی حسرت ہے اس کی بنائی اس تصویر میں۔ یقیناً وہ بھی نارمل بچوں کی طرح اپنے ماں اور باپ دونوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوگا لیکن افسوس......''

وہ کاشان کی بدقسمتی پر باقاعدہ آہیں بھرنے لگی۔ اول روز اس کی مون کے بارے میں قیاس آرائی کو رد کر دینے والی لبنیٰ بھی اس بار کوئی اعتراض نہیں کر سکی اور اس نے خود کو روشی سے متفق محسوس کیا۔

☆☆☆

آتش دان کے قریب راکنگ چیئر پر بیٹھی مون کے ہاتھ میں ایک کھلی.... کتاب تھی لیکن اس کی توجہ کتاب پر نہیں تھی، وہ بڑی سی گلاس ونڈو کے پار گرتی روئی کے گالوں جیسی برف کو دیکھ رہی تھی لیکن اسے ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ باہر ہوتی برف باری بھی اس کی توجہ کا اصل مرکز نہیں ہے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حقیقتاً وہ تھوڑی سی پریشان اور اُداس تھی۔ پریشان اپنے ایکس بوائے فرینڈ کی کال پر جس نے بہت سے دوسروں کی طرح مون کے دامن چھڑا لینے پر صبر کرنے کے بجائے مسلسل اسے تنگ کر رکھا تھا اور دن میں کئی بار کال کر کے اس سے التجا کرتا تھا کہ وہ اس سے ترکِ تعلق نہ کرے لیکن مون کے لیے اس سے تعلقات قائم رکھنا ممکن نہیں تھا۔ چند مہینوں کی دوستی میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسد نامی وہ لڑکا امیر زادہ تو تھا لیکن خودمختار نہیں۔ اس کے جاگیردار باپ نے سارا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا اور وہ اسد کو لگا بندھا جیب خرچ دیتا تھا اور ظاہر ہے اس جیب خرچ پر وہ مون کی دوستی افورڈ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مون نے اس سے جلد ہی دامن چھڑا لیا لیکن وہاں وہ حساب تھا کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ کمبل بن جانے والے اسد کو اس نے کئی بار سخت باتیں بھی سنائی تھیں کہ وہ

اسے تنگ نہ کیا کرے پھر بھی وہ اسے فون کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ تنگ آکر مون نے اس کی کال اٹینڈ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جس کے بعد وہ اسے ٹیکسٹ میسج بھیجتا رہتا تھا۔ ان میسجز میں وہ اپنی بے قراری اور بے تابی کو بہت شدت سے بیان کرتا تھا جس سے وہ متاثر تو ہوتی تھی لیکن کوئی مثبت ردعمل دینے سے اس لیے بھی قاصر تھی کہ اسد کے جاگیردار باپ نے اسے پیغام بھجوایا تھا کہ اب اگر اس نے اسد سے تعلقات استوار کیے تو اسے بُرے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ شاید ان کی دوستی سے دیر سے واقف ہوا تھا اس لیے مون کے پاس ترکِ تعلق کے بعد یہ پیغام آیا تھا۔ بہرحال مسئلہ اسد کے باپ کا نہیں خود اسد کا تھا۔ اپنی شدتوں کے جواب میں مون کی خاموشی پر اس کے دل میں غصے کے جذبات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے اور اب اس کے پیغامات میں دھمکی کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا۔ آج بھی اس نے پیغام بھیجا تھا کہ اگر مون نے مزید اسے نظرانداز کیا تو وہ کچھ ایسا کر گزرے گا جس کی بعد میں تلافی ممکن نہیں ہوگی۔ چھوٹی موٹی دھمکیاں اسے کبھی کبھار مل ہی جایا کرتی تھیں لیکن اسد کی طرح کسی جنونی سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا جو کسی صورت اس کی جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حقیقتاً اب اسے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں اسد کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر گزرے لیکن وہ کیا کرے گا اس کا اسے صحیح طرح اندازہ نہیں تھا۔ اپنی ذات کے علاوہ وہ سب سے زیادہ کاشان کے لیے متفکر رہتی تھی اور اسے ڈر تھا کہ کہیں اسد، کاشان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ اس پریشانی کے ساتھ ساتھ اسے اداسی نے بھی گھیرا ہوا تھا۔ وہ جس دنیا کی باسی تھی وہاں عورتیں گھر نہیں بسا تیں لیکن پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ اس کا بھی ایک گھر ہو جہاں وہ چاہنے والے شوہر اور بچوں کے ساتھ غمِ روزگار سے بے فکر ہو کر زندگی گزارے۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے شاید تواتر سے مطالعے میں آنے والے ان ناولوں نے بھی کردار ادا کیا تھا جو خواتین لکھاریوں نے تحریر کیے تھے اور جن پر آج کل ٹی وی سیریلز بنائے جا رہے تھے۔ ان ناولوں کا مرکز زیادہ تر گھر ہی ہوتا تھا۔ مون نے ان کا مطالعہ صرف کہانی کو اچھی طرح سمجھنے اور خود کو اپنے کردار میں پوری طرح ڈھالنے کی غرض سے کیا تھا لیکن پھر وہ خود کو ان کہانیوں کا ہی ایک حقیقی کردار محسوس کرنے لگی تھی۔ اب بھی وہ جس ڈراما سیریل کی شوٹنگ کے لیے مری آئی ہوئی تھی اس میں اس کا کردار ایک ایسی لڑکی کا تھا جو محبت کی شادی کے بعد اپنے چاہنے والے شوہر کے ساتھ ہنی مون کے لیے مری آئی ہوئی تھی۔ اس کا ساتھی اداکار اورنگزیب بہت خوب صورت شخصیت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ فطری اداکار بھی تھا اور ہر کردار کو اتنا ڈوب کر ادا کرتا تھا کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ خود مون کو وہ سب حقیقت محسوس ہونے لگا تھا لیکن شوٹنگ کے درمیانی وقفوں میں جب اورنگزیب سب کچھ بھول بھال کر اپنی بیوی یا بیٹی سے گفتگو میں مصروف ہو جاتا تھا تو اس کا خواب ایک چھناکے سے ٹوٹ جاتا تھا۔ اورنگزیب اپنی فیملی کے ساتھ حد سے زیادہ اٹیچڈ تھا اور اسے لمحہ لمحہ ان سے رابطے میں رہنے کا اتنا جنون تھا کہ وہ وقفے میں یونٹ کے دوسرے افراد سے زیادہ گفت و شنید بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ گفتگو کرتا بھی تو اپنی فیملی کے متعلق۔ آج مون نے برف باری میں اس کے ساتھ بہت ہی رومانوی منظر فلم بند کروایا تھا اور ہر ایک نے تعریف کی تھی کہ دونوں نے بہت ڈوب کر اداکاری کی تھی اور دونوں کا کپل اچھا لگ رہا تھا۔ ایک جونیئر اداکارہ نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ اس سین کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہوں۔ اس تبصرے پر کئی لوگ بے ساختہ ہی ہنس دیے تھے لیکن اورنگزیب کا ردعمل سب سے انوکھا تھا۔ اس نے سوشل میڈیا پر ''آئی مس یو'' کے پیغام کے ساتھ بھیجی گئی اپنی بیٹی کی تصویر مون کو دکھاتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ وہ جلد از جلد شوٹنگ سے جان چھڑا کر اپنی فیملی کے پاس واپس جانا چاہتا ہے۔ اپنے حسن کے جادو سے واقف مون کے لیے اورنگزیب کی یہ بے نیازی بڑا صدمہ تھی... اس کا موڈ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ پیک اپ کے بعد جب بیشتر لوگ گھومنے پھرنے اور شاپنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے وہ کسی کی بھی پیشکش پر باہر نہیں گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اورنگزیب کو بھی انکار کر دیا تھا جو اپنی بیوی اور بیٹی کی شاپنگ میں اس کی مدد کا خواہاں تھا۔ وہ سب سے اپنی طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرتی رہی تھی۔ برف باری میں کام کرنے سے اس کی طبیعت متاثر بھی ہوئی تھی اور ہلکے سے فلو کے باعث ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اس لیے اس کا بہانہ چل گیا تھا۔ اس ڈرامے کا ڈائریکٹر سعد تھا اور اس نے اپنی ٹیم کو کسی ہوٹل میں ٹھہرانے کے بجائے اپنے ایک دوست کے بنگلے میں ٹھہرایا تھا۔ ہوٹل کے بجائے بنگلے میں رہنے سے وہ لوگ پبلک اور میڈیا کی دخل اندازی سے بچ گئے تھے اور آرام و سکون سے اپنی مرضی کے مطابق وقت گزار رہے تھے۔ سعد کا دوست بنگلے کو سیزن میں کرائے پر چلاتا تھا لیکن سعد کی

دوستی کا لحاظ کرکے اس نے اسے بنگلا ممکنہ حد تک کم کرائے پر فراہم کردیا تھا۔ بنگلے پر ایک چوکیدار تھا جس کی بیوی ان لوگوں کی خدمت کے لیے تقریباً ہر وقت حاضر رہتی تھی۔ چوکیدار باہر سے سودا سلف بھی لادیتا تھا۔ مون کی طبیعت کی خرابی کا سن کر چوکیدار کی بیوی نے اس سے خاص جڑی بوٹیوں کا جوشاندہ منگوایا تھا اور وہ کڑوا کسیلا جوشاندہ تیار کرکے بااصرار مون کو پلایا تھا۔ جوشاندہ پی کر مون نے اپنی طبیعت میں خاصا افاقہ محسوس کیا تھا لیکن اس کی ذہنی اور قلبی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اس کیفیت کے تحت وہ کرسی پر ساکت بیٹھی کسی خوب صورت مجسمے کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ باہر جانے والوں میں سے سب سے پہلے سعد کی واپسی ہوئی اور وہ جو سردی سے اچھا خاصا کانپ رہا تھا مون کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ تراشیدہ خال وقد کی مالک مون سفید لباس میں ملبوس، ساکت بیٹھی کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ آتش دان میں لپکتے شعلوں کا عکس اس پر پڑنے سے اس کے وجود سے رنگ برنگی روشنیاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سعد ان روشنیوں میں ڈوب سا گیا۔ اسی وقت باورچی خانے میں کام کرتی ملازمہ کے ہاتھ سے کوئی برتن چھوٹ کر گرا اور زوردار آواز ابھری، اس آواز نے وہاں چھایا طلسم یکدم ہی توڑ دیا اور جہاں سعد اپنی محویت سے باہر آیا وہیں مون بھی اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آگئی۔

”سعد! تم کب واپس آئے؟“ اس کی نظر سعد پر پڑی تو اس سے دریافت کیا۔

”آئے تو کافی دیر گزر گئی لیکن آتے ہی تمہارے حسن نے اس طرح جکڑ لیا کہ میں اپنی جگہ سے قدم ہی نہیں اٹھا سکا۔“ اس نے فدویانہ نظروں سے مون کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ بے دلی سے مسکرا کر رہ گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنی اس تعریف سے خوش ہوتی اور مزید نازو ادا دکھا کر کچھ فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس وقت وہ الگ ہی کیفیت میں تھی، اسے کسی نام نہاد عاشق اور حسن کے متوالے کی نہیں بلکہ ایک سچی محبت کرنے والے ساتھی کی خواہش نے اسیر کررکھا تھا۔

”کیا بات ہے طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی کیا؟“ سعد کے ساتھ وہ کافی عرصے سے کام کررہی تھی اور ان میں بے تکلفی کی ساری حدوں کو توڑنے والی دوستی تھی، اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کی اس تبدیلی کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل آبیٹھا اور قدرے تشویش سے دریافت کرنے لگا۔

”طبیعت کافی بہتر ہے۔ تم فکر نہیں کرو تمہارا شیڈول ڈسٹرب نہیں ہوگا۔“ مون نے اسی بے جان مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا۔

”بھاڑ میں جائے شیڈول۔ مجھے تو تمہاری فکر ہے۔ تم اتنی ڈل کیوں لگ رہی ہو؟“ وہ پکا کاروباری دماغ رکھنے والا آدمی تھا جسے ہر دم اپنے نفع اور نقصان کی فکر رہتی تھی لیکن اسے اداکاری بھی خوب آتی تھی اور وہ مون پر یہ ظاہر کررہا تھا کہ اس کے نزدیک مون سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ درحقیقت مون کا حسن اس کے حواسوں پر چھا رہا تھا اور وہ اس کی توجہ کا طلب گار تھا لیکن وہ کچھ عجیب سے موڈ میں نظر آرہی تھی۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے بس کچھ دیر ایسے ہی خاموش بیٹھنے کا دل چاہ رہا تھا۔“ مون نے اسے ٹالا اور یونہی اس کا جائزہ لینے لگی۔ سعد تیس بتیس سال کا عام سی شکل وصورت رکھنے والا آدمی تھا لیکن پیسے کی فراوانی کے باعث اس نے اپنی شخصیت کو نکھارنے کا پورا انتظام کررکھا تھا، اس وقت بھی جینز کے ساتھ سیاہ اور سفید دھاری دار پل اوور میں خاصا پرکشش لگ رہا تھا۔

”کم آن یار۔ اس عمر میں اس طرح کا موڈ طاری کرکے کیوں بور ہو رہی ہو اور دوسروں کو بھی بور کررہی ہو۔ چیئر اپ بے بی۔ تمہاری عمر ابھی ہلا گلا اور انجوائے کرنے کی ہے۔“ سعد نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟ کیا میں یہاں بھنگڑے ڈالنا شروع کردوں۔“ وہ دھیرے سے ہنسی۔

”اس کے علاوہ بھی کچھ کیا جاسکتا ہے۔“ سعد کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں اور لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

”مثلاً......؟“ مون نے اس کا انداز بھانپ لینے کے باوجود تجاہل سے کام لیا۔

”چلو چپکے سے یہاں سے نکل چلتے ہیں۔ پہلے میں تمہیں شاپنگ کرواؤں گا۔ پھر کسی اچھی سی جگہ ڈنر کریں گے اور اس کے بعد ہم کسی ہوٹل میں ہی ٹھہر جائیں گے۔“ اس نے اپنے پروگرام کو بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے مون کو شاپنگ کا لالچ دیا۔

”اس سیزن میں کسی ہوٹل میں کمرا نہیں ملے گا۔“ مون نے اسے ٹالا۔

”وہ میرا مسئلہ ہے۔ مجھے اس طرح کے پرابلم سولو کرنے آتے ہیں۔“

”میرا موڈ نہیں ہے سعد!“ آخر مون کو صاف جواب دینا پڑا۔

”تم مجھے انکار کر رہی ہو؟“ سعد گویا حیرت کا شکار ہو گیا۔

”کیوں؟ کیا میں تمہیں انکار نہیں کر سکتی؟“ اس بار اس نے چڑچڑے پن سے جواب دیا۔

سعد پرائیویٹ پروڈکشنز میں ایک بہت ہی معتبر نام تھا اور مون نے ہمیشہ اس سے بہت بنا کر رکھی تھی اس لیے وہ اس کے انکار پر حیران تھا۔ دوسری طرف مون پر جو موڈ طاری تھا اس کے باعث وہ سعد کے ساتھ اس طرح برتاؤ کر رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے تم کسی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو۔ چاہو تو مجھ سے اپنی پرابلم شیئر کر لو۔“ سعد کے بارے میں مشہور تھا کہ بظاہر بہت خوش اخلاق ہونے کے باوجود وہ اندر سے بڑا کینہ پرور اور منتقم مزاج آدمی ہے اور ہر بات کو اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیتا ہے اس کے باوجود وہ مون سے اپنے گہرے مراسم کا خیال رکھتے ہوئے اب بھی اس کے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ اس کے اس انداز پر مون کے دل نے اسے صلاح دی کہ کیوں نہ اپنا مسئلہ اس کے سامنے بیان کر دے اور پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنے سارے خواب اس کے گوش گزار کرنے شروع کر دیے۔ سعد ٹکٹکی باندھے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

”میں جس ماحول میں پیدا ہوئی وہ میری چوائس نہیں تھی۔ اگر میں کسی شریف خاندان میں پیدا ہوتی تو وہاں کے رسم و رواج کے مطابق زندگی گزارتی۔ اب بھی میرے دل میں تمنا ہے کہ میں شریفانہ زندگی گزاروں اور خود کو اپنے شوہر تک محدود کر لوں لیکن اپنی اس تمنا کی تکمیل کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ ایک بار اگر کوئی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اس دلدل سے نکال لے تو میں ساری زندگی اس کی وفادار رہوں گی۔“ وہ دل کی گہرائیوں سے یہ سب کہہ رہی تھی لیکن سعد کو اس کی یہ باتیں بور کر رہی تھیں۔ اس کے نزدیک مون جیسی لڑکیاں محض تفریح طبع کا ذریعہ تھیں اور وہ کسی معاشرہ سدھار مہم یا اس طرح کے کسی اور کام میں ہاتھ ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

”سعد تم میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم شادی شدہ ہو۔ تم نے ایک بار بتایا تھا کہ تمہاری بیوی تم سے عمر میں بڑی ہے اور تم نے محض خاندانی دباؤ کی وجہ سے اس سے شادی کی تھی۔ تمہاری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں اور تم ابھی تک بے اولاد ہو، تم اپنی فیملی کو دوسری شادی کا جواز دے سکتے ہو۔ آخر تمہارا بھی حق ہے کہ تم کسی خوب صورت اور کم عمر لڑکی کے ساتھ زندگی گزارو اور تمہارے بچے ہوں۔“ اپنی رو میں بہتے ہوئے اسے ٹھیک سے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ اور کر رہی ہے۔ وہ سعد کا ہاتھ تھامے، آنسو بہاتے ہوئے اس سے التجا کیے جا رہی تھی۔

”ریلیکس مون، ریلیکس! تم ضرورت سے زیادہ ایموشنل ہو رہی ہو اور میری پوزیشن کو سمجھے بغیر مجھ سے ایسا مطالبہ کر رہی ہو جو میں پورا نہیں کر سکتا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے شادی کرنے کے لیے اس لیے مجبور کیا گیا تھا کہ وہ بہت دولت مند ہے۔ میں جس عالیشان گھر میں رہتا ہوں وہ میری بیوی اپنے جہیز میں لائی تھی، میری گاڑی بھی اسی کے نام پر ہے اور میرے پروڈکشن ہاؤس میں سارا پیسا بھی اسی کا لگا ہوا ہے۔ اسے اگر میری دوسری شادی کے ارادے کا بھی علم ہو گیا تو وہ مجھے سڑک پر لے آئے گی اور آئی ایم سوری ٹو سے، میں عمر رسیدہ اور بانجھ بیوی کے ساتھ تو رہ سکتا ہوں لیکن سڑک پر جوتیاں نہیں چٹخا سکتا۔ خوب صورت اور کم عمر عورتوں کے ساتھ کا کیا ہے۔ وہ تو میں جب چاہوں قیمت ادا کر کے حاصل کر سکتا ہوں اور کرتا بھی رہتا ہوں۔ میری بیوی ہوا کے جھونکوں کی طرح میری زندگی میں آنے والی عورتوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ اس کی واحد شرط یہی ہے کہ وہ میری اکلوتی بیوی رہے گی باقی میں عیاشی جتنی چاہے کروں اسے کوئی اعتراض نہیں۔“ سعد نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا تو احساس ذلت سے سکتہ زدہ سی رہ گئی۔ سعد نے اپنی مجبوریاں نہیں گنوائی تھیں بلکہ اسے یہ بھی باور کروا دیا تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جنہیں وہ قیمتاً حاصل کر سکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔

”ایکسکیوزمی سعد! میری طبیعت خراب ہے، اب میں اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں گی۔“ اس کا سکتہ ٹوٹا تو اس نے بمشکل اتنا کہا اور ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”اونہہ...... شادی کر لوں وہ بھی اس طوائف سے۔ میری بیوی مجھ سے عمر میں بڑی اور کم صورت ہی لیکن ہے تو باکردار۔ میں دوسری شادی کروں گا بھی تو کسی شریف اور خاندانی لڑکی سے۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اس طوائف کو اپنے گلے میں لٹکانے کی۔“ اس کے جانے کے بعد سعد بلند آواز میں بڑبڑاتا رہا۔

''سالی نے سارا موڈ غارت کر دیا۔ مان جاتی تو آج کی رات اچھی گزر جاتی۔ اب اس سردی میں خالی شراب سے گزارا کرنا پڑے گا۔'' وہ بے حد خراب موڈ کے ساتھ خود بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اسے ہر صورت اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' شاہنواز نے میز پر مکا مارا اور سیاہ کوٹ میں ملبوس اپنے مقابل بیٹھے شخص سے بولا۔

''ریلیکس یار! دیکھتے ہیں کہ کیا راستہ نکل سکتا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں نے اس سلسلے میں کافی کام کیا ہے لیکن فی الحال کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔'' سیاہ کوٹ والا شخص شاہنواز کا دوست عدنان تھا جو وکالت کے پیشے سے وابستہ تھا جبکہ شاہنواز خود ایک آرٹسٹ تھا۔ وہ آئل پینٹنگ اور مجسمہ سازی دونوں میں مہارت رکھتا تھا اور بین الاقوامی سطح پر اس کا کام جانا اور مانا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک دولت مند آرٹسٹ تھا جس کے زیرِ استعمال اشیا کو دیکھ کر ہی اس کی امارت کا احساس ہو جاتا تھا۔ کپڑوں، جوتوں اور گھڑی سے لے کر سگار تک اس کی ہر شے برانڈڈ تھی۔ البتہ انداز میں فنکاروں والی مخصوص بے نیازی بھی پائی جاتی تھی۔ اس کے سر کے بال شانوں کو چھوتے تھے اور قدرے الجھے ہوئے بھی تھے لیکن ان کی چمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے کسی اچھے شیمپو کا استعمال کرتا ہے۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور ہمیشہ بڑھی ہوئی ہی دکھائی دیتی تھی لیکن اس میں اس کے ذاتی ارادے کا بھی دخل تھا اس لیے یہ شیو ایک حد سے زیادہ کبھی نہیں بڑھتی تھی۔

''اگر تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے تو پھر میں سیدھا راستہ اختیار کرتا ہوں اور اسے اٹھوا لیتا ہوں۔ وہ ایک بار میرے پاس آجائے تو پھر کوئی اسے مجھ سے نہیں چھین سکتا۔'' اس کی انگلی میں دبا سگار یونہی سلگ رہا تھا اور وہ مضطرب سا عدنان کو اپنے ارادے سے آگاہ کر رہا تھا۔

''ریلیکس یار! تمہارے جیسے بندے کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔'' عدنان نے اسے ٹوکا۔

''اور مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا کہ میرا بیٹا، میرا خون اتنے عرصے سے طوائفوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔ ان کی کمائی پر پل بڑھ رہا ہے۔ مجھے سات سال بعد اس کی اس دنیا میں موجودگی کا علم ہوا ہے اور میرا بس نہیں چل رہا ورنہ میں اسے گھڑی بھر میں وہاں سے لے آؤں، اس کے باوجود میں نے پورے تین دن صبر کیا ہے، وہ بھی تمہارے بھروسے پر اور تین دن بعد تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔'' وہ واقعی بہت الجھا ہوا اور انتشار کا شکار تھا۔ قریبی دوست کی حیثیت سے عدنان اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا اس لیے اس کے تند لہجے کے باوجود اس نے برا نہیں مانا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھو یار میں نے کاشان سے متعلق جو انفارمیشن اکٹھی کی ہیں ان کا سب سے اہم پوائنٹ یہ ہے کہ اس کی ولدیت کے خانے میں تمہارا نام موجود نہیں ہے۔ اس کی ولدیت وہی لکھی ہوئی ہے جو مون کی مختلف دستاویزات میں درج ہے۔ ساری دنیا کاشان کو الماس کے بیٹے اور مون کے بھائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اسپتال کے ریکارڈ سے کاشان کے سلسلے میں کوئی ثبوت حاصل کر سکوں لیکن مجھے یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ کسی اسپتال میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ہوم ڈیلیوری ہے اس لیے کوئی ریکارڈ بھی موجود نہیں ہے جس سے اس کے اصل والدین کا پتا چل سکے۔ تمہارے پاس گواہ بھی نہیں ہے۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ کسی نامعلوم شخص نے تمہیں ٹیلی فون پر یہ حقیقت بتائی تھی کہ تمہارا بیٹا الماس بائی اور مون کی تحویل میں ہے اور وہ تمہیں یہ اطلاع صرف اس لیے دے رہا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کوئی نیک کام کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں اطلاع دینے والے شخص نے غالباً کینسر کی آخری اسٹیج پر ہونے کا بتایا تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تمہیں ایک قریب المرگ شخص نے تمہارے ایسے بیٹے کی موجودگی کی اطلاع دی ہے جس کے وجود سے ہی تم بے خبر تھے اور اب تمہیں خبر ہوئی بھی ہے تو حالات یہ ہیں کہ تمہارے پاس نہ تو کوئی ثبوت ہے اور نہ ہی گواہ۔ ایسے میں، میں نوٹس بھجوا بھی دوں تو وہ لوگ زیادہ پریشر میں نہیں آئیں گے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں نے تمہارے دعوے سے بچنے کے لیے ہی کاشان کی ولدیت میں گڑبڑ کی ہو۔''

''ان لوگوں کی ایسی کی تیسی۔ تم انہیں نوٹس بھیجو۔ میں ڈی این اے ٹیسٹ سے ثابت کر دوں گا کہ کاشان میرا ہی بیٹا ہے۔'' وہ غصے اور جوش کی ملی جلی کیفیت میں تھا۔

''اس میں بھی تمہارا ہی نقصان زیادہ ہو گا۔ تم انٹرنیشنل لیول پر پہچانے جانے والے آرٹسٹ ہو۔ کیس شروع ہو گا تو تمہاری بدنامی ہو گی اور گڑے مردے اکھاڑے جائیں گے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم کیس کرنے کے بجائے کوئی اور راہ اختیار کرو کیونکہ تمہاری قانونی پوزیشن بھی کمزور ہے اور تمہاری عزت کا بھی سوال

ہے۔'' عدنان اسے اس معاملے کی اونچ نیچ سمجھانے لگا۔

''کھل کر بتاؤ تاکہ میں تمہاری بات پوری طرح سمجھ سکوں۔'' وہ عدنان کے مشورے پر چونکا۔

''میں آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھو...... وہ جس ماحول کے لوگ ہیں، وہاں لڑکوں کے مقابلے میں یوں بھی لڑکیوں کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ لڑکیاں انہیں کما کر دیتی ہیں۔ تم انہیں کاشان کی اچھی قیمت آفر کرو۔ میرے خیال میں وہ لوگ مان جائیں گے۔ ان کے لیے لڑکے کو پالنا ویسے بھی ایک بوجھ ہی ہوگا۔''

عدنان کے مشورے پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو یار! میں پہلے بھی اس در پر لٹ چکا ہوں۔ اس بار اپنے بیٹے کے حصول کی خاطر لٹوں گا تو یہ میرے لیے مہنگا سودا نہیں ہوگا لیکن میں نے سنا ہے کہ مون اسے بہت چاہتی ہے اور اسے خود سے دور کرنا پسند نہیں کرتی۔ کیا پتا وہ سودے بازی پر تیار نہ ہو۔'' شاہنواز نے اس کی رائے سے اتفاق کرنے کے ساتھ ہی ایک اندیشے کا اظہار کیا۔

''میری اطلاع کے مطابق مون کاشان کو یہیں چھوڑ کر خود شوٹنگ کے لیے ناردرن ایریاز گئی ہوئی ہے۔ اسے کاشان کی اتنی فکر ہوتی تو اسے اپنی نشئی ماں کے پاس چھوڑ کر ہرگز بھی کہیں نہیں جاتی۔'' عدنان وکیل تھا اور اسے دلیل سے دوسروں کو قائل کرنا آتا تھا۔ شاہنواز بھی قائل ہوگیا اور قدرے بےقراری سے بولا۔

''کیا میں آج ہی الماس بائی سے ملنے چلا جاؤں؟''

''میرے خیال میں مون کا انتظار کرلینا بہتر ہوگا۔ الماس بائی اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہی ہے۔ ڈرگز کے بے تحاشا استعمال نے اس کی ذہنی حالت بھی تباہ کر رکھی ہے۔ اگر تم اس سے سودا کرکے کاشان کو حاصل کرلیتے ہو تو بہت ممکن ہے کہ مون ہنگامہ مچائے۔ وہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ تم نے اس کی ذہنی معذور ماں کو بہلا پھسلا کر بچے پر قبضہ کرلیا ہے اس لیے بہتر ہے کہ معاملات اس کے ساتھ طے کرو۔ میں کسی سے اس کی واپسی کی ڈیٹ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' عدنان نے اسے مشورہ دیا جسے ماننے میں ہی اسے بہتری محسوس ہوئی لیکن دل کی بےقراری کا کیا کرتا جو فوراً سے بیشتر کاشان کو اپنی آغوش میں دیکھنے کے لیے بےتاب ہوا جا رہا تھا۔

☆☆☆

مون کے سعد کے ساتھ تعلقات مسلسل خرابی کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے سعد کے مطالبات رد کرنا شروع کردیے تھے جواباً سعد کی مہربانیوں کا سلسلہ بھی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شوٹنگ کے دوران کوئی ری ٹیک ہوجانے پر وہ مون کو بری طرح لتاڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اس کے رویے پر شدید سبکی محسوس کرنے کے باوجود مون اس کے آگے جھکنے کو گوارا نہیں کر رہی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ماضی میں جو ہوا سو ہوا اب وہ ایک صاف ستھری زندگی گزارے گی۔ اپنے خوابوں کی راہ گزر پر چلتے ہوئے اسے کاشان کا بھی خیال آیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ جب کاشان بڑا ہوگا اور معاملات کو سمجھنے لگے گا تو وہ اس کا سامنا کیسے کرے گی اور اس کے سوالوں کے جواب کیسے دے گی۔ وہ جو اسے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھانے اور مستقبل میں کسی اچھے عہدے پر دیکھنے کا ارادہ رکھتی ہے خود اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔ معاشرے کے طعنے اسے بھی آگے نہیں بڑھنے دیں گے اور بالفرض وہ کسی اچھے مقام پر پہنچ بھی گیا تو اسے وہ عزت نہیں ملے گی جس کا وہ اصل میں حق دار ہوگا۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ لوگوں کی باتوں کی وجہ سے وہ ڈپریشن میں مبتلا ہوکر پڑھنا لکھنا ہی چھوڑ دے اور بری صحبت میں پڑ جائے، ایسے میں اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ کیا وہ کوٹھوں پر پیدا ہونے والے اور بہت سے مردوں کی طرح دلال بن جائے گا۔ ایسا بےشرم دلال جو کمیشن پر اپنی بہنوں، کزنز اور بعض اوقات بیٹیوں تک کے لیے گاہک ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ کاشان کے ایسے تاریک مستقبل کا خیال اس کے لیے نہایت روح فرسا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب چاہے تنگی میں ہی گزارا کرنا پڑے، وہ غلط راہوں پر نہیں چلے گی۔ سعد کے رویے نے اسے بتا دیا تھا کہ اس جیسے دوسرے مہربانوں کا رویہ بھی اس جیسا ہوگا۔ پہلے سعد نے اپنی آئندہ دونوں سیریلز میں بھی اسے ہی ہیروئن لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن اب وہ برملا کہتا پھر رہا تھا کہ مون کام میں دلچسپی نہیں لیتی اور اس کا وقت برباد کرتی ہے اس لیے اپنی کسی آئندہ سیریل میں اسے کاسٹ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقتاً اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے بعد مون خود بھی ڈسٹرب تھی — اسے احساس تھا کہ اسے اخراجات کے لیے کافی زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی ذہنی انتشار کے باعث اس کا کام بھی متاثر ہو رہا تھا اور سعد کو اس کے خلاف بولنے کے مواقع میسر آتے جا رہے تھے۔ کل رات بھی اس کی سعد کے ساتھ بحث ہوئی تھی اور سعد نے واضح طور پر اسے دھمکی دی تھی کہ اگر مون نے اپنا

رویہ تبدیل نہیں کیا تو وہ اسے تباہ کر کے رکھ دے گا اور وہ ناقابلِ تلافی نقصان اٹھائے گی۔ سعد کی دھمکی اپنی جگہ تھی اور اسد بھی اس کے لیے وبال بنا ہوا تھا۔ سعد سے بحث کے بعد اس کے پاس اسد کا میسج آیا تھا اور اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر چوبیس گھنٹوں کے اندر مون نے اسے مثبت ردِعمل نہیں دیا تو وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے گا۔ مون کے دل میں ایک بار خیال آیا تھا کہ کیوں نا اسد ہی کو آزما کر دیکھے۔ اگر وہ اس کا ایسا ہی دیوانہ تھا تو اسے اپنا بھی سکتا تھا لیکن پھر اسے اسد کے باپ کا خیال آگیا تھا۔ وہ جاگیردار آدمی تھا اور پہلے ہی اسے متنبہ کر چکا تھا کہ وہ اس کے بیٹے سے دور رہے۔ وہ اس کی دھمکی کو نظرانداز بھی کر دیتی تو اسے معلوم تھا کہ اسد ایک بے عمل آدمی تھا جس کا گزارا باپ کے دیے جیب خرچ پر ہوتا تھا۔ اس جیسا شخص بھلا اسے اور اس کی فیملی کو کیسے سپورٹ کر پاتا۔ اسد سے تعلق قائم کرنا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا اس لیے وہ اس کی دھمکی پر تھوڑی سی ہراساں ہونے کے باوجود اسے نظرانداز کر گئی تھی۔

''کیا بات ہے مس مونا! آپ کچھ پریشان ہیں؟''

آج موسم صاف تھا اور ہلکی ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی اس لیے وہ باہر ٹیرس پر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گئی تھی اور دھوپ کی حرارت سے اتنے دن سے سردی سے اکڑ جانے والے جسم کو تمازت پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی پریشان سوچوں کا عکس اس کے چہرے پر تھا شاید اسی وجہ سے وہاں چلا آنے والا اورنگزیب بے ساختہ ہی اس سے سوال کر بیٹھا۔ آج کے شیڈول کے مطابق شوٹنگ سہ پہر کو ہونی تھی اس لیے کافی دن چڑھ جانے کے باوجود سب لوگ اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔

''ارے آپ جلدی اٹھ گئے؟ باقی لوگوں کی طرح آپ کو اپنی نیند پوری کرنے میں دلچسپی نہیں ہے کیا؟'' مون نے اس کا سوال نظرانداز کر کے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''وہ میری نٹ کھٹ سی بیٹی ہے نا، وہ کہاں مجھے سونے دیتی ہے۔ پاپا کو گڈ مارننگ کہے بغیر محترمہ ناشتا کرنے پر بھی تیار نہیں ہوتیں اسی لیے مجھے لازماً صبح جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔ کافی دیر بیوی اور بیٹی سے بات کرنے کے بعد نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے میں نے سوچا چلو ذرا باہر کا نظارہ کر لیتے ہیں لیکن اس نظارے میں سب سے پہلے آپ پر نظر پڑ گئی اور مجھے لگا کہ آپ کچھ پریشان ہیں اس لیے آپ سے سوال کر بیٹھا۔ دو تین دن سے آپ کی پرفارمنس بھی پہلے جیسی نہیں رہی ہے اور سعد کا موڈ بھی خاصا آف ہے تو......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ بس ایسے ہی۔'' وہ اسے کیا بتاتی اس لیے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بس اتنا ہی کہہ کر رہ گئی۔

''شاید میں کچھ پرسنل ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔ عموماً میں دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا لیکن آپ مجھے زیادہ ہی ڈسٹرب لگیں اس لیے......'' اس نے ایک بار پھر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ارے نہیں اورنگزیب صاحب! آپ اتنے فارمل کیوں ہو رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کولیگز ہیں اور آپس میں اس طرح کے سوال جواب کر سکتے ہیں۔ میں تو آپ کی شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرا اتنا خیال کیا کہ مجھ سے میری پریشانی کے بارے میں پوچھا۔ ورنہ آپ کے بارے میں تو یہی مشہور ہے کہ آپ کو اپنے کام اور فیملی کے علاوہ کوئی تیسری چیز سجھائی ہی نہیں دیتی۔'' بولتے بولتے آخر میں مون کا لہجہ تھوڑا شوخ ہو گیا تو اورنگزیب تھوڑا سا جھینپ گیا اور وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

''ایکچولی میں مکمل طور پر ایک فیملی مین ہوں اور کام بھی اس لیے کرتا ہوں کہ میری فیملی ایک اچھی لائف گزار سکے۔ میرے خاندان میں سے کبھی کوئی فرد شوبز میں نہیں آیا۔ میں بھی شادی کے بعد ہی آیا ہوں اور اس فیلڈ کو جوائن کرتے وقت میرے فادر نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بیٹا کبھی اپنے دامن کو داغ دار نہ ہونے دینا اور کوشش کرنا کہ کسی چھوٹے اسکینڈل میں بھی نہ پھنس سکو اس لیے میں خود کو ریزرو رکھتا ہوں۔''

''نائس، آپ کی مسز خوش قسمت ہیں کہ انہیں اتنا صاحبِ کردار لائف پارٹنر ملا۔'' مون کے لہجے میں بیک وقت رشک و حسد اتر آئے۔

''خوش قسمت تو میں بھی ہوں کہ مجھے ایسی بیوی ملی جس کی سوچ کا محور بس میں اور میرا گھر ہے۔ وہ بہت خوش اخلاق اور خاندان کو جوڑ کر رکھنے والی عورت ہے۔ اس نے مجھے مکمل ذہنی و قلبی آسودگی دے رکھی ہے۔'' اورنگزیب نے اپنی بیوی کی تعریف کی۔

''عورت کوئی بھی ہو اور کسی بھی فیلڈ میں کام کرتی ہو اس کی تان آخر کار اپنے گھر پر ہی آ کر ٹوٹتی ہے لیکن ہر عورت کو ایسا گھر کہاں ملتا ہے جہاں وہ مکمل تحفظ کے احساس

کے ساتھ رہ سکے۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی تھی جسے محسوس کر کے اورنگزیب گنگ ہو گیا۔ اسے لگا کہ اس نے مون کا مسئلہ سمجھ لیا ہے لیکن وہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہے یہی سوچ کر خاموشی اختیار کر لی۔ دوسری طرف مون بھی خاموش بیٹھی اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس خاموشی کو مون کے ہاتھ میں موجود موبائل کی رنگ ٹون نے توڑا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" مون نے اسکرین پر آنے والے اجنبی نمبر کو دیکھا... اورنگزیب سے کہہ کر کال ریسیو کی۔

"میری بات غور سے سنو میڈم! تمہاری جان کاشان ہمارے قبضے میں ہے اور ہمیں اس کی رہائی کے بدلے ایک کروڑ تاوان چاہیے۔ تم رقم کا انتظام کر لو۔ میں اگلی کال میں وقت اور جگہ کے بارے میں بتادوں گا۔ میرے خیال میں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ پولیس کو اطلاع دینے کی صورت میں تم شدید نقصان اٹھاؤ گی۔" اس کی "ہیلو" سنتے ہی دوسری طرف موجود شخص نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر سنگین لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔

"کون ہو تم؟ اور کیوں کاشان کو اغوا کیا ہے؟" مون جو کاشان کے اغوا کی خبر سن کر پوری جان سے لرز گئی تھی لرزتی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔

"بیکار کے سوالات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے تم جلد سے جلد رقم جمع کرنے اور واپس آنے کے بارے میں غور کرو۔ میں اب تمہارے کراچی واپس پہنچنے پر ہی تم سے رابطہ کروں گا۔" دوسری طرف موجود شخص نے سرد مہری سے اسے جھڑک کر اپنے آئندہ کا لائحہ عمل بتایا اور فوراً ہی کال کاٹ دی۔ مون ہیلو ہیلو کرتی رہی اور پھر دوسری طرف خاموشی کو محسوس کر کے خود ہی اس نمبر پر بے تابی سے کال بیک کرنے لگی لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔

"اینی پرابلم مس مون؟" وہ بار بار اسی نمبر پر کال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ اورنگزیب نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کسی نے کاشان کو کڈنیپ کر لیا ہے اور مجھ سے ایک کروڑ کا تاوان مانگ رہا ہے۔" اس نے اورنگزیب کو بتایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"پلیز مون خود کو سنبھالیے اور مجھے پوری بات بتائیے۔" اورنگزیب بے ساختہ ہی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور دلاسا دینے والے انداز میں اس کے شانے پر

ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"یہاں کیا چل رہا ہے؟" سعد جو اسی وقت وہاں آیا تھا اس منظر کو دیکھ کر حاسدانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"مس مون کے بھائی کاشان کو کسی نے اغوا کر لیا ہے، یہ اس کے لیے پریشان ہیں۔" اورنگزیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتایا پھر دوبارہ مون کی طرف متوجہ ہو کر اس سے تفصیلات دریافت کرنے لگا۔ مون نے کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پا کر اسے فون پر ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔

"کہیں کسی نے مذاق تو نہیں کیا ہے؟ آج کل لوگ ایسے بے ہودہ مذاق بھی کرنے لگے ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ پہلے اپنے گھر فون کر کے معلوم کر لیں۔" اورنگزیب نے اسے مشورہ دیا تو وہ موہوم سی امید کے سہارے گھر کا نمبر ملانے لگی۔ الماس کا اسے معلوم تھا کہ اس وقت نشے میں دھت سوئی پڑی ہوگی۔ حسب توقع ملازمہ نے فون اٹھایا۔

"کاشان بابا تو اپنے وقت پر ڈرائیور کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میں بھی بس جانے ہی والی تھی۔ کاشان بابا کے آنے کے وقت پر دوبارہ آجاؤں گی۔" اس کے پوچھنے پر ملازمہ نے اسے اطلاع دی تو اسے خیال آیا کہ یہ تو کاشان کی کیمپ میں موجودگی کا وقت ہے۔ ڈرائیور صبح اسے وہاں ڈراپ کرتا تھا اس کے بعد اسے اجازت تھی کہ وہ جیسے چاہے اپنا وقت گزارے اور پھر مقررہ وقت پر وہاں سے لے کر واپس گھر پر چھوڑ دے۔ دوپہر سے رات تک پھر وہ وہیں رہتا تھا کہ کسی کام سے اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مون کو ڈرائیونگ کرنا پسند نہیں تھا بلکہ وہ خوف محسوس کرتی تھی اس لیے اس نے ڈرائیور کا اضافی خرچہ پال رکھا تھا۔ ملازمہ کے جواب کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر کے سب سے پہلے ڈرائیور کا نمبر ملایا لیکن اس کا نمبر بند تھا۔ مون کا دل اور بھی زیادہ اندیشوں کا شکار ہو گیا پھر اس نے اپنے سیل فون میں محفوظ ونٹر کیمپ کا نمبر ملایا۔ فوری ہی کال ریسیو کی گئی۔

"پرل ونٹر کیمپ۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" دوسری طرف سے شیریں لہجے میں کاروباری جملہ ادا کیا گیا۔

"میں مونا خادم علی بات کر رہی ہوں۔ میرا بھائی کاشان خادم علی آپ کے ونٹر کیمپ میں ہوتا ہے، میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے بے تابی سے اپنے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

"لیکن آج تو کاشان غیر حاضر ہیں۔" دوسری طرف سے حیرت بھرے لہجے میں جواب دیا گیا۔

"آپ کو بالکل کنفرم معلوم ہے؟" اس کا دل مزید پاتال میں گرنے لگا۔

"جی بالکل! میں نے ہی صبح بچوں کی اٹینڈنس لی تھی اور کاشان کو غیر حاضر پا کر یہی سمجھی تھی کہ شاید ان کی طبیعت وغیرہ خراب ہے اس لیے وہ آج نہیں آئے۔ کیا کوئی پرابلم ہے؟" اسے اطلاع فراہم کرنے والی کا لہجہ تشویش زدہ ہوا لیکن مون کو اسے جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے سلسلہ منقطع کیا اور اورنگزیب اور سعد کی طرف دیکھتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں بتانے لگی۔

"کاشان اپنے ٹائم پر ونٹر کیمپ جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن وہ وہاں نہیں پہنچا اور ڈرائیور کا فون بھی بند جا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کڈنیپرز نے راستے میں ہی کارروائی کی ہے۔ مجھے فوراً کراچی جانا ہوگا تاکہ کاشان کی واپسی کے لیے کچھ کر سکوں۔ آپ لوگ پلیز اس بات کو اپنے تک رکھیے گا۔ کڈنیپر نے مجھے صاف دھمکی دی ہے کہ بات پولیس تک نہیں پہنچنی چاہیے۔"

"لیکن شوٹنگ کا کیا ہوگا۔ تمہارے دو تین سین باقی ہیں، وہ آج کروا لو تو پھر چلی جانا دوسری صورت میں میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔" سعد اس کا فیصلہ سن کر بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا۔

"یہاں میری جان سولی پر لٹکی ہے اور تمہیں اپنے نقصان کی پڑی ہے۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا ڈراما...... میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رک سکتی۔" اس کا مطالبہ سن کر مون کو سخت طیش آ گیا اور وہ پیر پٹختی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی۔

"بچ......" سعد نے دانت چباتے ہوئے اسے گالی دی اور بڑبڑایا۔ "مجھے اسے روکنا ہوگا۔ یہ چلی گئی تو مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو سعد! ایک انسانی زندگی کے مقابلے میں تم اپنے مالی نقصان کو کیسے اہمیت دے سکتے ہو؟" اورنگزیب نے اسے ٹوک دیا۔

"چھوڑو یار، جانے کس کس کی ناجائز اولادیں پالتی پھرتی ہیں یہ عورتیں۔ یہ جس کے لیے پریشان ہو رہی ہے وہ کون سا اس کے باپ کا سگا ہوگا۔" سعد کے لہجے میں مون کے لیے حقارت تھی۔

"بات جائز اور ناجائز کی نہیں، انسانی زندگی کی

ہے۔ تمہیں ذرا احساس نہیں ہے کہ ایک معصوم بچہ مشکل میں ہے اور اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔'' اورنگزیب کے لیے سعد کا رویہ بہت افسوس ناک تھا۔ وہ خود ایک بیٹی کا باپ تھا اس لیے مون کی کیفیت کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

''رہنے دیں اورنگزیب صاحب! یہ شخص نہیں سمجھے گا۔ اس کی اپنی اولاد ہوتی تو اسے دوسرے کے درد کا احساس ہوتا۔'' مون اپنا شولڈر بیگ ٹانگے کھڑی تھی اور لگ رہا تھا کہ وہ روانگی کے لیے بالکل تیار ہے۔ بات تھی بھی یہی۔ اس نے اتنی عجلت میں واپسی کا فیصلہ کیا تھا کہ اپنا سامان بھی ڈھنگ سے نہیں سمیٹا تھا اور جو ہاتھ لگا تھا اسے بیگ میں ٹھونس کر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔

''میں جا رہی ہوں۔ اسلام آباد کے لیے کوئی ٹیکسی ہائر کر لوں گی اور وہاں سے پلین میں کراچی چلی جاؤں گی۔'' اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ سعد نے کوئی جواب دیے بغیر منہ پھیر لیا البتہ اورنگزیب بولا۔

''دو منٹ رکیں۔ میں آپ کے ساتھ اسلام آباد تک چلتا ہوں۔ آپ کا اکیلے ٹیکسی میں جانا مناسب نہیں ہوگا۔'' مون کے لیے اس کی پیشکش ایک نعمت تھی جسے اس نے ٹھکرانے کے بجائے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اورنگزیب نے فوراً ہی کہیں فون کر کے ٹیکسی کے لیے بات کی اور پھر مون سے بولا۔

''ٹیکسی آنے میں بیس منٹ لگیں گے۔ آپ چاہیں تو اتنی دیر میں اپنی تیاری مکمل کر لیں۔ لمبا سفر ہے اتنی عجلت کا مظاہرہ کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔'' مون نے اس کی بات کو سمجھ کر سر ہلایا اور دوبارہ اپنے مخصوص کمرے کی طرف چلی گئی۔ بیس منٹ بعد ٹیکسی آگئی اور وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

''میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی کہ آپ کو خاص طور پر کراچی پہنچنے کی تاکید کیوں کی گئی؟'' کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اورنگزیب نے سوال اٹھایا۔

''شاید اس لیے کہ انہیں اندازہ ہوگا کہ میں کراچی پہنچ کر ہی رقم کا انتظام کر سکوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے وہ دھیمے اور محتاط انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

''یا پھر اس لیے کہ وہ خود کراچی میں موجود ہیں اور آپ کو بھی وہاں دیکھنا چاہتے ہیں۔'' اورنگزیب کا لگایا گیا اندازہ اسے چونکا گیا اور سب سے پہلے اس کے ذہن میں اسد کا نام آیا۔ وہ مسلسل اسے دھمکیاں دیتا رہا تھا اور ... اس نے بہت ہی زیادہ دھمکی آمیز پیغام بھیجا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ کوئی منصوبہ بنا چکا تھا۔ کیا وہ منصوبہ کاشان کے اغوا کا تھا اور اسد اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے کاشان کے بہانے کراچی بلا رہا تھا؟ اس کے ذہن میں خیال آیا تو اس نے تیزی سے اسد کا نمبر ڈائل کیا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کر لی گئی لیکن دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز اسد کی نہیں تھی۔

''اسد کہاں ہے؟ اس سے میری بات کروائیں۔'' اس نے مطالبہ کیا۔

''اسد کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ آپ مجھ سے بولو آپ کو اس سے کیا کام ہے زندگی صاحبہ!'' بات کرنے والے نے سخت لہجے میں پوچھا۔ لیکن مون تو اس کے طرزِ تخاطب پر حیران تھی۔

''زندگی صاحبہ...... کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ادھر اسد کے موبائل کی اسکرین پر آپ کے نمبر کے ساتھ یہی نام آرہا ہے۔ آپ کو پسند نہیں تو اپنا اصل نام بتا دو۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''آخر آپ ہیں کون اور اسد کا موبائل آپ کے پاس کیوں ہے؟'' اس بار مون جھنجلا گئی۔

''میں ایس ایچ او اقبال چانڈیو ہوں اور اسد کا موبائل میرے پاس اس لیے ہے کہ وہ خود میری تحویل میں ہے۔'' تعارف کے ساتھ اطلاع دی گئی تو مون چونک گئی اور اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس کے پولیس کی تحویل میں ہونے کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کر گزرا ہے کیا......؟ یہی سوال اس کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہا تھا۔

''کیا کیا ہے اس نے؟'' یہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔

''آپ کو اس کی اتنی فکر ہے تو ادھر تھانے آکر بات کرو۔ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ ایسی کون سی زندگی ہے جس کے لیے وہ اس حد تک چلا گیا۔'' ایس ایچ او کے لہجے میں طنز کی کاٹ اور بھی تیز ہو گئی۔

''آپ کیا باتیں کر رہے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ پلیز آپ کھل کر بتائیں۔'' اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ایس ایچ او سے حقیقت جاننا چاہتی تھی۔

''کھل کر تو آمنے سامنے ہی بات ہو سکتی ہے۔ آپ

بولو کب تھانے پہنچ رہی ہیں؟''
''دیکھیں، میں اس وقت شہر سے باہر ہوں اس لیے فوری طور پر تھانے نہیں آسکتی۔'' اس نے اپنی مجبوری بیان کی۔
''ہمیں بھی یہی اطلاع تھی ورنہ آپ کے گھر پہنچ چکے ہوتے۔ آپ بتائیں آپ کی واپسی کب ہورہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''میں آج ہی واپس آرہی ہوں لیکن آپ کچھ تو بتائیں۔'' اس نے اصرار کیا۔
''آپ آہی رہی ہیں تو پھر جلدی کس بات کی ہے، سامنے بیٹھ کر بات کرلیں گے۔'' ایس ایچ او نے جواب دے کر فوراً ہی رابطہ منقطع کردیا۔ مون کے ذہنی دباؤ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ پریشانی کے عالم میں وہ بار بار اپنے موبائل پر مختلف نمبر ڈائل کرتی رہی لیکن یہی لگ رہا تھا کہ آج کسی سے رابطہ نہیں ہوسکے گا۔ اورنگزیب ساتھ بیٹھا سب سن رہا تھا لیکن سوال جواب سے گریز کیا اور تھرماس میں سے کافی نکال کر اسے پیش کی۔ یہ کافی وہ چلتے وقت ملازمہ سے تیار کروا کر لایا تھا۔ مون نے شکریے کے ساتھ کافی قبول کرلی۔ حقیقتاً اس وقت اسے ڈرنک کی طلب ہورہی تھی۔ بہت زیادہ اعصابی دباؤ یا خاص مواقع پر وہ ڈرنک کرنے کی عادی تھی لیکن اس وقت اسے کافی پر ہی گزارا کرنا تھا۔ اسلام آباد ائرپورٹ تک پہنچنے میں انہیں خاصا وقت لگا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اورنگزیب پہلی دستیاب فلائٹ میں ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کرکے پہلے ہی سیٹ کا انتظام کرچکا تھا۔ اس نے راستے میں بہت زیادہ گفتگو نہیں کی تھی اور نہ ہی بار بار مون کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن جس طرح اس کی عملی مدد کرتا رہا تھا اس پر مون اس کی بہت مشکور تھی۔ سعد نے تو اس موقع پر پرانے تعلقات کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا بلکہ اسے مون کے مسئلے کے بجائے اپنی شوٹنگ کی فکر لگ گئی تھی۔
''تھینک یو سو مچ اورنگزیب! آپ نے میرا اتنا ساتھ دیا۔ پلیز دعا کیجیے گا کہ میں کاشان کو پانے میں کامیاب ہو جاؤں۔'' اسلام آباد ائرپورٹ پر رخصت ہونے سے قبل اس نے بطور خاص اورنگزیب کا شکریہ ادا کیا۔
''اٹس او کے مس مون! انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ میں جو کرسکتا تھا میں نے کیا۔ آپ کو آپ کا بھائی مل جائے یہ میری دلی خواہش ہے۔'' اورنگزیب نے کہا اور پھر قدرے عجلت سے بولا۔ ''اب چلنا چاہیے۔ لوگ ہماری طرف متوجہ ہورہے ہیں۔'' وہ دونوں بالکل سادہ حلیے میں تھے اور اسکرین کے مقابلے میں خاصے مختلف نظر آرہے تھے پھر بھی دیکھنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں اور وہاں موجود لوگوں میں سے یقیناً کچھ نے انہیں پہچان لیا تھا اس لیے ان کی طرف اشارے کررہے تھے۔ وہ ان کے درمیان گھر جاتے اس سے پہلے ہی نکل جانا بہتر تھا۔ دونوں نے یہی کیا اور ایک دوسرے کو بائے کہہ کر مخالف سمتوں میں چل پڑے۔

☆☆☆

''ہمیں کاشان کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔'' لبنیٰ نے جیسے حتمی فیصلہ سنایا۔ فون پر اسی نے مون سے گفتگو کی تھی اور کاشان کے متعلق اس کے کیے گئے سوال جواب سے زیادہ اس کے لہجے کی سراسیمگی پر چونک گئی تھی۔ مون نے سلسلہ بھی بالکل اچانک منقطع کردیا تھا اس لیے اس کی تشویش میں اضافے کے ساتھ جاسوسانہ رگ بھی پھڑک گئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہے تو فی الحال مون اس کی کال ریسیو نہیں کرے گی۔ اس نے اس کے گھر کے نمبر پر کال کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں ملازمہ نے فون اٹھایا۔ لبنیٰ نے اس سے اتنی ہوشیاری سے گفتگو کی کہ ملازمہ جو پہلے ہی پریشان تھی بہت کچھ اگل گئی۔ ملازمہ سے گفتگو کے بعد اس کا شک یقین میں بدل گیا کہ کاشان کے ساتھ گڑبڑ ہے اور مبینہ طور پر وہ اغوا کرلیا گیا ہے۔ اس نے فوراً پرل کے باقی تینوں ارکان کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ معاملہ رکھ کر اپنا فیصلہ سنایا۔
''بالکل، وہ بچہ ہمارے کیمپ کا حصہ ہے اور ہم کسی بھی طرح اسے نظرانداز نہیں کرسکتے۔'' مہ پارہ نے بھی اس کے فیصلے کی توثیق کردی۔ باقی دو کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔
''اب یہ سوچو کہ ہمیں اب کام کہاں سے شروع کرنا ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ کاشان کو دشمنی یا تاوان کی وجہ سے اغوا کیا گیا ہے اور مون کو بطور خاص اس کی اطلاع دی گئی ہے اسی لیے اس نے پریشان ہوکر یہاں فون کیا تھا۔ ملازمہ سے جو باتیں معلوم ہوئیں اس سے یہ بھی اندازہ ہورہا ہے کہ کاشان کو گھر سے یہاں آنے کے دوران راستے میں اغوا کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے یقیناً اس کی گاڑی کو روکا گیا ہوگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی گاڑی اور ڈرائیور کہاں ہے۔ کڈنیپرز گاڑی ساتھ لے بھی جائیں تو ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ غریب ڈرائیور ان کے لیے اضافی بوجھ ہوگا۔'' یہ سارا تجزیہ عروج نے پیش کیا۔

”اگر کڈنیپرز گاڑی نہیں لے گئے تو وہ راستے میں ہی کہیں کھڑی ہوگی۔ ہم اس کے نمبر سے اسے چیک کرواسکتے ہیں۔ نمبر میرے پاس ہے۔“ پُرجوش انداز میں یہ مشورہ دینے والی لبنیٰ تھی۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے باہر سیکیورٹی کیمرے لگائے گئے تھے اور اپنی جاسوسانہ فطرت سے مجبور ہوکر اس نے یہاں بچوں کو چھوڑنے آنے والی گاڑیوں کے نمبر مانیٹر پر دیکھ کر نوٹ کر لیے تھے۔ بچوں کے آنے اور جانے کے اوقات میں وہی مانیٹر پر باہر کے مناظر پر نظر رکھتی تھی۔

”او کے تو پھر نکالو نمبر۔ میں ابھی جعفر انکل کو فون کر کے ان سے گاڑی کا پتا کرواتی ہوں۔“ روشی بھی پُرجوش ہوئی۔ اس کے انکل ایس ایس پی تھے اور وہ ان کی لاڈلی بھتیجی ہونے کے باعث ان سے اس طرح کے کام نکلوالیتی تھی۔ لبنیٰ نے جوں ہی اسے گاڑی کا نمبر نکال کر دیا اس نے اپنے انکل کو کال کی اور بہانے سے انہیں مطلوبہ نمبر کی گاڑی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر راضی کر لیا۔ اس نے انہیں کلیو بھی دے دیا تھا کہ گاڑی کو کس راستے پر چیک کیا جاسکتا ہے۔

”ایک کام تو ہو گیا اب بولو اور کیا کرنا ہے؟“ کال سے فارغ ہو کر روشی نے ہاتھ جھاڑے اور ذرا شاہانہ انداز میں بولی۔

”فی الحال ہم انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ مون شوٹنگ چھوڑ کر واپس آجائے گی۔ صحیح صورتِ حال جاننے کے لیے ہمیں اس سے بات کرنی ہوگی باقی تمہارے انکل کا فون آجائے اور گاڑی کا پتا چل جائے تو آگے دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔“ مہ پارہ ایک طرح سے گروپ لیڈر تھی اور زیادہ تر فیصلے وہی سنایا کرتی تھی۔

”اس معاملے میں الجھ کر ہم یہاں اپنے کیمپ کو کیسے دیکھیں گے؟“ یہ اہم سوال عروج نے اٹھایا۔ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوتی رہتی تھی جس میں زیادہ دخل ان کی ایڈونچرز فطرت کا تھا اور وہ چاروں جانتی تھیں کہ غیر معمولی حالات میں خلافِ توقع کچھ بھی ہوسکتا تھا اس لیے عروج کے سوال پر سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

”کوئی ایمرجنسی نہ ہونے کی صورت میں ہم میں سے دو افراد لازمی یہاں رہ کر نگرانی کریں گے۔ ایمرجنسی کی صورت میں مس انعم کو یہاں کا انچارج بنا دیا جائے گا۔“ مہ پارہ نے بطور گروپ لیڈر تجویز پیش کی جسے سب نے منظور کر لیا۔ لبنیٰ نے نیٹ پر اسلام آباد سے کراچی آنے والی پروازوں کا شیڈول حاصل کر کے اِدھر اُدھر دو چار جگہ فون کھڑکا دیے۔ اب ان کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ کیمپ میں اپنی اپنی ذمے داریاں ادا کرنے لگیں۔ سب کے سیل فون البتہ ان کے ہاتھوں میں ہی تھے کہ کوئی کام کی کال مس نہ ہو جائے۔ آخر لبنیٰ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اسے اس کے واقف کار رپورٹر نے بتایا کہ مون، کچھ دیر بعد اسلام آباد سے روانہ ہونے والی فلائٹ کے ذریعے واپس آرہی ہے۔ فیصلہ ہوا کہ لبنیٰ اور روشی ائرپورٹ پر ہی اس سے ملاقات کریں گی۔ مون کی ان دونوں سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی اس لیے وہ آسانی سے اس سے گفتگو کر سکتی تھیں۔ روانگی کا وقت آنے سے پہلے ہی روشی کے ایس ایس پی انکل کی کال آگئی۔ انہوں نے بتایا کہ مطلوبہ نمبر کی گاڑی سپر ہائی وے پر ملی تھی اور اس کا ڈرائیور زخمی اور بندھی ہوئی حالت میں پایا گیا تھا۔ ڈرائیور کا بیان مشکوک تھا اور اس کا کہنا تھا کہ کچھ لوگ زبردستی اسے اس طرف لے گئے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا اور بعد میں وہ کیوں اسے بے ہوش چھوڑ کر چلے گئے اس بات کا اسے علم نہیں ہے۔ پولیس والے اس کی طرف سے مشکوک تھے لیکن اس پر کوئی الزام نہیں تھا اس لیے اس کے ساتھ سختی سے بھی پیش نہیں آیا گیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کی ملکیت اور اپنی ضمانت کے لیے مون کا حوالہ دیا تھا لیکن اس کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ شہر سے باہر ہے۔ روشی نے اس اطلاع پر اپنے انکل کا شکریہ ادا کیا اور وہ چاروں اس صورتِ حال پر غور کرنے لگیں۔ طے پایا کہ ڈرائیور سے ملاقات ضروری ہے جو مون کی موجودگی میں مناسب رہے گی۔ یہ ملاقات بھی لبنیٰ اور روشی ہی کریں۔ بہت ممکن تھا کہ وہ مون کو ائرپورٹ سے ہی سیدھا ڈرائیور سے ملاقات کے لیے متعلقہ تھانے میں لے جاتیں۔ امید تھی کہ ڈرائیور مون کو اصل بات بتا دے گا۔

☆☆☆

مون ائرپورٹ سے سیدھی تھانے جانے کا ہی ارادہ رکھتی تھی۔ اسے وہاں اسد کی موجودگی کا سبب جاننا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس سارے چکر میں اسد کا ہاتھ ہے اور اس نے اسے خود سے ملاقات کے لیے آمادہ کرنے کے لیے یہ چکر چلایا تھا اور شاید خود بعد میں کسی چکر میں پڑ کر تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس نے جو بھی کیا تھا اس سے مون کا تعلق بہرحال تھا کیونکہ فون پر ایس ایچ او اقبال چانڈیو نے اسے ایسا ہی اشارہ دیا تھا۔ وہ بس اس امید پر تھانے جانا چاہتی تھی کہ اسد اس معاملے میں ملوث ہوگا اور وہ اس سے معاملات

طے کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس نے دوران پرواز اپنے حلیے میں بھی تبدیلی کرلی تھی۔ اس نے کاٹن کے ایک سادہ سے سوٹ پر بغیر آستینوں والا سویٹر پہن لیا تھا اور سر کے گرد اسکارف لپیٹنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں پر سیاہ چشمہ بھی لگا لیا تھا۔ اس لیے اس کا یہ حلیہ موسم کی مناسبت سے بھی ٹھیک تھا اور اپنی شناخت چھپانے کے لیے بھی مددگار لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے اسی حلیے کی وجہ سے شناخت کرلی جائے گی۔ لبنیٰ اور روشی سے اس کی ملاقات اس سے ملتے جلتے حلیے میں ہی ہوئی تھی اس لیے انہوں نے اسے آسانی سے شناخت کرلیا اور قریب جاکر آہستہ آواز میں پکارا۔ مون اپنا نام سن کر بُری طرح چونکی اور پھر دو لڑکیوں کو سامنے پاکر اس کے چہرے کے تاثرات تھوڑے سے بگڑ گئے۔ اسے لگا تھا کہ حلیے کی تبدیلی کے باوجود اس کی فینز نے اسے شناخت کرلیا ہے۔

''ایکسکیوز می! میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' رکھائی سے کہتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی۔

''ہم جانتے ہیں اور آپ کے لیے گاڑی کا انتظام کرنے ہی آئے ہیں۔ آپ کے ڈرائیور سے تو یقیناً آپ کا رابطہ نہیں ہوسکا ہوگا۔'' لبنیٰ نے کہا تو وہ اور بھی زیادہ چونک گئی۔ اس نے واقعی یہاں آکر ڈرائیور سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا نمبر ہنوز بند تھا۔

''آپ نے شاید ہمیں پہچانا نہیں۔ ہم پرل ونٹر کیمپ کی مینجمنٹ میں سے ہیں اور امید ہے کہ آپ کو درپیش مسئلے میں آپ کی مدد کرسکتے ہیں۔'' روشی نے مون کو متوحش پاکر نرم لہجے میں تسلی دی تو اس نے ایک بار پھر ان دونوں کو غور سے دیکھا اور پھر پہچان کر سر کو جنبش دی مگر حیران وہ اب بھی تھی۔

''میرا خیال ہے یہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہم راستے میں بات کرلیتے ہیں۔'' مون کی حیرانی کے جواب میں روشی نے مشورہ دیا جسے اس نے قدرے تامل سے قبول کرلیا۔ حقیقتاً اس وقت اس کے نزدیک ہر شخص مشکوک تھا لیکن اس نے کاشان کی خاطر خود کو خطرے میں قبول کرلیا تھا۔ تاوان کی رقم کی ادائیگی بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ ایک کروڑ کسی شناسا سے بھی ملنے کی امید نہیں تھی البتہ ایک شخص تھا جس سے وہ یہ رقم مانگ سکتی تھی۔ وہ شخص کاشان کا باپ شاہنواز تھا جسے کبھی اس کے بیٹے کی خبر بھی نہیں دی گئی تھی لیکن مون کے پاس کچھ ثبوت تھے جن کے ذریعے وہ شاہنواز کو یقین دلانے کی کوشش کرسکتی تھی کہ کاشان اسی کا بیٹا ہے بہرحال یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی تو وہ اسد سے مل کر معاملہ طے کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

''آپ مجھے درخشاں تھانے پر ڈراپ کردیں۔'' گاڑی ایئرپورٹ کی حدود سے نکلی تو اس نے گاڑی ڈرائیو کرتی روشی سے کہا۔

''ہم آپ کو وہیں لے کر جارہے ہیں۔ آپ کو یقیناً اپنے ڈرائیور سے ملاقات کرنی ہوگی۔'' روشی نے اسے اطمینان دلایا لیکن وہ حیران رہ گئی۔

''ڈرائیور سے ملنے...... میرا ڈرائیور وہاں کیسے پہنچا؟'' جواب میں لبنیٰ نے اب تک حاصل شدہ تمام معلومات اس کے گوش گزار کردیں اور آخر میں بولی۔

''ہمیں آپ کی پریشانی کا اندازہ ہے اور ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ کاشان کو اغوا کیا گیا ہے اور کڈنیپرز آپ سے بھاری تاوان مانگ رہے ہیں۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ انہوں نے آپ کو پولیس سے رابطہ نہ کرنے کی ہدایت دی ہوگی۔ ایسے میں اگر آپ ہماری مدد قبول کرلیں تو بہت فائدے میں رہیں گی۔''

''لیکن آپ اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہیں؟'' مون مزید حیران ہوئی۔

''آپ ہمیں پرائیویٹ ڈیٹیکٹو سمجھ لیں۔ ہمیں اس طرح کے کیسز سولو کرنے میں خاصی مہارت ہے۔'' لبنیٰ نے شان بگھاری۔

''میری تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میں بس کاشان کی سلامتی چاہتی ہوں چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ مجھے ایک بندے پر شک ہے کہ وہ اس چکر میں انوالو ہے۔ اصل میں، میں اسی سے ملنے جارہی تھی۔ ڈرائیور کے بارے میں تو مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا فون مسلسل بند جارہا ہے۔'' اس نے مختصراً انہیں اسد کے بارے میں آگاہ کیا۔

''آپ اس پر شک کرسکتی ہیں لیکن ایسی صورت میں اسے تھانے کے بجائے کسی خفیہ جگہ پر ہونا چاہیے تھا۔'' روشی نے نکتہ اٹھایا۔

''پتا نہیں، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا، سر چکرا کر رہ گیا ہے۔'' مون نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''پریشان مت ہوں۔ انشاء اللہ کاشان جلد آپ کو صحیح سلامت مل جائے گا۔'' روشی نے اسے تسلی دی۔ مون خاموش رہی اور تھانے تک کا باقی راستہ خاموشی میں ہی کٹا۔ لبنیٰ، مون کے ساتھ اندر نہیں گئی۔ روشی ڈرائیونگ سیٹ پر

ہی بیٹھی رہی۔ مون نے اندر جاتے ہی ایس ایچ او اقبال چانڈیو سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جو پوری کردی گئی۔

''میں مونا خادم علی ہوں اور اسد کے سلسلے میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

''زہے نصیب۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے تھانے کو دیکھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اسد کا جنون ایسے ہی نہیں ہے۔'' اقبال چانڈیو نے لہک کر مون کا استقبال کیا اور پھر اس کے ساتھ موجود لبنیٰ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''آپ کی تعریف؟''

''میں روشی عثمان خان ہوں۔ ایس ایس پی جعفر خان کی بھتیجی۔'' لبنیٰ نے کمال اعتماد سے اپنا تعارف کروایا۔ اسے معلوم تھا کہ ایس ایچ او اس سے شناختی کارڈ مانگنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ایسا ہی ہوا اور وہ جو مون کو دیکھ کر خاصا ترنگ میں نظر آرہا تھا خاصا سنبھل گیا اور سنجیدگی سے بتانے لگا۔

''اسد جس کیس میں گرفتار ہوا ہے اس میں آپ پر کوئی الزام تو عائد نہیں کیا جاسکتا لیکن آپ کا تعلق کچھ ایسا بن رہا ہے کہ آپ کا بیان لینا ضروری ہے۔''

''اسد نے کیا کیا ہے؟'' مون نے دریافت کیا۔ وہ خاصی اعصاب زدہ نظر آرہی تھی۔

''اس نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے باپ نے اس سے اس کی زندگی کو دور کیا تھا اس لیے جواب میں اس نے اپنے باپ سے اس کی زندگی چھین لی۔ آپ کو شاید معلوم ہی ہو کہ وہ آپ کو اپنی زندگی کہتا ہے۔ اب آپ اپنا بیان دیں تاکہ اسد کے بیان کی تردید یا تصدیق ہوسکے۔'' ایس ایچ او نے کہا تو مون جو خبر سن کر شاکڈ میں آگئی تھی اسے اپنے اور اسد کے بارے میں بتانے لگی لیکن ساتھ ہی اس نے ایس ایچ او سے یہ استدعا بھی کی کہ اس بات کو پبلک میں زیادہ اچھالا نہ جائے۔

''اس کا مطلب ہے کہ اسد کا بیان ٹھیک ہے۔ اس نے غصے اور جنون کی کیفیت میں اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔'' اس کا بیان سن کر ایس ایچ او نے تبصرہ کیا۔

''اب اسد کا کیا ہوگا؟'' مون نے دریافت کیا۔

''سزائے موت تو شاید نہ ہو اسے۔ مرنے والے کی وارث اس کی بیوی یعنی اسد کی ماں ہے۔ ماں اپنے بیٹے کی خاطر شوہر کا خون معاف کردے گی تو کیس بہت نرم ہوجائے گا۔ اسد کے بہت طویل عرصے تک جیل میں رہنے کا امکان نہیں ہے۔'' ایس ایچ او نے بتایا۔

''کیا میں اسد سے مل سکتی ہوں؟'' مون نے پوچھا۔

''صرف پانچ منٹ کے لیے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اس سے پہلے میں اپنے ڈرائیور سے ملنا چاہتی ہوں۔ پتا چلا ہے کہ وہ بھی اسی تھانے میں ہے؟''

''ہاں جی، تھا تو وہ سہراب گوٹھ کے تھانے میں مگر ایس ایس پی صاحب کے کہنے پر اسے ادھر شفٹ کر دیا گیا۔ اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔ بس شک ہے کہ وہ کوئی خاص بات چھپا رہا ہے۔ اگر آپ اس کی ضمانت دیں تو ہم اسے ابھی چھوڑ دیں گے۔ آپ کی گاڑی بھی ساتھ میں مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں اس کی ضمانت دے دیتی ہوں۔ آپ پلیز ابھی اس کو رہا کردیں اور میری گاڑی بھی ریلیز کر دیں تاکہ میری دوست کو بھی میری ڈرائیوری سے نجات ملے۔'' مون کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ لبنیٰ وغیرہ کو مزید اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔

''بے فکر رہیں جی۔ ابھی دونوں کام ہوجاتے ہیں۔'' ایس ایچ او یقیناً ایس ایس پی جعفر کی ''بھتیجی'' کی موجودگی کی وجہ سے اتنا تعاون کررہا تھا۔

''ٹھیک ہے روشی۔ تم جاؤ...! میرا مسئلہ حل ہوگیا اب میں تمہیں مزید زحمت نہیں دوں گی۔'' اس بار مون نے براہ راست لبنیٰ سے مخاطب ہوکر کہا۔ لبنیٰ نے خود کو ایس ایچ او سے روشی کے نام سے متعارف کروایا تھا۔ اس لیے وہ بھی اسے روشی ہی پکار رہی تھی۔

''بکواس مت کرو۔ دوستی میں کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ مجھے مہینے بھر بھی تمہاری ڈرائیور بن کر رہنا پڑے تو اعتراض نہیں کروں گی۔'' لبنیٰ نے بے تکلف دوستوں والے لہجے میں کہا۔

''میں جانتی ہوں لیکن اب مجھے میرا ڈرائیور اور گاڑی واپس مل رہے ہیں تو تم کیوں اپنا ٹائم ویسٹ کرو۔ جاؤ تم جا کر اپنا کیمپ دیکھو وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔'' مون کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اب لبنیٰ کو اپنے ساتھ مزید برداشت نہیں کرے گی۔ اس لیے اسے بادلِ ناخواستہ اس سے رخصت ہونا پڑا۔ باہر روشی اس کی منتظر تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے لبنیٰ کے پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی دریافت کیا۔ جواب میں لبنیٰ نے اسے ساری تفصیل بتادی۔

''ایسے کیسز میں لوگ کسی پر اعتبار نہیں کرتے ہیں۔ مون بھی کاشان کی زندگی پر رسک لینے سے ڈر رہی ہوگی۔''

روشی نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے مون کے رویے کی توضیح پیش کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کہاں چل پڑیں۔ کیا تم نے معاملہ مون کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے؟''

''نہیں، ایسا کیسے ممکن ہے۔ میں صرف احتیاطاً وہاں سے ہٹی ہوں۔ تم نے شاید سڑک کے اس پار کھڑے موٹر سائیکل سوار کو نہ دیکھا ہو۔ اس بندے کو میں ائرپورٹ سے اپنی گاڑی کے پیچھے دیکھ رہی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مون کی نگرانی کررہا ہے۔ اب ہم اس کی نگرانی کریں گے۔ مجھے تو وہ کڈنیپرز کا ساتھی لگ رہا ہے۔'' روشی نے اسے بتایا اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی روک دی۔ اب انہیں مون کے تھانے سے نکلنے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

مون نے تھانے میں اسد سے ملاقات کی۔ وہ اسے سامنے پاکر خوش ہوگیا اور بولا۔

''آخر میری محبت تمہیں یہاں کھینچ ہی لائی۔''

''تم نے بہت غلط حرکت کی ہے اسد، تم نے اپنے باپ کو قتل کردیا۔'' مون نے اسے سرزنش کی۔

''مجھے پتا چل گیا تھا کہ انہوں نے تمہیں دھمکی دی ہے کہ تم مجھ سے نہیں ملوگی۔ انہوں نے مجھ سے میری زندگی چھینی تھی۔ جواب میں، میں نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا تو اس میں کیا غلط ہے۔''

اس نے وہی بات دہرائی جو پہلے ایس ایچ او بھی اسے بتا چکا تھا۔ مون اس کے جنون سے واقف تھی۔ اس نے تو گھر بھی اسی علاقے میں لے رکھا تھا جہاں مون رہتی تھی۔ اس کا جاگیردار باپ شاید اس سے ملنے اس کے گھر آیا تھا اور اس نے اسے قتل کردیا۔

''میں ان کی دھمکی سے پہلے ہی تمہیں چھوڑ چکی تھی اور تمہاری حرکت نے بتادیا ہے کہ میرا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔ جو شخص اپنے باپ کو قتل کرسکتا ہے وہ بھروسے کے لائق نہیں۔ تم تو اتنے دنوں سے مجھے بھی الٹی سیدھی دھمکیاں دے رہے تھے اور مجھے لگتا ہے کہ کاشان کو اغوا کرواکر تم نے اپنی دھمکیوں پر عمل کردکھایا ہے۔ بتاؤ کہاں ہے میرا کاشان؟ اس کی زندگی کے لیے میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' مون کا انداز جذباتی تھا لیکن اس نے اپنی آواز دھیمی ہی رکھی تھی۔ وہ پولیس والوں کو اس معاملے کی بھنک نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

''تم کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ بھلا میں کیوں کاشان کو اغوا۔۔۔ کروں گا؟'' اسد اس کے الزام پر حیران ہوا۔

''مجھے ستانے کے لیے اور کیوں؟'' وہ تلخ ہوئی تو جواب میں اسد زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے مون، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''میں کیسے یقین کرلوں کہ تم سچ بول رہے ہو؟''

''میں تمہاری قسم کھاتا ہوں کہ میں نے یہ حرکت نہیں کی۔ میں تمہیں اپنے پاس بلانے کے لیے صرف زبانی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں تمہیں نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

اسد کے جواب نے مون کو خاموش کروادیا۔ اس کے لہجے کی سچائی ایسی تھی کہ اعتبار کیے بغیر چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ اب پوری طرح پُریقین ہوگئی تھی کہ کاشان کو تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے ایسی صورت میں اسے تاوان کی رقم کا انتظام کرنے کی تگ ودو کرنی چاہیے تھی۔ یہاں اس کے پاس رکنا بے کار تھا۔ اسد اسے آوازیں دیتا رہ گیا اور وہ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ڈرائیور کو چھوڑ دیا گیا تھا اور اس کی گاڑی بھی مل گئی تھی۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیور کے ساتھ تھانے سے روانہ ہوئی۔ ڈرائیور کو اس نے شاہنواز کے گھر چلنے کو کہا تھا۔

''اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' گاڑی تھانے سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی تو اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''وہ جی میں کاشان بابا کو ان کے کیمپ پہنچانے کے لیے گھر سے لے کر نکلا تھا کہ ایک جگہ دو موٹر سائیکل والوں نے گاڑی رکوالی۔ وہ چار بندے تھے۔ ایک نے میری کنپٹی پر پستول رکھ کر مجھے گاڑی چلانے کو کہا اور دوسرا کاشان بابا کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ میں پستول کے آگے کیا کرتا۔ ان کی بات ماننی پڑی۔ وہ مجھے گاڑی اور کاشان بابا سمیت سپرہائی وے تک لے گئے۔ وہاں انہوں نے گاڑی رکوائی اور مجھ سے کہا کہ اپنی میڈم سے بولنا اگر بچہ صحیح سلامت چاہیے تو ایک کروڑ تاوان تیار رکھے اور پولیس کے پاس جانے کی غلطی نہ کرے۔ اس کے بعد انہوں نے میرے سر پر پستول کا دستہ مار کر مجھے بے ہوش کردیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں بندھا ہوا گاڑی میں پڑا تھا اور پولیس والوں نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ کاشان بابا کی سلامتی کے لیے میں نے پولیس والوں کو کچھ نہیں بتایا اور آپ کا انتظار کرتا رہا۔ آپ مجھے معافی دے

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!
فیئر فیس
FAIRFACE
ٹی ٹی کی فیئر فیس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگ کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد حلقے، چہرے اور گردن کی جھریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ لوشن اور کریمیں ملتے پھریں لیکن فیئر فیس کھانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔
www.facebook.com/toptreatments
چھوٹے قد والے دِل چھوٹا نہ کریں!!
گروٹال
ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیوپیتھک دوا ہے جو مضر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سوماٹوٹروپن (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔
اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو
گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!
HELPLINE
ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیوپیتھک سٹور اور دواخانہ پر دستیاب
TT
نہ ملنے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے
042-35789145&6,0334-4266255
Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net
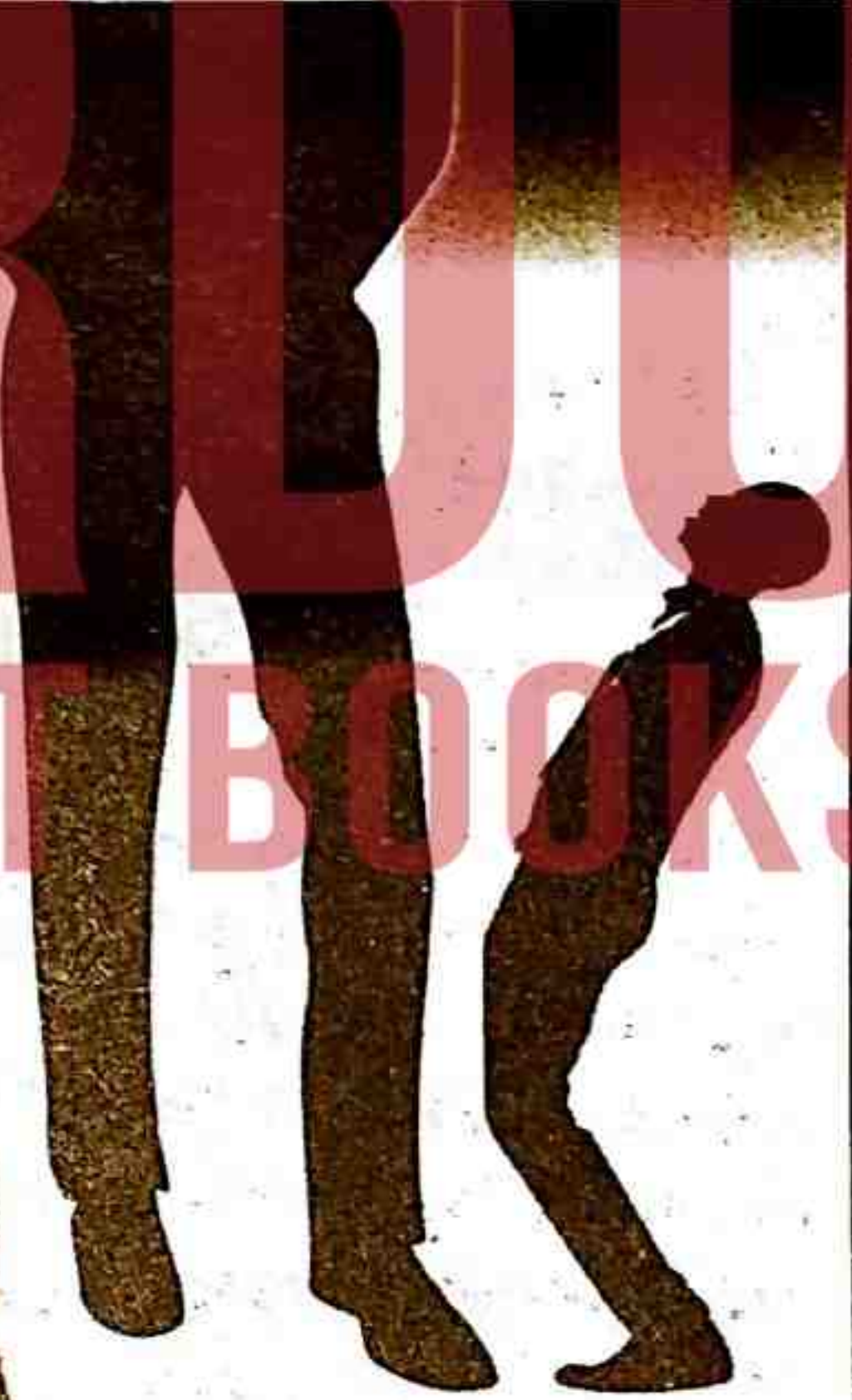
دیں میڈم، میں کاشان بابا کی حفاظت نہیں کر سکا۔'' ڈرائیور کا لہجہ روہانسا ہو گیا۔

''تم ہتھیاروں کے سامنے کر بھی کیا سکتے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ، تم نے ان چاروں کی شکلیں دیکھی تھیں؟ وہ جانے پہچانے لوگوں میں سے تو نہیں ہوں گے؟''

''میں نے ان کی شکلیں نہیں دیکھیں میڈم! جو موٹر سائیکلیں چلا رہے تھے انہوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے اور باقی دو کے چہروں پر ماسک اور سر پر پی کیپ تھی۔'' ڈرائیور نے بتایا۔ اسی وقت مون کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے دیکھا اجنبی نمبر سے کال آ رہی ہے۔ اس نے دھڑکتے دل سے کال ریسیو کی۔

''ہم نے تم سے کہا تھا کہ پولیس کے پاس نہیں جانا اور تم ائرپورٹ سے سیدھی تھانے پہنچ گئیں؟'' مون نے فون کرنے والے کی آواز پہچان لی یہ وہی تھا جس نے اسے پہلے بھی کال کی تھی۔

''میں وہاں اپنے ڈرائیور کو چھڑانے گئی تھی۔ میں نے وہاں کاشان کا ذکر تک نہیں کیا۔'' مون نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

''یہ بتاؤ رقم کا بندوبست ہو گیا؟'' اس کی وضاحت کو نظرانداز کر کے پوچھا گیا۔

''تم نے بہت بڑی رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ میرے پاس اتنی رقم موجود نہیں ہے۔ پلیز تم رقم کم کر دو۔'' مون نے اس سے درخواست کی۔

''رقم کم نہیں ہو سکتی۔ تمہارے پاس نہیں ہے تو تم حاصل کر سکتی ہو۔ آخر تمہارے اتنے چاہنے والے ہیں۔ تم تو چند راتوں میں ایک کروڑ کما سکتی ہو۔'' بولنے والے کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ مون کے رخسار ان توہین آمیز کلمات پر دہک اٹھے اور وہ تیز لہجے میں بولی۔

''شٹ اپ۔ تمہیں مجھ سے اتنی گھٹیا گفتگو کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے نہیں کرتا بس تم تاوان کی رقم جمع کرو۔ بچہ ہمارے پاس آرام سے ہے۔ بس تم کوئی حماقت نہیں کرنا ورنہ بچہ اپنی جان سے جائے گا۔'' اس کا لہجہ خوفناک ہو گیا۔

''میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تم کاشان سے میری بات کرواؤ۔'' اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''وہ سو رہا ہے ابھی بات نہیں ہو سکتی۔ تم رقم کی طرف دھیان دو۔ ہمیں رقم مل گئی تو ہم بچے کو چھوڑ دیں گے پھر دل بھر کر اس سے باتیں کرتی رہنا۔'' جواب دینے کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔ مون نے اس نمبر پر کال بیک کی۔ پہلے کی طرح یہ نمبر بھی بند ہو چکا تھا۔ مون کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''آپ اتنی پریشان نہ ہوں میڈم۔ انشاء اللہ کاشان بابا جلد مل جائیں گے۔'' ڈرائیور جو ساری گفتگو سن رہا تھا اسے دلاسا دینے لگا لیکن مون نے اس کی بات ڈھنگ سے سنی تک نہیں۔ وہ اغوا کار کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ اس نے اسے رقم جمع کرنے کے سلسلے میں جو مشورہ دیا تھا اسے سن کر اسے لگا تھا کہ وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے اور اس کے روز و شب کے معمولات سے واقف ہے۔ کاشان کے لیے خود کو بیچنا اس کے لیے اتنا مشکل نہ ہوتا جو وہ خود کو تبدیل کرنے کا فیصلہ نہ کر چکی ہوتی۔ اس فیصلے کے باعث تو اس کے سعد سے اچھے بھلے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ وہ جو ایک طوائف پر دل کھول کر لٹا تا تھا اسے شریف زادی کے روپ میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب اس کی ہر امید شاہنواز سے بندھی تھی۔ اگر شاہنواز کاشان کو اپنا بیٹا تسلیم کر لیتا تو وہ تاوان کی رقم ادا کر سکتا تھا۔ اس کے لیے وہ اتنی بڑی رقم نہیں تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی شاہنواز کے گھر کے سامنے روکی تو اس نے نیچے اتر کر بیل بجائی۔ اسے معلوم تھا کہ شاہنواز ایسے ہی ہر کسی سے ملاقات کے لیے راضی نہیں ہوجاتا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی بات الگ ہے شاہنواز کے لیے انکار آسان نہیں ہوگا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ چند منٹوں بعد ہی وہ ڈرائنگ روم میں شاہنواز کے مقابل بیٹھی تھی اور وہ اسے گھور رہا تھا۔

''کیوں آئی ہو؟'' اس نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

''میں آپ سے آپ کے بیٹے کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔'' اس نے اپنی طرف سے دھماکا کیا۔

''کیا بات؟'' شاہنواز چونکا ضرور لیکن اس کا ردِعمل ویسا نہیں تھا جیسا مون سوچ کر آئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق شاہنواز کو بیٹے کے وجود کا ہی علم نہیں تھا لیکن اس کے دولفظی سوال نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں جانتا ہے۔

''آپ کاشان کے بارے میں کیسے جانتے ہیں؟'' وہ سوال کیے بنا نہیں رہ سکی۔

''اس بات کو چھوڑو۔ میں جانتا ہوں اور اس دائی سے مل کر تصدیق بھی کر چکا ہوں جس کے ہاتھوں کاشان کی پیدائش ہوئی تھی۔ تم شہر سے باہر تھیں ورنہ میں خود بھی تم سے

ملاقات کر کے یہ معاملہ نمٹانا چاہتا تھا۔‘‘ شاہنواز کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ مون کے ہونٹ لرزے۔

’’صاف بات ہے۔ میں اپنا بیٹا واپس چاہتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کے بدلے کتنی رقم لوگی؟‘‘ شاہنواز کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ مون اس کے الفاظ پر تڑپ اٹھی اور بولی۔

’’میرے لیے کاشان ساری دنیا کی دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر اسے پالا ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے کسی کے حوالے نہیں کرسکتی۔‘‘

’’کم آن...... بولی بڑھانے کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے جیسوں کے لیے انسانوں کی تجارت کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ آخر تمہاری ماں نے بھی تو اپنی بیٹی منہ مانگے داموں میرے ہاتھ بیچی تھی نا لیکن اس کے خون میں ہی وفا نہیں تھی۔ میں نے اسے شہزادیوں کی طرح رکھا پھر بھی وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ گئی۔‘‘ شاہنواز کے لفظ لفظ میں زہر تھا اور وہ اپنے اس عمل میں حق بجانب بھی تھا۔ مون کی بڑی بہن صنم جو اسی کی طرح ذہین اور طرح دار تھی، ایک اتفاقی ملاقات کے بعد یوں شاہنواز کے دل پر چڑھی کہ اس نے اسے اپنے گھر کی زینت بنالیا اور بدلے میں الماس بائی کو منہ مانگی رقم دی لیکن پھر بھی صنم چند ماہ سے زیادہ اس کے گھر میں نہیں ٹکی اور واپس اسی بازار میں لوٹ گئی۔ صنم کی واپسی شاہنواز کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اور اس کے بعد اس کی زندگی میں بھی کسی عورت کی گنجائش نہیں نکلی تھی۔

’’آپ کیا جانیں کہ صنم کیوں اور کس دل سے واپس چوبارے لوٹی تھی۔ آپ اسے بے وفا ہونے کا طعنہ دے رہے ہیں حالانکہ آپ سے وفا نبھانے کے لیے ہی اس نے یہ کڑوا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتارا تھا۔‘‘ مون کی آواز بھیگنے لگی۔

’’کیا مطلب؟‘‘ شاہنواز حیران ہوا۔

’’آپ سے صنم کے دام کھرے کرنے کے باوجود اماں کی نیت سیر نہیں ہوئی تھی اور وہ صنم کے ذریعے آپ کی ساری دولت ہتھیانا چاہتی تھیں۔ صنم نے ایک دو بار تو ان کے مطالبے پر انہیں رقم لا کر دی لیکن جب اس نے سمجھ لیا کہ آپ کے کنگال ہونے تک یہ سلسلہ نہیں رکنے والا تو اس نے اپنے دل کی مرضی کے خلاف صرف آپ کی خاطر آپ کا گھر چھوڑ دیا۔‘‘ مون کی ایک آنکھ سے آنسو کا قطرہ نکل کر اس کے گلابی رخسار پر بہتا چلا گیا۔ شاہنواز آ[illegible] تھا اور [illegible] اس کی کمزوری۔ اس منظر نے بھی جیسے اسے قید کرلیا۔

’’جس زمانے میں یہ سب ہوا میں بہت کم عمر تھی لیکن پھر بھی صنم مجھے دوستوں کی طرح اپنے دل کی ہر بات بتاتی تھی۔ آپ کے بغیر اس کا جینے میں دل نہیں لگتا تھا لیکن پھر بھی اپنے وجود میں پلتی آپ کی نشانی کی خاطر اس نے کسی نہ کسی طرح زندگی کے وہ شب و روز کاٹے۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ اگر میری بیٹی ہوئی تو اسے ایک دن بھی اس کوٹھے پر مت رہنے دینا اور فوراً شاہنواز تک پہنچا دینا۔ میں نہیں چاہتی کہ شاہنواز کی عزت کوٹھے پر رلے، اللہ نے اسے بیٹی کے بجائے بیٹا دیا لیکن وہ خود جانبر نہ ہوسکی۔ معلوم نہیں دائی اناڑی تھی کہ صنم کے اندر ہی جینے کی چاہ نہیں تھی۔ کاشان کی پیدائش پر اماں خوش نہیں تھیں لیکن اسے اٹھا کر بھی نہیں پھینک سکتی تھیں بس انہوں نے اسے رکھ لیا اور اس کے برتھ سرٹیفکیٹ پر ولدیت کے خانے میں وہی نام لکھوا دیا جو ہماری ولدیت کے خانے میں لکھا ہے۔ اس وقت کسی کے ذہن میں کچھ نہیں تھا لیکن بعد میں مجھے لگا کہ یہ بالکل ٹھیک ہوا ہے۔ کاشان میں میری جان ہے اور میں اسے اپنی نظروں سے دور نہیں کرسکتی اس لیے میں نے جان بوجھ کر یہ حقیقت چھپالی کہ وہ صنم کا بیٹا ہے۔ میں اسے اپنا بھائی کہتی رہی اور مجھے اطمینان سا ہوگیا کہ آپ کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتا سکیں گے لیکن آج میری مجبوری مجھے اس مقام پر لے آئی ہے کہ میں خود اس حقیقت کو بتانے آپ کے روبرو چلی آئی ہوں۔ پلیز شاہنواز...... میرے کاشان کو بچالیں۔ اسے کچھ ہوگیا تو میں صنم کی روح کے سامنے شرمسار رہوں گی۔‘‘ اب وہ تواتر سے رو رہی تھی۔

’’ریلیکس مون! خود کو سنبھالو اور مجھے بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے؟‘‘ شاہنواز کو اس کے آنسوؤں نے بے چین کر دیا اور وہ بے ساختہ اس کے قریب آ کر اس کا شانہ تھپکنے لگا۔ مون نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن حلق میں پھنسے آنسوؤں کے گولے کی وجہ سے اسے بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ شاہنواز نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے پیش کیا۔ پانی کے دو تین گھونٹ پینے کے بعد مون کی حالت سنبھلی اور اس نے کاشان کے اغوا کی پوری داستان سناڈالی۔

’’تمہیں کسی پر شک ہے؟‘‘ شاہنواز نے سب سن کر اس سے پوچھا۔

’’اسد اور سعد دو ایسے افراد ہیں جن سے میرے کچھ

اختلافات ہیں لیکن اسد تھانے میں بند ہے اور سعد مری میں ہے۔ اس لیے دونوں پر ہی شک کرنا مشکل ہے یوں بھی یہ انتقام کے بجائے اغوا برائے تاوان کی واردات ہے۔ کڈنیپر کا سارا زور رقم پر ہی تھا اگرچہ میں اپنی سابقہ روش ترک کر کے آبرومندانہ زندگی گزارنے کا اٹل فیصلہ کر چکی تھی لیکن کاشان کی خاطر میں یہ بھی کر سکتی ہوں لیکن مسئلہ وقت کا ہے۔ اس طرح رقم جمع کرنے میں مجھے کئی دن لگ جائیں گے اور میں اتنے دن کاشان کو ان لوگوں کے قبضے میں نہیں دیکھنا چاہتی اس لیے بہت مجبور ہو کر آپ کے در پر آئی ہوں۔ آپ کے لیے ایک کروڑ اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ آپ مجھے رقم دے دیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آہستہ آہستہ آپ کو ساری رقم واپس کر دوں گی۔'' اس کا رواں رواں التجا کر رہا تھا۔

''لیکن میں کاشان کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ قدرت نے اس سے اس کی ماں چھین لی لیکن جیتے جی اس سے باپ کو چھیننے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ میں اس کا باپ ہوں اس لیے تاوان کی رقم ضرور ادا کروں گا لیکن واپس آنے کے بعد وہ میرے ساتھ ہی رہے گا۔'' شاہنواز نے فیصلہ سنایا جسے سن کر مون کی اجلی رنگت میں زردی گھل گئی اور وہ ہونٹوں سے سسکی نکالے بغیر سر جھکا کر خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ قدرت کا شاہکار اس موی مجسمے جیسی لڑکی کو آنسو بہاتا دیکھ کر شاہنواز کا دل ایک بار پھر بے چین ہوا اور اسے لگا کہ وہ مون کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔

''کیا آپ مجھے کاشان سے ملتے رہنے کی اجازت دیں گے؟'' چند پل آنسو بہانے کے بعد اس نے بڑی آس سے شاہنواز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یعنی تم کاشان کو میرے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو؟'' اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے شاہنواز نے کہا۔

''ایک بار میری بہن نے آپ کے بھلے کے لیے آپ کو چھوڑ کر خود اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی آج میں اسی تاریخ کو دہراتے ہوئے کاشان کی خاطر اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس سے الگ ہو کر میرا دل بہت بری طرح تڑپے گا لیکن میں یہ کڑوا گھونٹ صرف اس لیے پینے کو تیار ہوں کہ کاشان کی زندگی بچ جائے گی اور ظاہر ہے آپ کے ساتھ وہ زیادہ اچھی لائف گزارے گا۔'' وہ بولتی تھی تو اس کی آواز آنسوؤں کی نمی کے باعث گھٹ گھٹ جاتی تھی۔ شاہنواز کو لگا کہ وہ اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کر رہا ہے لیکن وہ بھی تو اپنے بیٹے، اپنی محبت کی نشانی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے کاشان ہر صورت اپنے پاس چاہیے تھا۔

☆☆☆

ان دونوں نے گاڑی شاہنواز کے گھر سے کچھ فاصلے پر آڑ میں روک رکھی تھی۔ مون بہت دیر سے شاہنواز کے گھر کے اندر تھی اور اب ان کی توجہ مون سے زیادہ اس کے تعاقب کار پر تھی۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل مون کی گاڑی سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی کر رکھی تھی اور صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ سر پر ہیلمٹ کے باوجود پتا چل رہا تھا کہ وہ ایک نوجوان لڑکا ہے جسے اس قسم کے کاموں کا ذرا بھی تجربہ نہیں ہے۔

''بے چارہ بالکل ہی اناڑی ہے۔'' اس کی طرف دیکھتے ہوئے لبنیٰ نے تبصرہ کیا۔

''تم اس کی ہمدردی میں مبتلا ہونے کے بجائے معلوم کرو کہ مہ پارہ اور عروج کہاں تک پہنچیں۔ اس لڑکے کو پکڑنا ضروری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اس سے اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔'' روشی نے سنجیدگی سے کہا۔

''ابھی عروج کا ایس ایم ایس آیا ہے، وہ اس علاقے میں پہنچ چکی ہیں۔'' لبنیٰ نے منہ بنا کر اطلاع دی۔

''بس تو پھر ہوشیار رہو۔ کسی بھی وقت ان کی طرف سے کارروائی کا آغاز ہو جائے گا۔'' عام حالات میں بہت شوخی کا مظاہرہ کرنے والی روشی پر اس وقت گہری سنجیدگی طاری تھی۔

''ویسے گھامڑ تو یہ مون کا ڈرائیور بھی لگتا ہے۔ مالکن اتنی پریشانی میں مبتلا ہے اور اسے دیکھو کتنے مزے سے اسٹیئرنگ پر سر لگائے آرام کر رہا ہے۔ اسے اتنا بھی اندازہ نہیں ہے کہ ان کی گاڑی کا تعاقب کیا جاتا رہا ہے۔'' لبنیٰ کی زبان آج چپ ہونے کو تیار نہیں تھی۔

''اس میں ہوشیاری ہوتی تو بچہ اغوا ہی کیوں ہوتا۔'' روشی نے جلے کٹے لہجے میں کہا اور پھر چونک گئی۔ مہ پارہ کی گاڑی ان سے کچھ فاصلے پر آ کر رکی تھی اور اس سے عروج برآمد ہوئی تھی۔ عروج نے الٹرا ماڈل لباس پہن رکھا تھا اور پرس کو ہاتھوں میں جھلاتے ہوئے اس گلی میں داخل ہو رہی تھی جہاں شاہنواز کا گھر تھا۔ گلی میں پہنچ کر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر جیسے اس کی نظرِ انتخاب موٹر سائیکل سوار پر جا ٹھہری۔

''ایکسکیوزمی! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ عبدالقیوم

صاحب کی کوٹھی کون سی ہے۔ مجھ سے ان کا ایڈریس گم ہو گیا ہے لیکن آج میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' وہ نہایت لوچدار لہجے میں نوجوان سے مخاطب تھی۔ ایک تو اس کے حسن کے جلوے اوپر سے ایسا لب و لہجہ۔ نوجوان موٹر سائیکل سوار یقیناً کھڑے کھڑے لٹ گیا ہو گا۔ چنانچہ نہایت شیریں لہجے میں افسوس کے ساتھ عروج کو بتایا کہ وہ خود اس علاقے میں اجنبی ہے اور کسی عبدالقیوم صاحب سے واقف نہیں ہے۔

''ہائے اللہ!'' اس کی اطلاع پر عروج نے ایک دردناک ہائے کی اور چہرے پر مظلومیت طاری کرتے ہوئے بولی۔ ''میں پچھلے دو گھنٹے سے اس علاقے میں ان کی کوٹھی ڈھونڈ رہی ہوں لیکن مل کر ہی نہیں دے رہی۔ چلتے چلتے حلق خشک ہو گیا ہے اور پیروں میں چھالے پڑنے لگے ہیں۔ اب تو اسٹاپ تک جانے کی ہمت بھی نہیں رہی ہے کہ اپنے گھر ہی واپس چلی جاؤں۔ پلیز کیا آپ مجھے اسٹاپ تک چھوڑ دیں گے۔ اس علاقے میں پبلک ٹرانسپورٹ بھی کہاں آسانی سے ملتی ہے۔'' عروج نے فرمائش کرتے ہوئے دکھڑا رو دیا۔

''میں......'' نوجوان اس کی فرمائش پر بوکھلا سا گیا۔

''جی ہاں آپ۔ پلیز ڈراپ کر دیں نا۔'' عروج نے التجا ہی نہیں کی، اچھل کر موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے سوار بھی ہو گئی۔ نوجوان نے ذرا سے تذبذب کے بعد موٹر سائیکل کو کک لگائی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ مون تو اتنی دیر سے اندر ہے۔ وہ لڑکی کو اسٹاپ پر چھوڑ کر فوراً واپس آ جائے گا لیکن جب علاقے سے نکلتے ہی چھیل چھبیلی نار نے سچ مچ کی نار (آگ) بن کر اس کے پہلو میں پستول کی نال چبھوئی اور آگ برساتے لہجے میں بولی کہ جہاں میں کہتی ہوں چپ چاپ چلو ورنہ گولی مار دوں گی تو وہ کانپ کر رہ گیا۔ عروج اسے ہدایات دیتی ہوئی ایک سنسان علاقے تک لے گئی اور موٹر سائیکل روکنے کا حکم دیا۔ مہ پارہ اور روشی بھی اپنی گاڑیوں میں ان کے پیچھے تھیں۔ موٹر سائیکل رکتے ہی ان کی گاڑیاں بھی رکیں اور وہ لپک کر باہر نکلیں۔

''اسے گاڑی میں بٹھاؤ۔'' مہ پارہ نے حکم صادر کیا۔

لڑکیوں کے ہاتھوں اغوا ہونے والا نوجوان ہونق بنا ان کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھا کہ عروج نے پستول کو ایک لمحے کے لیے بھی اس کے پہلو سے نہیں ہٹایا تھا۔ وہ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا اس کے سر پر سے ہیلمٹ اتار کر آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور اس کے اوپر سیاہ سن گلاسز لگا دیے گئے۔ اب باہر سے دیکھنے والوں کو پتا نہیں چل سکتا تھا کہ کسی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر زبردستی کہیں لے جایا جا رہا ہے۔

''کون ہو تم لوگ اور مجھے اس طرح اغوا کرنے کا کیا مطلب ہے؟'' آخر نوجوان نے سوال کرنے کی جرأت کر ہی لی۔

''سب معلوم ہو جائے گا۔ ابھی بالکل خاموش بیٹھو۔'' عروج غرائی تو وہ دبک گیا۔ احتیاطاً ابھی بھی اسی گاڑی میں سوار ہو گئی تھی اور روشی اپنی گاڑی میں پیچھے آ رہی تھی۔ مون کے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں ان کے ہاتھ ایک بہت اہم مہرہ آ چکا تھا جس کے ذریعے وہ کاشان تک پہنچ سکتی تھیں۔

☆☆☆

''نام کیا ہے تمہارا؟'' عروج نے لہجے کو خوب کڑک دار بنا کر نوجوان سے پوچھا۔ انہوں نے پستول کے زور پر اسے کرسی سے باندھ دیا تھا اور اب اس کے گرد جمع اس سے تفتیش کر رہی تھیں۔ وہ اسے اسی کوٹھی میں لائی تھیں جہاں اپنا ونٹر کیمپ قائم کر رکھا تھا۔ چھٹی ہو جانے کے باعث بچے اور اسٹاف رخصت ہو چکا تھا اور صرف گیٹ پر چوکیدار موجود تھا جسے پتا نہیں چل سکا کہ کوٹھی کے اندر آنے والی دو گاڑیوں میں سے ایک میں وہ کسی نوجوان کو اپنے ساتھ لائی ہیں۔

''تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' نوجوان نے عروج کے سوال کو نظرانداز کر کے اس سے دریافت کیا۔ وہ خود کو کافی سنبھال چکا تھا پھر بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم لوگوں نے کاشان کو اغوا کر کے کہاں رکھا ہے؟'' روشی نے مزے سے اپنا مقصد بتایا۔

''کیا تم لوگوں کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے؟'' وہ کچھ اور گھبرایا۔

''بالکل، اتنی خفیہ پولیس سے کہ خود خفیہ پولیس والوں کو بھی نہیں معلوم۔ اب تم جلدی سے ہمیں کاشان کا پتا بتاؤ۔'' عروج نے ایک بار پھر اپنے لہجے میں سختی سموئی۔

''میں کسی کاشان کو نہیں جانتا۔'' اس نے اچانک ہی پینترا بدل لیا۔

''پھر تم مون کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟''

''میں اس کا فین ہوں۔''

''فین آٹوگراف لیتے ہیں۔ ساتھ سیلفی بنواتے ہیں۔ اس طرح چھپ کے پیچھا کرنے والا فین ہم پہلی بار

دیکھ رہے ہیں۔'' اس کے جواب پر مہ پارہ نے طنز کیا۔
''کچھ میرے جیسے بھی ہوتے ہیں۔'' اس نے ڈھٹائی دکھائی۔
''لگتا ہے تم ایسے زبان نہیں کھولو گے۔ تمہیں ڈرائنگ روم کی سیر کروانی پڑے گی۔'' مہ پارہ نے اسے ڈرانے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش رہا۔ ابتدا میں وہ جتنا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اب اتنی ہی ڈھٹائی اختیار کر گیا تھا۔
''اس کی زبان کیسے کھلوائیں۔ یہ تو کچھ بتانے کے لیے راضی ہی نہیں ہو رہا۔'' تھوڑی دیر بعد وہ چاروں دوسرے کمرے میں سر جوڑے ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں کیونکہ ان کی دھمکیوں کے باوجود اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔
''لگتا ہے اسے ٹارچر کرنا پڑے گا۔'' مہ پارہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔
''لیکن کرے گا کون؟ ہم میں سے کون ہے جو اس پر ہنٹر برسا سکے، چاقو سے اس کے کان، ناک کاٹے یا الٹا لٹکا کر مرچوں کی دھونی دے۔'' لبنیٰ نے تشدد کے جانے پہچانے حربوں کا ذکر کرتے ہوئے سوال اٹھایا اور خود ہی جھرجھری لی۔ سب یک دم خاموش ہو گئیں۔ واقعی وہ یہ سب نہیں کر سکتی تھیں۔
''اسے پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔'' روشی نے تجویز پیش کی۔
''اگر سچ مچ اس کا اغوا کاروں سے تعلق نہیں ہوا تو الٹا ہم اسے اغوا کرنے کے الزام میں دھر لیے جائیں گے۔'' مہ پارہ نے ایک دوسرا پہلو سامنے رکھا۔
''یہ تو بڑی مصیبت گلے پڑ گئی۔'' لبنیٰ بڑبڑائی۔ اسی وقت اس موبائل کی میسج ٹون بجی جو انہوں نے نوجوان کے قبضے سے برآمد کیا تھا۔ روشی نے میسج دیکھا، لکھا تھا۔
''مون نے رقم کا انتظام کر لیا ہے۔ اب اسے کال کر کے وقت اور جگہ کا بتاؤ۔''
''یہ کیا؟ اس میسج سے تو صاف پتا چل رہا ہے کہ یہ کڈنیپرز کا ساتھی ہے۔'' روشی پُرجوش ہوئی۔
''اس سے یہ بھی پتا چل رہا ہے کہ کڈنیپرز کا کوئی ساتھی مون کے بہت قریب ہے جب ہی اسے رقم کے بارے میں معلوم ہے۔''
''ایسا کرتے ہیں مون کو یہاں بلا کر اس بندے سے ملواتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اسے جانتی ہو۔'' عروج نے تجویز دی، جس سے سب نے اتفاق کیا۔ فوراً ہی مون کو کال کی گئی اور اس کو یہاں آنے کے لیے کہا گیا۔ وہ آنے کے لیے راضی نہیں تھی لیکن جب اس سے کہا گیا کہ کڈنیپرز کے بارے میں ایک اہم کلیو ملا ہے تو وہ راضی ہو گئی۔ وہ شاہنواز سے کامیاب ملاقات کے بعد اپنے فلیٹ پر واپس آ چکی تھی۔ شاہنواز نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ دو گھنٹے میں رقم لے کر اس کے پاس آ جائے گا۔ وہ مسلسل سفر میں رہی تھی اس لیے کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی لیکن عروج کی کال نے ڈسٹرب کر دیا۔ اسے انہیں ملنے والے کسی کلیو سے کوئی غرض نہیں تھی۔ شاہنواز رقم لا رہا تھا اور وہ کڈنیپرز کو رقم دے کر کاشان کو واپس لانا چاہتی تھی لیکن اسے خیال آیا کہ ان احمق لڑکیوں کی کسی حرکت کی وجہ سے کڈنیپرز بھڑک نہ جائیں اس لیے وہ ان سے ملاقات کے لیے چل پڑی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے صرف پندرہ منٹ میں وہ وہاں پہنچ چکی تھی۔
''آپ آرام کرنے کے بجائے یہاں کیوں آ گئیں میڈم؟'' ڈرائیور کو اس نے شاہنواز کے گھر سے نکلتے ہی بتا دیا تھا کہ اس نے رقم کا انتظام کر لیا ہے اور اب کچھ دیر گھر پر آرام کرے گی اس لیے اس نے اس کے یہاں آنے پر حیرت کا اظہار کیا۔
''ابھی میں جلدی میں ہوں۔ واپسی میں بتاتی ہوں۔'' مون اسے جواب دے کر گاڑی سے اتر گئی۔ اندر وہ چاروں اس کی منتظر تھیں۔
''تم لوگ کیا چاہتی ہو، اگر تمہاری وجہ سے کاشان کو نقصان پہنچا تو میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔'' وہ دیکھتے ہی ان پر برسنا شروع ہو گئی۔
''ہم آپ کو کڈنیپرز کے ایک ساتھی سے ملوانا چاہتے ہیں۔ شاید آپ اسے جانتی ہوں۔'' اس کے رویے کے باوجود مہ پارہ نے تحمل سے کام لیا اور اسے اس کمرے تک لے گئی جہاں انہوں نے نوجوان کو باندھا ہوا تھا۔ نوجوان کو دیکھتے ہی مون چونک گئی اور اس کے منہ سے نکلا۔
''باسط تم......'' مون کو سامنے پا کر وہ نظر چرا گیا۔
''یہ سعد کی ٹیم میں شامل ہے۔ اسپاٹ بوائے کا کام کرتا ہے لیکن مری والے ٹرپ پر یہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا اس کی ماں بیمار ہے۔ اوہ گاڈ...... کیا اس سب کے پیچھے سعد کا ہاتھ ہے۔ وہ اس طرح سے مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔'' انہیں بتاتے بتاتے وہ بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی۔
''یہ سعد کون ہے؟'' مہ پارہ نے فوراً سوال کیا جس کے

جواب میں اس نے مختصراً انہیں سعد کے بارے میں بتادیا۔

''یعنی سعد مری میں بیٹھ کر آپریٹ کررہا ہے اور اس کے بندے یہاں کام کررہے ہیں لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ سعد کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ نے رقم کا انتظام کرلیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کے موبائل پر یہ میسج آیا تھا۔'' روشی نے اسے میسج دکھایا۔

''شاہنواز کے علاوہ صرف میرے ڈرائیور کو یہ بات معلوم ہے کہ رقم کا انتظام ہو چکا ہے۔ اوہ گاڈ...... اس کا مطلب ہے کہ میرا ڈرائیور......'' مون نے اندازہ لگایا۔

''عموماً قریبی لوگ ہی ایسے کام کرتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم پولیس سے رابطہ کرکے ابھی اسے گرفتار کرواتے ہیں۔'' روشی نے اسے تسلی دی۔

''اس سے پہلے میں شاہنواز سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ کاشان کا باپ ہے اور اس نے ہی تاوان کی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس معاملے میں اس کا مشورہ ضروری ہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں اس کا سامنا نہیں کرسکوں گی۔'' مون نے کہا اور اپنے سیل فون پر شاہنواز کا نمبر ملانے لگی۔ یہ نمبر اس نے آج ہی شاہنواز سے لیا تھا۔

''میں خود وہاں آرہا ہوں۔ مجھے پتا بتاؤ۔'' ساری بات سن کر اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تو مون اسے اس جگہ کا پتا سمجھانے لگی۔ وہ لوگ قیدی والے کمرے سے ہٹ چکی تھیں اور ایک دوسرے کمرے میں یہ ساری گفتگو ہورہی تھی۔

''میں ڈرائیور کو چیک کرتی ہوں۔ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔'' روشی نے کہا۔

''ایسا کرو خان سے کہہ دو کہ ڈرائیور پر نظر رکھے۔ وہ بھاگنے نہ پائے۔'' مہ پارہ نے یہ ذمے داری چوکیدار کو سونپنا زیادہ مناسب سمجھا۔ جیسے جیسے مجرموں کی نشاندہی ہورہی تھی ان کا جوش بڑھتا جارہا تھا۔

''شفیق میرے بڑے اعتماد کا ڈرائیور تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ مجھے ایسا دھوکا دے گا اور سعد جیسے کمینے آدمی کے ساتھ مل جائے گا۔'' مون صدمے سے دوچار تھی۔

''انسان کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ یہاں خونی رشتے دھوکا دے جاتے ہیں۔ وہ تو پھر صرف تنخواہ دار ڈرائیور ہے۔'' عروج نے فلسفیانہ لہجے میں اسے سمجھایا۔ دسمبر کے بالکل آخری دن چل رہے تھے اور سورج ڈھلنے کے ساتھ سردی میں اضافہ شروع ہوگیا تھا۔ انجی نے الیکٹرک کیتل کی مدد سے کافی تیار کر کے سب کو ایک ایک کپ تھمایا۔ ابھی تک گھر نہ پہنچنے پر وہ اپنے اپنے گھروں میں فون کرکے معقول بہانہ بنا چکی تھیں۔ انہیں یہاں نیو ایئر نائٹ کا فنکشن کرنا تھا اور اسی فنکشن کی تیاری کے لیے رکنے کا بہانہ بنایا تھا۔

''میں کئی سالوں سے شوبز کے لوگوں کے ساتھ نیو ایئر نائٹ سیلیبریٹ کررہی ہوں۔ ایسے فنکشنز میں بہت رونق ہوتی ہے لیکن سارے رنگ اور روشنیاں کھوکھلی ہوتی ہیں یہ صرف اس دنیا کے لوگ جانتے ہیں۔ کاشان واپس آجائے تو میں اس دفعہ اس اہم دن کو آپ لوگوں کے ساتھ سیلیبریٹ کرنا پسند کروں گی۔'' گرم کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے مون نے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

''کیوں نہیں، ہمیں آپ کی شرکت سے خوشی ہوگی۔'' روشی نے فوراً ہی اسے جواب دیا۔ وہ ٹی وی ڈراموں کی شوقین تھی اس لیے مون کے ارادے پر سب سے زیادہ اسے ہی خوشی ہوئی تھی۔

آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد شاہنواز کی وہاں آمد ہوئی۔ اسی وقت مون کے فون کی گھنٹی بجی۔

''تم کہاں ہو مون! کاشان کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے اور تم ہو کہ سیر سپاٹوں میں مگن ہو۔'' فون کرنے والی اس کی ماں الماس تھی جو اس پر برس رہی تھی۔

''لگتا ہے آپ کی ساری ڈرگز اور بوتلیں ختم ہوگئی ہیں جب ہی آپ کو کاشان کا خیال آرہا ہے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی مون کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ کچھ دیر قبل جب وہ گھر گئی تھی تو الماس اپنے کمرے سے باہر آکر اس سے ملی تک نہیں تھی اور اب وہ اس سے بازپرس کررہی تھی تو اس کا غصے میں آنا بنتا تھا۔ صبح سے یہ وقت آگیا تھا وہ ایک پل سکون سے نہیں بیٹھی تھی اور اسے ہی طعنے دیے جارہے تھے۔

''بکواس مت کرو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرسکتیں۔ مجھے بتاؤ کہ تم کاشان کے لیے کیا کررہی ہو؟'' الماس نے گرج کر پوچھا۔

''میں گھر آکر آپ کو بتاتی ہوں۔'' مون نے ضبط سے کام لیتے ہوئے جواب دیا اور سلسلہ منقطع کردیا۔ الماس نے فوراً ہی دوبارہ کال کرنا شروع کردی لیکن مون نے فون وائبریشن پر کرکے اس کی گھنٹی بند کردی تھی۔ اسے کڈنیپرز کی طرف سے کال کا انتظار نہ ہوتا تو فون کو آف ہی کردیتی۔

''کہاں ہے وہ بندہ ذرا مجھے اس کے پاس لے چلیں۔'' مون کو گفتگو میں مصروف دیکھ کر اب تک خاموشی

اختیار رکھنے والے شاہنواز نے فرمائش کی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ایک بڑے سائز کی پلاسٹک کی بوتل اور چھوٹی سی رسی نظر آرہی تھی۔ ان سب ہی نے ان دونوں چیزوں کو حیرت سے دیکھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے کسی کو سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ شاہنواز نے دوسرے کمرے میں پہنچ کر کرسی سے بندھے نوجوان کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر ہاتھ میں موجود بوتل کا ڈھکن کھول کر اس میں موجود مائع اس کے کپڑوں پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ باسط نامی وہ نوجوان جو خواتین کے جھرمٹ میں کسی مرد کو پا کر پہلے ہی گھبرا گیا تھا۔ اس کی اس حرکت پر مزید سٹپٹا گیا۔ کیونکہ بوتل کھلتے ہی ہر سو پھیلتی بو نے بتا دیا تھا کہ اس میں موجود مائع اصل میں پیٹرول ہے۔

''کون ہو تم اور میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے چلّا کر شاہنواز سے پوچھا۔

شاہنواز نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور بوتل کا ڈھکن بند کر کے اسے ایک طرف ڈالنے کے بعد ہاتھ میں موجود رسی کو ایک سیدھی لکیر کی صورت میں اس طرح فرش پر پھیلایا کہ اس کا ایک سرا باسط کے پاؤں کے قریب تھا۔ شاہنواز نے جیب سے لائٹر نکال کر رسی کے دوسرے سرے پر آگ جلائی اور سنگین لہجے میں بولا۔

''تمہارے پاس سچ بولنے کے لیے بس اتنی مہلت ہے کہ رسی کے اس سرے پر جلتی آگ دوسرے سرے پر پہنچ جائے۔ اس مہلت کے دوران تم نہیں بولے تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا کیا انجام ہوگا۔'' یہ صورت حال ایسی تھی کہ کرسی سے بندھا باسط تو کیا جملہ خواتین بھی ہکا بکا رہ گئیں۔ رسی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس لیے باسط کی مہلت بہت تیزی سے ختم ہونے لگی۔ پیٹرول سے اسے شاہنواز نے نہلایا تھا۔ خوف نے پسینے سے نہلا ڈالا اور بالآخر اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ زور سے چیخا۔

''ہٹاؤ، اسے ہٹاؤ۔ میں سب بتاتا ہوں۔'' اور پھر اس نے جو کچھ بتایا اسے سُن کر سب دنگ رہ گئے۔

☆☆☆

پرل ونٹر کیمپ میں آج الگ ہی رونق تھی۔ ان چاروں سہیلیوں کے ساتھ ساتھ اسٹاف کے دیگر ارکان بھی بہت سرگرم اور پُرجوش نظر آرہے تھے۔ یہ سرگرمی آنے والے نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے تھی۔ آج خصوصی طور پر نائٹ فنکشن رکھا گیا تھا۔ وہاں آنے والے سارے بچے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے والدین نے بہ خوشی اپنے بچوں کو اس فنکشن میں شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ بچوں کے ساتھ والدین کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن بہت کم والدین اپنے بچوں کے ساتھ آرہے تھے۔ اپنے طبقے کی روایت کے مطابق آج رات ان میں سے بیشتر کو نیو ایئر کی خصوصی پارٹیز میں شرکت کرنی تھی جہاں ظاہر ہے مست و مدہوش ہونے کے سارے لوازم میسر ہوتے ہیں ایسے میں وہ لوگ اس بچکانا فنکشن میں شرکت کر کے اپنی یہ خاص رات کیوں برباد کرتے، ہاں بچوں کو ڈرائیورز کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ مختلف عمر کے بچے دمکتے چہروں کے ساتھ اس فنکشن میں شریک تھے جو خاص ان کے لیے منعقد کیا گیا تھا ورنہ اس سے قبل انہیں یہ رات عموماً اپنے گھروں کی تنہائی میں زیادہ سے زیادہ ٹیلی وژن کے پروگرام دیکھتے ہوئے گزارنی پڑتی تھی اور وہ نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لے پاتے تھے۔ وہ چاروں سہیلیاں آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے خود گیٹ کے دونوں جانب کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس خصوصی بینڈز تھے جن پر نہایت خوب صورتی سے چمکتے حروف میں ویلکم ٹو 2017ء کندہ تھا۔ وہ یہ بینڈز بچوں میں تقسیم کر رہی تھیں جو خوشی خوشی انہیں اپنی کلائیوں میں پہن رہے تھے۔ بنگلے کے گیٹ پر وقفے وقفے سے گاڑیاں آکر رک رہی تھیں۔ پھر ایک جانی پہچانی گاڑی آکر وہاں رکی۔ اس گاڑی کو حسب معمول ڈرائیور شفیق ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کی پچھلی نشست پر مونا خادم علی عرف مون بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی سے اتری تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس نے سیاہ رنگ کی بالکل سادہ ساڑی پہن رکھی تھی اور اس ساڑی پر سلور رنگ کے خوب صورت و نفیس زیورات الگ ہی بہار دکھا رہے تھے۔ گلے میں پہنا نازک لیکن لمبا سا ہار اس کے سینے تک آرہا تھا، کانوں میں سلور رنگ کے لمبے آویزے تھے۔ ایک ہاتھ کی کلائی میں موٹا سا سلور کڑا اور دوسرے میں نازک سی رسٹ واچ تھی۔ پیروں میں سلور سینڈل تھے۔ زیورات سے لے کر گھڑی، سینڈل اور پرس تک میں بے تحاشا چھوٹے چھوٹے نگینے جڑے ہوئے تھے جن سے روشنیاں منعکس ہو کر مون کے چہرے پر رقص کر رہی تھیں۔

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ایسی ڈریسنگ کسی عام سی عورت نے کی ہوتی تو قطعی اچھی نہیں لگتی لیکن مون تو غضب ڈھا رہی ہے۔'' روشی نے ساتھ کھڑی لبنیٰ کے کان

میں سرگوشی کی، اس نے بھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کیونکہ اسی وقت وہاں آکر رکنے والی دوسری گاڑی سے شاہنواز اترا تھا۔ وہ سیاہ ڈنر سوٹ میں ٹک سک سے تیار بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی سے کاشان بھی اترا تھا جس نے بالکل شاہنواز جیسا ہی ڈنر سوٹ پہن رکھا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی اس کی نظر مون پر پڑی اور وہ لپک کر اس کی طرف دوڑا۔ مون نے بھی جلدی سے اپنی باہیں وا کر دیں اور اسے خود سے چمٹا کر بے تحاشا چومنے لگی۔ اس عمل کے دوران اس کی آنکھوں میں ستارے سے بھی چمکتے دکھائی دیے لیکن اس نے کمال مہارت سے جھلمل ستارے جیسے ان آنسوؤں کو اپنے اندر اتار لیا اور کاشان کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھی۔ شاہنواز بھی قدم بڑھا کر بیٹے کی دوسری جانب آگیا اور اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ کاشان وہ پہلا بچہ تھا جو وہاں اس طرح داخل ہو رہا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کو کسی نے تھام رکھا تھا۔

"پرفیکٹ فیملی۔" ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے عروج نے تبصرہ کیا۔

"غلط۔ یہ ایک فیملی نہیں ہے۔" مہ پارہ نے افسوسناک حقیقت بیان کی جس پر سب ہی افسردہ ہوگئیں۔ اس وقت تک وہ تینوں اتنے قریب آگئے تھے کہ اب ان پر تبصرے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ عروج نے کاشان کو آج کا خصوصی بینڈ پہنایا جبکہ بٹی اور روشی نے شاہنواز اور مون کو پھول پیش کرتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ کچھ دیر میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا تو وہ چاروں کوٹھی کے لان میں پہنچ گئیں جہاں آج کے فنکشن کا انتظام کیا گیا تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی لیکن باربی کیو کے لیے کیے گئے انتظام نے کچھ نہ کچھ سردی کا توڑ کر رکھا تھا۔ پھر طاقتور بڑی لائٹس تھیں جن سے روشنی کے ساتھ حرارت بھی خارج ہو رہی تھی۔ بارہ بجنے میں اب زیادہ وقت باقی نہیں رہا تھا۔ جب بارہ بجنے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تو اچانک وہاں جلتی لائٹس بند کر دی گئیں۔ اندھیرے میں ابھرنے والی گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک بہت واضح تھی جو ایک ایک سیکنڈ کا حساب بتا رہی تھی۔ انسٹھویں سیکنڈ پر ٹک ٹک کی یہ آواز بند ہوئی اور اسٹیج پر روشنیاں سی جھلملاتی نظر آئیں۔ یہ روشنی ان موم بتیوں کی تھی جو خاص طور پر 2017ء کے ہندسوں کی شکل میں ڈیزائن کی گئی تھیں اور انہیں چھوٹے چھوٹے بچوں نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ بچوں کے نمودار ہونے کے اگلے ہی لمحے خوب صورت آتش بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برقی روشنیاں اب بھی نہیں جلائی گئی تھیں اور پس منظر میں گونجتے نئے سال کے گیت کے ساتھ روشنیوں کا یہ کھیل بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ آتش بازی کا سلسلہ رکا اور اسٹیج پر موجود بچے نیچے اترے تو یک دم ہی برقی قمقمے جل اٹھے، ان قمقموں کو بڑی لائٹوں کی وجہ سے پہلے کسی نے نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔ اب جب وہ روشن ہوئے تو معلوم ہوا کہ انہیں ایک ترتیب سے 2017ء کے ہندسوں کی شکل میں ڈیزائن کیا گیا تھا۔ قمقموں کی شکل میں ہر سو جگمگاتے 2017ء کے ہندسے سب ہی کو بہت متاثر کن لگے اور بچوں کے ساتھ بڑے بھی تالیاں بجا کر اپنی پسندیدگی اور خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ 2017ء کو خوش آمدید کہنے کے بعد فنکشن کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ اسٹیج پر بچوں نے کچھ پرفارمنس دی ساتھ ہی خورد و نوش کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا۔

"الماس صاحبہ کیسی ہیں؟" کاشان اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا تو شاہنواز نے قریبی نشست پر موجود مون سے دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

"پہلے سے بہتر ہیں۔ میں آنے سے پہلے ان سے ملاقات کر کے آئی ہوں۔ کیسی بھی سہی وہ میری ماں ہیں اور میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔" مون نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ اس دن باسط نے جو انکشاف کیا اس کے مطابق جو کچھ ہوا اس کے پیچھے الماس کا ہاتھ تھا۔ اسی نے باسط اور اس کے ساتھ کام کرنے والے لڑکے کو اس کام کے لیے راضی کیا تھا۔ ماں کی بے اعتدالیوں کو دیکھتے ہوئے مون نے خاصے عرصے سے اس کے ہاتھ میں کھلا پیسا دینا ترک کر دیا تھا۔ بیٹی کی اس روش پر نالاں الماس نے بیٹی کی کمزوری کو جانتے ہوئے اس سے یکمشت رقم حاصل کرنے کے لیے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا۔ ڈرائیور شفیق بس اس حد تک قصوروار تھا کہ جب مون فریش ہونے گھر گئی تھی تو اس نے الماس کے دریافت کرنے پر اسے ساری روداد سنا دی تھی جس سے اسے پتا چل گیا تھا کہ مون نے رقم کا انتظام کر لیا ہے اور اس نے باسط کو میسج کر دیا تھا کہ مون رقم کا انتظام کر چکی ہے۔ باسط اور اس کے دوست نے دو اور لڑکوں کو اس منصوبے میں شامل کر کے پلان بنایا تھا کہ وہ الماس کو رقم میں حصہ دار نہیں بنائیں گے اسی لیے باسط خود مون کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ اپنے اناڑی پن کی وجہ سے برل گروپ کی نظروں میں آگیا اور یوں سارا کچا چٹھا کھل گیا۔ شاہنواز کے پولیس میں بہت اوپر

نیک تعلقات تھے۔ باسط کی مدد سے اس نے ان کے ٹھکانے پر ریڈ کروا کر کاشان کو بازیافت کروانے کے ساتھ ساتھ باسط کے ساتھیوں کو بھی گرفتار کروا دیا۔ مون کی خواہش پر شاہنواز نے اس کیس کی میڈیا کو ہوا نہیں لگنے دی تھی لیکن مون کو مشورہ دیا تھا کہ وہ الماس کا پراپر علاج کروائے۔ مون نے اس کے مشورے پر الماس کو بحالی صحت کے ایک مرکز میں جہاں نشے کے عادی افراد کا علاج کیا جاتا تھا، داخل کروا دیا تھا۔ کاشان کو شاہنواز اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مون نے اُداس ہونے کے باوجود اس کے اس عمل پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ کاشان کی اس طرح حفاظت نہیں کر سکتی جیسے شاہنواز کرتا۔ سینے پر برداشت کا بھاری پتھر رکھے وہ خود کو کاشان کے بغیر جینے کا عادی بنانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مختصر عرصے میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کام اس کے اندازوں سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ آج وہ خاص طور پر کاشان سے ملنے اور اسے دیکھنے کے لیے وہاں آئی تھی۔

''اچھی بات ہے کہ آپ کو اپنی ماں کا خیال ہے لیکن کیا آپ کو اس بن ماں کے بچے کا کوئی خیال نہیں ہے؟'' شاہنواز نے دوستوں کے ایک گروپ کے ساتھ کھڑے کاشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تو مون نا سمجھی سے شاہنواز کی شکل دیکھنے لگی۔

''مجھے کاشان بہت عزیز ہے۔ میں اس کے لیے دنیا کی ہر نعمت کا ڈھیر لگا سکتا ہوں۔ آپ نے اس کی تربیت بھی بہت اچھی کی ہے اس لیے وہ آپ کی نصیحتوں کے مطابق مجھے بالکل تنگ نہیں کرتا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ وہ میرے ساتھ مکمل طور پر خوش نہیں ہے۔ میں اسے دنیا کی ہر نعمت دے سکتا ہوں لیکن میرے پاس آپ کا نعم البدل نہیں ہے، آپ اس کی زندگی میں اتنی اہم ہیں کہ آپ کی کمی باقی ہر نعمت پر بھاری ہے۔''

''تو کیا آپ نے کاشان کو مجھے واپس کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' خوشی سے مون کی آواز کانپی۔

''جی نہیں۔'' شاہنواز کے صاف انکار نے مون کے چہرے پر زردی مل دی۔ رنگوں سے کھیلنے والے نے اس رنگ کو محسوس کیا اور بولا۔

''میں کاشان کو آپ کے حوالے کرنے کے بجائے یہ چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ کے لیے میرے گھر آ جائیں کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ ہی وہ واحد ہستی ہیں جو میری اور کاشان کی زندگی میں صنم کا خلا پُر کر سکتی ہیں۔ آپ کو عزت دار زندگی گزارنے کے لیے ایک گھر کی چاہ ہے اور مجھے گھر کو گھر بنانے کے لیے ایک مخلص ساتھی کی ضرورت۔ ہم دونوں یکجا ہوں گے تو یقیناً ایک مکمل خاندان تشکیل پا جائے گا۔'' شاہنواز کہتا رہا اور مون سکتے کی سی کیفیت میں سب سنتی رہی۔

''آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا؟'' مسلسل خاموش پا کر شاہنواز نے ٹوکا۔

''میں کیا کہوں، میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آنکھوں میں خواب اتارنے والا رب یوں بھی اپنے بندوں کے خوابوں کو تعبیر دیتا ہے۔ اپنے خواب کی اتنی خوب صورت تعبیر تو خود میرے گمان میں بھی نہیں تھی۔'' اس بار مون کی آنکھوں میں جھلملاتے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے رخساروں پر مانند کہکشاں بہنے لگے۔ شاہنواز نے بے ساختہ ہی ان ستاروں کو اپنی انگلیوں کی پوروں پر چننا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا مون! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ڈیڈی آپ نے مون کو کچھ کہا ہے؟'' کاشان نے دور ہی سے مون کے آنسو دیکھ لیے تھے اور وہاں دوڑا چلا آیا تھا۔

''میں مون کو آپ کی مما بنا کر اپنے ساتھ گھر لے جانے کے لیے راضی کر رہا ہوں۔ ذرا آپ بھی میرا ساتھ دو جانو۔'' شاہنواز نے جان بوجھ کر مون کو چھیڑنے کے لیے کاشان سے کہا اور مون کے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ مصور تھا لیکن رنگوں کی ایسی خوب صورت بہار خود اس نے بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''راضی کیا کرنا، میں تو مون کو آرڈر دے سکتا ہوں۔ کیوں مون! آپ چلیں گی نا ہمارے ساتھ۔'' کاشان نے اتنے رعب سے پوچھا کہ مون کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی اور اس نے ہنستے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دے ڈالی۔ جاسوسی کی خصوصیات سے مالا مال پرل گروپ کے ارکان نے دور ہی سے یہ منظر دیکھا اور بات کی تہ تک پہنچ کر ''وہ مارا'' کا نعرہ لگایا۔

''میں نے کہا تھا نہ پرفیکٹ فیملی۔ لو بن گئی پرفیکٹ اینڈ کمپلیٹ فیملی۔'' کاشان کو ایک ساتھ شاہنواز اور مون کی بانہوں کے حصار میں دیکھ کر عروج نے اترا کر کہا تو وہ سب ہنس پڑیں اور پھر مہ پارہ بولی۔

''اس کا مطلب ہے اگلی بار چھٹیوں میں پرل گروپ ایک عدد میرج بیورو یا نجومی بابا کا دفتر بھی کھول سکتا ہے۔''

اس بار چاروں کا قہقہہ پہلے سے بھی زیادہ بلند تھا۔